.... اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا

(اول، دوئم)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ



....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد اول

(پہلا اور دوسرا حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

جہانگیر بُک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر: نبیل نیاز

قیمت: 275/- روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

تقسیم کنندہ: سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879
سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار۔فون: 041-2627568
سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ۔ فون: 0300-3012131

جہانگیر سنز

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

محمود الحسن

فہرست

پیش لفظ

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے کا تعلق سلطان محمود غزنوی کے دور کے ساتھ ہے۔ دس کہانیوں کا پہلا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے متعلق کچھ وضاحتیں بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلے اُس بے انصافی، دھاندلی اور تعصّب کی تفصیل سُن لیں جس سے سُلطان محمود غزنوی کی شخصیّت اور جہاد کی تاریخ مسخ کی گئی ہے جن قارئین نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں دس جماعتیں پاس کی ہیں، انہیں ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملے پڑھائے جاتے تھے۔ نمایاں تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ محمود غزنوی لُوٹ مار کے لیے ہندوستان آتا تھا اور بے انداز زر و جواہرات اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اُس کا مقصد لُوٹ مار نہ ہوتا تو وہ یہاں بیٹھ کر حکومت کرتا جس طرح اس کے بعد آنے والے مسلمانوں نے کی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اُس کے بیشتر حملے ہندوستان کے بڑے بڑے مندروں پر ہوتے تھے جہاں کے وہ بُت توڑ کر واپس چلا جاتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مندروں میں اُس دور میں زر و جواہرات مہاراجوں کے خزانوں کی نسبت زیادہ ہوتے تھے، اس لیے تاریخ میں یہ مفروضہ شامل کر لیا گیا کہ سُلطان محمود مندروں پر صرف زر و جواہرات کے لیے حملے کرتا تھا۔ اس مفروضے کے ساتھ یہ جھُوٹ شامل کر لیا گیا کہ بعض بُت بہت بڑے سائز کے تھے جو اندر سے کھوکھلے تھے۔ ان کے اندر خزانے بھرے ہُوتے تھے۔

تھانیسر اور سومنات کے بڑے بُتوں کے متعلق خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ ان کے اندر سونا بھرا ہُوا تھا اور سونے کے لیے ہی سُلطان محمود نے یہ بُت توڑے تھے۔ غیر جانبدار اور غیر متعصّب مؤرخوں نے (جن کا تعلق یورپ سے تھا) اصل حقیقت بیان کی ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ تمام بُت ٹھوس تھے۔ ان میں سے جو زیادہ اہم اور مقدّس تھے، وہ بھی مٹی کے بنے ہُوتے تھے اور ان پر کانسی چڑھائی گئی تھی۔ تھانیسر کے بُت کو سُلطان اپنے

ساتھ غزنی لے گیا تھا اور اسے توڑ کر اس کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں پھینک دیتے تھے۔

سومنات کے بُت کے متعلق غیر متعصب مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلطان نے اس کے دو ٹکڑے کیے، پھر دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ اور سولہ کے بتیس ٹکڑے کر کے انہیں باہر پھینکا اور ان پر سے اپنی فوج گزاری تھی۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں نصابی کتابیں ہندو مصنفوں کی لکھی ہوتی تھیں انگریزوں کا محکمۂ تعلیم ان کتابوں کو منظور کر لیا کرتا تھا کیونکہ خود انگریز کی دلچسپی اس میں تھی کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے۔ انگریزوں نے خود بھی ہماری تاریخ کا چہرہ مسخ کیا۔ سید احمد شہید کو ڈاکو کہا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو "ہندوستانی سپاہیوں کا غدر" کہا۔ کلکتہ کا "بلیک ہول" انگریزوں کا من گھڑت اور بے سروپا قصہ ہے۔ انگریزوں نے اپنے اس خدشے کو چھپا کر بھی نہیں رکھا کہ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے لیے اگر کوئی قوم خطرہ بن سکتی ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ انگریزوں کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہُوا۔

ہندو سُلطان محمود غزنوی کو مردِ مجاہد اور بُت شکن کیوں کہتے؟ ہندو تاریخ دانوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ انہوں نے انگریزی حکومت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ سُلطان محمود کے جہاد کو گھناؤنے طریقے سے نصابی کتابوں میں شامل کیا۔ یہی کتابیں مسلمان بچے بھی پڑھتے رہے۔ سلطان محمود کی تاریخ کو سترہ حملوں تک محدود رکھا گیا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بھی وہی نصاب رائج رہا اور سلطان محمود غزنوی سترہ حملوں کی وجہ سے ہی جانا پہچانا جاتا رہا۔ اب بھی آپ کو نصابی کتابوں میں وہی کچھ ملے گا جو انگریزوں کے دور میں لکھا گیا تھا۔ پاکستان میں نصابی کتابیں لکھ کر سکولوں کالجوں کے لیے منظور کرانا ایک کاروبار ہے۔ اس میں لین دین کا خیال رکھا جاتا ہے دکھایا پیا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کہاں تک مستند ہے اور بچوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

نصابی کتابوں کے علاوہ (آزادی سے پہلے) جو کتابیں عام مطالعہ کے لیے لکھی گئیں، ان میں بھی سُلطان محمود کو لٹیرا ہی ظاہر کیا گیا۔ یہ زہر پاکستان میں بھی پھیلایا گیا۔ مثلاً ۱۹۷۰ء میں

پاکستان میں انگریزی زبان میں ایک کتاب چھپی ہے جو ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپی تھی۔ اس کا مصنّف محمد حبیب بی۔ اے (آکسن) ایم۔ ایل سی ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ یہ کتاب سُلطان محمُود غزنوی کی زندگی، اس کے کردار اور اس کے کارنامے نمایاں کا ایک تجزیہ و مطالعہ ہے۔ پیش لفظ میں اس مسلمان مصنّف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سلطان محمود غزنوی کو برگزیدہ شخصیّت سمجھنا شروع کر دیا ہے جس سے مصنّف (محمد حبیب) کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس مصنّف نے کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

- محمُود غزنوی اپنے باپ سبکتگین کا بیٹا نہیں تھا اور یہ اُسے خود بھی شک تھا جس سے وہ بہت پریشان رہتا تھا۔
- محمُود غزنوی ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہُوا تھا جو سلطان کے باپ سبکتگین کی بیوی نہیں تھی۔
- محمُود غزنوی کو فروغ و تبلیغِ اسلام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لادینیت میں یقین رکھتا تھا۔
- محمُود غزنوی ہندوستان میں لُوٹ مار کے لیے آیا کرتا تھا۔
- محمُود غزنوی روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔
- محمُود غزنوی نے مرتے وقت لُوٹی ہُوئی تمام دولت کا اپنے سامنے ڈھیر لگوایا اور وہ بہت رویا۔
- محمُود غزنوی عام شہزادوں جیسا شہزادہ تھا اور شراب اور عورت کا شیدائی تھا
- محمُود غزنوی صرف ہندوؤں کے خلاف ہی نہیں لڑا بلکہ وہ مسلمانوں کے خلاف بھی لڑا کیونکہ اُس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع تھا۔

ایسے ہی کچھ اور الزامات ہیں جو صرف ایک مصنّف نے نہیں، بہت سے مصنّفوں نے محمُود غزنوی پر عائد کیے ہیں۔ ہمارے بچّے اگر ان الزامات سے واقف نہیں تو پھر بھی سُلطان محمُود غزنوی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ اُس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔

سُلطان محمود غزنوی اگر واقعی بُت شکن تھا اور وہ ہندوستان میں اسلام پھیلانا چاہتا تھا

تو اُس نے یہاں بیٹھ کر حکومت کیوں نہ کی؟ ـــ اس سوال کا جواب آپ کو ان کہانیوں میں ملے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ وہ جب ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے مسلمان حکمران غزنی کی سلطنت پر کہیں نہ کہیں حملہ کر دیتے تھے۔ سلطان صلاح الدّین ایّوبی کی طرح سلطان محمود کے بھی اپنی قوم میں دشمن موجود تھے جو اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ سلطان اِدھر اُدھر ہو تو غزنی پر قبضہ کر لیا جائے۔ ہندوستان میں ہر فتح کے ساتھ ہی اُسے پیغام مِلا کرتا تھا کہ غزنی پر فلاں نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ ایک مسلسل خانہ جنگی تھی جو سلطان محمود کو لڑنی پڑی۔ وہاں ایمان فروشوں کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے سُلطان محمود کو کبھی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہندوستان میں باقاعدہ اپنا دارالحکومت قائم کر سکتا۔

یہ تو کہا گیا ہے کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کیے تھے مگر یہ کم ہی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ہندوؤں نے غزنی پر کتنے حملے کیے تھے۔ حملوں میں پہل ہندوؤں نے کی تھی۔ مہاراجہ جے پال نے غزنی پر پہلا حملہ سلطان سبکتگین کے دَورِ حکومت میں کیا تھا۔ سُلطان سبکتگین کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اُس نے اپنے بیٹے سُلطان محمود کو وصیّت کی تھی کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی جنگی قوت سے اپنی سلطنت کو بچانا چاہتے ہو تو انہیں چین سے نہ بیٹھنے دینا۔ وہ غزنی کو نہیں اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں اگر غزنی ہاتھ سے نکل گیا تو ہندو عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے خانہ کعبہ تک پہنچیں گے۔ یہ خیال رکھنا کہ تمہارے حملے انتقامی جذبے کے تحت نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد بُت پرستی کا خاتمہ ہو۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کے وقت کے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے تم ہندومت کا خاتمہ کر دو۔

البیرونی، فرشتہ، گردیزی، عطبی، بیہقی اور ان جیسے کتنی اور مؤرخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ سُلطان محمود غزنوی اولیا کا معتقد تھا اور وہ اُس وقت کے ایک ولی شیخ ابوالحسن خرقانی کا مُرید تھا۔ اُس وقت کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شیخ خرقانی کے ہاں جایا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ خود سلطان محمود ہے۔ وہ خرقانی کے ہاں اپنے آپ کو سلطان محمود کا قاصد یا ایلچی ظاہر کیا کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے پہچان لیا تھا اور یہ کہا تھا ـــ "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ غزنی کا سُلطان اپنا قاصد خود بن کر آتا ہے۔ یہ سچے مسلمان کی شان ہے۔"

اُس وقت کی تحریروں سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ سلطان محمود قرآن کا طالب علم اور مذہبی علوم کا شیدائی تھا۔ ایک دو یورپی مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ میدانِ جنگ میں اُس کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی تھی اور اکثر یوں ہوا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں اتنا بے بس ہو گیا کہ شکست صاف نظر آنے لگی۔ ایسے وقت اُس نے ہر بار یوں کیا کہ گھوڑے سے کود کر اُترا اور قبلہ رُو ہو کر دو رکعت نفل پڑھے۔ دعا مانگی اور گھوڑے پر سوار ہو کر بلند آواز سے اعلان کیا —— "مجھے خُدا نے اشارہ دے دیا ہے۔ فتح ہماری ہے" —— اور ہر بار فتح اُسی کی ہوتی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی جہاں کہیں حملہ کرتا، جمعہ کے مُبارک روز کیا کرتا تھا اور وقت وہ مقرر کرتا جب مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ دیا جا رہا ہوتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی ہر حملے سے پہلے میدانِ جنگ میں دو رکعت نفل پڑھا کرتا تھا۔

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن کرنے والے سلطان محمود غزنوی کے صحیح حالاتِ زندگی اور جہاد کی مکمل تفصیلات پیش کی جائیں تاکہ سلطان کے خلاف جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، اسے افسانہ نہ سمجھا جائے۔

بعض قارئین نے سلطان محمود کی اس سلسلہ وار داستان کا موازنہ سُلطان صلاح الدین ایوبی کی کہانیوں سے کیا اور دونوں میں ایک فرق کو محسوس کیا ہے۔ جواب میں عرض ہے کہ عزم اور عقیدے کے لحاظ سے دونوں سُلطان ایک جیسے تھے۔ سُلطان ایوبی صلیبیوں کے خلاف لڑتا رہا اور سلطان محمود کی زندگی اسلام کے دوسرے بڑے دشمن ہندو کے خلاف لڑتے گزر گئی۔ دونوں کو یورپی مورخوں اور موجودہ دور کے جنگی مبصروں نے دنیا کے بہترین جرنیل کہا ہے۔ دونوں کٹر مسلمان تھے اور دونوں قرآن سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔

دونوں میں جو فرق نظر آ رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے جس جس ماحول میں جہاد کیا، وہ مختلف تھے۔ علاقے مختلف تھے، جنگوں کے پس منظر مختلف تھے۔ سلطان ایوبی کے دور میں صلیبیوں اور یہودیوں نے اپنی حسین اور تربیت یافتہ لڑکیاں مُسلمان علاقوں میں بھیج رکھی تھیں اور ان کے جاسوس بھی موجود اور سرگرم تھے۔ سلطان محمود کی کہانیوں میں آپ کو کوئی ایسا ہندو جاسوس مرد یا عورت نہیں ملے گی جو غزنی کی سلطنت میں گئی ہو۔ مہاراجے اپنے جاسوس

غزنی نہیں بھیجتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سُلطان محمود کے جاسوس موجود رہتے تھے۔ یہاں کے مُسلمان ان کی مدد کرتے تھے۔

دونوں سُلطانوں کے جاسوسوں میں ایک فرق تھا۔ سُلطان صلاح الدّین ایّوبی کے جاسوس ایمان، کردار اور فرض کے پکّے تھے۔ جانیں قربان کر دیتے تھے، ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتے تھے اور دشمن کے حسین جال میں کم ہی آتے تھے۔ اس کے برعکس سُلطان محمود کے بعض جاسوس ہندوؤں کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوؤں کی شعبدہ بازی تھی جسے آپ مسمریزم کہہ سکتے ہیں۔ اُس زمانے میں ہندوستان کی جادوگری ساری دُنیا میں مشہور تھی۔ اس شعبدہ بازی میں لڑکیاں بھی استعمال کی جاتی تھی۔ سُلطان محمود کے بعض جاسوس شعبدہ بازی اور جادوگری کو ایک آدمی کی کرامات سمجھ بیٹھتے تھے۔

ان کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کچھ مُسلمان برائے نام مُسلمان تھے۔ وہ ہندو مہاراجوں کے درباری اور مُخبر تھے اور اس طرح خاصی دولت کما لیتے تھے۔ یہ لوگ غزنی کے جاسوسوں کو پکڑوا دیتے یا اپنے ساتھ ملا لیتے تھے۔

یہاں کے مندروں کے اندر کی دنیا طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھی۔ مذہب کے پردے میں بدکاری اور عیاشی ہوتی تھی۔ پنڈت مہاراجوں اور ان کی فوجوں کے بالائی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ حکم پنڈتوں کا چلتا تھا۔ یہاں انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ پنڈت جس کسی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیتے، اُس کے ماں باپ کو وہ لڑکی پنڈتوں کے حوالے کرنی پڑتی تھی۔ غزنی کا جو جاسوس اس طلسم میں چلا جاتا، وہ اپنے فرض اور اپنے مذہب کو بھی بھول جاتا تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود غزنوی کا نظامِ جاسوسی بڑا کارآمد تھا۔ گو سلطان صلاح الدّین ایّوبی جتنا کارآمد نہیں تھا۔

ہم تاریخ کی بہت سی کتابوں سے مدد اور روشنی لے کر یہ داستان سنا رہے ہیں۔ ان میں میدانِ جنگ کے جو احوال و کوائف اور سلطان کی جو جنگی چالیں بیان کی گئی ہیں، وہ ہم نے اُس دَور کے وقائع نگاروں اور اس کے بعد کے جنگی مبصروں کی تحریروں سے حاصل کئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی تفصیل من گھڑت نہیں۔ ہمارا مقصد حقیقت کو سامنے لانا ہے اور ہم کہانی پن اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ بچے اور نوجوان بھی دلچسپی سے پڑھیں اور غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

سلطان محمود غزنوی کے خلاف ایک اور الزام بھی ہے جس کا ذکر نصابی کتابوں میں خاص طور پر لایا گیا ہے۔ یہ ہے فردوسی کا شاہنامہ۔ روایت ہے کہ محمود غزنوی نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کو کہا اور بے دریغ انعام کا وعدہ کیا تھا مگر شاہنامہ لکھا گیا تو سلطان نے انعام کا وعدہ پورا نہ کیا۔ یہ غم فردوسی کو لے بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود شاہنامہ اپنی مدح میں لکھوانا چاہتا تھا۔

غیر جانبدار مورخوں نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے۔ سلطان محمود کو اپنی مدح میں شاہنامہ لکھوانے کی فرصت اور ہوش ہی نہیں تھی۔ اس کی عمر ہندوستان میں ہندوؤں کے خلاف اور اپنے ہاں اقتدار پرست غداروں اور ایمان فروشوں کے خلاف لڑتے گزر گئی۔

ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ سلطان محمود چاہتا تھا کہ ایسا شاہنامہ لکھا جائے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہو اور آخر میں سلطان محمود کا ذکر اس طرح آئے کہ اُس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کفرستان تک پہنچایا اور سلطان کا ذکر رسولؐ کے غلام کی حیثیت سے آئے لیکن فردوسی نے جو شاہنامہ لکھا، وہ شہنشاہوں اور سلطانوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ سلطان محمود نے اس شاہنامہ کو قبول نہ کیا۔ بہر حال یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فردوسی کے شاہنامہ کا واقعہ سلطان محمود کو رسوا کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔

سلطان محمود کے متعلق مختلف مؤرخوں اور تاریخ دانوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ اختصار سے پیش کیا جاتا ہے:

"سلطان ہٹ کا پکا تھا۔ اپنا ارادہ پورا کر کے رہتا، اور مخالفت کم ہی برداشت کرتا تھا لیکن اپنے افسروں کے مشوروں اور تجاویز پر اور اُن کے ذاتی مسائل اور امور پر غور کرتا اور کام کی کوئی تجویز رَد نہیں کرتا تھا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کے افسر اُس کا نام ہمیشہ احترام سے لیتے رہے۔" (ابن الاثیر۔ سبط ابن الجوزی۔ بیہقی)

"سلطان خویش پرور نہیں تھا۔ وہ وزارت اور دیگر عہدے صرف اُنہیں دیتا تھا جو ان کے اہل ہوتے تھے۔" (بیہقی)

"سلطان کے سات بیٹے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی وہ خصوصی نگرانی کرتا تھا۔ اُس

نے اپنے بیٹوں کی پرائیویٹ زندگی اور مشاغل پر نظر رکھنے کے لیے تربیّت یافتہ جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو سلطان کو باقاعدگی سے رپورٹیں دیتے رہتے تھے۔ کوئی بیٹا کہیں بھی کوئی ناروا حرکت کرے، سلطان اُسے بڑی سخت سزا دیتا تھا۔" (بیہقی۔ گردیزی)

"سلطان اپنی پرائیویٹ زندگی میں اسلامی اصولوں کی پابندی کرتا تھا۔" (ابن الاثیر۔ مجمل)

"ترکمان کے خوبصورت غلام ابوالنجم ایاز کے ساتھ سلطان محمود کی محبت کو شاعروں اور قصیدہ گوؤں نے رومانی رنگ دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایاز بے شک خوبصورت تھا لیکن اس کے ساتھ سلطان کی محبت اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیّت کی وجہ سے تھی۔ ایاز کی قابلیّت اور فرض شناسی سے متاثر ہو کر سلطان نے اُسے ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا۔"

(چہار مقالہ۔ کلیّاتِ اطہر۔ فرخی۔ نظام سمرقندی۔ شیخ فریدالدّین اطہر۔ زوالالی۔ محمود و ایاز۔)

"سلطان جتنا دانشمند تھا، اتنا ہی بہادر تھا۔ میدانِ جنگ میں جہاں دشمن کا دباؤ زیادہ ہوتا وہاں سلطان خود آگے ہو کر حملہ کرتا تھا۔ اس کی ذاتی شجاعت کا اثر یہ تھا کہ اس کے سپاہی انتہائی مایوس کُن حالات اور دشواریوں میں بھی ایسی بے جگری سے لڑتے تھے کہ متوقع شکست فتح بن جاتی تھی۔" (آداب الملوک۔ عطبی)

"سلطان عدل و انصاف کے معاملے میں بڑا سخت تھا۔ کسی کا اُس کے ساتھ خون کا رشتہ یا کسی کا اُونچا عہدہ اور رتبہ سلطان محمود کے عدل و انصاف کو موڑ توڑ نہیں سکتا تھا۔ سلطان محمود کے اپنے بیٹے مسعود نے ایک تاجر سے قرض لیا اور مقرّرہ مدّت گزر جانے پر ادائیگی سے پس و پیش کرنے لگا۔ تاجر نے قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ مسعود اس خوش فہمی میں مُبتلا تھا کہ سلطان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اُسے عدالت میں نہیں بلایا جائے گا۔ اُس نے طلبی پر قاضی کے سامنے جانے سے انکار کر دیا۔ سلطان کو اطلاع ملی تو اُس نے اپنے بیٹے کو گرفتار کروا کے عدالت میں بھیجا۔ قاضی نے اس سے قرض واپس دلایا اور جرمانہ بھی کیا۔"

(سیاست نامہ۔ حافی۔ فرخی۔ سبط ابن الجوزی)

"علی تشگین فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ اس نے اسلام کے منافی ایک حرکت کی۔ سلطان کے حکم سے اُسے سرِ عام کوڑے لگائے گئے۔" (سیاست نامہ۔ حافی۔ سبط ابن الجوزی)

"عاملِ نیشاپور نے اپنے رتبے اور سرکاری حیثیت کے رعب میں ایک عورت کی جائیداد

پر قبضہ کر لیا۔ عورت نے سلطان محمود سے شکایت کی۔ سلطان نے عاملِ نیشاپور کے رُتبے اور حیثیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے سرِ عام کوڑوں کی سزا دی اور سرکاری حیثیت سے برطرف کر دیا۔"

(سیاست نامہ۔ مجموعہ الانساب)

"سُلطان محمُود نے فقہ پر خود ایک کتاب لکھی تھی اور علما کو دربار میں جمع کر کے ان سے فقہ اور نظامِ شریعت پر کتابیں لکھواتی تھیں۔" (حاجی خلیفہ۔ امام مسعود بن شاتبان۔ حکایت السلاطین)

"سلطان مذہب کا پابند تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا اور سحر صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کیا کرتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں اپنی جائداد کی مالیّت اور نقد رقم پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کیا کرتا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ کسی علاقے میں زلزلے اور سیلاب وغیرہ سے تباہی آجاتے تو زکوٰۃ کی یہ رقم ہی متاثرہ علاقوں کی امداد اور آبادکاری کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔"

(فرخی۔ حاجی خلیفہ۔ امام مسعود)

"ذاتی جیب سے غریبوں اور معذوروں کی مدد کرتا تھا۔ طلبہ کو وظیفے دیتا تھا۔ ہندوستان پر حملوں کے لیے جاتا تو بہت سے لوگ رضاکارانہ طور پر ساتھ چلے جاتے اور لڑائی میں حصّہ لیتے تھے۔ سُلطان ان رضاکاروں کو فوج کی تنخواہوں کی نسبت زیادہ تنخواہ دیا کرتا تھا۔"

(سبط ابن الجوزی)

"لڑائی کیسی ہی خوفناک صورت کیوں نہ اختیار کر لے اور دشمن کا دباؤ کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جاتے، سلطان محمود تیمّم کر کے نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ وہ حج کے لیے ترستا رہا لیکن مجبُوریاں ایسی تھیں کہ اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حاجیوں کے جو قافلے حج کو جاتے اور آتے تھے، ان کی حفاظت کے لیے فوجی دستے بھیجا کرتا تھا۔ بدّو قافلوں پر حملے کرتے تھے۔ سلطان نے بدّوؤں کے سرداروں کے ساتھ یہ سودا کر لیا تھا کہ حاجیوں کے قافلوں پر وہ حملے نہ کریں، اس کی بجائے غزنی کے خزانے سے رقم لے لیا کریں۔" (ابن الاثیر۔ فرشتہ)

"سُنّی عقیدے کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔ سلطان نے افسر مقرر کر رکھے تھے جو اُن لوگوں کو سزا دیتے تھے جو سُنّی عقیدے کے خلاف کوئی نیا عقیدہ پھیلاتے پکڑے جاتے تھے۔ باطنی اور قرامطی عقیدوں کے پیروکاروں اور مبلّغوں کو وہ بڑی سخت سزائیں دیتا تھا۔ پھر بھی باز نہ آتے تو انہیں سرِ عام سزائے موت دی جاتی تھی۔ باطل عقیدوں کے بعض

مبلّغوں کو سلطان نے زندہ جلادیا تھا۔ اُس نے باطنی، قرامطی اور بہائی فرقوں کی تمام کتابیں سارے ملک کی تلاشی لے کر جمع کیں اور آگ لگادی"۔ (ابن الاثیر۔ ابن الجوزی۔ مجمل)

"سلطان نے ہندوستان میں ہندوؤں کو کبھی بھی اسلام قبول کرنے کا حکم نہ دیا۔ یہ کام عالم اور مبلّغ کرتے تھے جو سلطان کی فوج کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ اس نے ہندوستان میں ویران مسجدیں آباد اور نئی مسجدیں تعمیر کیں اور مبلّغوں سے کہا کہ وہ ہندوؤں کو اسلام سے روشناس کرائیں"۔ (البیرونی۔ مولوی ذکاء اللہ۔ گردیزی)

"سلطان کی فوج میں جو ہندو دستے تھے، ان کے لیے غزنی میں اُس نے مذہبی آزادی کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سلوک سے متاثر ہوکر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کرلیا تھا"۔ (المعاری۔ رسالۃ الغفران)

سلطان محمود غزنوی کی تاریخ کو مسخ کرکے اسے رُسوا کرنے اور زروجواہرات کا لٹیرا ثابت کرنے میں ہندوؤں کے علاوہ ان مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے جو عہدوں، اقتدار، زروجواہرات اور سلطانی کے خواہش مند تھے۔

ہم دس کہانیوں کا جو مجموعہ پیش کر رہے ہیں ان میں آپ کو وہ تمام لوازمات ملیں گے جو آپ کے اور آپ کی نوجوان نسل کے اس مطالبے کو پورا کرتے ہیں کہ کہانی تفریحی انداز میں لکھی جائے، اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور یہ جذبات میں ہلچل مچادے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہانیاں اس قومی جذبے کو بھی زندہ و بیدار کریں گی جسے ہمارے ملک میں ذہنی لذت مہیّا کرنے والی فحش کہانیوں سے ختم کیا جارہا ہے۔

عنایت اللہ

مُدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

.... اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا

یکم نومبر ۹۷۱ء بمطابق ۱۰ محرم ۳۵۷ ہجری کے روز اُمتِ رسول اللہ کا وہ مردِ مجاہد پیدا ہُوا جسے تاریخ بت شکن کے خطاب سے پہچانتی ہے۔ یہ تھا سلطان محمود غزنوی۔

دس صدیاں گزر گئی ہیں محمود غزنوی کا نام زندہ ہے۔ وہ پیغام زندہ ہے جو وہ غزنی سے لے کر اُس وقت ہندوستان میں آیا تھا جب یہ کفرستان تھا، اور یہاں برہمن اور اُس کے خداؤں کے بُتوں کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ عظیم پیغام تھا جو خدائے ذوالجلال نے اپنے رسول ؐ کو غارِ حرا میں دیا تھا۔ یہ پیغام ایک شمع تھی جسے غارِ حرا کی تاریکی نے نور بخشا تھا ــــ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں ــــ اور یہ بھی کہ کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کر سکتا۔

محمود غزنوی کا نام زندہ ہے، عظیم پیغام زندہ ہے، سومنات زندہ ہے، ہندوستان کے وہ سارے مندر، وہ بُت کدے زندہ ہیں جن کے بُت غزنی کے محمود نے توڑ کر باہر پھینکے اور ان کے پجاریوں سے کہا تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت انسان کے خدا نہیں ہو سکتے۔ ان میں خدائی کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے۔ تو انہیں کہو کہ اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑ کر میرے جسم کے ٹکڑے کر دیں۔

بُتوں کے ٹکرے جڑ نہ سکے، محمود کے ٹکڑے ہو نہ سکے۔ محمود نے ان ٹکڑوں کے اُوپر سے اپنی فوج گزاری ــــ پیادہ بھی، سوار بھی ــــ اُس نے تھانیسر میں بھی یہ مظاہرہ کیا، سومنات میں بھی کیا ــــ برہمن کے "خدا" اسلامی فوج کے پاؤں تلے پس کر مٹی کے ذرّے اور پتھر کے ریزے بن گئے۔

پھر محمود غزنی میں مر گیا ــــ ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں اور سنکھ بج

اُٹھے۔ برہمن نے ٹوٹے ہوئے بتوں کی جگہ نئے بُت کھڑے کر دیئے۔

پورے ایک ہزار سال بعد، دسمبر ۱۹۷۱ء میں اسی ہندوستان سے، اسی بُت کدے سے یہ آواز اُٹھی ـــ "ہم نے اسلامی شجاعت اور روایات کا بُت توڑ دیا ہے۔"

گزرے ہوئے ماہ و سال ہیں ہمارے کئی اور بُت ٹوٹ گئے ہیں ـــ ایمان کا بُت، قومی کردار کا بُت، وقار کا بُت، روایات کا بُت، اُمتِ رسولؐ کی وحدت کا بُت ـــ ہمارا کوئی بُت سلامت نہیں رہا۔ برہمن کے بڑے ہی حسین بتوں نے ہم پر ایسا طلسم طاری کیا ہے کہ ہم سب بھُربھُری مٹی کے بُت بن گئے ہیں جنہیں خود پیدا کردہ آندھیاں کھاتی اور اُڑاتی چلی جارہی ہیں۔

وہ مسجدیں جو محمود غزنوی نے یہاں بنائی تھیں وہ ویران ہیں۔

وہ بُت خانے جو اُس نے ویران کیے تھے وہ آباد اور پُر رونق ہیں۔

اور بُت یہ طعنے دے رہے ہیں کہ مُسلم کا خدا کوئی نہیں!

باطل کے بُت توڑنے والے کیسے ہوتے ہیں؟ حق کا بُت کس طرح ٹوٹتا ہے؟ اِن سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ماضی کے اُن تاریک گوشوں کو کھوجنا ضروری ہے جن تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچتی ـــ اور چونکہ اِن گوشوں تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچتی اور سچائی انہی گوشوں میں ہوتی ہے، اس لیے باطل ان گوشوں پر تاریکی کے زیادہ دبیز پردے ڈال دیتا ہے کہ سچائی دبی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ باطل شکنی کی تاریخ کا چہرہ مسخ ہوا اور آج کے دور کے دو کلمہ گو تاریخ دانوں نے بھی لکھ دیا کہ محمود غزنوی کو زر و جواہرات اور خزانوں سے دلچسپی تھی، اور بُت اس لیے توڑتا تھا کہ ان کے اندر زر و جواہرات اور بیش قیمت ہیرے بھرے ہوئے تھے جو ہندو عقیدت کے طور پر ان میں ڈالتے تھے۔ سومنات کے بُت کے متعلق بھی یہی کہا گیا مگر غیر مسلم مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ بُت اندر سے کھوکھلا نہیں ٹھوس تھا۔ محمود غزنوی نے اسے آٹھ ٹکڑوں میں توڑا اور باہر پھینکا جہاں اس کی فوج نے نفرت کے اظہار

کے لیے ان آٹھ ٹکڑوں کے کئی ٹکڑے کیے، پھر پوری فوج انہیں پیستی ہوئی گزر گئی۔
باطل دروغ سے فروغ پاتا ہے، اور جب باطل شکنوں کی اولاد دروغ کو برحق مان لیتی ہے تو حق کے بت ٹوٹ جاتے ہیں۔
تاریخ کے تاریک گوشوں میں جھانکئے۔ ایک ہزار سال پہلے کے عینی شاہدوں کی تحریریں پڑھیئے۔ یہ تحریریں الجھی الجھی سی ہیں، مگر غور کرو تو کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ بکھری بکھری کڑیاں بھی ملتی ہیں جنہیں ایک دوسری سے ملاؤ تو اس دور کے کئی واقعات کا پس منظر روزِ روشن کی طرح چمکتا سامنے آجاتا ہے ــــ تاریخ کا چہرہ بگاڑا نہیں جا سکتا، تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جس مٹی میں شہیدوں کا خون اور مظلوموں کا خون رچ بس جاتا ہے، اس مٹی کے ذرّے بولتے ہیں۔ شہیدوں اور مظلوموں کی روحیں مٹی کو زبان دے دیتی ہیں۔ پاک مٹی کی آواز سننے کے لیے ایمان کی بصیرت درکار ہے۔ اس آواز کو سمجھنے کے لیے دل و دماغ میں اللہ کا نور ضروری ہے۔
ایمان کی بصیرت نہ ہو، دل و دماغ میں اللہ کا نور نہ ہو تو ہم اللہ کے دھتکارے ہوئے ان لوگوں میں شامل کر دیئے جاتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ ہم نے ان کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا اور دماغوں کو سر بمہر کر دیا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں آگ کا عذاب اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ عذاب کس قدر بھیانک ہے۔

۶۴۰ء سے دو چار سال پہلے یا دو چار سال بعد کا واقعہ ہے کہ ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کا سنہری دور مدّت گزری ختم ہو چکا تھا اور اس سرزمین پر اب ان کی حکمرانی تھی جنہیں انصاف سے نفرت اور آمریت سے محبت تھی۔ وہ بادشاہ تھے اور انسانوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ انسانوں کو غلام بنانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کی بساط لپیٹ کر پھینک دو۔ رعایا کو بھوکا رکھو۔ انہیں بات نہ کرنے دو، حق کا گلا گھونٹ دو۔ انصاف اس سے کرو جو بادشاہ کے گیت گائے، خوشامدیوں کا ٹولہ پیدا کرو۔ مشیر اور وزیر اسی ٹولے سے منتخب کرو۔ انسانوں کو تنگدست رکھو

کر اس حال تک پہنچا دو جہاں انسان کتّے کے مُنہ سے ہڈی چھین کر اپنے بھوکے بچّے کے مُنہ میں ڈال دیا کرتا ہے۔

ایران کے اس بادشاہ نے عدل و انصاف کو ملک بدر کر دیا اور نوشیرواں عادل کے لگائے ہوئے شجر کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا اور اسکے خاندان کو مجبور کر دیا کہ وہ ایران سے نکل جائیں چنانچہ یہ لوگ ایران سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے عرش سے فرش پر گرے تو جدھر کو منہ آیا اُدھر کا رُخ کر لیا۔ ذریعۂ معاش نے انہیں بکھیر دیا، خانہ بدوش کر دیا ــــ انصاف کے علمبردار بے انصافی کا شکار ہوتے بڑے مرتے گئے، بچے جوان ہوتے گئے اور نسلیں روپوش اور نمودار ہوتی رہیں۔

اسی نسل کا ایک شخص قرار الحکم بن قرار ارسلان، گٹھا ہوا جوان جہرے پر آبا ؤ اجداد کی عظمت کے نقوش نمایاں مگر تنگدست اور روزی کا متلاشی بخارا کے ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ کسی نئے ٹھکانے کی تلاش میں جا رہا تھا۔ تھک گیا اور ایک درخت تلے بیٹھ گیا۔ قریب گھنی جھاڑیاں اور گھنے پیڑ تھے۔ ان کی اوٹ سے اُسے بچوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ الحکم کو معلوم تھا کہ یہ کوئی خانہ بدوش خاندان ہے۔ وہ لیٹ گیا۔

بچے ہنستے کھیلتے دور نکل گئے۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی سے ایک مترنّم آواز ابھری۔ آواز جوان تھی اور مقدّس بھی ــــ کوئی عورت تلاوتِ قرآن کر رہی تھی۔ قرار الحکم پر وجد سا طاری ہو گیا۔ اس کی تھکن دور ہونے لگی۔ سنتے سنتے وہ بدک اٹھا اور اٹھ کر دوڑ پڑا۔ جھاڑیوں سے گھوم کر اُدھر گیا جہاں خانہ بدوشوں نے دو پھٹے پرانے، پیوند لگے خیمے لگا رکھے تھے۔ ایک خیمے کے باہر ایک جوان لڑکی قرآن پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی آواز کی طرح دلکش اور حسین تھی۔ دو بوڑھے آدمی الگ بیٹھے رسّیاں بنا رہے تھے چند عورتیں اور دو چار مرد بھی تھے۔ قرار الحکم کو دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اُن کے درمیان چلا گیا۔

"آپ کی اس بیٹی نے ایک آیت غلط پڑھی ہے" ــــ الحکم نے بوڑھوں سے کہا ــــ "مجھے اجازت ہو تو اس کی غلطی درست کر دوں؟"

"ضرور کر دو" — ایک بوڑھے نے کہا۔ "ہم نے نہیں سنا کہ یہ صحیح پڑھ رہی ہے یا غلط۔"

"آپ کو سننا چاہیئے" — الحکم نے کہا — "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم ترک ہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "ترک مسلمان۔"

"وہ تو میں نے دیکھا ہے کہ آپ سب مسلمان ہیں" — الحکم نے کہا — "میں ذرا اس کی غلطی درست کر دوں۔"

وہ لڑکی کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔

لڑکی نے قرآن سے سر اٹھایا۔ قرارالحکم نے دیکھا کہ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔ لڑکی نے قرآن بند کر دیا اور اپنے خاندان کے آدمیوں کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ شخص کون ہے۔

"قرآن کھولو" — الحکم نے لڑکی سے کہا — "تم نے ایک جگہ سے غلط پڑھا تھا۔"

لڑکی نے پڑھا۔ وہ لفظ اس نے پھر غلط پڑھا۔ قرارالحکم نے اس کی غلطی درست کی۔ لڑکی نے اُسے تشکر یے کی نظر سے دیکھا۔

"اس کا مطلب جانتی ہو جو پڑھ رہی ہو؟"

"کچھ کچھ سمجھتی ہوں" — لڑکی نے شرمیلے سے لہجے میں جواب دیا — "ہمارے ساتھ ایک بزرگ ہُوا کرتے تھے۔ وہ مجھے قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ مطلب بھی سمجھاتے تھے۔ وہ مر گئے ہیں۔ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اب پڑھ سکتی ہوں۔ کچھ سمجھتی ہوں کچھ نہیں سمجھتی۔"

"میں تمہیں اس کا مطلب سمجھاتا ہوں" — قرارالحکم نے کہا — "ابراہیمؑ کو یاد کرو۔ بے شک وہ سچے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ سُن سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں، اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ مجھے ایسا علم مِلا ہے جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ میرے ساتھ ہو جائیں، میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلونگا" — الحکم نے لڑکی کو اس کا مطلب سمجھا کر کہا — "اور آگے دیکھو یہاں خداوند فرماتا ہے — اور جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور جن بتوں کی وہ پرستش کرتے تھے

اُن سے الگ ہو گئے تو ہم نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے اور سب کو پیغمبر بنایا؟ ——— تم سمجھتی ہو یہ کیا قصّہ ہے؟ ..... وہ بتوں کے آگے سجدے کرتے اور اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ تم نے قرآن میں پڑھا ہے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے۔"

قرار الحکم اُسے بتا رہا تھا کہ غیر مسلم کیسے کیسے "خداؤں" کی عبادت کرتے ہیں اور بُت جو سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں بت پرستوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر لڑکی خاموشی سے کبھی اس کے چہرے کبھی سراپا کو دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انہماک اور چہرے پر مسرّت تھی۔ اس خاندان کے مرد بھی ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلنے لگا۔ بوڑھوں نے اُسے روک لیا۔ لڑکی سے دور ہٹ کر وہ مردوں میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"ایران کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی ہے" ——— قرار الحکم نے جواب دیا ——— "جس کے آباؤ اجداد نے عدل و انصاف سے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچایا تھا وہ آج حشرات الارض میں شامل ہو گیا ہے۔ کیا میں کیڑا مکوڑا نہیں ہوں جو دشت و جبل میں پیٹ کی آگ بجھانے اور بے انصافوں اور ظالموں سے بچنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ہم تین چار پشتوں سے اسی حال میں جی رہے ہیں۔ ایک جگہ سے طبیعت اچاٹ ہوتی ہے۔ تو جدھر منہ آئے اُدھر کو چل پڑتا ہوں"

"تو یوں کہو تم نوشیرواں عادل کی نسل سے ہو" ——— ایک بوڑھے نے کہا ——— "ہمارے باپ دادا اُس کے بہت قصے سنایا کرتے تھے مگر ہم نوشیرواں عادل کو خیالی بادشاہ سمجھتے ہیں ...... تمہارا کنبہ کہاں ہے؟"

"اکیلا ہوں" ——— الحکم نے جواب دیا ——— "بچپن سے مذہب سے لگاؤ ہے۔ مسجدوں میں زیادہ وقت گزارا ہے"

"تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو" ——— دوسرے بوڑھے نے کہا ——— "رہنا چاہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ جانا چاہو تو ایک رات ہمارے ساتھ گزارو"

وہ رات کے لیے رُک گیا۔ وہ کوئی عالم فاضل نہیں تھا لیکن خانہ بدوش چونکہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس لیے ان میں وہ عالم لگتا تھا۔ باتیں داستان گوئی کے انداز سے کرتا تھا۔ سننے والے مسحور ہوتے جا رہے تھے۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی محفل کی رونق کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے عورتیں اٹھیں پھر مرد ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ آخر میں دونوں بوڑھے رہ گئے انہوں نے الحکم سے ذرا زور دے کر کہا کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ الحکم نے محسوس کیا جیسے وہ اسے کسی ذاتی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ وہ ان کے کس کام آسکتا ہے۔

"ہمارے ہاں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی ہے"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔۔۔ "مرد جتنے بھی ساتھ ہوں اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں صرف درندوں کا خطرہ نہیں ہوتا، انسان درندوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ لڑکی جس کی آواز پر تم ادھر آئے تھے ہمارے لیے بڑی ہی نازک اور خطرناک ذمہ داری بنی ہوئی ہے۔ تم نے اس کی جوانی اور اس کا حسن دیکھا ہے۔ ہمارے خاندان کے سارے مرد بیویوں والے ہیں۔ باقی سب بچے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے ہمیں خاوند نہیں ملتا۔ تم ہمارے ساتھ رہو اور اس کے ساتھ شادی کر لو"

"مجھ سے پہلے تمہیں باہر کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا؟"۔۔۔ الحکم نے پوچھا۔۔۔ "مجھ جیسے کسی اور کو لڑکی کیوں نہ دے دی؟ باہر کا میں پہلا ہی آدمی یہاں آیا ہوں؟"

"آتے رہے ہیں"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "مگر وہ خریدار تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر بولیاں دے گئے ہیں۔ ہم نے ایک بار قیمت لے کر لڑکی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر لڑکی نہیں مانی۔ اس نے خودکشی کی دھمکی دی تو ہم چپ ہو گئے۔"

اُس دور میں امیر کبیر لوگ لڑکیاں خریدا کرتے تھے۔ ایرانی اور ترک خانہ بدوشوں کی لڑکیاں زیادہ خوبصورت ہوتی تھیں۔ اس لیے گاہک خانہ بدوشوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ لڑکیاں فروخت ہونے کو معیوب نہیں سمجھتی تھیں کیونکہ یہ رواج تھا۔ خریدار انہیں باقاعدہ منڈی میں بیچتے تھے۔ غلاموں کی بھی منڈی لگا کرتی تھی۔ لڑکیوں اور غلاموں کے سوداگر عام طور

پرڈاکو ہُوا کرتے تھے جو قافلوں پر حملہ کر کے مردوں اور عورتوں کو پکڑ لاتے تھے خوبصورت لڑکیاں امیروں اور بادشاہوں کے امراء وزراء کے گھروں میں حرموں کے لیے یا حرموں کی ملازمت کے لیے یا مہمانوں کے لیے رکھی جاتی تھیں قحبہ خانوں والے بھی ان کے خریدار ہوتے تھے۔

"کبھی سنا نہیں کہ خانہ بدوشوں کی کسی لڑکی نے بکنے سے انکار کیا ہو" الحکم نے کہا — "آپ نے اس کی بات کیوں مانی؟"

"یہ ایسی باتیں کرتی ہے جن سے ہم ڈر جاتے ہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "تم جانتے ہو ہم لوگ مذہب کے اتنے پکے نہیں ہوتے۔ کسی آدمی کو اس کی خوبصورت لڑکی کی قیمت اچھی مل جائے اور وہ اس قیمت پر بیوی کو طلاق دے دے تو اس آدمی کا کیا مذہب ہو سکتا ہے، لیکن ہم مسلمان ہیں۔ اسلامی اصولوں کے ہم پابند تو نہیں پھر بھی قرآن اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہ لڑکی کبھی ہمیں کوئی خواب سناتی ہے، کبھی کہتی ہے کہ اسے جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی چہرے والے بزرگ نظر آئے تھے اور کہتے تھے کہ کسی کی زر خرید لونڈی نہ بننا، نکاح پڑھوا کر بیوی بننا کیونکہ تم اُس بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائیگا۔

"ایسے خواب ہر کوئی دیکھتا ہے" — قرار الحکم نے کہا — "مَیں بھی ایسے خواب دیکھا کرتا ہوں۔"

"دو چاند پہلے کی بات ہے، ہم نے لڑکی کا سودا کر لیا تھا۔" ایک بوڑھے نے کہا — "خریدار کے پاس رقم کم تھی۔ ہم نے سو نے کے دینار مانگے تھے جو اُس کے پاس پورے نہیں تھے۔ لڑکی کو ہم نے خیمے کے اندر بٹھا کر دو آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے کیونکہ لڑکی کہتی تھی کہ بھاگ جاؤں گی۔ ہم نے پہرہ کھڑا کر دیا تو اس نے کہا — 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے' — آدھی رات کو ہم سب گھٹاؤں کی گرج سے جاگ اُٹھے۔ بارش اتنی طوفانی کہ خیمے اڑ اڑ کر گرے۔ بجلی کڑکنے لگی تو دل دہل گئے۔ پھر ایسی کڑک ہوئی کہ

ہم سب کی چیخیں نکل گئیں۔ ساتھ ہی سارا جنگل دن کی طرح روشن ہو کر اندھیر ہو گیا۔ ایک درخت کا بہت بڑا ٹہن کڑکڑ کرتا گرا۔ پھر بار بار زمین اور آسمان روشن ہوتے اور بجلی کڑکتی تھی۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سب چیختے چلّاتے اور بچوں کو ڈھونڈتے اور انہیں سینے سے لگاتے پھر رہے تھے۔ صرف یہ لڑکی تھی جو بے خوف تھی۔ ایک جگہ کھڑی چلا چلا کر کہہ رہی تھی ـــ 'کوئی آدمی اذان دو جہاں جہاں ہو وہیں سجدے میں گر پڑو' ـــ تین آدمی اذان دینے لگے۔ باقی سب قیامت کی بارش میں، پانی اور کیچڑ میں سجدے میں گر پڑے ....

"طوفان بہت دیر بعد تھما۔ ہم نے اس سے زیادہ خوفناک طوفان بھی دیکھے ہیں۔ ہماری چھت آسمان ہے۔ آسمان ہی ہمیں نعمتوں سے نوازتا ہے اور یہی آسمان ہم پر کبھی کبھی آفت بھی نازل کرتا ہے مگر ہم کبھی ڈرتے نہیں تھے۔ اس رات ہمارے دلوں پر جو دہشت طاری ہوئی وہ کچھ اور معنی رکھتی تھی۔ صبح ہوئی۔ سب ایک جگہ ٹھٹھرتے ڈرے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی ہم سب کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی آہستہ آہستہ ہمارے آگے سے گزری۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا اثر تھا کہ ہم سب نے نظریں نیچی کر لیں۔ ہمیں اس کی دھمکی یاد آنے لگی ـــ 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے' ـــ لڑکی کے ہاتھ میں یہی قرآن تھا جو یہ آج پڑھ رہی تھی ....

"ہم نے خیمے سنبھالے۔ سامان اکٹھا کیا اور اسے خشک کرنے لگے۔ بہت دیر بعد دو گھوڑ سوار آئے۔ وہ سونے کے دینار لائے تھے۔ انہوں نے تھیلی ہمارے آگے پھینک کر کہا ـــ 'گن لو اور لڑکی ہمیں دے دو' ـــ میں نے تھیلی اٹھائی اور گھوڑ سوار کو دے کر کہا ـــ 'ہم لڑکی نہیں دیں گے۔ لے جاؤ اپنا سونا' ـــ دوسرے گھوڑ سوار نے دو دینار اور میرے آگے پھینک کر کہا ـــ 'اور لو، لو جو قیمت مانگو گے دیں گے' ـــ ہم نے لڑکی نہ دی۔"

"یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"یتیم ہے" ـــ بوڑھے نے جواب دیا ـــ "میری بھتیجی ہے۔"

"میرے پاس لڑکی کی قیمت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں" ___ قرار الحکم نے خالی ہاتھ دکھا کر کہا۔ "آپ مجھے اللہ کی راہ میں تو یہ لڑکی نہیں دیں گے؟"

"تمہیں ہمارے ساتھ رہنا پڑے گا" ___ بوڑھے نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں ایک مرد کا اضافہ ہو جائے گا۔ ہر رات ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ لڑکی کو ہم چھپائے پھرتے ہیں۔ مرد جتنے زیادہ ہوں گے خطرہ اتنا ہی کم ہو گا۔"

قرار الحکم کی شادی اُس لڑکی کے ساتھ کر دی گئی۔

"تمہیں حاصل کرنے کے میں نے اپنی اور اپنی آزادی کی قیمت دی ہے" ___ پہلے روز الحکم نے اپنی بیوی سے کہا۔ "میں اپنے آپ کو قید میں رکھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے دل میں تمہاری اتنی محبت پیدا ہو گئی ہے کہ میں آگے نہیں جا سکتا۔ تمہارے چچا نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں اور یہیں رہوں۔ اگر کسی وقت میرا دل یہاں سے اُچاٹ ہو گیا تو میرے ساتھ چلی چلو گی؟"

"کیا میں نے آپ کو خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنا خاوند قبول نہیں کیا؟" ___ اُس کی بیوی نے جواب دیا ___ "میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اب مجھے اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا تو میرے دل نے کہا تھا کہ یہ آدمی تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہے تو اسے قبول کر لینا۔"

"سنا ہے تم کہتی ہو کہ تمہیں جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی صورت بزرگ ملے تھے جنہوں نے تمہیں کہا تھا کہ تم ایک بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور بولی ___ "یہ میری خواہش ہے کہ ایسے ہی بچے کو جنم دوں۔ یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ تیری نسل کا ایک آدمی جو تیرا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، تیرے بیٹے کا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، راہِ حق میں اتنا نام پیدا کرے گا کہ دنیا اُسے بھول نہیں سکے گی۔"

"تم نہیں جانتی کہ غریبوں کی اولاد باطل شکن نہیں شکم پرور ہوا کرتی ہے" — الحکم نے کہا "یہی کافی ہے کہ خود حق پر رہو اور باطل کی کشش سے بچو۔ ہمارا بیٹا خانہ بدوش ہوگا۔ اُس کا بیٹا بھی خانہ بدوش ہوگا' یا کسی امیر کے گھر کسی غلیظ کام پر نوکر ہوگا۔"

"تو کیا میں وہم میں مبتلا ہوں؟"

"خواہش جو پوری نہ ہو سکے وہم بن کر انسان کا دِل بہلائے رکھتی ہے۔" الحکم نے کہا۔

"اُس روز تم میری غلطی دُرست کرنے آئے تھے۔" بیوی نے کہا — "تم نے مجھے ان آیتوں کا ترجمہ سنایا کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ بُتوں کو کیوں پُوجتے ہیں جو نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ میرے ساتھ ہو جائیں۔ میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا...... یہ الفاظ میرے دل میں اٹک گئے۔ اس کے بعد میں قرآن نہیں پڑھ سکی۔ یہی ایک آواز سنائی دیتی رہی کہ تُو ایک ابراہیم کو جنم دے گی۔ میں نے رات خواب میں ایک نورانی صورت بزرگ کو دیکھا۔ وہ تمہاری طرح میری یہی غلطی درست کر کے مجھے پڑھا رہے تھے جو تم نے درُست کی ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم خوبصورت بچہ بغیر عقل کے چاہتی ہو یا بدصُورت بچہ جو عقل والا ہو۔ میں نے انہیں کہا کہ ایسا بچہ چاہتی ہوں، جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اتنا حق پرست ہو کہ اُسکا باپ حق پر نہ ہو تو اُس سے بھی الگ ہو جائے۔ میں نے اس بزرگ سے کہا کہ خُدا مجھے لڑکی دے تو وہ اتنی بدصورت ہو کہ کوئی خریدار اور کوئی ڈاکو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔"

"تم اپنے قبیلے کے رسم ورواج کے خلاف کس طرح ہو گئی ہو؟" — قرار الحکم نے کہا — "خانہ بدوشوں کی لڑکیاں فروخت ہونے کو ناپسند تو نہیں کرتیں۔"

"معلوم نہیں میرے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ میں شادی کر کے ایک آدمی کی بیوی بن کے رہوں گی۔" بیوی نے جواب دیا۔ "مجھے کسی نے کوئی سبق نہیں دیا۔

میرے دل کی آواز تھی جو مجھے اچھی لگتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"دل سے یہ وہم نکال دو کہ تم ایسے بچے کو جنم دو گی جو بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا۔" الحکم نے کہا۔ "ایسی خواہشیں تمہارا دماغ خراب کر دیں گی۔"

اُس رات کا طوفانِ باد و باراں اور بجلی کا کوندنا محض اتفاق ہو سکتا تھا یہ آسمانی آفت اِس کے فوراً بعد آئی جب اس لڑکی کے خریدار آئے تھے اور لڑکی نے اپنے خاندان کو تباہی سے ڈرایا تھا لیکن یہ اتفاق جو خدا کا اشارہ بھی ہو سکتا تھا، کام کر گیا۔ قرار الحکم حقیقت پسند آدمی تھا۔ اس نے اسے کوئی معجزہ نہ سمجھا۔ البتہ اپنی بیوی کے متعلق اسے یقین ہو گیا کہ عقیدے کی پکی ہے اور اس کا حسن جسمانی کم اور رُوحانی زیادہ ہے۔

الحکم خانہ بدوشوں کے ساتھ رہا۔ شادی کے دوسرے سال اُسکا پہلا بچہ پیدا ہُوا۔ اس کا نام انہوں نے سبکتگین رکھا۔ بچے کی ماں کا یہ وہم اور گہرا ہو گیا کہ یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ الحکم بعض اوقات اپنی بیوی کی باتیں سن کر ہنس پڑتا تھا۔

"تمہارا دل ابھی اس خانہ بدوش زندگی سے اُچاٹ نہیں ہُوا؟" — ایک روز نوجوان بیوی نے قرار الحکم سے پوچھا۔

"میرا دل تو اچاٹ نہیں ہُوا۔" الحکم نے جواب دیا — "یہ سوچ آتی ہے کہ بچے کو ہیں اس جانوروں جیسی زندگی سے دُور لے جاؤں۔ یہ کیا زندگی ہے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنا اور خطروں سے بھاگتے پھرنا۔"

"میں جانتی تھی کہ میری یہ خواہش بھی پوری ہو گی" — اس کی بیوی نے کہا — "میں تمہاری دُنیا سے واقف نہیں۔ کیا کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے جہاں بچہ بڑا ہو تو اسے کچھ پڑھایا لکھایا جا سکے؟"

"کسی کے گھر نوکری مل سکتی ہے۔" الحکم نے کہا۔ "خُدا کی زمین تنگ نہیں۔

جس نے بچہ دیا وہ اس کی روزی بھی دے گا۔"

"مگر ہمیں چوری چھپے یہاں سے نکلنا پڑے گا"۔ بچے کی ماں نے کہا۔ "یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ تم مجھے مفت لے جا رہے ہو۔ تمہیں انہوں نے میری قیمت کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تھا.... میں تمہیں طریقہ بتاتی ہوں۔ کل صبح لکڑیاں چننے کے بہانے نکلیں گے پھر واپس نہیں آئیں گے۔"

انہوں نے ایسے ہی کیا۔ اُس دن بچے کی عمر چھ ماہ ہو چکی تھی۔ میاں بیوی بچے کو اٹھا کر سب کو یہ بتا کر گئے کہ لکڑیاں چننے جا رہے ہیں۔ دوپہر تک واپس نہ آئے تو بوڑھوں کو شک ہوا۔ انہوں نے دو آدمیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے ان کی تلاش کو روانہ کر دیا۔ ایک شک تو یہ تھا کہ ڈاکوؤں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں۔ لڑکی کا حسن اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اتفاق سے کسی مسافر نے گھوڑ سواروں کو بتا دیا کہ اس نے ایک آدمی اور بڑی خوبصورت جوان لڑکی کو دودھ پیتا بچہ اٹھائے فلاں طرف جاتے دیکھا ہے۔

انہوں نے اس شک پر ادھر کو گھوڑے دوڑا دیئے کہ الحکم اُن کی لڑکی کو کہیں اور لے جا رہا ہے۔ الحکم اور اس کی بیوی پیدل جا رہے تھے۔ راستہ ناہموار اور دشوار تھا۔ ان کے ایک طرف دریا تھا۔ انہیں گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ گھوم کے دیکھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے آ رہے تھے۔ ذرا اور آگے آئے تو الحکم نے انہیں پہچان لیا۔ سواروں نے تلواریں نکال لی تھیں۔ اس سے اُن کے ارادے کا پتہ چل گیا۔ الحکم نہتہ تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ ہتھیار ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"دریا میں کود جاؤ"۔ بیوی نے کہا۔

"پانی گہرا ہے"۔ الحکم نے کہا "تیز بھی ہے۔ وہ گھوڑے دریا میں ڈال دیں گے۔"

"میں کہتی ہوں دریا میں کود جاؤ"۔ بیوی نے یوں کہا جیسے اُسے خدا سے اشارہ ملا ہو۔ "بچے کو تم پکڑو۔ میں اس کے بغیر تیر سکوں گی۔"

الحکم نے اس سے بچہ لیا۔ اُسے ایک ہاتھ پر اٹھایا، اور دریا میں اُتر گیا۔ بچے کو پانی سے اُوپر رکھا۔ وہ ایک ہاتھ اور ٹانگوں سے تیرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی دریا میں اتری۔ دریا کا رُخ اُدھر ہی تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ سواروں نے گھوڑے کنارے پر روکے اور انہیں للکارا مگر وہ دریا کے وسط میں چلے گئے تھے۔ آگے پانی کم گہرا تھا۔ وہ نکل گئے۔

ایک شہر میں وہ داخل ہوئے تو ہر کسی کی نظریں اُن پر اٹھتی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کی کشش تھی۔ چونکہ کپڑوں سے دونوں غریب اور پردیسی لگتے تھے اس لیے لڑکی لوگوں کو اور زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ مفلس کی بیٹی کو کوڑیوں کے داموں خریدا بھی جا سکتا ہے اور اُسے بے خوف و خطر اغوا بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لڑکی کی خوبصورتی کا ہی کرشمہ تھا کہ فوراً الحکم کو گھوڑوں کے ایک بہت بڑے سوداگر کے محل جیسے مکان میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے ساتھ اُسے اصطبل کے ساتھ ایک جھونپڑا بھی دے دیا گیا۔ الحکم اصطبل میں کام کرنے لگا۔ اس کی بیوی بچے کی خاطر جھونپڑے میں رہتی لیکن اُسے زیادہ دن فارغ نہ رہنے دیا گیا۔ اُسے محل میں کام کرنے کے لیے بلا لیا گیا۔

اُسے ایک بڑھیا کے سپرد کیا گیا جس نے اُسے نہلایا اور اسے اپنے پاس سے ایسا لباس پہنایا جس میں اُس کے بازو اور اوپر سے گردن اور سینے کا بالائی حصہ عُریاں رہے۔ یہ شہزادیوں کا لباس تھا جو اُسے پسند نہ آیا لیکن بڑھیا نے اُسے کہا کہ آقا گندی خادمہ کو پسند نہیں کرتے۔ اس نے یہ لباس پہن لیا۔ اس میں اُسے خود شک ہونے لگا کہ وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی نہیں۔ اس کے بال دُھل کر نکھرے اور اُس کے شانوں پر بکھرے تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کے بال ریشم جیسے ملائم اور چمکدار ہیں۔

بڑھیا اُسی وقت اُسے آقا کے پاس لے گئی۔ اُدھیڑ عمر آقا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے اشارے پر بڑھیا باہر نکل گئی۔ آقا نے لڑکی کو قریب بیٹھنے کو کہا۔ لڑکی کھڑی

رہی وہ آقا کی نیّت سمجھ گئی۔ آقا نے اٹھ کر اُسے بازو سے پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم خانہ بدوشوں کی لڑکی ہو۔" آقا نے کہا۔ "مگر اپنے آپ کو تم کسی بادشاہ کی بیٹی سمجھتی ہو۔ میں تم پر حکم نہیں چلا رہا۔ انعام دوں گا، شہزادی بنا کر رکھوں گا۔"

لڑکی دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ آقا کے چہرے پر غصہ صاف نظر آنے لگا۔

"میں سونے کے دینار ٹھکرا کر آئی ہوں" الحکم کی بیوی نے کہا۔ "اپنے آپ کو نیلام کرنا ہوتا تو شادی نہ کرتی۔ دریا تیر کر پار نہ کرتی۔ تم اپنی دس بیٹیاں میرے خاوند کو دے دو تو بھی تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔"

"خاوند سے ہاتھ دھو بیٹھو گی لڑکی!" آقا نے کہا۔ "بچے کو ترستی رہو گی .... اِدھر آؤ۔"

وہ باہر نکل گئی۔

آقا نے غصّے سے گرج کر بڑھیا کو بلایا۔ اس کے خادم بھی بھاگے آئے اور حرم کی دو عورتیں بھی آگئیں۔ اپنے آقا کا غصّہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

"اگر وہ شرما رہی ہوتی تو اور بات تھی۔" آقا نے کہا۔ "وہ میری توہین کر گئی ہے۔"

"ہم اُسے گھسیٹ کر لاتے ہیں" ــــ ایک خادم نے

"نہیں"۔ آقا نے کہا۔ "اُس خانہ بدوش بھکارن کو وہ سزا دوں گا جس سے میرے گھر میں سب عبرت حاصل کریں۔" اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کہا ــ "وہ جھونپڑہ دیکھ لو جس میں یہ بدبخت لڑکی رہتی ہے۔ آج رات اس کے خاوند کو قتل کر دو اور لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔ اس کے بچے کو تم جہاں چاہو بیچ دینا۔"

حرم کی جو دو عورتیں وہاں موجود تھیں، انہوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ماتھوں پر شکن آئے۔ آقا غصّے سے پھنکار رہا تھا ــ "کوئی شہزادی ہوتی تو میں برداشت کر لیتا، کم بخت خانہ بدوش کی یہ جرأت؟ ... سب چلے جاؤ۔"

الحکم کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کا وقت رات گہری ہونے کے بعد کا رکھا گیا۔ سورج غروب ہُوا تو الحکم اپنے جھونپڑے میں آیا اس کی بیوی اپنے کپڑوں میں تھی۔ وہ بڑھیا کا پہنایا ہُوا ریشمی لباس اُسی کے کمرے میں پھینک آئی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنے خاوند کو آج کی واردات بتائے یا نہ بتائے مگر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ یہاں ایک اور دن بھی نہیں گزارے گی۔ اسے خاوند کو وجہ بھی بتائی تھی کہ وہ کیوں نہیں رہنا چاہتی۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج رات اپنے خاوند کو آخری بار زندہ دیکھ رہی ہے اور بچہ بھی اس سے چھن جائے گا۔

اُس نے الحکم کے آگے کھانا رکھا تو جھونپڑے میں ایک عورت داخل ہُوئی۔ اُس نے جھونپڑے کا دروازہ بند کر دیا اور الحکم سے کہا "کھانا ختم کرو اور اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ شہر میں نہ ٹھہرنا"

یہ عورت اُن دو میں سے ایک تھی۔ جو آقا کی گرج سن کر اُس کے کمرے میں گئی تھیں۔ یہ آقا کی منظورِ نظر تھیں۔ انہوں نے الحکم کی بیوی کی جھلک دیکھی تھی انہوں نے جب آقا کا یہ حکم سنا کہ الحکم کو قتل اور اس کی بیوی کو اغوا کر لیا جائے تو دونوں نے تنہائی میں میاں بیوی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں کو اپنا اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ انہوں نے شادی کے خواب دیکھے تھے مگر اس شخص کی بے نکاحی بیویاں بنیں۔ یہاں سے وہ بھاگ نہیں سکتی تھیں یہاں دولت اور اثر و رسوخ کی حکومت تھی۔ اثر و رسوخ اُسے حاصل ہوتا تھا جس کے حرم میں رونق زیادہ ہوتی تھی۔ ان دونوں نے اپنی قسمت کو قبول کر لیا تھا۔ گناہوں کی دنیا میں آ کر وہ سراپا فریب بن گئی تھیں۔ انہوں نے آقا کو حاکموں میں مقبول بنانے کے لیے اپنے جادو چلائے تھے۔ حرم کی سازشوں اور سیاست میں وہ پیش پیش تھیں اور اپنی خوبیوں اور فریب کاریوں کی بدولت آقا پر چھا گئی تھیں، مگر ان کے اندر وہ عورت مر نہ سکی جو ایک خاوند اور مسرتوں سے مخمور ازدواجی زندگی کی متمنی ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے دبائے نہ جا سکے۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک اور معصوم لڑکی جو ایک دودھ پیتے بچے کی ماں بھی ہے، غریب اور پردیسی بھی ہے، ایک انسان کی ہوس کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ خود تو لڑکپن

ہیں معصومیّت اور اپنے خوابوں کو بچا نہیں سکی تھیں، انہوں نے اس لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ تو خدائے ذوالجلال کا تھا کہ اس بچے کی ماں گناہ کے پرستاروں سے محفوظ رہے۔ اس کے لیے خدا نے ان دو عورتوں کو سبب بنایا جو گناہوں میں ڈوب چکی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کے ایمان کا کرشمہ تھا۔

"میں زیادہ دیر یہاں رُک نہیں سکتی۔ اس سے زیادہ کچھ بتا نہیں سکتی" ——— عورت نے کہا ——"فوراً نکل جاؤ"——— اور وہ چلی گئی۔

الحکم نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے اُسے بتا دیا کہ آج دن اس پر کیا گزر رہی ہے مگر الحکم سوچ میں پڑ گیا۔ بیوی نے اسے کہا کہ اٹھو چلیں۔ الحکم چلنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ یہ عورت اس گھر کی خادمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ کسی اور نیّت سے یہاں آئی تھی۔ الحکم نے کہا کہ وہ آقا سے ملے گا۔ بیوی ضد کرنے لگی کہ انہیں یہاں نہیں رکنا چاہیئے۔

وہ دو آدمی جنہیں قتل اور اغوا پر مامور کیا گیا تھا شراب پی رہے تھے۔ ہتھیار ان کے پاس تھے۔ ایک غریب کا قتل اور اس کی بیوی کو اٹھا لانا ان کے لیے کوئی مہم نہیں تھی۔ انہوں نے شام سے پہلے جھونپڑی دیکھ لی تھی۔ انہیں کسی قانون کا ڈر نہیں تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں انعام ملنے کا ذریعہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اُٹھے اور الحکم کی جھونپڑی کی طرف چل پڑے۔ وہ ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم لڑکی کو پکڑ لینا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ایک نے گرج کر کہا ——"اُٹھو او ئے"—— مگر اندھیرے میں کوئی ہلچل نہ ہوئی جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ انہوں نے ایک بار پھر للکارا۔ اب کے بھی خاموشی رہی۔ اندھیرے میں ٹٹولا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شاید غلط جھونپڑے میں آ گئے تھے۔ وہ دوسرے جھونپڑے دیکھنے چلے گئے۔

الحکم اور اس کی بیوی شہر سے نکل گئے تھے۔

"ہم پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے"۔۔۔ الحکم نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
"مایوس نہ ہو میرے بچے کے باپ!"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا۔۔۔ "تم یہ تو نہیں مانتے کہ مجھے خدا کی طرف سے اشارے ملتے ہیں۔ مجھے خدا کی ذات پر یہ اعتماد ہے کہ ہم گناہگار نہیں تو ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ میرے دل میں کوئی خوف نہیں۔ میں نے اُس بچے کو جنم دیا ہے جس کا اشارہ مجھے قرآن سے ملا ہے۔"

"تم پاگل ہو"۔۔۔ الحکم نے اسے غصے سے کہا۔ "خدا ہم پر اسی لیے ناراض ہے کہ تم دعویٰ کرتی ہو کہ تم نے پیغمبر کو جنم دیا ہے۔ یہ خبط دماغ سے نکال دو۔ قرآن کو تعویذ نہ سمجھو۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ تم سے شادی کر لی ہے۔ بیوی بدصورت ہو تو اچھی رہتی ہے اب میں تمہاری حفاظت کروں یا کہیں کام کر کے تمہارا پیٹ بھروں۔"

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا۔۔۔ "تم قرآن کے معنی بھی جانتے ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو۔"

الحکم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل پر افسوس اور غصے کا قبضہ تھا۔ اس نے مذہب اور خدا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

"واپس چلے چلیں؟"۔۔۔ الحکم نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"تمہارے قبیلے میں"۔۔۔ الحکم نے جواب دیا۔۔۔ "وہ لوگ وہیں ہوں گے یا کہیں مل جائیں گے۔"

"پھر کیوں نہ گھوڑوں والے آقا کے پاس چلے جائیں"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا ۔۔۔ "میں اپنے جسم سے تمہیں بہت دولت کما دوں گی۔ تم آنکھیں بند رکھنا یہی سمجھتے رہنا کہ تمہاری بیوی نیک اور پاک ہے۔۔۔ کیا تم مرد ہو؟ کیسے مرد ہو؟ میں اپنے بچے کو تم جیسا مرد نہیں بننے دوں گی۔"

"پہلے یہ دعا کرو کہ بچہ زندہ رہے"۔۔۔ الحکم نے غصے سے کہا۔

"یہ بچہ زندہ رہے گا، اور ایک روز ابراہیمؑ کی طرح تمہیں کہے گا کہ میرے باپ! جو علم مجھے ملا ہے وہ خدا نے تمہیں نہیں دیا میرے ساتھ آجاؤ، میں تمہیں سیدھے راستے

پر نے جاؤں گا" وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہی اور دونوں چلتے گئے۔ اس کی حالت ہذیانی سی ہوتی جارہی تھی جیسے زبان بے قابو ہوگئی ہو۔ الحکم پر خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

اُس رات سے ان کی زندگی خانہ بدوشی کی صورت اختیار کرگئی۔ فرق یہ تھا کہ وہ جنگلوں کی بجائے شہروں میں رہتے تھے۔ الحکم کو کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی تھی۔ سال دو سال کچھ کما کر وہ کہیں اور چلے جاتے تھے۔ بچہ چار سال کا ہُوا تو اس کی ماں نے الحکم سے کہا کہ اب کہیں مستقل ٹھکانہ کرلیں جہاں بچے کو کسی مسجد یا کسی استاد کے پاس بٹھا دیا جائے ورنہ یہ بھی بڑا ہو کر ہماری طرح دربدر مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایک آدھ سال پہلے ماں باپ نے بچے کو قرآن کے سبق دینے شروع کردیئے تھے۔ ماں بچے کو بڑی غور سے دیکھتی رہتی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ بچہ اسی عمر میں عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔ سبق میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ ماں اسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔

کسی قصبے میں ماں کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ وہاں کی مسجد کے امام نے بچے کو اپنی شاگردی میں بٹھا لیا۔ بچے کی ماں اور اس کا باپ امام کی خدمت اور مسجد کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ امام جب پہلے روز بچے کو پڑھانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی عام بچے کو پہلا سبق نہیں دے رہا۔ الحکم مذہبی تعلیم کے پہلے مرحلے سے بچے کو گزار لایا تھا۔ امام اسے اگلے مرحلے میں لے گیا جہاں پانچ چھ سال کی عمر کے بچے نہیں جا سکتے۔ بچہ جو سوال پوچھتا تھا، ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے ساتھ خدا سے کچھ علم بھی لایا تھا۔

یہاں بچے نے کم و بیش چار سال تعلیم حاصل کی۔

بچے کی عمر دس گیارہ سال ہوچکی تھی۔ وہ قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث پڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے استاد سے مزید تعلیم لینا چاہی تو استاد نے کہا۔ "یہاں میرا علم ختم ہوگیا ہے" ــــ بچہ ایک سوال پر سر پٹخ رہا تھا ــــ "علم بغیر عمل کے مکمل ہو سکتا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام بزورِ شمشیر جائز ہے؟ میں ساری دنیا میں قرآن کا پیغام کس طرح پہنچا سکتا ہوں؟" ــــ اور ایسے بہت سے سوال تھے جو بچہ پوچھتا تھا اور امام پریشان ہو جاتا تھا۔

"قرار الحکم!" ــــ ایک روز امام نے بچے کے باپ سے کہا۔ "بچے کو بخارا لے جاؤ" ــــ

اس نے کسی عالم کا نام لے کر کہا۔ ”اسے ان کی شاگردی میں بٹھا دو۔ اگر بچے کی یہ تشنگی نہ بجھی تو یہ پاگل ہو جائے گا۔ اس میں پیاس بیاہ ہجو ہر بھی ہیں۔ علم کے ساتھ اگر اس نے سپہ گری سیکھ لی تو یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ یہ دور ہے جنگ و جدل کا ہے۔ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور کفار مسلمانوں کو غلام بنانے اور اسلام کو مٹانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔ غریبوں کی قسمت اتنی اچھی تو نہیں ہوتی لیکن اس بچے کو موقع مل جائے تو یہ کسی خطے میں اللہ کی حکمرانی قائم کر دے گا مگر اسے ایسا موقعہ مل نہیں سکے گا۔ یہ عدل و انصاف کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے ایسا سبق کبھی نہیں دیا تھا۔“

”یہ سبق اسے میں نے دیا ہے“ ــــــ قرار الحکم نے کہا ــــــ ”میں کم علم انسان ہوں۔ میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کی نسل سے ہوں۔ باپ دادا مجھے اس دور کی جو باتیں سناتے تھے وہ میں اس بچے کو سناتا رہتا ہوں۔ قرآن میں بھی اس نے یہی پڑھا ہے۔“

”اسے بخارا لے جاؤ“ ــــــ امام نے کہا ــــــ ”میں خط لکھ دیتا ہوں۔ وہاں تمہیں بڑا اچھا ذریعہ معاش بھی مل جائے گا۔۔۔۔ اور خیال رکھنا۔ اکیلے نہ چل پڑنا۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں اور رہزنوں کا بہت خطرہ ہے۔ تمہارے پاس کوئی دولت نہیں لیکن تمہاری بیوی بہت قیمتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ بچے بھی اغوا ہوتے اور غلاموں کی منڈی میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے دن رک جاؤ۔ کوئی قافلہ تیار ہو جائے تو اس کے ساتھ جانا۔“

اس زمانے میں لوگ ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ اکیلے دکیلے مسافر رہزنوں کے ہاتھوں لٹ جاتے تھے۔ کبھی کبھی قافلوں پر بھی حملے ہوتے تھے لیکن قافلے والے مل کر مقابلہ کرتے، باقاعدہ معرکہ لڑا جاتا اور بچ نکلنے کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ خوبصورت عورتوں اور کمسن بچوں کو فروخت کیا جاتا تھا جن حاکموں اور بادشاہوں کو ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنا چاہیئے تھا وہی ان کی اغوا کی ہوئی عورتوں اور بچوں کے خریدار ہوتے تھے۔ امام نے ٹھیک کہا تھا۔ الحکم کی بیوی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کا بچہ کمسنی کی وجہ سے ایک دولت تھی جو اکیلے سفر کرتے لٹ سکتی تھی۔

کوئی قافلہ تیار نہ ہُوا، ایک قافلہ وہاں سے گزرا جس میں دو تین سو مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ ان میں زیادہ تر سوداگر تھے جو اپنے محافظ ساتھ لاتے تھے۔ وہ بلخ اور بخارا جا رہے تھے۔ الحکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہو گیا۔

سفر کی پہلی رات آئی۔ قافلے نے ایک وادی میں پڑاؤ کیا۔ کھانا پکا۔ سب نے کھایا اور دن کی مسافت کے تھکے ماندے مسافر سو گئے۔ تین چار آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ پہرہ دار چٹانوں پر اور خیمہ گاہ کے ارد گرد گھوم پھر رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیتے جو اُن کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ پہرہ داروں نے کمانوں میں تیر ڈال لیے اور چند ایک ایسے آدمیوں کو جگا لیا جو جوان تھے قریب آنے والی آوازیں کسی قافلے کی نہیں تھیں یہ کسی محاذ کو جاتی ہُوئی فوج ہو سکتی تھی یا ڈاکو۔

وادی میں مشعلیں نظر آنے لگیں۔ یہ سواروں کے ہاتھوں میں تھیں سواروں نے قریب آ کر گیدڑوں اور بھیڑیوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ پہرہ داروں نے تیر چلا دیئے۔ ایک دو سوار گرے لیکن ڈاکو طوفان کی طرح آئے بعض مسافروں کو جاگنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ گھوڑوں تلے کچلے گئے۔ قافلے میں جو لڑنے کے قابل تھے، انہوں نے مقابلہ کیا۔ ڈاکوؤں نے مشعلیں پھینک دی تھیں جو زمین پر پڑی جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں ساری وادی نظر آتی تھی۔ ماؤں نے بچوں کو سینوں سے لگایا اور جدھر منہ آیا بھاگ اٹھیں بعض بچے چیختے چلاتے اکیلے اکیلے بھاگ اُٹھے۔

الحکم نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑا اور اُسے کسی طرف گھسیٹ کر لے گیا، بچہ اُن کے ساتھ چلا تھا لیکن الحکم اپنی بیوی کو بڑی مشکل سے ایک چٹان کے پیچھے لے گیا تو وہاں دیکھا کہ بچہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ماں نے واویلا بپا کیا تو الحکم نے اُسے سختی سے کہا کہ وہ خاموشی سے چھپی رہے ورنہ ڈاکو اسے پکڑ لے جائیں گے اسے جھاڑیوں میں چھپا کر الحکم اپنے بچے کی تلاش میں نکلا۔ وہ خالی ہاتھ تھا آگے بڑھنے سے ڈرتا بھی تھا۔ خیمہ گاہ میں قتل و غارت ہو رہی تھی۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ بچے چلا رہے تھے۔ ڈاکو

گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔ اور وہ سامان سمیٹ رہے تھے، اور ان میں سے بعض اپنے کام کی عورتوں اور بچوں کو لے جا رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے گھوڑے چلے گئے، اور ان کے ساتھ قافلے کے گھوڑے اور اونٹ بھی چلے گئے۔ رات گزر گئی۔ صبح بچے کھچے لوگ جو رات اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، باہر آئے خیمہ گاہ میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں قیمتی سامان اور تمام جانور غائب تھے۔ کچھ بچے مرے ہوئے اور کئی لاپتہ تھے، اور جوان عورتیں صرف وہ موجود تھیں جنہیں بھاگنے اور چھپنے کا موقع مل گیا تھا۔ ان میں الحکم کی بیوی بھی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اُسے بچہ تو نہ ملا، بچے کا باپ مل گیا مگر وہ زندہ نہیں تھا۔ اُس کے پہلو میں برچھی یا تلوار لگی تھی۔ لاش خون میں لت پت تھی۔ بیوی بالکل ہی پاگل ہو گئی۔ لاشوں کو بکھرے ہوئے سامان اور گرے ہوئے خیموں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ہر کسی سے پوچھنے لگی ——"تم نے میرا بچہ دیکھا ہے؟ سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔"

وہاں سب کی حالت یہی تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ چٹانوں پر چڑھتی، اترتی، جھاڑیوں کو ٹٹولتی پھرتی، وادیوں میں بھاگتی پھری، اس کی دلدوز اور جگر پاش آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی —— "سبکتگین ..... سبکتگین ..... آجاؤ۔ اپنی ماں کے پاس آجاؤ۔"

لُٹا ہوا قافلہ خوف سے کانپتا، آہ وزاری کرتا چل پڑا چلتا گیا اور دور افق میں غائب ہو گیا۔ پیچھے جب گدھوں، بھیڑیوں اور گیدڑوں نے لاشوں اور جاں بلب زخمیوں پر ہلہ بولا، وادیوں میں ایک نسوانی پکار سنائی دے رہی تھی —— "سبکتگین .....سبکتگین!"

اور جب دو چار روز بعد وہاں بکھری ہوئی ہڈیاں رہ گئیں تو بھی یہ نسوانی پکار سنائی دیتی رہی —— "اپنی ماں کے پاس آجاؤ..... سبکتگین..... سبکتگین۔"

اس راستے سے گزرنے والے قافلے، ڈاکو، رہزن اور فوجی بہت مدت تک یہ پکار سنتے رہے۔ انہوں نے کئی کہانیاں گھڑ لیں اور اس آواز کو کسی کی بد روح کہہ کر ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔

فراالحکم مرگیا تھا۔ زندہ ہوتا تو اپنی بیوی کو وہاں سے گھسیٹ کر لے جاتا اور اسے بتاتا کہ غریبوں کے بیٹے باطل شکن نہیں شکم پرور ہوا کرتے ہیں تم دل میں جس خواہش کو جگر کے خون سے سینچتی رہی ہو وہ پوری ہونے والی تھی ہی نہیں۔ یہ خواہش وہم بن کر تمہیں کبھی سفید ریش اور نورانی چہرے والے بزرگ کی صورت میں نظر آتی رہی، کبھی تم نے خواب دیکھے اور انہیں حقیقت سمجھ لیا جہاں دولت، دھوکے اور گناہ کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں عقل و دانش والوں کی قسمت سو جاتی ہے۔ نام وہ پیدا کرتے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں میرے بچے کی ماں! قرآن کے اشارے ہم جیسے خانہ بدوشوں کے بچوں کے لیے نہیں ہوتے۔

"خواہش تھی یا وہم، خواب تھا یا حقیقت، جو کچھ بھی تھا فراالحکم کی بیوی کے ساتھ چلا گیا تھا، اور اس پکار میں سمٹ آیا تھا "سبکتگین .... سبکتگین" جسے لوگ کسی کی بد روح کی آواز سمجھتے رہے۔ پھر یہ ماں اور اس کی پکار تاریخ کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

اسلام نے غلاموں کی خرید و فروخت اور کسی کو غلام بنا کر رکھنے کی ممانعت کر دی تھی مگر یہ احکام خلافتِ راشدہ سے آگے نہ چل سکے۔ خلافت تو قائم رہی مگر شہنشاہیت کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر سازشوں کا مرکز بنی سلطنتِ اسلامیہ مملکتوں اور ریاستوں میں بٹ گئی، اور خلافت برائے نام رہ گئی۔ خلیفہ کی کوئی قوت نہیں تھی۔ کسی کا جی چاہتا تو خلافت کا احترام کرتا تھا۔ ورنہ من مانی کا دور دورہ تھا۔ حرم اور غلامی کی بدعتیں پھر سے شروع ہو گئیں۔ دولت والوں کے حرموں میں لڑکیاں اور کام کرنے کے لیے غلام ہوتے تھے جس کے پاس لونڈیاں اور غلاموں کی افراط ہوتی اسے اتنا ہی دولت مند اور قابلِ احترام سمجھا جاتا۔

بخارا کے ایک میدان میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بولیاں دی جا رہی تھیں کچھ نیلام ہو رہا تھا۔ ہجوم کے سامنے چند ایک خیمے کھڑے تھے۔ ان کے آگے لکڑی کا چبوترہ تھا تین چار لڑکیاں اس چبوترے پر کھڑی تھیں۔ ایک آدمی ایک لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے کہتا "عمر بیس سال، سیدھی اپنے گھر سے آئی ہے، جسم دیکھو کوئی بیماری نہیں۔

کسی کے پاس نہیں رہی ..... بولو..... تازہ مال ہے جی ایک سو دینار..... بہت تھوڑے ہیں..... بولو۔"

یہ لڑکیاں نیلام ہو رہی تھیں۔ خریداروں میں بردہ فروش بھی تھے، قحبہ خانوں والے، لڑکیوں کو رقص اور گانا سکھانے والے اور ان میں امرأ وزرا اور حاکموں کے حرموں کے کارندے بھی تھے۔

اس سے ذرا پرے ایک اور منڈی لگی ہوئی تھی یہاں آدمی فروخت ہو رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے۔ خریدار انہیں یوں دیکھ رہے تھے جس طرح مویشی خریدنے سے پہلے دیکھے جاتے ہیں۔ قیمت بچوں کی زیادہ تھی۔ یہ آٹھ دس بچے تھے۔ سب رو رہے تھے۔ ان کی عمریں آٹھ سے بارہ تیرہ سال تک تھیں۔ صرف ایک بچہ ایسا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ یہ سب بچے اُس قافلے سے اٹھائے گئے تھے جس کے ساتھ الحکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ جا رہا تھا۔ عورتیں بھی اسی قافلے کے ساتھ تھیں۔

یہ بچہ جو رو نہیں رہا تھا دوسروں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھا لیکن دوسروں کی نسبت اچھا لگتا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ خریداروں میں حاجی نصر نام کے ایک بڑے آدمی کے نوکر بھی موجود تھے۔ انہیں کسی وقت حاجی نصر نے کہا تھا کہ وہ پختہ عمر کے غلاموں کی بجائے دو چار بچے خریدنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکے اور وہ بڑے ہو کر وفادار رہیں۔ اس کے ان خاص آدمیوں نے بچوں کو دیکھا تو فوراً حاجی نصر کو اطلاع دی۔ وہ آیا اُس نے ہر ایک بچے کو دیکھا اُن کے رونے سے وہ گھبرا گیا۔ اسے یہ بچہ پسند آیا جو اداس تھا، رو نہیں رہا تھا۔

"ان رونے والے بچوں میں خوبصورت بھی ہیں مگر انہیں بہلانا آسان نہیں ہو گا"۔ حاجی نصر نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "یہ بچہ لے لینے ہیں"۔

اُس نے بچہ خرید لیا بچہ اس کے ساتھ چل پڑا وہ بچے کو نخشب لے گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے بچے؟"۔ گھر لے جا کر حاجی نصر نے پوچھا۔

"سبکتگین!"

"تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟"

"معلوم نہیں" ۔۔۔ سبکتگین نے جواب دیا ۔۔۔ "میں سویا ہوا تھا ۔ قافلے پر حملہ ہوا تو میری آنکھ کھل گئی ۔ گھوڑے ہمارے درمیان سے گزر گئے میں بھاگ اٹھا ۔ ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا اور وہاں سے دور لے جا کر میرے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھ دیئے پھر ہمیں یہاں لے آئے ۔"

"تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

"امیروں کے گھروں میں نوکری چاکری ۔"

"تم روئے کیوں نہیں رہے؟"

"جواب دینے سے پہلے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟"

"میں مسلمان ہوں" ۔۔۔ حاجی نصر نے جواب دیا ۔۔۔ "میں حاجی ہوں ۔"

"پھر مجھے نہیں بلکہ آپ کو رونا چاہیئے" ۔۔۔ بچے نے جواب دیا ۔۔۔ "آپ کا حج قبول نہیں ہوا ۔ مجھے میرے باپ نے بتایا تھا کہ قرآنِ حکیم کا یہ حکم ہے کہ کوئی انسان کسی انسان کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا ۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں رو کیوں نہیں رہا ۔۔۔۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ روؤں یا ہنسوں یا کیا کروں ۔ اگر میری عمر آپ کی طرح پختہ ہوتی تو میرے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوتا ۔"

حاجی نصر بدک اٹھا ۔ اُسے قطعاً توقع نہ تھی کہ اس عمر کا بچہ ایسی عقلمندی سے جواب دے گا ۔ اُس نے بچے سے پوچھا کہ اسے یہ باتیں کس نے بتائی ہیں ۔ بچے نے جواب دیا کہ اس کا استاد ایک امام مسجد ہے ۔ اُس نے امام کا نام بتایا اور کہا ۔۔۔ "میرے باپ نے مجھے عدل و انصاف کے بہت سبق دیئے ہیں جو کہانیوں کی شکل میں تھے ۔ میرا باپ کہا کرتا تھا کہ وہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے ہے ۔ میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ اُسے خوابوں میں ایک نورانی صورت بزرگ نظر آتے ہیں جو اسے بتاتے ہیں کہ وہ ایک بچے کو جنم دے گی جو باطل شکن ہوگا اور حق کی آواز دُور دُور تک پہنچائے گا ۔ بزرگ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بچہ میں نہ ہُوا تو وہ میری اولاد سے ہوگا ۔"

"تم اپنی ماں کے اس عقیدے پر یقین رکھتے ہو؟"

صلہ ۔ تاریخِ کامل، ابنِ اثیر، کتاب الانساب، پند نامہ (مصنفہ سبکتگین)

"اپنی ماں کے عقیدے پر میں کس طرح یقین رکھ سکتا ہوں"۔ سبکتگین نے جواب دیا
۔۔۔ "غلام کا کیا عقیدہ ہو سکتا ہے؟ کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ کر نہیں خریدا؟ جانوروں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔"

"بیشک تم میرے غلام ہو لیکن میں جانوروں کی سطح سے تمہیں بہت اوپر رکھوں گا"
۔۔۔ حاجی نصر نے کہا۔ "تم کوئی کام کر سکتے ہو؟"

"مجھے ماں باپ بخارا کے کسی عالم کے پاس لے جا رہے تھے"۔ بچے نے جواب دیا۔ "میرے استاد نے انہیں کہا تھا کہ مجھے بخارا لے جا کر اس عالم کی شاگردی میں بٹھا دیں۔"

"میں تمہیں اپنے بچوں کے اتالیق کے حوالے کر دیتا ہوں"۔ حاجی نصر نے بچے سے متاثر ہو کر کہا۔ "تم اس کے نوکر ہو گے اور تم ان سے تعلیم و تربیت بھی لے سکو گے۔"

سبکتگین کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "پند نامہ" میں مختصر سا ذکر ہے کہ وہ تین سال نخشب میں رہا۔ اس دوران حاجی نصر نخشب سے باہر رہا وہ کتاب الانساب میں "کچھ تفصیل ملتی ہے۔ سبکتگین بیمار ہو گیا تو حاجی نصر نے اسے نخشب میں ہی رہنے دیا اور خود غیر حاضر رہا۔ کسی بھی پرانی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حاجی نصر کا منصب یا کاروبار کیا تھا، سوائے اس کے کہ وہ امیر کبیر اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔

سبکتگین جب اتالیق کے پاس گیا تو اتالیق نے اسے ایک نوکر یا غلام سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہ دی لیکن پہلے ہی روز بچے نے اپنی اہمیت جتا دی۔ اتالیق بے خبر تھا اور حاجی نصر کے ایک بچے نے قرآن کا کوئی لفظ غلط پڑھا۔ سبکتگین نے خود بچے کی تصحیح کرنے کی بجائے اتالیق کو بتایا۔ اتالیق حیران ہوا کہ یہ بچہ ہے اور نوکر ہے اور یہ قرآن پڑھنے والے کی غلطی درست کر سکتا ہے۔ اس نے سبکتگین سے پوچھا کہ اس نے قرآن کہاں پڑھا ہے۔ سبکتگین نے اسے اپنے متعلق، اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اتالیق نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ حاجی نصر اپنے بچوں کو مذہب کی اتنی زیادہ تعلیم نہیں دلانا چاہتا تھا جتنا انہیں سپاہی بنانے کا ارادہ تھا۔ بچوں کو گھوڑ

سواری، تیراندازی اور تیغ زنی بھی سکھائی جاتی تھی۔ سبکتگین نے بھی سپہ گری کی تربیت لینی شروع کردی۔

بچے اسے بہت پسند کرتے تھے، کیونکہ وہ ہنس مکھ تھا اور باتیں بہت اچھی کرتا تھا۔ اتالیق نے دیکھا کہ حاجی نصر کے بچے باپ کی دولت کی وجہ سے نہ پڑھنے میں دل چسپی لیتے تھے نہ سپہ گری میں، اور سبکتگین میں عسکری جوہر موجود تھے۔ اتالیق نے اس کی تربیت میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کردی۔

چودہ برس کی عمر میں سبکتگین پختہ کار سپاہی بن چکا تھا اور علم بھی اس نے بہت حاصل کرلیا تھا۔ اتالیق نے اسے اسلام کی تاریخ سے بھی آگاہ کردیا تھا۔

حاجی نصر واپس آیا تو وہ سبکتگین کو پہچان نہ سکا۔ وہ اب بارہ سال کی عمر کا لباس بچہ نہیں بلکہ قدآور جوان تھا حاجی نصر نے اس کی سپہ گری کی مہارت اور گھوڑسواری دیکھی تو وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اسے حاجی نصر نے کوئی عسکری قسم کا کام دے دیا۔ بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے غلاموں کی تربیت ا نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ تھوڑے سے وقت میں حاجی نصر کا دست راست بن گیا۔

اُس وقت الپتگین بخارا کا گورنر تھا اور حکومت عبدالملک کی تھی۔ الپتگین حاجی نصر کا دوست تھا۔ ۹۵۹ء (۳۴۸ھ) میں حاجی نصر الپتگین سے ملنے گیا تو سبکتگین اس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت سبکتگین کی عمر بیس سال ہوچکی تھی۔ (بعض مؤرخ عمر زیادہ بتاتے ہیں) یہ پہلا موقعہ تھا کہ خانہ بدوشوں کا بیٹا جسے ڈاکوؤں نے اغوا کیا اور فروخت کرکے غلام بنایا تھا، ایک گورنر سے ملا۔ گورنر الپتگین نے حاجی نصر سے کہا کہ وہ اپنا یہ غلام اسے دے دے۔ حاجی نصر ایسے قیمتی غلام سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ الپتگین نے اسے بہت زیادہ قیمت پیش کی جو حاجی نصر نے قبول کرلی۔

اُس دور میں الپتگین، سبکتگین، بلپتگین قسم کے نام ترکوں کے ہُوا کرتے تھے۔ سبکتگین کی چونکہ ماں ترک تھی اس لیے اس کا نام ماں نے ترکی کے ناموں کے مطابق رکھا تھا اُس وقت ترکی میں اسلام پھیلا نہیں تھا۔ کوئی کوئی گھرانہ یا کوئی کوئی

آدمی مسلمان تھا۔ حکومت ایسی ظالم تھی کہ لوگ ترکی سے دوسرے علاقوں کو بھاگے جارہے تھے۔ ان میں سے بعض خانہ بدوش ہو گئے اور باقی غلاموں کی منڈی میں فروخت ہوئے۔ ترک چونکہ جسمانی لحاظ سے تنومند اور دماغی لحاظ سے مستعد اور عقلمند ہوتے تھے، اس لیے ان کی قیمت زیادہ تھی ان کے رنگ گورے ہونے کی وجہ سے اچھے بھی لگتے تھے۔ غزنی، بلخ، بخارا اور گردونواح کے علاقوں میں ترک غلام مشہور تھے اور ترکوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ غلام ہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے اچھے غلام ہوتے ہیں۔

"تم ان ترک غلاموں میں سے ہو جن کے متعلق ان علاقوں کے لوگ کہتے ہیں کہ بڑے اچھے ہوتے ہیں" — الپتگین نے سبکتگین سے کہا جو اس کے دربار میں غلاموں کی طرح کھڑا تھا — "تم مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم وفادار غلام ہو" — وہ چپ ہو گیا۔ سبکتگین نئے آقا کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ الپتگین اس کے قریب آ کر گرج کر بولا — "سر اوپر کر، سینہ پورا کھولو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ تم ترک ہو۔ میں بھی ترک ہوں" — سبکتگین اس گرج سے چونک اٹھا۔ الپتگین نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

"حاجی نصر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے پاس علم بھی ہے عمل بھی" — الپتگین نے اسے کہا — "انسان صرف علم سے مکمل نہیں ہوتا نہ صرف عمل سے مکمل ہوتا ہے۔ اصل وصف عمل ہے مگر علم کے بغیر یا کسی عالم کی راہنمائی کے بغیر عمل ناکام رہتا ہے اور صرف علم انسان کو گوشۂ تنہائی میں چھپائے رکھتا ہے۔ تم میں دونوں وصف ہیں"

"مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں جس سے اتنے بڑے ملک کا حاکم متاثر ہو" — سبکتگین نے کہا۔

"تم میں یہی خوبی کچھ کم نہیں کہ تم ترک ہو اور تم غلام ہو" — الپتگین نے کہا — "میں بھی ترک ہوں اور میں بھی غلام تھا۔ تم پر جو گزر رہی ہے وہ مجھ پر گزر چکی ہے۔ میرا لڑکپن ویسا ہی گزرا ہے جیسا تمہارا گزرا ہے۔ تم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے ہو، میرے ماں باپ مسلمان نہیں تھے۔ میں غلامی میں مسلمان ہوا۔ کبھی نے مجھے حکماً مسلمان

نہیں بنایا تھا۔ میں نے ایک عالم سے اسلام کے اصول سُنے تھے۔ میرے دل میں تڑپ تھی، پیاس سی تھی۔ میں نے اس عالم کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسلام قبول کیا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا زر خرید غلام بنائے اور یہ جو حکمران اور حاکم ہوتے ہیں، انہیں خدا نے لوگوں کا اور قوم کا خادم کہا ہے۔ حکومت صرف اللہ کی ہے..... اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور اگر میرے دل میں علم اور عمل کی تڑپ نہ ہوتی تو میں اس منصب تک نہ پہنچ سکتا۔"

"میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم بڑے ہو کر نام پیدا کرو گے"۔ سبکتگین نے کہا۔ "وہ کہتی تھی کہ تم حق کی تلوار سے باطل کو کاٹو گے۔ وہ مجھے قرآن کی یہ آیت بار بار دکھاتی اور سناتی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا کہ تم اپنے بناتے ہوئے خداؤں کو پوجتے ہو جو سن نہیں سکتے، جو بول نہیں سکتے۔ آؤ میں تمہیں صحیح راستہ دکھاؤں گا..... ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم اُن لوگوں کو جو اُن خداؤں کو پوجتے ہیں جو نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں، اُس معبود کی راہ دکھاؤ گے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں..... میرا باپ کہا کرتا تھا کہ تمہاری ماں کا عقیدہ صحیح ہے لیکن اس کی خواہش غلط ہے۔ غریب کا بچہ نام پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اس میں یہ جرأت اور ہمت نہیں ہوتی کہ وہ بادشاہیوں سے ٹکر لے اور لوگوں کو اپنے عقیدے کا قائل کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ ہو سکتا ہے"۔ الپتگین نے کہا۔ "عرب کے شتربان اور گڈریئے آدھی دنیا سے اپنا عقیدہ منوا کر اللہ کی حکومت قائم کر سکتے ہیں تو بخارا کا امیر الامراء کیا نہیں کر سکتا؟ تم خانہ بدوشوں کے بیٹے اور غلام میری برابری میں کس طرح آ بیٹھے ہو؟ کوئی غلام ایسا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری ماں کے خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ یہاں تک تمہیں تمہارے ایمان اور کردار نے پہنچایا ہے۔ میں نے تم میں وہ جوہر دیکھ لیے ہیں جو تمہیں اور اوپر لے جائیں گے۔"

"لیکن مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیئے۔" سبکتگین نے کہا۔ "میں کسی منصب کا خواہاں نہیں..... میں..... میں کچھ چاہتا ضرور ہوں مگر پتہ نہیں چل رہا کہ میں

کیا چاہتا ہوں۔"

الپتگین ہنس پڑا اور بولا "میں اس کیفیت میں سے گزر چکا ہوں۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر میرا ذہن صاف ہو گیا۔ تمہیں جلدی پتہ چل جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو..... آج سے تم اپنے آپ کو غلام نہ سمجھو۔"

سبکتگین کے سینے میں ایک تڑپ عقیدے کی اور کچھ سمجھنے اور کچھ کرنے کی تھی۔ اُسے اسکا کوئی غم نہ تھا کہ اس کی ماں نہیں، باپ نہیں اور وہ غلام ہے۔ اُس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُس کے اندر ایک عظیم مقصد پرورش پا رہا ہے اور اسے اپنے ذہن میں واضح کرنا ہے۔ اس تڑپ کے ساتھ جوانی کی تپش تھی۔ وہ اپنے آپ میں جسمانی قوت کا اُبال بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کی توجہ جوانی کے جذبات کی طرف تو نہیں آتی تھی لیکن یہ تغیّر اور یہ انقلاب اُسے بے چین رکھتا تھا۔

دوسری شام، سورج غروب ہونے سے پہلے وہ اصطبل سے ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا لے کر سواری کے لیے باہر نکل گیا۔ شہر سے دُور جا کر اُس نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا اور اس سے جھاڑیاں پھلانگنے لگا۔ اسے دُور سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی اور گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کے ٹاپو بھی۔ اُس نے اُدھر دیکھا ایک سوار گھوڑے سے گر رہا تھا۔ اور گھوڑا بے لگام ہو گیا تھا۔ سبکتگین سمجھ گیا کہ گھوڑے کی زین ڈھیلی ہو گئی ہے اور سوار کے دائیں بائیں لڑھکنے اور سنبھلنے کی وجہ سے گھوڑا ڈر کر بے قابو ہو گیا ہے۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کا منہ اُدھر کر کے ایڑ لگائی۔

وہ گھوڑا کبھی دائیں کبھی بائیں کو جاتا تھا۔ سبکتگین نے دیکھ لیا کہ سوار مرد نہیں عورت ہے۔ وہ چیخ چلّا رہی تھی۔ سبکتگین کا گھوڑا اُس کے قریب پہنچا تو وہ چلّانے لگا "رکابوں سے پاؤں نکال لو..... لگام کھلی چھوڑ دو"۔ بدکے ہوئے گھوڑے نے جب اپنے تعاقب میں ایک اور گھوڑے کو دیکھا تو وہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ آگے میدان زرافشاں تھا۔ گھوڑے کا رُخ اُدھر کو ہو گیا۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کی رفتار اور تیز کی اور گھوڑے کو بدکے ہوئے گھوڑے کے پہلو میں لے گیا۔ تب اُس نے دیکھا

کہ یہ کوئی جوان لڑکی ہے اور کسی امیر وزیر کی بیٹی ہو سکتی ہے سبکتگین نے اُس کے گھوڑے کی باگ کو وہاں سے پکڑا جہاں گھوڑے کا منہ تھا اور اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس کے گھوڑے پر کود آئے۔

اس کوشش کے دوران گھوڑے دریا میں چلے گئے۔ لڑکی پانی میں گر پڑی کیونکہ گھوڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ دونوں رک گئے۔ سبکتگین دریا میں کودا لڑکی تیر رہی تھی۔ سبکتگین نے اُسے پکڑ لیا۔ کیونکہ یہ دریا پہاڑی ہونے کی وجہ سے بہت تیز تھا۔ اور پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے اُوپر ڈال کر باہر نکل آیا۔ پھر دونوں گھوڑوں کو پانی سے نکالا۔ لڑکی کو ڈرا ہوا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ ہنس رہی تھی۔

"تم احمق ہو یا دلیر ہو؟" ــــ سبکتگین نے کہا۔ "تمہاری موت یقینی تھی۔"

"میں اُس باپ کی بیٹی ہوں جو احمق نہیں دلیر ہے" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "میں بخارا کے حاکم الپتگین کی بیٹی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو، انعام دلاؤں گی۔"

"میرے لیے یہی انعام بہت ہے کہ میں نے اپنے محسن کی بیٹی کو موت کے منہ سے نکال لیا ہے" ــــ سبکتگین نے کہا ــــ "میں تمہارے گھوڑے کی زین کس دیتا ہوں۔"

دونوں ہم عمر تھے۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ سبکتگین میں بھی جسمانی کشش تھی۔ دونوں شاہسوار تھے۔ لڑکی نے سبکتگین کے ساتھ اپنے گھوڑے کی زین کسی اور دونوں گھر کو چل پڑے۔ راستے میں لڑکی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ سبکتگین نے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

"رات ابا آپ کا ذکر کر رہے تھے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "وہ شاید تمہیں اپنی فوج میں کوئی عہدہ دیں گے۔"

"اپنی فوج؟" سبکتگین نے کہا ــــ "اُن کی اپنی فوج کیسے ہو سکتی ہے، فوج تو حکمران کی ہوتی ہے۔"

"ابا نے کچھ اور سوچ رکھا ہے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "وہ حکومت کو اپنے ہاتھ

میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے بخارا میں جو فوج ہے۔ اس میں اپنے حامی سالار وغیرہ متعین کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکمران صرف نام کے مسلمان ہیں عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ لوگ مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ ابّا کا ارادہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ تمہارے متعلق کہہ رہے تھے کہ کام کا نوجوان ہے۔"

گھر کے قریب پہنچے تو ایک آدمی کھڑا تھا جو رُتبے والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے کپڑوں سے پانی ٹپکتا دیکھا۔ لڑکی کا حلیہ بدلا ہوا اور بال بکھرے ہوئے اور بے ترتیب دیکھے تو اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اس کے قریب جا کر دونوں گھوڑوں سے اُترے۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" اس آدمی نے لڑکی سے پوچھا۔ "اور یہ کون ہے؟"

"اور تم کون ہو جو حاکموں کی طرح مجھ سے پوچھتے ہو؟" لڑکی نے کہا۔ "گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا، اور مجھے دریا میں لے گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے آیا اور دریا سے نکال لایا" لڑکی نے سبکتگین کو بازو سے پکڑا اور اُسے اپنے گھر لے گئی۔

"کون ہے یہ؟" سبکتگین نے پوچھا۔

"میرا منگیتر" لڑکی نے جواب دیا۔ "ابھی سے مجھ پر حکم چلانے لگا ہے.... تم اس سے نہ ڈرنا" وہ ایک کمرے میں چلے گئے تھے۔ لڑکی نے بے ساختگی سے سبکتگین کے سامنے آ کر اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور پوچھا "تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں"

"کوئی لڑکی کبھی تمہیں اچھی لگی ہے؟"

"لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔"

"میں اچھی نہیں لگتی؟"

سبکتگین چُپ چاپ کھڑا رہا اور اُس کی نظریں جُھک گئیں

"تم نے کیا سمجھا ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔ "مجھے بے حیا سمجھا ہے؟.... بے شرم سمجھا ہے؟.... بولو سبکتگین! اگر مجھے یہی کچھ سمجھا ہے تو میں پھر کبھی تمہاری صورت

نہیں دیکھونگی۔"

"تم کسی اور کی منگیتر ہو۔"

"یہ میرے ابّا کا فیصلہ ہے"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "یہ آدمی مجھے پسند نہیں۔ یہ مجھے لونڈی بنا کے رکھے گا۔ یہ مجھے کہا کرتا ہے کہ گھوڑسواری چھوڑ دو۔ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ مجھے نمائش کی ایک خوبصورت چیز سمجھتا ہے مجھے ایسا مرد چاہیئے جس نے تمہاری طرح لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہ دیا ہو اور جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے، میرے ساتھ دریا میں کود جائے۔ میں حرموں کے بادشاہوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ اسلام کا زوال اس روز شروع ہوا تھا جس روز تم نے عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ تم عورت کو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا کر خوار ہوئے۔ اپنے اوپر شراب کا نشہ طاری کر کے تم ذلّت کو عظمت سمجھ رہے ہو۔ عورت ایک طاقت ہے مگر تم نے عورت کو اپنی کمزوری بنا رکھا ہے.... سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمتِ اسلام کے پاسبان نہیں ہوتے ہو سکتے ہی نہیں۔ میں اُس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دُور دُور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر۔"

"میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی"۔ سبکتگین نے کہا۔۔۔ "مگر اُس کا بیٹا غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا۔"

"اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے میرے باپ جیسے غلام ہو نگے"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "میرے ابّا نے تمہیں بتایا نہیں کہ وہ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوئے تھے؟ آج اُن کا رتبہ اور منصب دیکھ لو۔ اُن کے ارادے اور اُن کا عقیدہ دیکھ لو۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تم جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہو وہ بچہ میرا ہوگا؟" سبکتگین نے کہا۔ "یہ جوانی کا جوش ہے، شباب کا خمار ہے۔"

"یہ میرے دل کی آواز ہے"۔۔۔ لڑکی نے جوشیلی سی جھنجھلاہٹ سے کہا۔۔۔ "یہ

میری روح کی آواز ہے۔ اپنے دل کو اتنا مردہ نہ کرو سبکتگین! ..... اگر تم میری محبت کو جسمانی یا محض جذباتی سمجھتے ہو تو یہی سمجھو لیکن میری محبت کو ٹھکرا نہ دینا۔ میں اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

سبکتگین وہاں سے نکلا تو وہ اپنے اندر عجیب سی ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ ایک تو اس کا علم ادھورا تھا جو اُسے پریشان رکھتا تھا۔ اُس کے دل میں ایک عزم اور ایک مقصد تھا جو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہُوا تھا۔ اب اس لڑکی نے اُس کے ایسے جذبات کو بیدار اور مشتعل کر دیا جن کے متعلق اُسے علم ہی نہیں تھا کہ اُس میں موجود ہیں۔ اُس پر خمار سا طاری ہوتا گیا۔ اُسے صرف اپنی ماں کے جسم کا لمس یاد تھا جس کے ساتھ لگ کر وہ سکون کی نیند سویا کرتا تھا۔ نیند نہ آتی تو سکون ایسا ملتا جو اُس کی رُوح میں اتر جاتا تھا۔ دُوسرا جسم اس لڑکی کا تھا جسے اُس نے دریا سے نکالتے اپنے بازوؤں میں لیا اور اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اُس وقت اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا، سوائے اس کے کہ اس لڑکی کو بچانا اُس کا فرض ہے۔ اب لڑکی نے اُس کے ساتھ جو باتیں کیں اِن سے اُس کی ذات میں بھونچال جیسے جھٹکے آنے لگے۔

"یہی وجہ ہے کہ دولت والوں نے حرم آباد کر رکھے ہیں"۔ اُس نے سوچا۔ "عورت ایک قرار ہے، سکون کا سرچشمہ ہے، ایک خمار ہے۔ انسان تھوڑے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ قانع نہیں ہوتا۔ وہ دوسری عورت لاتا ہے۔ تیسری اور چوتھی لانے کے لیے ناجائز طریقوں سے دولت کماتا ہے۔ بادشاہوں کا خوشامدی بنتا اور انعام پاتا ہے۔ پھر بھی تسکین نہیں ہوتی تو ایمان نیلام کر دیتا ہے۔ اپنے مذہب اور قوم کے دشمن کے آگے بھی جا سجدے کرتا اور زر و جواہرات سے جھولیاں بھرتا ہے۔ یہ تباہی عورت سے شروع ہوتی ہے اور شراب تک پہنچاتی ہے .... کیا میں بھی اسی راہ پر چل پڑوں گا؟"

"عورت زیبائش کی چیز نہیں"۔۔۔ اُسے الپتگین کی بیٹی کے الفاظ یاد آنے لگے ۔۔۔ "عورت بہت بڑی طاقت ہے جسے ان لوگوں نے اپنی بہت بڑی کمزوری بنالیا ہے"۔۔۔ سبکتگین کو اپنی ماں اور اُس کی باتیں یاد آنے لگیں اور اس کے اندر

وہ قوت بیدار ہونے لگی جو ماں نے پیدا کی تھی۔ ایک ایسی عورت کی پیدا کی ہوئی قوت جو بہت خوبصورت تھی۔ اسے سوداگروں نے سونے کے درہم و دینار پیش کیے تھے مگر اُس نے بھی الپتگین کی بیٹی کی طرح سوچا تھا کہ وہ زیبائش کی چیز نہیں۔ اسے اُس بچے کو جنم دینا ہے جو ابراہیمؑ کی طرح اپنے باپ سے اور اپنے قبیلے سے کہے گا کہ تم اُن بتوں کی پوجا کرتے ہو جو سُن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی یہی کہتی ہے۔

"کیا ہر عورت ایسی ہی خوش فہمیوں اور وہموں میں مبتلا ہوتی ہے؟"

نوشیرواں عادل کو ایک عورت نے ہی جنم دیا تھا" سبکتگین کے اندر سے یہ آواز اٹھی۔ یہ آواز اس کے اُستاد کی تھی جو چھوٹی سی مسجد کا امام تھا۔ اس میں اُس کی ماں اور اُس کے باپ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ اُس کے بچپن کی آوازیں تھیں۔ یہ تعلیم و تربیت کی آوازیں تھیں ـــ "عورت کو تفریح اور عیاشی کا ذریعہ بنالو تو طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور نوشیرواں پیدا نہیں ہُوا کرتے ہیں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے انہی خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی اور گھوڑے کے آگے آگے پیدل جا رہا تھا۔ لڑکی اُس کے دل پر غالب آتی چلی جا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی بہت اچھی ہے اور وہ اسے پھر بھی ملے گا۔ ضرور ملے گا۔

"او ئے ٹھہرو۔"

علم و عشق کی جھیل میں کسی کی بھاری آواز کا پتھر آن گرا۔ اُس نے رُک کر دیکھا۔ لڑکی کا منگیتر بڑی تیزی سے آ رہا تھا۔ سبکتگین کے پاس آ کر رُک گیا۔

"حاجی نصر کے بکے ہوئے غلام کی آئندہ یہ جرأت نہ ہو کہ شہزادیوں کے گھروں میں جا گھُسے۔" اس شخص نے کہا ـــ "تم ہمارے غلام ہو۔ اگر تم نے حاکم بخارا کی بیٹی کو گھوڑے سے گرنے سے بچایا اور اسے دریا سے نکالا ہے تو یہ تمہارا فرض تھا۔ اس کا تمہیں انعام نہیں مل سکتا۔ اگر تم اسے نہ بچا سکتے تو ہم تمہیں قید خانے میں ڈال کر بھوکا مار دیتے۔"

"میں آزاد ہوں۔" سبکتگین نے بُردباری سے کہا ـــ "اور غلام تم ہو۔"

"کیا بکتے ہو"۔۔۔ اُس نے غصے سے کہا۔ "بھاگو یہاں سے۔ آئندہ اصطبل سے بغیر اجازت گھوڑا نہ کھولنا۔"

"تم اپنے دل کے غلام ہو۔"

"میں تمہارا سر یہیں تن سے جُدا کردوں گا"۔۔۔ سبکتگین کو غلام سمجھتے ہوئے لڑکی کے منگیتر نے جو جوانی کی عمر سے کچھ آگے چلا گیا تھا، تلوار نکال لی۔

سبکتگین کے کمر بند میں لمبا خنجر تھا۔ اُس نے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر خنجر نکال لیا اور بولا۔۔۔ "ڈیڑھ ہاتھ لمبی تلوار کو ڈیڑھ بالشت لمبا خنجر میرے قدموں میں نہ گرادے تو تمہارے آگے جھک جاؤں گا۔ بڑے شوق سے میرا سر تن سے جُدا کر دینا مگر اس سے پہلے اپنی منگیتر سے پوچھ آؤ کہ وہ تمہیں قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

اس آدمی نے سبکتگین کے تیور دیکھے۔ ذرا سی دیر کھڑا رہا اور غصے میں تلوار نیام میں ڈال کر بہت تیزی سے چلا گیا۔ سبکتگین نے خنجر کمر بند میں ڈالا، اور گھوڑے پر سوار ہو کر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ الپتگین کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ انہی کپڑوں میں جو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے، چلا گیا۔

"ابو اسحاق سے تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے؟" الپتگین نے پوچھا۔

سبکتگین نے سارا واقعہ سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی بیٹی نے اُسے کیا کہا ہے۔۔۔ الپتگین کو یہ صاف گوئی پسند آئی۔

"اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ دیں"۔۔۔ سبکتگین نے کہا۔۔۔ "میری کوئی حیثیت نہیں مگر اپنی بیٹی کی شادی اس آدمی کے ساتھ کرنے کی غلطی بھی نہ کریں۔"

الپتگین گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اُٹھا کر کہا۔۔۔ "تم جاؤ سبکتگین!"

"اگر آپ ناراض ہیں تو میں معافی نہیں مانگوں گا"۔۔۔ سبکتگین نے کہا۔۔۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں جھوٹ جیسے گناہ کا بھی مرتکب نہیں ہوا۔"

الپتگین نے مسکرا کر اشارہ کیا کہ چلے جاؤ۔

دوسری شام الپتگین کی بیٹی (کسی تاریخ میں اس کا نام نہیں ملتا) حسبِ معمول گھوڑ سواری کے لیے نکل گئی۔ سبکتگین بھی اصطبل سے گھوڑا لے کر دریا کی طرف نکل گیا۔ دو گھوڑے دُور دُور تھے، مختلف سمتوں کو جا رہے تھے مگر دُور دریا کے کنارے جا کر ان کے رُخ ایک دوسرے کی طرف ہو گئے، پھر وہ اکٹھے ہو گئے۔ رُک گئے۔ سوار اترے اور دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔

"وہ مجھے ملا تھا" ــــ لڑکی نے اپنے منگیتر کے متعلق بتایا ــــ "بہت غصے میں تھا۔ کہنے لگا میں فوج کا کماندار ہوں اور تم ایک غلام سے کہتی رہی ہو کہ تم نے مجھے قبول نہیں کیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ میں نے اپنے باپ کے حکم کا احترام کرتے ہوئے اُسے قبول کیا ہے۔ اس نے کچھ دھمکیاں دیں پھر منّت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا کہ میرے ابّا سے بات کرو.... رات ابّا نے مجھے الگ بٹھا کر کہا کہ سبکتگین نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ انہوں نے تمہاری صاف گوئی اور بے باکی کی بہت تعریف کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ منگیتر مجھے پسند نہیں۔ یہ اوچھا آدمی ہے معلوم ہوا ہے کہ آج دن کو کسی وقت اس کی اور ابّا کی باتیں ہوئی ہیں"۔

سبکتگین اس لڑکی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جو اسی جیسی جوان تھی۔ کل سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو وہ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب ہو گئی کہ اُس کے جسم کی تپش بھی وہ محسوس کرنے لگا، پھر اُس نے اُس کی سانسوں کی بھی تپش محسوس کی۔ اس کا اپنا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"میری ماں تمہاری طرح خوبصورت تھی" ــــ سبکتگین نے کہا۔

"تمہارا بیٹا بھی یہی کہا کرے گا" ــــ لڑکی نے کہا اور ہنس پڑی۔

سُورج دریا کے دوسرے کنارے کی چٹان کی اوٹ میں چھُپ گیا، پھر شام گہری ہونے لگی اور دریا کے اس کنارے بیٹھے ہوئے دو سائے ایک سایہ بن گئے۔ دریا کی لہروں کا جل ترنگ اور زیادہ پُرسوز ہو گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔۔۔ سبکتگین الپتگین کے دل میں اتنا اُتر گیا تھا کہ اُس کا معتمدِ خاص اور مشیر بن گیا۔ الپتگین نے اسے اپنا ایک منصوبہ ان الفاظ میں بتا دیا تھا۔ "مسلم قوم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ قوم ریاستوں اور چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بٹ گئی ہے کفار انہیں عیاشیوں کا عادی بنا کر انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رہے ہیں خلافت جو قوم کے مرکز کی علامت تھی ایک برائے نام منصب بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارا حکمران عبدالملک ہے۔ اس کی زندگی میں ہی اس کی گدّی کے امیدوار اور ان کے حامی آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ عبدالملک کے مرنے کے بعد اس کے کمسن بیٹے کو تخت پر بٹھاؤں مگر اس کا بڑا بیٹا امیر منصور ایسا نہیں ہونے دے گا میں اس صورت میں منصور کا تختہ الٹ کر غزنی میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر دوں گا۔"

"آپ کی فوج جو یہاں (بخارا میں) ہے آپ کا ساتھ دے گی؟"۔۔۔ سبکتگین نے پوچھا۔

"سالار عبدالملک سے نالاں ہیں"۔۔۔ الپتگین نے جواب دیا۔۔۔ "اُس کی نسبت وہ میرا حکم ماننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ غزنی کو مرکز بنا کر ارد گرد کی مسلمان ریاستوں کو متحد کر لوں اور کفار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو وہ وقت دور نہیں جب اسلام کی حکمرانی جو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے ٹکڑا ٹکڑا غائب ہونے لگے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے حکمران جو مہاراجے کہلاتے ہیں لمغان (درۂ خیبر) کے راستے ہم پر حملے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

"غزنی کا تختہ الٹنے کا کام آپ مجھے سونپ دیں"۔۔۔ سبکتگین نے کہا۔۔۔ "اس کے لیے ہمیں بہت بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔ منصور اور اس کے حامی حاکموں کو گرفتار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے منصوبے کے عملی پہلوؤں اور خطروں پر غور کر لیں"۔۔۔ اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔۔۔ "آپ محتاط نہیں۔ اتنے بڑے منصوبوں کی کامیابی کے لیے رازداری ضروری ہوتی ہے۔ آپ کا یہ منصوبہ مجھے آپ کی بیٹی سنا چکی ہے۔ اسے اس سے بے خبر ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ محتاط ہو جائیں۔ اگر آپ نے اپنے راز چھپائے

رکھے اور دشمن کے راز حاصل کر لیے تو آپ آدھی جنگ جیت جائیں گے۔

الپتگین کو سبکتگین پر اعتماد تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ سبکتگین اتنا ذہین اور دوُر اندیش ہے۔ دونوں نے تختہ اُلٹنے کے منصوبے پر ہر پہلو سے غور کیا اور ایک کار آمد منصوبہ تیار ہو گیا۔

ادھر غزنی کو اسلامی سلطنت کا مرکز بنانے کا منصوبہ تیار ہُوا اُدھر ایک منصوبہ سبکتگین کے قتل کا تیار ہو گیا۔ یہ الپتگین کی بیٹی کے منگیتر ابو اسحاق نے تیار کیا تھا۔ رتھوں کی دوڑ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ فوج کے سواروں کا مقابلہ تھا جس میں سبکتگین کو بھی شامل ہونے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور اس میں ابو اسحاق کو بھی شامل ہونا تھا۔ بہت وسیع میدان میں مقابلے کے لیے رتھیں کھڑی کی گئیں۔ ہر ایک کے آگے ایک ایک گھوڑا جُتا ہُوا تھا۔ پہلی دوڑ میں بیس رتھیں تھیں۔ دوڑ شروع ہوئی تو ابو اسحاق نے اپنی رتھ کچھ آگے لے جا کر سبکتگین کی رتھ کے قریب کر لی اور اس کے پہلو کے ساتھ اپنی رتھ دوڑانے لگا۔ سبکتگین نے دیکھا کہ ابو اسحاق اپنی رتھ ذرا آگے کر کے اس کی رتھ کو ایک طرف ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس طرح اُس نے دو تین بار کیا۔ تو سبکتگین نے اپنی رتھ اُس کے گھوڑے کے قریب کر کے اُسے ایک طرف دھکیلنے لگا۔

تماشائیوں نے چیخ و پکار بپا کر رکھی تھی۔ رتھیں ہوا سے باتیں کر رہی تھیں۔ ابو اسحاق نے اپنا خنجر جو وہ گھوڑے کو مار رہا تھا وہ سبکتگین کو مار دیا مگر سبکتگین نے اپنی رتھ اُس کے گھوڑے کے ساتھ لگائے رکھی۔ ابو اسحاق نے چلاّ کر کہا ــــ "خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ" ــــ سبکتگین نے اپنی رتھ پرے ہٹا لی اور اس کے ساتھ ہی ابو اسحاق کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ رتھ اوپر کو گئی اور گھوڑے سے آگے گری۔ ابو اسحاق ہوا میں اُڑا اور اپنی اُلٹی ہوئی رتھ پر گرا۔ پیچھے آنے والی رتھ کا گھوڑا اتنی جلدی رُک نہ سکا۔ وہ ابو اسحاق کی رتھ پر چڑھ گیا اور ابو اسحاق جو گرنے سے بیہوش ہو چکا تھا کچلا گیا۔ سبکتگین نے اپنی رتھ روکی اور واپس آ گیا۔

سب دوڑے گئے۔ دیکھا گیا کہ وہاں گہرا گڑھا تھا جس میں ابو اسحاق کا گھوڑا گرا

تھا۔ اس میدان میں پہلے ایسا کوئی گڑھا نہیں تھا۔ وہاں درختوں کی لمبی اور خشک شاخیں بھی تھیں۔ ابواسحاق مر چکا تھا۔ اسی وقت تحقیقات شروع ہو گئیں۔ الپتگین نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس گڑھے کا راز بتائے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔

شام تک راز فاش ہو گیا۔ اس دوڑ کا اہتمام ابواسحاق نے ہی کیا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ وہ سبکتگین کو دوڑ میں شامل ہونے کے لیے کہے۔ دوست نے یہ کام کر دیا۔ ابواسحاق نے رات کو یہ گڑھا کھدوایا۔ اس کے اُوپر خشک ٹہنیاں رکھیں اور اُوپر مٹی بکھیر دی۔ گڑھے کی باقی مٹی میدان میں پھیلا دی۔ ڈھکے ہوئے گڑھے پر اُس نے کوئی نشانی رکھ دی تھی۔ ابواسحاق دوڑ کے دوران اسی لیے اپنی رتھ سبکتگین کی رتھ کے قریب لے آیا تھا کہ اُسے گڑھے کی سیدھ میں لے جائے۔ سبکتگین کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُسے موت کے گڑھے میں لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے ابواسحاق کی رتھ کو اپنی رتھ سے پرے دھکیلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں گڑھا آگیا۔ یہاں آکر ابواسحاق نے چلّا کر کہا کہ خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ۔۔۔ مگر گڑھا آگیا۔ ابواسحاق اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں اپنے گھوڑے اور رتھ کے ساتھ ایسا گرا کہ موت سے بچ نہ سکا۔ اُس نے دوستوں سے کہا تھا کہ سبکتگین کو مار کر وہ الپتگین کی بیٹی کے ساتھ شادی کر سکے گا۔

"خدا نے تمہیں کسی عظیم کام کے لیے زندہ رکھا ہے"۔۔۔ الپتگین نے سبکتگین سے کہا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے منصوبے کی کامیابی کے لیے تم نے وہی کارروائی کی جو تم نے بتائی تھی تو تم میرے داماد ہو گے اور مجھے اس پر فخر ہو گا۔"

اس واقعہ سے ایک آدھ سال بعد غزنی کا حکمران عبدالملک مر گیا۔ الپتگین نے اپنے اثر و رسوخ سے کوشش کی کہ عبدالملک کا چھوٹا بیٹا تخت نشین ہو لیکن بڑے بھائی منصور کی موجودگی میں الپتگین کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ دو روز بعد سبکتگین تین سو منتخب سواروں کے ساتھ غزنی گیا اور ظاہر یہ کیا وہ بخارا کے لوگوں کی طرف سے مبارک باد پیش کرنے آیا ہے مگر اس نے اندر جا کر منصور کو گرفتار کر لیا اور اس کے سواروں نے ہدایت کے مطابق محافظ دستے کو گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈلوا لیے۔

منصوبے کی اگلی کڑی کے مطابق الپتگین نے جو فوج کے ساتھ غزنی کے قریب آچکا تھا، طوفان کی طرح آکر شہر کے اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔

گلیوں اور بازاروں میں اعلان ہونے لگے ۔"ظالموں کی حکومت ختم ہوچکی ہے۔ ہم عدل وانصاف لائے ہیں ہم اللہ اور رسولؐ کی حکمرانی لائے ہیں"۔ پہلے روز سے ہی ایسے احکام جاری کیے جانے لگے جو لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے لوگ نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے کہ ظلم وتشدد، ننگ ہستی اور بے انصافی کا دور ختم ہوچکا ہے۔ انہوں نے دل وجان سے نئی حکومت کو قبول کرلیا۔

الپتگین کی حکومت ۹۶۲ء (۳۵۱ھ) میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے سبکتگین کو امیر الامرا بنا دیا اور اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کردی مگر اگلے ہی سال ۹۶۳ء میں الپتگین مرگیا۔ اس کے بیٹے اسحاق نے باپ کی گدی سنبھال لی مگر خوشامدیوں اور چاپلوس قسم کے مشیروں کے گھیرے میں آگیا۔ وہ اس سے اپنے مطلب اور مفاد کے احکام صادر کرانے لگے جو اس کے باپ کے احکام کے الٹ تھے۔ لوگ ایک بار پھر پریشان ہونے لگے۔

امیر سبکتگین نے ایک بار پھر دانشمندی اور جرأت کا مظاہرہ کیا، اور ایک صبح لوگوں نے یہ خبر سن کر سکون محسوس کیا کہ ان کے حاکم اسحاق کو قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کا نیا سلطان سبکتگین ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ سبکتگین نے کس طرح اسحاق کو معزول کیا اور کس طرح قوم کی کایا پلٹ دی۔ اُس نے فوج اور لوگوں کے دل جیت کر کچھ اور علاقے اپنی سلطنت میں شامل کرلیے اور سب سے پہلے ہندوستان کی طرف توجہ دی۔

اُس نے ایک رات خواب دیکھا کہ اس کے محل کے ایک کمرے میں ایک درخت پیدا ہوا جو بڑھتا گیا۔ چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور یہ اتنا زیادہ پھیلا کہ آدھی دنیا پر سایہ کرلیا۔ اس خواب نے سبکتگین کو پریشان کردیا۔ اس نے خواب اپنی بیوی کو سنایا۔ وہ چپ رہی۔ اس کے فوراً بعد اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ اس سے اس پریشانی اپنے آپ ہی دور ہوگئی۔ اس

ص اگزیدہ۔

کی بیوی نے اسے کہا۔۔۔ "آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آگئی ہے۔ میں نے اُس بچّے کو جنم دے دیا ہے جو باطل شکن ہوگا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔ اس اشارے کو سمجھیں۔"
سبکتگین نے بچے کا نام محمود رکھا۔ بچہ خوبصورت نہیں تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا مگر سبکتگین نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ بچپن میں ہی اسے قرآن حفظ کرانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے خاص اتالیق رکھے جنہوں نے محمود کو علم بھی دیا اور جنگی تربیت بھی۔ وہ پندرہ سال کا ہوا تو باپ اسے راجہ جے پال کے خلاف جنگ میں لے گیا۔ اسے ہندوؤں کے خلاف لڑا کر کہا۔۔۔ "تم بت شکن بنو گے۔"

اور یوں نوشیرواں عادل کی نسل سے ایک بت شکن پیدا ہوا۔ [ص۲]

ص۲ صاحب طبقات ناصری بحوالہ بیہقی

جب مُسلمان مُسلمان سے ٹکرایا

غزنی کے مضافات میں ایک باغ تھا۔ باغ کے وسط میں چھوٹا سا ایک مکان تھا جس کی ساخت اور تعمیر بتاتی تھی کہ کسی شہزادے یا کسی امیر وزیر کا مکان ہے تھوڑا ہی عرصہ پہلے یہاں باغ تھا نہ مکان۔ ویرانہ تھا۔ اب یہ ویرانہ سبزہ زار بن گیا تھا۔ اس میں رنگ برنگے پھولوں کے تختے تھے۔ راہ جاتے لوگ رک کر دیکھتے اور باغ اور مکان کی دلکشی میں کھو جاتے تھے۔ غزنی کے رہنے والے اس باغ کے اردگرد گھومتے پھرتے اور اپنے سلطان سبکتگین کے بیٹے محمود کے ذوق کی داد دیتے تھے۔

یہ باغ اور اس میں یہ مکان محمود غزنوی نے اپنے باپ کو بتائے بغیر چند سال پہلے بنوانا شروع کیا تھا۔ اُس نے اپنی ماں سے اجازت لے لی تھی۔ محمود اپنے ماں باپ کا بدصورت اور کوتاہ قد لڑکا تھا۔ اس کے بھائی اچھی شکل وصورت کے تھے لیکن ماں کو سب سے زیادہ پیار محمود سے تھا۔ محمود نے چند سال پہلے جب اُسے کہا تھا کہ وہ ایک باغ اور اس باغ میں ایک بہت ہی خوبصورت مکان بنانا چاہتا ہے، تو ماں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"میں نے آپ کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مادرِ محترم!" — محمود غزنوی نے ماں سے کہا — "میں مکان نہیں بنواؤں گا۔"

"نہیں بیٹا!" — ماں نے کہا — "میں تمہیں خود مکان بنوا دوں گی جس کے اردگرد باغ ہو گا۔"

"پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے ہیں؟"

"مجھے وہ وقت یاد آگیا ہے جب تم پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے" — ماں نے کہا

—— وہ ابھی میں تمہارے باپ کی بیوی نہیں بنی تھی۔ میں ایک شہزادے کی منگیتر تھی۔ لیکن میرے دل اور میری روح میں تمہارا باپ بس گیا تھا۔ مجھے اپنا منگیتر اس لیے پسند نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ مجھے کہا کرتا تھا کہ گھوڑ سواری چھوڑ دو۔ میں گہرے دریاؤں میں کودنے اور تیرنے کی شوقین تھی۔ گھوڑ سواری اور تیراکی میرے مشاغل تھے۔ میں خوبصورت تو تھی مگر میں نمائش کی چیز نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ مجھے وہ خاوند چاہیے جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے اور جو دریا میں کود جائے....

"میرے عزیز بیٹے! میں حرموں کے بادشاہوں اور امراکو بتانا چاہتی تھی کہ مسلمانوں کا زوال اُسی روز شروع ہو گیا تھا جس روز عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ کر اُسے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا —— سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمت اسلام کے پاسبان نہیں بن سکتے۔ میں اُس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دُور دُور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر....

"تمہارے باپ نے ہنس کر کہا —— میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی، مگر میں غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا —— میں نے اُسے کہا تھا —— اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے، دولت والے تو اسلام کو ڈبوئیں گے۔ میرا باپ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا لیکن غزنی کا سلطان بنا۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ میں جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہوں وہ بچہ تمہارا ہوگا.... یہ میرے دل کی نہیں میری روح کی آواز تھی۔ سبکتگین کے ساتھ میری محبت جسمانی اور جذباتی نہیں تھی۔ میری روح میں خدا بول رہا تھا....

"خدائے بزرگ و برتر نے اپنی خدائی کا کرشمہ دکھایا۔ میں تمہارے باپ کی بیوی بن گئی۔ تمہارا باپ جو میرے باپ کی طرح غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا غزنی کی سلطنت کا سلطان اور میرے باپ کا جانشین ہوا۔ پھر خدائے ذوالجلال نے تمہارے

باپ کو اشارہ دیا تمہاری پیدائش سے ایک رات پہلے باپ نے یہ خواب دیکھا کہ محل کے ایک کمرے میں ایک درخت اُگا جو بڑھتا چلا گیا۔ درخت چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور پھیلنے لگا۔ اس نے آدھی دنیا کو اپنے سائے میں لے لیا۔ تمہارا باپ اس خواب سے کچھ پریشان تھا۔ تم پیدا ہوئے تو میں نے تمہارے باپ سے کہا۔ آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ میں نے اُس بچے کو جنم دے دیا ہے جو باطل شکن ہو گا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔ اس اشارے کو سمجھیں۔ تم عاشور کی رات پیدا ہوئے تھے۔"

"آپ پہلے بھی مجھے یہ کہانی سُنا چکی ہیں" ____ محمود غزنوی نے کہا۔ "آج آپ نے اتنا زیادہ جذباتی ہو کر وہی بات پھر کیوں سنائی ہے؟"

"اس لیے کہ تمہارا دل باغوں کی رنگینی اور مہک میں اور مکانوں کی دلکشی میں نہ اُلجھ جائے"۔ ماں نے جواب دیا۔ "اور میرے آنسو اس لیے بہہ نکلے تھے کہ تم شہزادے ہو مگر تمہاری عمر جنگلوں اور صحراؤں میں، پہاڑوں اور ویرانوں میں باطل کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم محل کے لیے نہیں میدانِ عمل کے لیے پیدا ہوئے ہو۔۔۔ تم باغ کے لیے جگہ پسند کر لو اور کام شروع کرا دو۔ جب کبھی میدانِ جنگ سے لوٹو تو دو چار دن اپنی پسند کے مکان میں رہ لیا کرنا۔"

محمود غزنوی نے کام شروع کرا دیا۔ مکان کے لیے تجربہ کار کاریگر اکٹھے کر لیے اور جب راجہ جے پال کی فوج غزنی پر حملے کے لیے آئی، باغ سرسبز ہو چکا تھا۔ پھول کھل آئے تھے۔ درختوں کے پودے اٹھ آئے تھے اور اس کے وسط میں ایک خوشنما مکان جس کی دلکشی دیکھنے والوں کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھی تعمیر ہو چکا تھا۔

پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر حملہ کیا تھا مگر غزنی سے دُور ہی لڑائی ہوئی۔ ہندو فوج پسپا ہوئی اور تباہ زیادہ ہوئی تھی۔ مالِ غنیمت اتنا زیادہ تھا کہ سبکتگین کی فوج کو یہ سامان، خزانہ، گھوڑے ہاتھی اور اونٹ سمیٹتے بیس دن لگ گئے تھے۔ فتح کا جشن بڑی دھوم سے منایا گیا۔ سبکتگین جب غزنی واپس گیا تو محمود غزنوی نے اسے بتایا کہ اسکا باغ اور مکان

مکمل ہو چکے ہیں۔

"آپ کو یہ میرا چھوٹا سا مکان بہت پسند آئے گا" ـــ محمود غزنوی نے سلطان سبکتگین سے کہا ـــ "آپ دیکھیں گے؟"

سبکتگین کو محمود کی ماں نے بتا دیا تھا کہ ان کا بیٹا غزنی کے مضافات میں اپنے لیے چھوٹا سا ایک مکان بنا رہا ہے۔ سبکتگین اسے چھوٹا سا ہی سمجھ رہا تھا، لیکن محمود کے کہنے پر جب وہ اس کے مکان کو دیکھنے گیا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ یہ مکان نہیں بلکہ چھوٹا سا محل تھا، اور باغ شاہانہ تھا۔

"محمود!" ـــ سلطان سبکتگین نے بیٹے سے کہا۔ "خدا تمہیں یہ محل، یہ باغ اور پھول مبارک کرے۔ تمہارا ذوق عمدہ ہے۔ یہ ایک شہزادے کا ذوق ہے لیکن تم صرف شہزادے نہیں اسلام کے شاہسوار بھی ہو۔ تم ایک سلطان کے نہیں اسلام کے بیٹے ہو، اور تم شاید بھول گئے ہو کہ تم ایک غلام کے بیٹے ہو۔ خدا نے مجھے سلطانی عطا کی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک فرض سونپا ہے۔ یہ فرض میری ماں کو اُس وقت خوابوں میں اور غیب کے اشاروں کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا جب وہ میرے باپ کی ابھی بیوی نہیں بنی تھی۔ مجھے یہ فرض دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے....

"میں اسے خدا کی بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ اس مقدّس فرض کی ادائیگی مجھے اور میری نسل کو عطا کی گئی ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تمہاری ماں بھی تمہیں بتا چکی ہے کہ تم نے ایک شہزادے اور ایک عام بچے کے روپ میں جنم نہیں لیا۔ میری ماں کی طرح تمہاری ماں کو بھی اس کی روح نے اشارہ دیا تھا کہ وہ ایک باطل شکن کو جنم دے گی۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے اتنا خوبصورت مکان نہیں بنانا چاہیے تھا؟" ـــ محمود غزنوی نے مایوس ہو کر کہا۔

"ضرور بنانا چاہیے تھا" ـــ سلطان سبکتگین نے کہا ـــ "میں تمہیں بتانا یہ چاہتا

ہوں کہ کوئی بھی آدمی جس کے پاس دولت ہے، ایسا مکان بنا سکتا ہے لیکن جو فرض تمہیں سونپا گیا ہے، وہ ہر کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ لوگ اونچے مکان اور شہزادے اور بادشاہ اونچی یادگاریں صرف اس لیے بناتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد بھی لوگ انہیں یاد رکھیں اور ان کا نام لیں مگر اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں مٹ جایا کرتی ہیں۔ یادگار لوگوں کے دلوں میں تعمیر کرو۔ کام وہ کرو جس کی یاد تاریخ کے ہر دور میں تازہ ہو۔ اپنے نام کو ایک مکان کی دیواروں میں قید نہ کرو، اسے تاریخ کے چہرے پر کبھی نہ مٹنے والا نقش بنا دو..... اور محمود! دولت، عورت اور خوشنما مکان انسان کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ یہ زنجیریں ہیں جن میں جو بندھ جاتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے لیے شیطان بن جاتا ہے۔ تم جوان ہو محمود! لڑکپن اور جوانی کا یہ سنگم زندگی کا بڑا ہی خطرناک دور راہا ہوتا ہے۔ انسان اپنے سود و زیاں کو کم ہی دھیان میں رکھتا ہے۔ اگر تم اس عمر میں دنیا کی رنگینی کی راہ پر چل پڑے تو واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔"

"آپ مجھے اس مکان میں نہیں دیکھیں گے" — محمود غزنوی نے کہا — "میں یہ کبھی بھی نہیں بھولا کہ میں مردِ میدان ہوں۔"

"اگر تم میری زندگی میں کفّار سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو میں تمہیں اسی مکان میں دفن کروں گا" — سلطان سبکتگین نے کہا — "تمہاری پسند کا یہ مکان تمہاری روح کی پسند کا مقبرہ ہو گا اور یہ باغ ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا۔"

سلطان سبکتگین نے ٹھیک کہا تھا۔ آج غزنی کے مضافات میں محمود غزنوی کے اس مکان اور اس باغ کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ہندوستان پر اس کے سترہ حملوں کے سترہ یادگاری مینار پورے سترہ نہیں رہے۔ متعدد مینار گر کر غائب ہو چکے ہیں لیکن تاریخ میں محمود غزنوی کا نام روشن مینار کی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ محمود غزنوی بت شکن کے نام سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

راجہ جے پال تھوڑا ہی عرصہ پہلے غزنی کی طرف جاتے ہوئے پشاور سے گزرا تھا تو

اُس کی شان اور اُس کی جنگی طاقت کو دیکھ کر پہاڑ اور دریا جیسے راستہ دے رہے تھے۔ لوگ ڈر کے مارے دُور بھاگ گئے تھے۔ وہی راجہ جے پال شکست کھا کر واپس پشاور میں داخل ہُوا تو لوگ دُور دُور سے دوڑے آئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ اُن کا مہاراجہ ہے یا اُس کی بدروح۔ اس کی جنگی طاقت لٹے پٹے قافلے کی طرح چلی آ رہی تھی گھوڑوں اور ہاتھیوں کے بھی سر جھکے ہوئے تھے۔ اُن کی چال بتاتی تھی کہ یہ کسی بھی قدم پر گر پڑیں گے۔

پشاور میں راجہ کا جو محل تھا وہاں اس کے استقبال کے لیے نقّارے بجے۔ محل کے محافظ تعظیم کے لیے دورویہ کھڑے ہو گئے۔ راجہ نے غصّے سے پھٹ کر کہا ــــ "بند کرو یہ غل غپاڑہ"ــــ اُس نے اپنے ساتھ کے کسی آدمی سے کہا ــــ "دونوں پنڈتوں کو فوراً حاضر کرو"۔

محل کی فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔ وہاں جو انسان تھے، وہ تو جیسے مر گئے تھے۔ اس سکوت میں دو تین آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں "پنڈت کہاں ہیں ..... پنڈت جی مہاراج کہاں ہیں"؟

راجہ اس کیفیت میں محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ غصّے سے اُس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے ہی ہاتھ پر گھونسہ مارتا یا اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مارتا تھا۔ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ دونو پنڈت کمرے میں داخل ہو کر دست بستہ کھڑے ہیں۔ یہ سب سے بڑے پنڈت تھے جو بھٹنڈہ میں رہتے تھے۔ اب چونکہ راجہ نے لاہور سے پیشقدمی کی تھی اس لیے وہ لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے ہی راجہ کو کوچ کا شبھ دن بتایا اور یقین دلایا تھا کہ اُسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ دونوں پنڈت اس کے ساتھ پشاور تک گئے تھے، اور جب راجہ اپنی فوج کے ساتھ پشاور سے نکلا تھا تو دونوں پنڈت گھنٹیاں بجاتے راستے میں کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ بارہ کنواریاں تھیں جن کے ہاتھوں میں طشتریاں اور طشتریوں میں اگربتیاں جل رہی تھیں۔ وہ کوئی مذہبی گیت گا رہی تھیں۔ انہوں نے راجہ کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بکھیری تھیں۔

"مہاراج!" — ایک پنڈت نے کہا — "ہم حاضر ہیں۔"
راجہ رک گیا۔ اُس نے پنڈتوں کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں قہر اُترا ہُوا تھا۔ وہ سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو کے رہ گیا تھا۔

"کیا تم نے جھوٹ بولا تھا یا تمہاری پوتھی نے جسے دیکھ کر تم نے مجھے کوچ کا شبھ دن بتایا تھا؟" — راجہ جے پال نے ان سے پوچھا۔

"نہ ہم نے جھوٹ بولا تھا نہ ہماری پوتھی نے" — ایک پنڈت نے جواب دیا — "ستارے جھوٹ نہیں بولا کرتے، مہاراج! ہم آپ کو پھر حساب جوڑ کر بتا سکتے ہیں۔"

"تم لاکھ حساب جوڑو، میرے سامنے اس وقت یہ شرمناک حقیقت ہے کہ میں شکست کھا کر آیا ہوں اور میری فوج تباہ ہو گئی ہے" — راجہ نے کہا — "اس کی کیا وجہ ہوئی؟ تم دونوں نے کہا تھا کہ فلاں دن کوچ کرو تو فتح ہو گی۔ تم نے کہا تھا کہ دیوی کی آشیرباد مل گئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ پنڈتوں کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ مورتیاں اور کشن مراری کے بُت ساتھ لے جائیں گے اور لڑائی سے پہلے سپاہیوں کے سامنے یہ بُت اور مورتیاں رکھ کر پرارتھنا کرانا، پھر یہ سپاہی پہاڑوں کو پیس ڈالیں گے۔ میں نے یہ سارا انتظام کیا۔ وہاں جا کر دیکھو جہاں لڑائی ہوئی تھی۔ وہاں بتوں کے ٹکڑے اور مورتیوں کے پرخچے بکھرے ہوئے ہیں۔ پنڈتوں نے سپاہیوں کو ان کے سامنے بٹھایا مگر گھنٹیاں بجنے لگیں اور پرارتھنا شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ہم پر اس طرح ہلّہ بول دیا جس طرح اچانک بگولہ آتا اور راستے میں جو کچھ آئے اڑا کر لے جاتا ہے....

"تم سمجھتے ہو گے کہ وہ لشکر کی صورت میں آئے تھے۔ نہیں حملہ کرنے والوں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی۔ رات کا وقت تھا جب عموماً لڑائی نہیں ہُوا کرتی۔ ہمارے کشن مراری کے بت اور مورتیاں ہمارے انہی سپاہیوں کے پاؤں تلے روندی گئیں جو ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر عبادت کر رہے تھے۔ پنڈت بھاگ گئے۔ سپاہی بکھر گئے۔ اس کے بعد میری فوج کسی بھی وقت مسلمانوں کے سامنے ٹھہر

نہ سکی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری فوج کی تعداد تین لاکھ تھی اور مسلمانوں کی فوج کی تعداد ہم سے چار گنا کم تھی۔"

"ہم حساب جوڑ کر بتائیں گے مہاراج!" ـــــ ایک پنڈت نے کہا ـــــ "معلوم ہوتا ہے، ستارے ٹکرا گئے ہیں۔"

راجہ جے پال کو غصّے نے باؤلا کر رکھا تھا۔ ایک طرف پنڈتوں کی پوتھیاں اور ستاروں کا علم تھا۔ دوسری طرف اس کے سامنے یہ انتہائی تلخ حقیقت تھی کہ وہ کس عزم کے ساتھ تین لاکھ کا لشکر لے کر غزنی پر قبضہ کرنے اور اس تمام علاقے یعنی آج کے تمام تر افغانستان کو ہندوستان میں شامل کرنے گیا تھا۔ وہ ہندوستان کو مہابھارت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی فوج کو سلطان سبکتگین کی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس کیفیت میں بھاگا کہ پشاور تک اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

اُس کے لیے یہ صورتِ حال بہت ہی تکلیف دہ تھی ـــــ وہ چار پانچ ریاستوں کی فوج اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسے ان مہاراجوں کا سامنا کرنا تھا۔ ایک صورت اور بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جو مہاراجہ دوبار دشمن سے شکست کھائے اُسے حکمرانی سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ جے پال دوبارہ شکست کھا چکا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے کے حق میں راج سے دستبردار ہونا تھا۔ اس کا بیٹا انند پال نوجوان تھا جس طرح سلطان سبکتگین نے محمود غزنوی کو عسکری تربیت دی تھی، اسی طرح جے پال نے اپنے بیٹے کو جنگجو بنا دیا تھا مگر انند پال ابھی ریاست کا راج سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ راجہ جے پال کو یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ دوسرے مہاراجے اسے راج سے ہٹ جانے کو کہیں گے۔ ان مہاراجوں کی بھی فوجیں تباہ ہوئی تھیں۔ ان حالات میں راجہ جے پال کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا جب پنڈت نے اسے کہا کہ وہ حساب جوڑ کر بتائیں گے کہ ان کا پہلا حساب جس میں انہوں نے راجہ کو فتح کی خوشخبری سنائی تھی کیوں غلط نکلا ہے، تو غصّے سے راجہ

کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مسلمان تمہاری طرح زائچہ بنائے بغیر لڑنے آئے تھے "۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "انہوں نے ستاروں کے راستے نہیں دیکھے تھے۔ ہمارے ہاتھ مسلمان فوج کے بہت تھوڑے جنگی قیدی آئے ہیں۔ ان میں سپاہیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دو اُونچے عہدے کے فوجی ہیں۔ میں انہیں تمہارے سامنے کھڑا کر کے پوچھوں گا کہ وہ اپنے مولویوں سے جوتش اور نجوم کے ذریعے فتح کی خوشخبری لے کر آئے تھے؟ .... مجھے شک ہونے لگا ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا سچ ہے کہ پتھر کے خدا جھوٹے ہیں۔ مسلمان جس خدا کی عبادت کرتے ہیں، وہ مجھے سچا خدا معلوم ہوتا ہے۔"

"چھی، چھی، چھی .... مہاراج!"۔ ایک پنڈت نے کہا۔ "مسلمان ملیچھ ہیں۔ اپنے دیوتاؤں کو اس لیے جھوٹا نہ کہیں کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ اس کی کئی اور وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کا مذہب سچا ہے۔"

"کسی کے گھر ڈاکہ پڑتا ہے تو گھر لُٹ جاتا ہے"۔ دوسرے پنڈت نے کہا ۔ "اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ڈاکوؤں کا خدا سچا ہے۔ اور لٹنے والوں کا جھوٹا۔"

"میں اپنے مذہب کو سچا سمجھ کر اسے مسلمانوں کے علاقوں میں پھیلانے کے ارادے سے گیا تھا"۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "دیوتاؤں نے میری کیوں مدد نہیں کی؟ مسلمان ہمارے بتوں اور مورتیوں کے ٹکڑے دیکھ کر ہمارے مذہب پر ہنس رہے ہوں گے۔"

"مہاراج! ہمیں زائچہ بنانے کے لیے مہلت دیں۔"

"میں مہلت دیتا ہوں"۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "لیکن ذرا ٹھہرو۔ میں مسلمان قیدیوں کو بلا لوں۔ تم بیٹھ جاؤ۔"

راجہ نے کمرے میں لٹکتا ہوا گھڑیال بجایا۔ دربان اندر آیا تو راجہ نے اسے اپنے دو تین جرنیلوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً بلا لاؤ اور اُن دو مسلمان قیدیوں کو بھی لے آؤ جنہیں دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا گیا ہے۔

راجہ جے پال اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار کے دستور کے مطابق اُس کے دو پنڈت اُس کے دائیں بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ دونوں جرنیل۔

دو خوش وضع، گٹھے ہوئے جسموں والے اور دراز قد آدمی اندر لائے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ تھے تو قیدی لیکن ان کی چال ڈھال میں وقار اور جلال تھا۔ ان کے چہروں پر خوف نہیں تھا۔ ندامت نہیں تھی۔ وہ سبکتگین کی فاتح فوج کے کماندار تھے۔ انہوں نے آخری معرکے میں شب خون مارا تھا جو اتنا دلیرانہ تھا کہ دشمن کے عقب میں چلے گئے اور پکڑے گئے تھے۔ دونوں کے جیشوں نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا تھا مگر انہیں خاصی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔

راجہ جے پال کے ساتھ ایک ترجمان تھا جو غزنی کے خطے کی زبان بولتا اور سمجھتا تھا۔ راجہ نے اس کی وساطت سے دونوں قیدیوں سے باتیں کیں۔

"میں تم دونوں سے کوئی جنگی راز معلوم نہیں کرنا چاہتا" ـــــ راجہ جے پال نے کہا ـــــ "مجھے یہ بتاؤ کہ جب تمہاری فوج لڑائی کے لیے جاتی ہے تو تمہارے مولوی یا جوتشی تمہارے بادشاہ کو بتاتے ہیں کہ فلاں دن کوچ کرو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے؟"

"نہیں" ـــــ غزنی کے ایک جنگی قیدی نظام اور یزی نے جواب دیا ـــــ "ہماری لڑائی ہمارے دین کے دشمن کے خلاف ہوتی ہے۔ دین کے دشمن آپ بھی ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہیں، اور ہمارے مسلمان بھائی بھی ہمارے دین کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ ہماری لڑائی جہاد کہلاتی ہے۔ ہم اپنی ریاست کی توسیع کے لیے کسی ملک پر حملہ نہیں کیا کرتے چونکہ ہم خدا کی راہ میں، خدا کے سچے مذہب کی خاطر لڑتے ہیں، اس لیے ہم کوچ، پیشقدمی اور حملے کے لیے ہر دن کو مبارک دن سمجھتے ہیں۔ دن ہو یا رات، بارش ہو یا طوفان، حکم مل جائے تو ہم جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"کیا مسجدوں میں تمہارے مولوی اور امام تمہاری کامیابی کے لیے خاص قسم

کی دعائیں مانگتے ہیں؟"

"ہر وہ فرد جو جہاد میں شریک نہیں ہوتا، جہاد پر جانے والوں کے لیے دعا کرتا ہے"۔۔۔ نظام اوریزی نے جواب دیا۔۔۔ "ہر وہ شخص، مرد یا عورت، بچہ یا بوڑھا، خدا کے ساتھ براہِ راست ہمکلام ہو سکتا ہے۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟"۔۔۔ راجہ جے پال نے پوچھا۔۔۔ "کیا تمہیں معلوم تھا کہ میری فوج کی تعداد کیا تھی؟"

"ہمیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ دشمن کی تعداد ہماری نسبت بہت زیادہ ہے"۔۔۔ نظام اوریزی نے جواب دیا۔۔۔ "آپ کے لشکر کی صحیح تعداد کا علم سلطان اور اس کے سالاروں کو ہوگا۔ ہماری کامیابی کا راز یہ ہے۔ کہ ہم اپنی جانیں خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم نہیں ہماری روحیں لڑا کرتی ہیں۔"

"یہ میں جانتا ہوں"۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا۔۔۔ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اتنی کم نفری سے اتنے بڑے لشکر پر کس طرح غالب آجاتے ہو۔ میں طریقہ پوچھ رہا ہوں۔"

"یہ ایک جنگی راز ہے"۔۔۔ نظام اوریزی نے جواب دیا۔۔۔ "یہ نہ میں آپ کو بتاؤں گا نہ میرا یہ ساتھی بتائے گا۔ صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ مردِ مومن ستاروں کی گردش کا پابند نہیں ہوا کرتا جب تک ایمان مضبوط رہتا ہے، اسلام کا مجاہد آسمان سے گرنے والی بجلی بنا رہتا ہے۔ ہماری فوج کے مولویوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہندو بتوں اور تصویروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم آپ کو عملی طور پر بتا چکے ہیں کہ پتھر کے خدا ہمارے حقیقی خدا سے ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ کیا آپ کی فوج کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بت نہیں گئے تھے؟ کوئی ایک بھی بت سلامت واپس آیا ہے؟"

"یہ ملیچھ ہمارے مذہب کی توہین کر رہا ہے مہاراج!"۔۔۔ ایک پنڈت نے غصے سے کہا۔

"اسے ابھی احساس نہیں ہوا کہ یہ ہمارا قیدی ہے"۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا

—"یہ اپنے انجام سے بے خبر ہے۔ اگر اس نے مجھے اپنا طریقہ جنگ نہ بتایا تو زندہ کی کھال اتاری جائے گی .... دونوں میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گا۔"

"یہ راز جاننے کے لیے آپ کو اسلام قبول کرنا ہوگا مہاراج!"— دوسرے قیدی نے کہا —"ہمیں قتل کر کے آپ اپنی شکست کو فتح میں نہیں بدل سکتے آپ ہم سے کوئی راز نہیں لے سکتے۔"

"لے جاؤ انہیں" — راجہ جے پال نے کہا —"انہیں زنجیروں میں رکھو۔ دوسرے جنگی قیدیوں کو قتل کر دو۔"

دونوں قیدیوں کو لے گئے، تو راجہ جے پال نے پنڈتوں سے کہا —"میں اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہتا ہوں۔ مجھے حساب کر کے بتاؤ کہ میں شکست کو کس طرح فتح میں بدل سکتا ہوں۔"

پنڈتوں کے چلے جانے کے بعد راجہ جے پال نے اپنے دونوں جرنیلوں سے کہا —"اِن دونوں قیدیوں کو لاہور لے چلو۔ ہم کل روانہ ہوں گے۔ یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گے۔"

"آپ ان سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟" — ایک جرنیل نے کہا —"ہماری شکست کی وجہ صاف ہے سبکتگین کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ ہم حملے کے لیے آرہے ہیں۔ مسلمانوں نے گھات لگائی اور پہلے ہی حملے میں ہماری فوج کا حوصلہ توڑ دیا۔ سبکتگین نے پہاڑیوں میں اپنے دستے گھات میں بٹھا رکھے تھے۔ اُس نے شب خونوں اور چھاپوں کی جنگ لڑی ہے۔ وہ تیار تھا اور ہمارے لیے اس کے شب خون غیر متوقع تھے۔ آپ یہ معلوم کریں کہ ہمارے کوُچ کی اطلاع غزنی تک کس طرح پہنچی۔ ہماری ریاست میں سبکتگین کے جاسوس موجود ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔"

راجہ جے پال بوڑھا بھی ہو گیا تھا۔ شکست نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا کہ وہ اس کے سوا کچھ اور سننے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی شکست کا

راز کچھ اور ہے۔ اب نظام اور یزدی نے اسے کہہ دیا کہ وہ جان دے دے گا، یہ راز نہیں بتائے گا تو اس کے دماغ میں یہی گانٹھ پڑ گئی کہ وہ یہ راز معلوم کر کے رہے گا۔

لاہور کے سب سے بڑے مندر میں پنڈت کئی ہاتھوں والی دیوی کے بُت کے آگے لوبان اور اگربتیاں جلائے کچھ پڑھ رہے تھے۔ مندر کو صاف کیا گیا تھا۔ اندر اور باہر سے سجایا بھی گیا تھا۔ مندر میں عام لوگوں کا داخلہ بند تھا۔ اندر صرف بیس پچیس نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھی۔ وہ مندر کے دروازے کے سامنے دو قطاروں میں کھڑی تھیں۔ وہاں فوج کے چند ایک افسر بھی گھوم پھر رہے تھے۔

باہر سے شور اٹھا۔ "مہاراج کی سواری آرہی ہے"

ہڑبونگ مچ گئی۔ راجہ جے پال لڑکیوں کی دونوں قطاروں کے قریب پہنچا تو لڑکیوں نے اُس کے راستے میں پھول پھینکنے شروع کر دیئے۔ راجہ قطاروں کے درمیان سے گزرا تو لڑکیوں نے اُس پر پھولوں کی پتیاں پھینکیں۔ وہ پھولوں کو روندتا، پھولوں کی بارش میں گزرتا مندر میں داخل ہو گیا جہاں پنڈت جنتر منتر پڑھ رہے تھے۔ ایک پنڈت نے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ ایک پنڈت سنکھ اور دوسرا گھنٹی بجانے لگا۔

راجہ جے پال نے کئی ہاتھوں کی دیوی کے بُت کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنی آنکھوں اور اپنے ماتھے سے لگائے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر قسم کھائی کہ میں شکست کا انتقام لوں گا۔ ہندومت کو دور دور تک پھیلاؤں گا۔ جس خطے سے اسلام اُٹھا تھا اُس خطے کو دیوی دیوتاؤں کے دیس میں شامل کر دوں گا۔ اگر نہ کر سکا تو وہیں اپنی جان دے دوں گا۔

وہ خاموش ہوا تو پنڈتوں کی باری آئی۔ انہوں نے اپنی زبان میں بُت سے بہت کچھ کہا۔ گھنٹیاں اور سنکھ بجتے رہے۔ عین اُس وقت بڑی زور کی گرج سنائی دی۔ باہر سورج کی روشنی ماند پڑ گئی۔ گرج ایک بار پھر سنائی دی۔ پنڈتوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے راجہ جے پال نے انہیں دیکھا گرج سنی تو اُس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ پنڈت اور زیادہ بلند آواز سے بُت کے آگے گڑگڑانے لگے۔ باہر دھوپ بالکل ختم ہوگئی۔ مندر کے اندر بھی نیم تاریکی چھاگئی۔ اس کے ساتھ ہی باہر چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"مہاراج!۔۔۔ بڑے پنڈت نے راجہ جے پال کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور ہاتھ جوڑ کر گھبراہٹ کے لہجے میں کہا۔۔۔ "دیوتا سخت ناراض ہیں۔ غزنی کے میدانِ جنگ میں بتوں کی جو توہین ہوئی ہے۔ اسے دیوتا بخشیں گے نہیں۔"

آسمان سے اتنی زور کا دھماکہ ہوا کہ مندر لرز گیا۔ بُت ڈول گیا۔

"پنڈت جی مہاراج!"۔۔۔ راجہ جے پال نے کانپتی ہوئی آواز میں چلّا کر کہا۔ ۔۔۔"دیوتا کیا مانگتے ہیں؟ کتنی قربانی مانگتے ہیں؟ کتنے انسانوں کی جان مانگتے ہیں؟ میں اتنے ہی انسانوں کی قربانی دوں گا۔"

اُس وقت راجہ جے پال، پنڈتوں اور بتوں پر آسمان کی کڑک، گرج اور چیخوں کا خوف طاری تھا۔ مندر سے کچھ دور مسلمان کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک دے رہے تھے۔ اس طوفانی بارش اور بجلی کی کڑک اور گھٹاؤں کی گرج میں ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ "اللہ نے کرم کردیا ہے.... اب فصل اُٹھے گی.... ڈھول بجاؤ.... ناچو .... نفل پڑھیں گے.... اللہ کا شکر ادا کرو۔"

مسلمانوں کے لیے جو اللہ کا کرم تھا، اسے بتوں کے پجاری اپنے بھگوان کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مسلمان مسجدوں میں شکرانے کے نفل پڑھنے کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ بارش جو آج برسنے لگی تھی۔ ایک ماہ پہلے برسنی چاہیئے تھی۔ اس تاخیر سے خشک سالی کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، مگر مسجد اور مندر میں یہ فرق تھا کہ مسجد کا کرم مندر کا قہر تھا۔ مسلمان کسانوں کے بچے بھی باہر نکل آئے اور ناچتے کودتے پھر رہے تھے مگر مندر میں کئی ہاتھوں والی دیوی کے چہرے پر بھی خوف تھا۔

پنڈت اس بُت کے سامنے ہاتھ جوڑے بخشش مانگ رہے تھے۔ باہر جن

لڑکیوں نے راجہ جے پال کے راستے میں پھول نچھاور کیے تھے، وہ بادو باراں کے طوفان سے گھبرا کر اندر آگئی تھیں۔

"مہاراج!" بڑے پنڈت نے راجہ جے پال سے کہا "ایک کنواری کی قربانی۔"

"صرف ایک؟"

"جی مہاراج!" پنڈت نے جواب دیا "صرف ایک کنواری لڑکی ہو۔"

"کسی مسلمان کی کنواری بیٹی کو پکڑ لاؤ اور میرے سامنے اسے قربان کرو" — راجہ نے حکم دیا۔

"نہیں مہاراج!" پنڈت نے کہا "بھگوان کسی ملیچھ کی قربانی قبول نہیں کرتے۔ لڑکی ہندو ہونی چاہیئے۔"

راجہ جے پال نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے اُس کے راستے میں پھول بچھائے تھے۔ انہیں کنواریاں کہا جاتا تھا۔

"ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھ لو" — راجہ جے پال نے کہا "یہ سب کنواری ہیں۔"

لڑکیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ بعض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، پھر سب نے پنڈتوں کی طرف دیکھا۔ پنڈت جھینپ گئے۔ یہ لڑکیاں آج پہلی بار مندر میں نہیں آئی تھیں۔ یہ آتی ہی رہتی تھیں۔ اکیلی اکیلی بھی آتی تھیں۔ دو دو چار چار بھی آتی تھیں۔ ان کے جاننے والے ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ یہ مندر کی کنواریاں تھیں۔ لوگوں کی نگاہوں میں پاک اور قابلِ تعظیم تھیں لیکن پنڈتوں اور لڑکیوں کی نگاہیں کچھ اور کہتی تھیں۔ پنڈت لڑکیوں کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔

راجہ جے پال نے ایک لڑکی کو جو سب سے زیادہ حسین اور نوجوان تھی بازو سے پکڑا اور پنڈت سے کہا "اس کی قربانی دے دو۔"

"میں آپ کے قدموں میں جان دینے کو تیار ہوں" — لڑکی نے کہا —

"میں اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ دوں گی، لیکن مہاراج! میں کنواری نہیں ہوں۔"

"تمہاری شادی ہو چکی ہے تو مندر میں کیوں آئی ہو" ــــ راجہ نے پوچھا۔

"میں کسی کی بیوی نہیں"ــــ لڑکی نے کہا ــــ "میں مندر کی داسی ہوں پنڈت جی مہاراج مجھے...."

"قربانی کے لیے خاص رنگ، عمر اور شکل وصورت کی کنواری کی ضرورت ہے" ــــ بڑے پنڈت نے لڑکی کی بات پوری نہ ہونے دی اور بولا ــــ "ان میں سے کوئی بھی لڑکی قربانی کے قابل نہیں۔ ہم خود تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم لڑکی کو پورے چاند کی رات سے لے کر اگلے پورے چاند کی رات تک اپنے پاس رکھیں گے۔ اُسے خاص قسم کی غذا دیں گے۔ اُسے خاص پانی سے غسل دیں گے۔ وہ اپنی زبان سے بولے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ وہ آپ کو آشیرباد دے گی۔ اُسے اس مندر میں نہیں کسی خاص علاقے میں لے جا کر قربان کیا جائے گا"

"یہ کام بہت جلدی ہونا چاہیئے" ــــ راجہ جے پال نے کہا۔

"آپ نے قربانی دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو دیوتاؤں کا قہر اسی سے رک گیا ہے" ــــ بڑے پنڈت نے کہا ــــ "آپ سن نہیں رہے۔ کہ آسمان کی گرج دھیمی ہو گئی ہے، طوفان کا زور تھم گیا ہے مہاراج!"

راجہ جے پال مندر سے نکل گیا۔ لڑکیوں کے چہروں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ انہیں ڈر لگ رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو قربان کر دیا جائے گا۔

"آج تم سب سمجھ گئی ہو گی کہ ہم نے تمہیں کنوارہ کیوں نہیں رہنے دیا" ــــ بڑے پنڈت نے لڑکیوں سے کہا ــــ "ورنہ آج تم میں سے ایک لڑکی کی گردن کٹ جاتی، یا اُسے زندہ جلا دیا جاتا۔ پھر باری باری سب کو قربان کر دیا جاتا" ــــ پنڈت کے لہجے میں سنجیدگی اور متانت تھی جیسے وہ کوئی مذہبی بات کر رہا ہو ــــ "تم اپنے اپنے جسم کی قربانی دے چکی ہو۔"

راجہ جے پال کی سواری برستی بارش میں چلی گئی۔ اُس کے فوجی افسر اور محافظ بھی چلے

گئے۔ مندر میں لڑکیاں اور پنڈت رہ گئے۔ پنڈتوں نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ پچھلے کمرے میں چلی جائیں۔ وہ چلی گئیں۔ تو پنڈت بھی اُن کے پیچھے چلے گئے۔

جس وقت راجہ جے پال مندر میں پہنچا تھا، اُس وقت غزنی کے دونو قیدی نظام اور یزمی اور اُس کا ساتھی قاسم بلخی، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے راج محل میں لائے گئے تھے۔ انہیں لانے کا حکم راجہ جے پال دے گیا تھا۔ دونوں کو راجہ کے انتظار میں تنگ سے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ راجہ نے یہ حکم بھی دیا تھا۔ کہ انہیں قید خانے کے گھٹیا کھانے کی بجائے راج محل کا اچھا کھانا دیا جائے۔ راجہ انہیں خوش کر کے اُن سے وہ جنگی راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو انہوں نے اس سے چھپالیا تھا، حالانکہ اُن کے پاس ایسا کوئی راز نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں سے کہا تھا کہ وہ ان دونوں کو اتنی عیش کرائے گا کہ ان کے دماغ ماؤف ہو جائیں گے، پھر وہ ان کے دلوں کو گرفتار کر لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے راز کی بات نہ بتائی تو انہیں بہت بُری ایذائیں دوں گا۔"

دونوں کے لیے کھانا لایا گیا۔ تو انہوں نے پوچھا کہ کھانا کس نے پکایا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ راج محل کے باورچی خانے کا پکا ہوا ہے۔ انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ انہیں کسی مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دیا جائے خواہ وہ کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو اور کھانا کوئی مسلمان لائے ..... چونکہ راجہ نے حکم دیا تھا کہ اِن دونوں قیدیوں کی خاطر تواضع کی جائے، اس لیے ہندو باورچی کے ہاتھ کا کھانا واپس کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مسلمان ملازم کھانا اٹھائے ہوتے آیا۔ قیدیوں نے یقین کر لیا کہ یہ ملازم واقعی مسلمان ہے۔

وہ جب کھانا کھانے لگے تو اُن کے ساتھ جو سپاہی آئے تھے وہ کمرے سے نکل گئے۔ قیدی زنجیروں میں تھے، اس لیے اُن کے بھاگنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مسلمان ملازم اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے چور نگاہوں سے دیکھا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں، تو وہ فارسی زبان میں بولا "خوش نہ ہونا کہ تمہاری خاطر و مدارت

ہو رہی ہے۔ یہ سلوک صرف اُس مسلمان قیدی سے کیا جاتا ہے جس کے متعلق شک ہو کہ اس کے پاس کوئی قیمتی راز ہے۔"

دونوں قیدیوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"دھیان کھانے میں رکھو" — ملازم نے کہا — "بات سرگوشیوں میں کرنا۔ انہیں شک ہو جاتے گا۔ مَیں تمہارا ہی آدمی ہوں.... اگر تمہارے پاس کوئی راز ہے تو انہیں نہ بتانا لیکن انہیں دھوکے میں رکھنا۔ ورنہ یہ تمہیں ایسے جہنم میں پھینک دیں گے جہاں ہر روز مرو گے اور ہر رات جیو گے۔ انہیں ایسا دھوکہ دیتے رہو کہ تمہاری زنجیریں کھول دیں۔ مَیں تمہیں فرار کراؤں گا۔ کسی لالچ میں نہ آنا۔"

اُس وقت بارش، بجلی کی کڑک اور تیز جھکڑ کی چیخوں کی وجہ سے اُن کی باتیں کوئی اور نہیں سُن سکتا تھا لیکن بارش کا زور ٹوٹتے ہی راجہ جے پال آگیا اور اُسے بتایا گیا کہ غزنی کے دو نو قیدی آ گئے ہیں۔ راجہ نے انہیں اندر بُلا لیا۔

"میں تم سے وہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں" — راجہ نے کہا۔

"ہم ہارنے کے عادی نہیں" — نظام اور بزی نے کہا — "خدا کے سوا ہم کسی کے سامنے نہیں جھکا کرتے اور ہم آپ پر اعتبار نہیں کر سکتے کیونکہ آپ اور آپ کی قوم مسلمان کو دھوکہ دینے اور وعدہ توڑنے کو نیکی سمجھتی ہے۔ اگر ہم زنجیروں میں بندھے ہوئے آپ کو راز کی باتیں بتا دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم قید کی اذیت سے بچنے کے لیے اپنی قوم کے ساتھ غدّاری کر رہے ہیں۔ قیدی کی حیثیت سے ہم اپنی زبانیں نہیں کھولیں گے۔"

"تو کیا میں تمہیں اپنا مہمان بنا کے رکھوں؟"

"جو کچھ بھی بنا کر رکھیں، ہم قیدی رہ کر آپ کو اپنا دوست نہیں سمجھ سکتے" — قاسم ایلچی نے کہا — "آپ ہمارے امرا اور ان کے محافظ دستے کو قید میں مار چکے ہیں۔ آپ نے ہمارے سلطان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ آپ ہم سے اپنے کام کی بات پوچھ کر ہمارا بھی وہی حشر کریں گے جو آپ ہمارے امرا اور ان کے محافظوں کا کر چکے ہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ اس سے زیادہ لشکر لے کر

جائیں، آپ کا انجام وہی ہوگا جو ہو چکا ہے۔ صرف ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ آپ بہت تھوڑی فوج سے ہماری فوج کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں۔"

"مَیں تمہاری زنجیریں کھلوا دوں گا"۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "اور تمہیں قید خانے میں نہیں رکھوں گا۔"

"اور جب ہم آپ کو راز کی بات بتا دیں گے تو آپ ہمیں رہا کر دیں گے؟"۔ نظام اور یزی نے پوچھا۔ "آپ ہمیں غزنی تک جانے کے لیے سواری دیں گے؟"

"جو مانگو گے دوں گا۔"

"ہم چند دن سوچیں گے، اور آپ کا رویّہ دیکھیں گے"۔ نظام اور یزی نے کہا۔ "قید خانے کے سوا ہمیں آپ جہاں جی چاہے رکھیں۔ ہم یہاں سے بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھائیں گے۔ آج بھی ہمارے کہنے پر ایک مسلمان ملازم کھانا لایا تھا۔"

شکست کے مارے ہوئے راجہ جے پال نے اُن کی شرط قبول کر لی اور ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا دیں اور حکم دیا کہ انہیں وہی مسلمان ملازم دے دیا جائے جس نے آج انہیں کھانا کھلایا تھا۔ انہیں الگ الگ دو کمروں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے لیے ہر قسم کی آسائش اور سہولت مہیّا کی گئی لیکن دونوں قیدیوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے کمروں کے ارد گرد پہرے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اگلے چند دنوں میں راجہ جے پال کی تمام تر ریاست کے مندروں میں لوگوں کو ایک بار پھر بتایا گیا کہ مسلمان فوج حملہ کرنے آ رہی ہے، اور یہ فوج کوئی مندر سلامت اور کوئی پنڈت زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں کو مسلمان فوج کی بربرّیت اور وحشی پن سے خوب ڈرایا گیا۔ اور اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی گئی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے مندروں، اپنے رِشیوں، پنڈتوں، اپنی جوان بیٹیوں کی عزت اور اپنی جانیں بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم سرکاری خزانے

میں جمع کرائیں بمندروں میں یہی کچھ بتایا جانے لگا۔ ہندوؤں نے پہلے کی طرح اپنے پیٹ باندھ لیے اور آمدنی کا بیشتر حصّہ اپنے مہاراجہ کے خزانے میں جمع کرانے لگے۔

لاہور کے بڑے مندر سے یہ اعلان ہُوا کہ مندر میں آنے والے لوگ اپنی کنواری لڑکیوں کو بھی مندر میں لایا کریں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ کنواری چونکہ گناہگار نہیں ہوتی، اُس کا جسم پاک ہوتا ہے، اس لیے دیوتا اس کی دعا قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوؤں کو پنڈتوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن کا مہاراجہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور جونہی فوج کی ضروریات کے لیے پیسہ جمع ہو گیا، مہاراجہ مسلمانوں کے ملک غزنی وغیرہ پر حملہ کر دیں گے تاکہ مسلمانوں کو حملے کی مہلت ہی نہ ملے۔ تیاریوں کے ساتھ عبادت اور دعا کی بہت ضرورت ہے۔

اس اعلان کی تعمیل میں لوگوں نے اپنی کنواری بیٹیوں کو بڑے مندر میں بھیجنا شروع کر دیا۔ بڑا پنڈت ان سے دعا کراتا تھا لیکن وہ ہر لڑکی کو غور سے دیکھتا تھا کیونکہ اُسے انسانی قربانی دینے کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔

پھر راجہ جے پال کو اتنی ہوش بھی نہ رہی کہ غزنی کے دونوں قیدیوں کی طرف توجہ دے سکتا کیونکہ اُن ریاستوں کے مہاراجے لاہور آ گئے تھے جنہوں نے راجہ جے پال کو سلطان سبکتگین کی سلطنت پر حملے کے لیے فوجیں دی تھیں۔ ان میں کالنجر، قنوج، گوالیار، دلّی اور کالنجر خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ دن رات شکست کے اسباب پر گرما گرم بحث ہوتی رہتی تھی جو ہنگامہ آرائی تک پہنچ جایا کرتی تھی مگر کوئی ایک بھی مہاراجہ ایسا نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اپنی فوج نہیں جھونکے گا۔ بحث کا موضوع یہ رہا کہ کس طرح سلطان سبکتگین کو اسی کے علاقے میں ختم کر کے اس کی سلطنت پر قبضہ کیا جائے۔

"اگر ہم یہ علاقے فتح کر لیتے ہیں تو وہاں سے عرب کے علاقوں پر حملے کیے جا سکتے ہیں"۔۔۔ کالنجر کے مہاراجہ نے کہا۔۔۔ "یہ عزم سب کے دلوں میں اُتر جانا چاہیئے کہ ہمیں ہندوستان کو مہابھارت بنانا ہے جس کی سرحدیں دجلہ اور فرات تک ہوں گی۔

اُس منبع کو بند کرنا ہے جہاں سے اسلام اُٹھا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اپنا یہ مقصد حاصل نہ کیا تو عرب پر عیسائی چھا جائیں گے۔ مسلمان ریاستوں کے متعلق مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک دوسری کی دشمن ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے، کہ اُن میں یہ پھوٹ عیسائی ڈال رہے ہیں۔ وہ بے بہا دولت، شراب اور خوبصورت اور چالاک لڑکیوں کے ذریعے چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے جا رہے ہیں۔"

"ہم بھی یہ طریقہ اختیار کریں گے" ——— راجہ جے پال نے کہا۔ "لیکن ہمیں مسلمانوں پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم جنگی قوت ہیں۔ اس وقت ہماری اور آپ کی اِن فوجوں پر جو بچ کر آئی ہیں۔ یہ خوف سوار ہو گیا ہے کہ مسلمان اس قدر دلیر اور زبردست لوگ ہیں، کہ انہیں کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔ واپس آنے والے سپاہیوں نے لوگوں پر بھی یہی خوف طاری کر دیا ہے۔ ہمیں سلطان سبکتگین کو ایک شکست دے کر اپنی فوجوں اور اپنے لوگوں کے دلوں سے مسلمانوں کی دلیری کا خوف نکالنا ہے۔ اگر ہم غزنی پر قبضہ کر سکیں تو وہاں سے ہم عیسائیوں کے طریقے استعمال کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑا سکتے ہیں۔"

"ہماری لڑکیاں عیسائی اور یہودی لڑکیوں کی نسبت زیادہ ہوشیار اور ذہین ہیں" ——— ایک اور مہاراجہ نے کہا ——— "اپنے مذہب کو پھیلانے، اپنے ملک کو وسیع کرنے اور اپنے دشمن مذہب کو ختم کرنے کی خاطر ہم ہزاروں لڑکیاں قربان کر سکتے ہیں اور ہماری لڑکیاں جو اپنے خاوندوں کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو زندہ جلا دیا کرتی ہیں، وہ ایسی قربانی بڑے شوق سے دیں گی جس میں اِن کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مسلمان کو ختم کرنے کے لیے ہم ایک لڑکی کی عزت قربان کر سکتے ہیں۔"

"میں ایک لڑکی کی قربانی دے رہا ہوں" ——— راجہ جے پال نے کہا۔

باقی دن مہاراجے فوجوں کی کمی پوری کرنے، سامان کی فراہمی، جانوروں کی خرید اور نئی فوج کی ٹریننگ کے منصوبے بناتے رہے۔ ان منصوبوں سے پتہ چلتا تھا

کہ اب کے غزنی پر جو حملہ ہوگا اسے سلطان سبکتگین کی فوج نہیں روک سکے گی صرف مہاراجے ہی مصروف نہیں تھے، مندروں میں پنڈت وغیرہ بھی لوگوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنے میں سرگرم تھے۔

اِدھر اسلام کی تباہی کے لیے متحدہ محاذ مضبوط ہو رہا تھا اُدھر سلطان سبکتگین کی سلطنت کے اِردگرد چھوٹے بڑے مسلمان حاکم اور حکمران سلطان کی تباہی کے پروگرام بنا رہے تھے۔ اگر تین لاکھ کا ہندو لشکر سلطان سبکتگین کو شکست دے دیتا تو ہندو ان چھوٹے بڑے تمام حکمرانوں کو کچل ڈالتے۔ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی ذریعۂ نجات نہیں تھا۔ اکیلے سبکتگین نے نہ صرف اپنی اور اپنے مسلمان پڑوسیوں کی سلطنتوں کو بچایا بلکہ اسلام کو بہت بڑے خطرے سے بچالیا۔ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کا بیٹا محمود اس کا دستِ راست تھا۔

سلطان سبکتگین نے ہندوستان میں اپنے جاسوس بھیج رکھے تھے جو اُسے یہاں کی افواج کی نقل وحرکت اور یہاں کے راجوں مہاراجوں کے عزائم سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ راجہ جے پال ایک اور حملہ ضرور کرے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اتنی زیادہ فوج مرواکر اور اتنے زیادہ جانور ختم کرا کے راجہ جے پال اتنی جلدی حملہ نہیں کر سکے گا مگر اُس کی اپنی فوج کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا بھی بہت نقصان ہُوا تھا۔ اس کے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ نہیں تھا کہ راجہ جے پال کے اگلے حملے کے مقابلے کی تیاری کرے، کئی اور مسائل درپیش تھے جن میں سب سے بڑا یہ تھا کہ اس کے پڑوسی مسلمان حکمران اُس پر دانت پیس رہے تھے۔

اُس نے دو کارروائیاں کیں، ایک یہ کہ تمام پڑوسی حکمرانوں کی طرف ایلچی بھیجے اور انہیں کہا کہ وہ ہندوؤں کے خلاف متحد ہو جائیں لیکن کسی ایک نے بھی تسلّی بخش جواب نہ دیا۔ سلطان نے دوسری کارروائی یہ کی کہ آج کے پشاور کے شمال مغرب کے پہاڑی علاقے میں جتنے چھوٹے بڑے قلعے تھے، ان سب پر قبضہ کر لیا۔ یہ افغانیوں اور خلجیوں کے علاقے تھے۔ انہیں سلطان سبکتگین نے اپنی فوج سے بھی

مرعوب کیا اور صوفی اور عالم قسم کے وفد بھیج کر انہیں اسلام کے نام پر اپنا حامی بنایا۔ افغانیوں اور خلجیوں کی کوئی خاص فوجی طاقت نہیں تھی وہ سبکتگین کے اتحادی بن گئے اور اپنے علاقے کے لوگوں کو اُس کی فوج میں بھرتی کرا دیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ محمود غزنوی کی عمر تئیس برس ہو گئی۔ سلطان سبکتگین نے اُسے خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ بخارا کا بادشاہ ابوالمنصور مر گیا۔ اُس کے بیٹے نوح کو اُس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ فائق نام کے ایک حاکم نے نوح کے خلاف بغاوت کر دی۔ فوج نے سلطان سبکتگین سے مدد مانگی۔ سبکتگین خود اُسے ملنے گیا اور مدد دی۔

سلطان کی اپنی سلطنت کا یہ حال تھا کہ ایک امیر بوعلی حسن بن سنجار نے خراسان کے تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کر لیا اور امیر فائق کو پناہ دے دی۔ سلطان سبکتگین نے صلح سمجھوتے کے پیغام بھیجے لیکن ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سلطان کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے اِن مسلمان بھائیوں پر حملہ کرے۔ بوعلی حسن وغیرہ کو عیسائیوں نے درپردہ بہت جنگی مدد دے رکھی تھی۔ انہیں اس مدد پر بہت ناز تھا۔ سلطان سبکتگین اپنی فوج کے ساتھ بلخ پہنچا۔ نوح بھی فوج لے آیا اور سلطان سے جا ملا۔

فائق اور بوعلی حسن نے جرجان نام کی ایک مسلمان ریاست کے حکمران فخر الدولہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ فخر الدولہ کے پاس دارا نام کا ایک سپہ سالار تھا جس کی قیادت اور جنگی فہم و فراست کی دھوم دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ امرا اپنی افواج کے ساتھ ہرات کے مقام پر پہنچ گئے۔ سلطان سبکتگین بھی اپنی فوج کو ہرات کے ایک میدان میں لے گیا۔ جسے وہ لڑائی کے لیے موزوں سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ محمود تھا۔ اور بخارا کا حکمران نوح بھی تھا۔ جو اپنی فوج کے ساتھ سلطان کا اتحادی بن کر آیا تھا۔ نوح ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ اسی لیے امیر فائق نے بغاوت کر دی تھی۔ کہ یہ کمسن لڑکا گھبرا کر تخت سے دستبردار ہو جائے گا۔

اُس وقت کے عینی شاہدوں کی تحریروں سے وہ منظر صاف نظر آنے لگتا

ہے کہ اِدھر ہندوستان میں ہندو مہاراجے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر دُنیائے اسلام پر حملے کی تیاری کر رہے تھے، اُدھر دُنیائے اسلام کے ایک خطّے میں جہاں بُت شکن پیدا ہوئے تھے، مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسری کا خون بہانے کو تیار تھیں۔ کہتے ہیں، سلطان سبکتگین نے اپنے نوجوان بیٹے محمود کو اور بخارا کے حکمران کمسن نوح کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"یہ آنسو ابّا جان؟" — محمود غزنوی نے پوچھا۔

"اسلام کے اتحاد کی لاش پر آنسو نہ بہاؤں تو اور کیا کروں بیٹا!" — سلطان سبکتگین نے جواب دیا — "مسلمان متحد تھے، تو یورپ کے کفرستان میں بھی انہوں نے اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ آج اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ تو نہ یورپ میں اسلامی پرچم نظر آتا ہے، نہ ہندوستان میں۔ اسلامی ملکوں میں سے کئی ایک پر عیسائی قابض ہیں۔ وہ آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔ اِدھر ہندوؤں کے عزائم بھی یہی ہیں ...... تم دونوں کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے یہ خیال آ گیا تھا کہ ہم تو آپس میں لڑ جھگڑ کر کل پرسوں اس دُنیا سے اُٹھ جائیں گے، اپنے بچوں کے لیے ہم کیا ورثہ چھوڑ جائیں گے؟ ہم تمہیں اسلامی سلطنت کے ٹکڑے دے کر جا رہے ہیں، اقتدار کی ہوس، خانہ جنگی اور ایمان فروشی کی طرح ڈال کر جا رہے ہیں۔ ان ایمان فروش اقتدار پرستوں کی اولاد بھی سلطانی کی مسند کی خاطر اپنا ایمان اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گی ....

"مجھے کفرستان کے بُت توڑنے تھے تمہیں باطل شکن بننا تھا۔ مگر ہمارے اپنے بھائی جو ہمارے ہی کعبہ کے پجاری ہیں، بُت پرستوں کی شہ اور مدد سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کو بھلا بیٹھے ہیں۔ میرے بچو! ہماری قوم کا مستقبل تاریک ہے۔ تخت و تاج کی ہوس اور پوجا عالمِ اسلام کی وحدت کو ریزہ ریزہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ہر مسلم ریاست کے اندر بھی نفاق اور منافقت ہے۔ یہ لوگ جب متحد ہوتے ہیں تو ان کے اتحاد میں بھی منافقت ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوتے

ہیں۔ ہر ایک کے دل میں سلطانی کی مسند ہے۔ خلافت موجود ہے لیکن برائے نام"
سلطان سبکتگین بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا
اور کہا — "محمود اور نوح! دونوں فوجوں کو میرے سامنے لاؤ"

دونوں فوجیں اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے فوجوں کو ایک نظر دیکھا تو اُس نے اپنے آپ میں زلزلے کا سا جھٹکا محسوس کیا۔ اُس کا گھوڑا ذرا سی اونچی جگہ کھڑا تھا جہاں سے اُسے امیر فائق، بو علی حسن اور فخرالدولہ کی متحدہ فوج کا کیمپ نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کے سپاہیو!" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "یہاں سے مجھے تم جیسی، تمہارے ہی مذہب کی ایک فوج کے خیمے نظر آ رہے ہیں۔ اگر تم اور وہ کندھے سے کندھا ملا لو تو اسلام کی سلطنت کی سرحدیں ایک بار پھر وہاں تک جا سکتی ہیں جہاں تک طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم لے گئے تھے، مگر تمہارے اور اُس فوج کے درمیان دشمن حائل ہو گیا ہے۔ تم خدا اور رسولؐ کے نام لیوا ہو، وہ تخت و تاج کے پجاری ہیں۔ وہ اپنا دین اور اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے بُت پرست ہندو ہم پر دو بار حملہ کر چکے ہیں۔ تم نے بہت تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے اتنے بڑے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہندو ہمارے رسولؐ کے دشمن ہیں.....

"اور اب تم ان مسلمانوں کا بھی حشر کرو گے جو تمہارے رسولؐ کے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم اس فوج کا نعرۂ تکبیر سُن کر اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لو اور تلواریں نیاموں میں ڈال لو۔ اگر اس دھوکے میں آ گئے تو اس خطّے سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ شیطان کے ساتھی ہیں۔ اُن کے پرچم پر جو چاند اور ستارہ ہے، وہ بہت بڑا فریب ہے۔ اپنے دشمن کو مارنے سے پہلے اپنے اُس بھائی کو مارو جو بھائی ہونے کا دھوکہ دے کر دین کے دشمن کا ہاتھ مضبوط کرتا ہے....

"مَیں نے بہت کوشش کی ہے کہ یہ لوگ خلوص اور محبت کی زبان سمجھ سکیں مگر وہ

نہ سمجھے۔ میں اپنے بیٹوں کو قتل کر سکتا ہوں، اپنے مذہب کو کمزور ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اسلام کا سپاہی اپنی حکومت کرنے کے لیے نہیں لڑتا بلکہ اللہ کی حکومت کو مضبوط کرنے اور گمراہ انسانوں کو اس حکومت تلے لانے کے لیے جہاد کیا کرتا ہے۔ کیا تم قوم کی اُن بیٹیوں کو بھول سکتے ہو جو کفار کے قبضے میں آئے ہوئے علاقوں میں عصمت کے موتی لٹا بیٹھی ہیں؟ کیا تم برداشت کر لو گے کہ کوئی کافر تم میں سے کسی کی بیٹی کو ہوس کاری کے لیے استعمال کرے؟ یہ مسلمان حکمران جو تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوجیں لائے ہیں، اپنی بیٹیوں کی عزت و آبرو سے دستبردار ہو چکے ہیں وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے وقار کا کیا تحفظ کریں گے۔"

سلطان سبکتگین کی آواز میں جوش اور جذبات کا لرزہ پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے اثر سے اُس کی اور نوح کی فوج میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ سلطان کا ایک ایک لفظ عسکریوں کے دلوں میں اُترتا جا رہا تھا۔ جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر سلطان سبکتگین کو اس سے ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی۔

اُسی روز اُس نے اپنی فوج کو جنگ کی ترتیب میں کھڑا کر دیا۔ خود قلب میں رہا۔ اس نے محمود اور نوح کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔

مخالف کیمپ میں دارا تجربہ کار اور قابل جرنیل تھا۔ اُس نے سلطان سبکتگین کی فوج کو جنگی ترتیب میں تیاری کی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی متحدہ افواج کو جنگی ترتیب میں کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان سبکتگین کو حملہ کرنے کا موقع دیا تو وہ جیت جائے گا۔ وہ سلطان کی چالوں اور جنگی تجربے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان کو مہلت دی تو اُس کے شبخون مارنے والے جیش عقب اور پہلوؤں پر آ جائیں گے اور وہ فوج کو تھکا کر اور بکھیر کر ماریں گے۔ دارا نے نہایت اچھی چال چلی۔ اُس نے قلب پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے منتخب دستے دُور کے چکر سے آگے بڑھا کر سلطان کی فوج کے دونوں پہلوؤں پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ غیر متوقع اور شدید تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان سبکتگین کے لیے دارا کی یہ چال غیر متوقع تھی۔ اُسکے

پہلوؤں کے دستے بے خبری میں دبوچے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے قدم اکھڑنے لگے۔ دارا نے اپنی فوج کا خاصا بڑا حصّہ اپنے پاس اس مقصد کے لیے رکھا ہُوا تھا کہ جب سلطان کے پہلوؤں کے دستے اکھڑیں گے تو سلطان اپنے دائیں اور بائیں مدد دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس وقت دارا قلب پر حملہ کر دے گا۔

سلطان سبکتگین کے لیے بالکل یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ شکست صاف نظر آنے لگی۔ اُس نے پہلوؤں کو قائم رکھنے کے لیے اپنے ریزرو ٹروپس سے کمک بھیجی تو قلب کمزور ہو گیا۔ وہ دارا کی چال سمجھ گیا لیکن بے بس ہو گیا۔ اُس کے دونو پہلو کٹ رہے تھے۔ وہ سامنے کے حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے محمود اور نوح سے کہا ۔۔۔ "میرے بیٹو! آج ہمیں زندگی کا آخری معرکہ لڑنا ہے۔ میدان دشمن کے ہاتھ آ گیا ہے۔"

اُس دور کا مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ عین اُس وقت جب سلطان سبکتگین کو اپنی شکست سامنے نظر آ رہی تھی، ایک گھوڑا گرد اُڑاتا اور بہت تیز رفتار سے دوڑتا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ سوار دشمن کی صفوں سے آیا تھا۔ وہ گرد سے نکلا تو دیکھا کہ اُس کی تلوار نیام میں تھی۔ اور اُس نے اپنی ڈھال اپنی پیٹھ پر ڈال رکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لڑنے کے لیے نہیں دوستی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اُس کے پیچھے دشمن کی فوج کے بہت سے دستے تھے۔

وہ جب سلطان سبکتگین کے سامنے آیا تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دشمن کا کوئی عام ایلچی یا قاصد نہیں تھا، وہ دشمن کا قابل جرنیل دارا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے اپنی تلوار اور ڈھال سبکتگین کے آگے پھینک دی۔

"سلطان!" ۔۔۔ دارا نے کہا ۔۔۔ "میں اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔ میں اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔ میں اپنے محفوظہ کے دستے ساتھ لے آیا ہوں۔ میں جن کا سپہ سالار ہوں وہ بادشاہی کے لالچی ہیں۔ میں نے ساری عمر کے جہاد کا جو ثواب کمایا تھا، وہ میں ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے خدا کے حضور سرخرو ہونے کا موقع دیں۔"

اُس نے اُن دستوں کو جو اُس کے ساتھ آئے تھے حکم دیا کہ پیچھے مڑیں اور امیر فائق وغیرہ کی فوج پر حملہ کر دیں۔ اُس نے اس حملے کی قیادت خود کی۔ سلطان سبکتگین نے اپنے تمام ریزرو ٹروپس (محفوظہ) کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلوؤں کو کمک دے دی۔ ایک کی قیادت محمود کے پاس تھی۔ نوح کو سلطان نے اپنے ساتھ رکھا کیونکہ وہ کمسن اور ناتجربہ کار تھا۔

گناہگار کے حوصلے جلدی پست ہو جایا کرتے ہیں۔ فائق اور بوعلی حسن اپنی فوجوں کو سلطان اور دارا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اُن کی کچھ فوج بھی بھاگ کر اُن کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ انہوں نے جرجان جا دم لیا، جہاں کے حکمران فخرالدولہ نے انہیں پناہ دی۔ سپہ سالار دارا کے سینے میں ایمان کا شعلہ کچھ ایسا بھڑکا تھا کہ وہ جرجان تک ان غداروں کا تعاقب کرنے پر زور دے رہا تھا لیکن سلطان سبکتگین نے اُسے یہ کہا کہ وہ خانہ جنگی کو طول نہیں دینا چاہتا، اس کی بجائے وہ انہیں دوستی اور اتحاد کا پیغام دینا چاہتا تھا۔ محمود غزنوی دارا کا ہم نوا تھا۔ اس کا نوجوان خون اُسے انتقام لیے بغیر چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

سلطان سبکتگین نے اپنی فوجوں کو سمیٹا اور غزنی کو کوچ کر گیا۔ محمود غزنوی تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور چلا گیا۔ گورنر کی حیثیت سے اُسے وہیں رہنا تھا۔ نوح اپنے ملک بخارا کو روانہ ہو گیا۔ دارا سلطان کے ساتھ تھا۔

محمود غزنوی نیشاپور پہنچا ہی تھا کہ فوجی قاصد گھبراہٹ کے عالم میں دوڑے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ فخرالدولہ نے انہیں تازہ دم فوج دے دی تھی۔ وہ سلطان سبکتگین کی فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ سلطان سبکتگین اور دارا فوج کا زیادہ تر حصہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور محمود تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور میں اکیلا رہ گیا ہے، تو انہوں نے نیشاپور پر حملہ کر دیا۔

محمود غزنوی نے انہی قاصدوں کو سلطان سبکتگین کے پیچھے دوڑا دیا اور خود فوج

کی کمان لے کر مقابلے کے لیے بڑھا مگر دشمن میدان پر چھا چکا تھا۔ محمود کی پوزیشن اتنی کمزور تھی کہ وہ گھیرے میں آ گیا۔ اس کی فوج بہت تھوڑی بھی تھی اور ہرات کی لڑائی کے فوراً بعد بڑی لمبی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ محمود اسے بروقت لڑائی کی ترتیب اور تنظیم میں لا ہی نہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود کو پسپا ہونا پڑا۔ وہاں تو پسپائی بھی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ انجام یہی نظر آ رہا تھا کہ محمود پکڑا جائے گا اور اس کی فوج بھی جنگی قیدی ہو جائے گی یا ماری جائے گی۔

دونو قاصدوں کے گھوڑے غزنی کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ محمود غزنوی کی قسمت خدا کے بعد ان قاصدوں کے ہاتھ تھی۔ سفر لمبا تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ دوسرے دن جب بوعلی حسن اور امیر فائق نے اپنے عقب میں گرد کے بادل اُٹھتے دیکھے تو وہ بہت خوش ہوئے کہ فخرالدولہ نے کمک بھیجی ہے اور اب وہ نیشاپور کو ترنوالے کی طرح نگل جائیں گے مگر گرد سے جو فوج نکلی وہ سلطان سبکتگین کی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان اتنی جلدی آ جائے گا۔ سلطان کے ساتھ دارا تھا۔ دونو نے بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کو گھیرے میں لینے کے لیے اپنی فوج پہلوؤں پر پھیلا دی۔ دونو باغیوں نے دیکھا کہ پسپائی کے راستے بند ہو چکے ہیں تو انہوں نے اپنی فوج کو سمیٹ کر سلطان سبکتگین کی فوج کے وسط میں آمنے سامنے کا معرکہ کر دیا۔

محمود غزنوی جو پسپائی کی حالت میں تھا، پیچھے مڑا۔ مشہور مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے ـــــ "محمود نے سخت غصے میں آئے ہوئے شیر کی طرح غداروں کی فوج پر ہلہ بول دیا۔ اُس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کچلی گئی مگر ان دونو غداروں کا کوئی پتہ نہ چلا کہ کدھر نکل گئے ہیں" ـــــ فتح مکمل تھی۔ سانپ کا سر کچل دیا گیا تھا۔

ادھر لاہور میں ہندو راجے مہاراجے غزنی، بلخ، بخارا اور خراسان وغیرہ پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے متحدہ فوج تیار کرنے میں دن رات مصروف تھے۔ ان تیاریوں میں پوری ہندو قوم شامل تھی۔ مرد اور عورتیں محنت و مشقت کر کے سرکاری

خزانہ بھرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ راجوں مہاراجوں نے اپنے اختلافات اور عداوتیں ختم کر ڈالی تھیں۔ مندروں میں لوگوں کے دماغوں میں یہ جنون پیدا کیا جا رہا تھا کہ ہندومت کو اسلام سے محفوظ کرنے کے لیے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنا مذہبی فریضہ ہے۔

ادھر اسلامی ملکوں میں دو اسلامی فوجیں ایک دوسری کا خون بہا رہی تھیں۔ اقتدار پرست اپنی ہوس کی خاطر اسلام کی عسکری قوت تباہ کر رہے تھے۔ اور قوم کے بیٹے کٹ رہے تھے۔

پشاور، لاہور اور بھٹنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس تھے۔ وہ غزنی کو صحیح اور بروقت اطلاعیں بھیجنے کے لیے موت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ان کے جذبۂ ایثار، شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہروں کو خدا کے سوا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ گمنام جانباز تھے جنہوں نے اپنے اُوپر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اپنے نام بھی بدل ڈالے تھے مگر ان کے ملک کے دو چار ایمان فروش ان کے جہاد پر مٹی ڈال رہے تھے۔

سلطان سبکتگین ذراستانے کے لیے اور فوج کو آرام دینے اور نئی بھرتی کے لیے بلخ چلا گیا اور وہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ جس بیماری کو وہ دبا تا رہا اور معمولی سمجھتا رہا ہے، وہ جان لیوا روگ ہے۔ جنگ وجدل نے اُسے اپنی صحت کی طرف دھیان دینے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ طبیبوں نے اس کا علاج شروع کیا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا ارادہ کیا اور روانہ ہو گیا مگر وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ تورسوزہ (بلخ سے تھوڑی ہی دُور) سے آگے جانے کے قابل نہ رہا۔ وہیں رک گیا۔

"ترجمہ یمینی" میں لکھا ہے کہ ایک روز نقاہت کی انتہا کے عالم میں سلطان نے شیخ ابوالفتح سے جو اُس نے پاس بیٹھا تھا، کہا ــــــ "ہم بیماری سے صحت یاب ہونے کے لیے ہر جتن کرتے ہیں۔ صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ریوڑ سمجھتے ہیں کہ موت نہیں آئے گی۔ مجھے بھیڑ کا خیال آتا ہے۔ اسے قصاب خرید کر لے جاتا ہے۔ کبھی کسی ریوڑ

ہیں اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی اکیلے کہیں باندھ دیتا ہے۔ بھیڑ زندہ رہنے کی آس لگائے رکھتی ہے مگر ایک روز قصاب اُس کی گردن پر چھری پھیر دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم کئی بار بستر علالت پر لیٹتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک روز موت اچانک ہماری گردن دبوچ لیتی ہے، اور ہمیں کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

اس سے چالیس روز بعد سلطان سبکتگین نے صرف یہ کہ کر کہ محمود سے کہنا تجھے بُت شکن بننا ہے، جان اللہ کے حوالے کر دی۔ یہ اگست ۹۹۷ عیسوی (شعبان ۳۸۷ھ) کا مہینہ تھا۔ اُس وقت سلطان کی عمر ۵۶ سال تھی ــــ خانہ بدوشوں کا بیٹا جو غلاموں کی منڈی میں فروخت ہوا تھا، تاریخ اسلام میں کبھی نہ مٹنے والا نام پیدا کر کے اور اپنے پیچھے تاریخ میں بُت شکن کہلانے والا بیٹا چھوڑ کر اللہ کے حضور چلا گیا۔

محمود غزنوی اپنے باپ کی وفات کی اطلاع پر پہنچا۔ اُس نے باپ کی میّت اٹھوائی اور اسے غزنی لے گیا۔ تجہیز و تکفین کے فوراً بعد اُس نے سلطنت کو سنبھال لیا۔ اُس وقت اُس کی عمر چھبیس سال تھی۔

دو مائیں

سُلطان سبکتگین کی تجہیز وتکفین کے بعد محمود غزنوی نیشاپور چلا گیا۔ چونکہ وہ مردِ میدان تھا، اِس لیے اُس نے سب سے پہلے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ اُس نے غزنی جا کر سلطنت کے کاروبار کو دیکھنا ملتوی کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ حکومت کی مشینری چل رہی ہے، اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اُسے اطلاع مل جائے گی۔ اُس کے دماغ میں سلطانی کا خبط ہوتا تو وہ سب سے پہلے غزنی جاتا اور باپ کی مسندِ سلطانی پر جا بیٹھتا۔

محمود غزنوی علماء، صوفیاء اور اولیاء کا شیدائی تھا۔ ان میں ابوالحسن غرقانی وہ ولی تھے جن کا وہ مرید تھا۔ ایک اور بزرگ ابوسعید عبدالملک صوفیائیں سے تھے جن کا محمود غزنوی معتقد تھا۔ غرقانی کہیں دور رہتے تھے۔ محمود کبھی کبھی اُن کے ہاں سلام اور پند و نصیحت کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور ابوسعید کبھی کبھی اس کے ہاں آجایا کرتے تھے۔ بیہقی لکھتا ہے کہ محمود غزنوی اُن کے استقبال کے لیے دربار سے اٹھ کر باہر جا کھڑا ہوتا تھا۔

محمود غزنوی کے ذہن پر راجہ جے پال اور اُس کے بُت سوار تھے۔ اُس کی توجہ فوجی امور پر مرکوز تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی سلطنت کو خوشامدیوں کی دیمک لگ چکی ہے اور خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ محمود غزنوی کو یہ اطلاع اُس کی انٹیلی جنس کے ایک آدمی نے دی جو غزنی سے یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سلطنت کی گدّی پر اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بیٹھ چکا ہے۔ اور اس نے

اپنی سلطانی کا فرمان بھی جاری کر دیا ہے۔

اسماعیل سلطان سبکتگین کی دوسری بیوی سے تھا۔ سبکتگین کی وفات کے وقت یہ بیوی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے نزع کے عالم میں سبکتگین سے اس وصیت پر دستخط کروالیے تھے کہ اسماعیل اس کی سلطنت کا جانشین ہوگا۔ متعصب غیر مسلم مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے محمود کو اس لیے جانشین نہیں بنایا تھا کہ وہ اُس ماں کے بطن سے تھا جو غلاموں کی نسل سے تھی اور اسماعیل کی ماں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس دور کے وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق یہی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ سبکتگین کے آخری لمحات اس قدر شدید تکلیف میں گزرے کہ اُس نے نیم غشی کی کیفیت میں اسماعیل کو جانشین مقرر کر دیا۔ اس داستان کی پچھلی اقساط میں تفصیل سے سنایا جاچکا ہے کہ محمود غزنوی کی ماں کون تھی اور کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ اسماعیل نوجوان اور کھلنڈرہ تھا۔ اُسے محمود کے مقابلے میں کوئی عسکری تجربہ نہیں تھا۔ جنگوں میں سبکتگین کے ساتھ محمود رہتا تھا۔ سبکتگین نے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کیا ہی نہیں ہوگا۔ اگر کیا ہی تھا تو اُس کے عالم نزع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسماعیل کی ماں نے اپنے بیٹے کو سلطان بنوالیا ہوگا۔

دونوں بھائیوں میں اتنا فرق تھا کہ جب محمود اپنے باپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر نیشاپور چلا گیا اور راجہ جے پال کا حملہ روکنے یا ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا، اُس وقت اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بلخ میں اپنی رسم تاجپوشی میں مگن ہو گیا۔

"سلطانِ عالی مقام!"۔۔۔ غزنی سے آئے ہوئے آدمی نے محمود غزنوی سے کہا۔۔۔ "اب ہندوستان کے کسی راجہ کو ہماری سلطنت پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے دشمن ہماری سلطنت کی تباہی چاہتے ہیں۔ آپ نے اور آپ کے والدِ مرحوم نے انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ وہ جب بھی آئے، اپنے خون میں ڈوب گئے۔ مگر سلطان سبکتگین مرحوم سلطنت کی تباہی کا انتظام اپنے ہاتھوں کر گئے ہیں"۔

"فوراً وہ خبر سناؤ جو غزنی سے لائے ہو"۔۔۔ محمود نے کہا۔

"میں نے آپ کو سلطان کہا ہے کیونکہ آپ مرحوم سلطان کے بیٹے ہیں"۔۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔۔۔"مگر سلطان آپ نہیں، آپ کے برادرِ خورد اسماعیل ہیں۔ میں آپ کا خادم اور ملازم ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ سلطنت کی گدی پر کون بیٹھا ہے۔ میں ایک وفادار اور نمک حلال ملازم کی حیثیت سے یہ بتانے آیا ہوں کہ جس دربار میں سالار اور دیگر عسکری کماندار احکام اور ہدایات لینے آیا کرتے تھے، وہاں اب خوشامدیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ آپ کے بھائی کے مشیر کون ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہیں، انہوں نے آپ کے بھائی کو چرب زبانی اور چاپلوسی کی زنجیروں میں گرفتار کر لیا ہے۔ نہایت معمولی حیثیت کے لوگوں کو اعلیٰ رتبے اور درجے دے دیئے گئے ہیں۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے آپ کے اور آپ کے والدِ مرحوم کے وفاداروں نے بتایا ہے کہ خزانہ تیزی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔"

محمود غزنوی کو جیسے چکر آ گیا ہو۔ اُس نے آدمی کو اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا کہ وہ وہاں کی مزید اطلاعات فراہم کرے۔ وہ خود اپنی ماں کے پاس گیا جو اُس کے ساتھ رہتی تھی۔

"مجھے خود وہاں جانا چاہیئے"۔۔۔ محمود غزنوی نے اپنی ماں سے کہا۔۔۔"مجھے وہاں سے آنا ہی نہیں چاہیئے تھا مگر میرے دل میں سلطانی کی خواہش نہیں تھی۔ میرے فرض کے تقاضے کچھ اور ہیں۔"

"تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیئے"۔۔۔ ماں نے اُسے کہا۔۔۔"تمہارا بھائی تمہیں قتل کرا سکتا ہے۔ تخت و تاج کا نشہ انسان کو وحشی اور درندہ بنا دیتا ہے۔۔۔ اور یہ بھی سوچ لو کہ وہ اپنے باپ کا جانشین بننے کے قابل ہے تو اُسے سلطان بنا رہنے دو اور فوج کی کمان تم اپنے ہاتھ میں رکھو۔"

"اگر وہ اس قابل ہوتا تو میں اتنا پریشان کیوں ہوتا"۔۔۔ محمود نے کہا۔۔۔"کیا آپ اُسے جانتی نہیں کہ وہ کس قماش کا لڑکا ہے؟ مجھے میرے پیرومرشد نے بتایا ہے کہ نااہل اور خود غرض حکمران کے گناہوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ میں سلطان نہیں بننا چاہتا۔ مجھے سلطنت کو بچانا ہے۔ اسے ایک مضبوط قلعہ بنا کر مجھے اسلام

کی شمع ہندوستان کے بت خانے تک پہنچائی ہے.... اگر میرا بھائی مخلص ہوتا تو وہ مجھے اپنی تاجپوشی پر بلاتا۔ اُس نے مجھے اطلاع تک نہ دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نیّت صاف نہیں۔ مجھے وہاں جانا چاہیئے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ان دنوں اسماعیل غزنی میں نہیں بلخ میں ہے۔"

"تم اسے پیغام لکھ کر بھیج دو" — ماں نے کہا — "اُس سے پوچھو کہ مجھے جو خبریں ملی ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ اُس کے جواب کا انتظار کرو۔"

اسماعیل اُس وقت بلخ میں ہی تھا جب قاصد نے اُسے محمود کا پیغام دیا۔ اسماعیل نے کاغذ کھولے بغیر اپنے ایک حاکم کی طرف پھینک کر کہا — "پڑھ کر سناؤ، میرے بھائی نے کیا لکھا ہے۔"

اس حاکم نے کاغذ سیدھے کیے اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا — "عزیز بھائی!"

اسماعیل نے غصّے سے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا — "اُس نے ہمیں بھائی لکھا ہے؟ سلطان نہیں لکھا؟"

"نہیں ظلِ الٰہی!" — حاکم نے جواب دیا۔

"یہ بدصورت مسخرا اس قدر گستاخ ہے؟"

"اسے اس کی سزا ملنی چاہیئے سلطان عالی مقام!" — ایک درباری نے کہا — "اگر باپ گستاخی کرے تو اُسے بھی سزا ملنی چاہیئے۔ خدا اور رسول ﷺ کے بعد درجہ سلطان کا ہوتا ہے۔ ظلِ الٰہی کی سواری جس راہ سے گذرتی ہے، اس راہ پر رعایا سجدے کرتی ہے۔ آپ کے دشمن آپ کا نام سن کر کانپتے ہیں۔"

"آگے پڑھو" — اسماعیل نے حکم دیا۔

"محمود نے لکھا ہے" — حاکم پیغام پڑھنے لگا — "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم سلطنت کی مسند پر بیٹھ گئے ہو۔ اللہ تمہیں یہ اعزاز مبارک کرے مگر اس سلطنت پر جو خطرے منڈلا رہے ہیں اور اس مسند کے ساتھ جو فرائض اور

ذمہ داریاں وابستہ ہیں، شاید تم اِن سے واقف نہیں ہو۔ اگر واقف ہوتے تو اس مسند کو پھولوں کی سیج سمجھ کر آرام سے بیٹھ نہ جاتے۔ سب سے پہلے میرے پاس آتے یا مجھے اپنے پاس بلاتے۔ اگر تم مجھے اس قابل سمجھتے تو مجھے اپنے باپ کا بیٹا سمجھ کر ہی اپنی تاجپوشی میں شریک کر لیتے۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ تمہاری نیّت ٹھیک نہیں یا درباری چاپلوسوں نے تمہاری ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہاری نیّت ٹھیک نہیں رہنے دی۔ تم جانتے ہو کہ سلطنت کے اندر بھی دشمن موجود ہیں۔ تمہارے سامنے ان کے ساتھ لڑائیاں لڑی گئی ہیں ہندوستان کے بُت پرست ہم پر دو حملے کر چکے ہیں، اور تیسرے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس وقت ہماری ضرورت یہ نہیں کہ دربار لگا کر درباریوں کے سلام اور قصیدے وصول کیے جائیں۔ اس وقت ہمیں خیموں میں ہونا چاہئے ....

"اگر تم یہ بہتر سمجھتے ہو کہ تم سلطنت کا کاروبار سنبھال سکتے ہو تو میں جنگی امور سنبھال لیتا ہوں۔ اس وقت جنگی امور کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مَیں صرف اس صورت میں تمہیں سلطانی سونپ سکتا ہوں کہ تم اچھے اور بُرے میں، دوست اور دشمن میں، نیک اور بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاؤ مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو۔ تم نے نااہل لوگوں کو رُتبے دے دیئے ہیں۔ ان میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ وہ خوشامدی اور چرب زبان ہیں۔ تم نے فوج کی تنخواہ بڑھا کر خزانے پر بے جا بوجھ ڈال دیا ہے۔ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تم ایک اسلامی سلطنت کے سلطان ہو اور تمہارے اوپر ایک خلیفہ بھی ہے ....

"میری ایک تجویز مان لو تاکہ مَیں وہ فرض ادا کر سکوں جو مرحوم باپ ادھورا چھوڑ گیا ہے"

"اگر آپ حکمرانی کے قابل نہیں تو اور کون ہے؟" ـــــ ایک اور نے کہا۔

وہاں جتنے درباری موجود تھے، انہوں نے محمود غزنوی کے پیغام کے خلاف باتیں کیں۔ اِن سب کو اسماعیل نے رُتبے دیئے تھے۔ محمود نے انہی لوگوں سے اسماعیل کو خبردار کیا تھا۔ اسماعیل نے اپنے بڑے بھائی کو اتنی سی بھی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کا پیغام تنہائی میں پڑھتا۔ درباری عہدیداروں نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ اسماعیل اِس میں اُڑنے لگا۔

"آپ کے بڑے بھائی نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے کہ آپ نے فوج کی تنخواہیں بڑھا دی ہیں" ـــ وزیر نے کہا ـــ "سلطانِ عالی مقام! آپ کی اس کرم نوازی سے ساری فوج آپکی مرید ہوگئی ہے۔ آپ کے اشارے پر فوج کٹ مرے گی.... اور پیغام میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ سلطنت کے اندر بھی ہمارے دشمن موجود ہیں اور ہندوستان کے بت پرست بھی دشمن ہیں.... ظلِّ الٰہی! جان بخشی کی التجا کرتا ہوں۔ سلطنت کے اندر ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ آپ کے والدِ ماجد جن کے خلاف لڑے تھے، انہیں دشمن بنایا گیا تھا اور اس میں آپ کے بڑے بھائی محمود کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ ہندوستان کے بُت پرستوں کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ ہم اُن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ ہمیں جنگ وجدل سے کیا؟"

وزیر کی تائید میں کئی ایک آوازیں سنائی دیں۔ صرف ایک بوڑھا تھا جو خاموش بیٹھا کبھی اسماعیل کو اور کبھی ان لوگوں کو دیکھتا تھا۔ جب وزیر نے کہا کہ ہمیں جنگ وجدل سے کیا، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خزانے کا مہتمِم اعلیٰ فرّخ زاد ابراہیم تھا۔

"جو اپنی عزّت، اپنا وقار اور اپنا ایمان بیچ ڈالیں، انہیں جنگ وجدل سے کیا" ـــ بوڑھے نے غصّے اور جذبات کی شدّت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "اسماعیل ابنِ سبکتگین! تو میرے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے سامنے پل کر جوان ہوا مگر تو تو بچّہ ہے اور اِن ایمان فروشوں کے ہاتھوں کھیل رہا ہے۔ یہ تجھے اپنا کٹھ پتلی بنا چکے

ہیں۔ یہ دنیا کے لالچ سے اندھے ہو گئے ہیں، اور تجھے بھی اندھا کر رہے ہیں۔ تُو نے اپنے آپ کو اس سلطنت پر ٹھونسا ہے۔ تجھے نہ قوم نے سلطانی دی ہے نہ خدا نے۔ اگر تجھ میں عقل ہے، تو اسے استعمال کر اور گریبان میں منہ ڈال کر سوچ کہ تُو اِس مسند کے قابل ہے؟ ... تیرے بھائی نے ٹھیک لکھا ہے کہ تُو نے اِن لوگوں میں صرف یہ خوبی دیکھی ہے کہ یہ خوشامدی ہیں۔ یہ تجھے تباہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ یہ اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ انہوں نے خزانہ خالی کر دیا ہے۔ یہ تجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ ہندوستان کے بُت پرستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ اِن کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی سے جنگ و جدل نہ ہو، اور ایمان فروش من مانی اور عیش و عشرت کرتے رہیں۔"

"سلطانِ عالی مقام!" ـــ وزیر نے کہا ـــ "یہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اسے وظیفہ دے کر گھر بھیج دیں۔ جہاں جاتا ہے ایسی ہی واہی تباہی بکتا رہتا ہے۔"

"لے جاؤ اسے" ـــ اسماعیل نے حکم دیا۔

درباری اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ اُس کی آواز سنائی دیتی رہی ـــ "جہاں بھائی سلطنت کی خاطر ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں وہاں سے رحمت کے فرشتے اُٹھ جاتے ہیں...... فتح بیرح کی ہوتی ہے۔"

محمود غزنوی نیشاپور میں اپنے پیغام کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ جب قاصد پیغام کا جواب لے کر آیا تو محمود کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ اسماعیل کا جواب مختصر تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اسے باپ سلطنت کا جانشین بنا گیا ہے، اور وہ کسی کے حق میں دستبردار نہیں ہو گا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اُس نے محمود کی یہ گستاخی معاف کر دی ہے۔ آئندہ وہ ایسا پیغام بھیجنے کی جرأت نہ کرے۔

محمود غزنوی نے ماں، اپنے ماموں بوغراز اور اپنے چھوٹے بھائی نصیرالدین یوسف کو بلایا اور یہ صورتِ حال اُن کے سامنے رکھ کر کہا ـــ "آپ سب اسماعیل کو جانتے ہیں۔ اس نے میرے پیغام کا جو تحریری جواب بھیجا ہے، یہ اُس کے اپنے الفاظ نہیں۔

اُس میں اتنی عقل نہیں۔ مجھے قاصد نے بتایا ہے کہ بلخ میں درباریوں نے میرے پیغام کا کس طرح مذاق اڑایا ہے، اور اسماعیل اُن کے جال میں آچکا ہے۔ ان لوگوں نے فرّخ زاد ابراہیم جیسے بزرگ کو جس کا احترام ہمارے والدِ بزرگوار بھی کرتے تھے، ہیچ کی پاداش میں گھسیٹ کر باہر نکال دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطنتِ غزنی سے دین و ایمان اُٹھ گیا ہے۔ مَیں کسی درباری مشیر سے مشورہ نہیں لیا کرتا میرے مشیر آپ ہیں۔ ہم سب کی رگوں میں ایک ہی خون ہے اور ہم سب کا نظریہ ایک ہے۔ مجھے شک ہونے لگا ہے کہ میرے بھائی اسماعیل کے خون میں ملاوٹ ہے"۔

"وہ میری کوکھ سے پیدا ہُوا ہوتا تو ہوس کار بندوں کی بجائے براہِ راست خدا سے مشورہ لیتا"۔۔۔ محمود کی ماں نے کہا۔۔۔ "وہ ہے تو تیرے ہی باپ کا بیٹا لیکن اس کی ماں نے اس کے دل میں سلطنت کی ہوس ڈال دی ہے .... اور محمود! مَیں تجھے دودھ کی دھاریں اُس روز بخشونگی جس روز تو ہندوؤں کے حملوں کا انتقام ہندوستان پر حملہ کر کے لے گا اور جس روز ہندوستان کے بُت ریزہ ریزہ ہو چکے ہونگے"۔

"مگر فوج کا سب بڑا حصّہ اسماعیل کے قبضے میں ہے"۔۔۔ محمود نے کہا۔۔۔ "اُس نے فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے فوج کو اپنا وفادار بنا لیا ہے۔ اُس کا جواب آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اُس نے صلح اور سمجھوتے کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ مَیں، جتنی بھی فوج میرے پاس ہے، اس سے بلخ پر حملہ کر دوں"؟

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔۔۔ اس کے ماموں بوعزاز نے کہا۔۔۔ "لیکن خطرہ ہے۔ تمہارے پاس فوج تھوڑی ہے۔ پہلے یہ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ بلخ اور غزنی کی فوج کس حد تک اسماعیل کی وفادار ہے"؟

"میرے پاس وقت نہیں"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔۔۔ "ہندوستان سے جو اطلاعیں آرہی ہیں، وہ تشویشناک ہیں۔ وہاں صرف فوج نہیں بلکہ پُوری ہندو قوم حملے کی تیاری کر رہی ہے۔ مندروں میں پنڈت بھی غزنی پر حملے کے سوا کوئی بات نہیں کرتے میرے پاس باتوں کے تیر چلانے کا وقت نہیں"۔۔۔ اُس نے آہ لی اور بولا۔۔۔ "مجھے اس وقت

ہندوستان میں ہونا چاہیئے تھا مگر یہ اسلام کی بد نصیبی ہے کہ ہمارا باپ اپنے ایمان فروش بھائیوں کے خلاف لڑتا رہا اور اپنی سرحد سے نکل نہ سکا، اور مجھے بھی خانہ جنگی میں الجھایا جا رہا ہے۔

"بیٹا!" ـــ ماں نے کہا ـــ "شکست ہوس کار کی ہوگی۔"

"اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ اسماعیل سلطنت کو تباہ کر رہا ہے" ـــ محمود کے ماموں نے کہا ـــ "ہمیں سلطنت کو بچانا ہے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ فوج کو استعمال کیا جائے۔"

اُس وقت اسماعیل بلخ میں ہی تھا جب اُسے اطلاع ملی کہ نیشاپور سے اپنی فوج محمود کی کمان میں غزنی کی طرف پیشقدمی کر رہی ہے۔ نیشاپور غزنی کے شمال اور مغرب میں واقع ہے اور بلخ نیشاپور کی نسبت غزنی کے قریب ہے۔ اسماعیل کو اس وقت اطلاع ملی جب محمود کی فوج آدھا راستہ طے کر چکی تھی۔ اسماعیل نے اپنے سالاروں، مشیروں اور وزیروں کو بلا کر کہا کہ اس کے بھائی محمود نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ غزنی پر قبضہ کرنے آ رہا ہے۔

"اسے میرے خلاف یہ شکایت ہے کہ میں نے فوج کی تنخواہ بڑھا دی ہے" ـــ اسماعیل نے سالاروں سے کہا ـــ "وہ غزنی کی فوج کو غلاموں کی فوج بنانا چاہتا ہے۔ تمام فوج کو بتادو کہ محمود کی نیت کیا ہے، اور فوج کو تیاری کا حکم دو۔"

اسماعیل کے مشیروں نے اسی مقصد کے لیے اسماعیل کو فوج کی تنخواہیں بڑھانے کا مشورہ دیا تھا کہ فوج دشمن کے خلاف لڑنے کی بجائے سلطان اسماعیل کے مخالفین کو کچلنے کے کام آئے۔ وزیر اور دیگر مفاد پرست اُمرا اور حاکموں نے فوج کو مزید مراعات دلا کر پروپیگنڈا کرایا کہ محمود فوج کو اپنی کمان میں لے کر ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اس حملے کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کے خزانوں اور زر و جواہرات سے اپنا خزانہ بھر لے۔

اسماعیل کی فوج غزنی سے کچھ دُور اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں محمود غزنوی

کی فوج نے آخری پڑاؤ کر رکھا تھا۔ اسماعیل نے اس کے قریب اپنی فوج کو خیمہ زن کر دیا۔ محمود کی دشواری یہ تھی کہ اُس کے پاس فوج بہت کم تھی۔ ایک تو یہ کمی اس کی کمزوری تھی، دوسرے اس کی نیّت یہ تھی کہ آپس کے خون خرابے سے گریز کیا جائے۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ اسماعیل کے پاس بھیجا کہ لڑائی کی بجائے صلح سمجھوتے کے لیے دونوں کی ملاقات ہونی چاہیئے۔ خانہ جنگی سے فائدہ دشمن کو پہنچے گا۔ محمود نے پیغام میں یہ بھی لکھا کہ ہندوستان کی فوج نے ہماری آپس کی لڑائی کے دوران حملہ کر دیا تو وہ سلطنت ہی نہیں رہے گی جس کی خاطر ہم دو بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔

"مَیں اُسے نہیں ملوں گا"۔۔۔ اسماعیل نے محمود کے ایلچی سے کہا ۔۔۔"وہ باغی ہے۔ مَیں اسے گرفتار کر کے ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ میری سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو گی"۔

"اُنہوں نے نیک نیتی سے ملاقات کا اظہار کیا ہے"۔ ایلچی نے کہا۔۔۔ "اور مجھے اختیار دیا ہے کہ میں آپ کو ملاقات کے لیے آمادہ کروں۔ مَیں قاصد نہیں ایلچی ہوں۔ ہم نے پہلی خانہ جنگی میں کیا حاصل کیا ہے؟ اب دیکھ لیں۔ خانہ جنگی ہماری روایت بن گئی ہے۔ آج ایک باپ کے دو بیٹے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تانے کھڑے ہیں۔"

"مَیں محمود کی نیّت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں"۔۔۔ اسماعیل نے کہا۔۔۔"وہ صلح اور سمجھوتے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اُس کے پاس فوج بہت تھوڑی ہے اور اُسے اپنی شکست اور اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ مَیں اس کی فوج کو کچل ڈالوں گا اور محمود میرا قیدی ہو گا.... جاؤ اُسے کہہ دو کہ میری اور تمہاری فوجوں کی ملاقات ہو گی"۔

ایلچی جب واپس جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا تو اُس نے کہا۔۔۔ "ہوس اور غرور نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں سے ہتھیار ڈلوائے ہیں"۔۔۔ اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

محمود غزنوی نے اپنے باپ کی طرح دو رکعت نفل پڑھے اور خدا کے حضور

گڑگڑایا ــــ "خدائے بزرگ و برتر! اگر میرا فیصلہ غلط ہے تو مجھے ابھی اس دنیا سے اٹھا لے۔ اگر تیرے حضور نیت پرکھی جاتی ہے تو میری نیت دیکھ۔ مجھے دنیا کے جاہ و جلال کی خواہش نہیں۔ میرے دل میں سلطانی کی ہوس نہیں۔ میں تیرے نام کو ہندوستان کے بُت خانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہاں اسلام کی شمع جو محمد بن قاسم نے جلائی تھی وہ بجھ رہی ہے۔ میں اس شمع کو اپنے لہو سے روشن کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بھائی میرے راستے کی چٹانیں بن گئے ہیں۔ مجھے ہمت عطا فرما کہ ان چٹانوں کو روند کر اپنی منزل کی طرف نکل جاؤں۔"

اُس نے سالاروں، کمانداروں اور عہدیداروں کو بلا کر کہا ــــ "آج دو بھائی دشمن بن کر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں۔ ہر ایک سپاہی کے ذہن میں ڈال دو کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں، قوم کے غداروں کے خلاف لڑنے آئے ہو۔ تمہارے چچا، تایا، ماموں یا اُن کے بیٹے اس فوج میں ہوں گے جس کے خلاف تم لڑو گے۔ انہیں بتاؤ کہ بدر کے میدان میں خون کے رشتے ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے اور یہ لڑائی ہمارے رسولِ مقبول صلعم نے لڑائی تھی۔ آپ حق پر تھے، اس لیے تین سو تیرہ نے ایک ہزار کو شکست دی تھی۔ تم بھی حق پر ہو۔ ہمیں وہی مذہب کفرستان تک پھیلانا ہے جس کی خاطر ہمارے رسول صلعم نے خون کے رشتوں کی پہلی جنگ لڑائی تھی۔ ہماری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ سپاہیوں کو یقین دلاؤ کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد محمود غزنوی نے سالاروں وغیرہ کو جنگی ہدایات دیں۔ تعداد کی کمی اُسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ اُسے اب دھوکے اور چالوں کی جنگ لڑنی تھی۔ اس نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اپنے بھائی کی خیمہ گاہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کیا۔ اسماعیل کی فوج ایک لشکر تھا، اور اس لشکر کے آگے ہاتھی تھے (مورخوں نے ہاتھیوں کی تعداد دو اور تین سو کے درمیان لکھی ہے) ہاتھیوں کی پیشانیوں اور سونڈوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے یہ وہ ہاتھی تھے جو راجہ جے پال کے دو

حملوں میں اُس کی فوج سے چھینے گئے تھے۔ سلطان سبکتگین نے یہ ہاتھی غزنی بھیج دیئے تھے۔ یہ جنگی ہاتھی تھے۔

راجہ جے پال جب اسماعیل کی فوج سے کئی گنا زیادہ لشکر لے کر حملہ کرنے آیا تھا تو اُس کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی تھے۔ محمود غزنوی نہ اس لشکر سے گھبرایا تھا نہ ہاتھیوں سے۔ اُسے اس احساس نے دلیری تھی، کہ یہ لشکر اس کے مذہب اور اس کی قوم کے دشمن کا ہے۔ اب اسماعیل کے لشکر کو دیکھ کر اُسے جہاں یہ دکھ ہُوا کہ یہ اس کی اپنی فوج ہے جو اس کے خلاف لڑنے آئی ہے، وہاں اُسے یہ خطرہ بھی نظر آیا کہ یہ مسلمان جنگجوؤں کی فوج ہے جو لڑنا اور مرنا جانتی ہے اور جو اُس کی چالوں سے واقف ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ فوج صرف اس لیے اس کے خلاف لڑنے آگئی ہے کہ اس کی تنخواہیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اس سے اُسے یہ اطمینان ہُوا کہ یہ فوج قومی جذبے کی بجائے تنخواہ کے زور پر لڑنے آئی ہے، اس لیے اسے شکست دی جا سکے گی، مگر محمود کا یہ مسئلہ جوں کا توں موجود تھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کم تھی۔

اُس نے اپنی قلیل فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ زیادہ تعداد کا حصّہ اپنی کمان میں محفوظہ میں رکھا۔ دو حصوں کو پہلوؤں کو پھیلا دیا اور چوتھے حصے کو دشمن کے سامنے رکھا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اُسے چھاپہ مار جنگ لڑنی پڑے گی کیونکہ جم کر لڑنے کے لیے نفری بہت تھوڑی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ ذرا سی دیر کے تصادم کے بعد اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کریں اور اسماعیل کی فوج کو پھیل جانے پر مجبور کر دیں۔ اس علاقے میں چٹانیں بھی تھیں۔ محمود نے اِن سے فائدہ اٹھانے کے لیے سالاروں اور کمانداروں کو یہ چال بتائی کہ وہ دشمن کو اس طرح بکھیریں کہ اُس کے جیش اور دستے چٹانوں کے درمیان بھی چلے جائیں اور ان کے درمیان چٹانیں آجائیں۔ اس نے جنگ کو طول دینے کی ہدایت بھی دی۔ شبخون مارنے کے لیے حالات سازگار نہیں تھے کیونکہ دونوں طرف کی فوجیں دراصل ایک ہی فوج تھی۔ شبخون مارنے کی مہارت رکھتی تھیں اور اسے شبخون سے بچاؤ کے طریقے بھی آتے تھے۔ مثلاً رات کو دونوں طرف کی خیمہ گاہوں کے اندر بھی اور باہر دُور دُور تک بڑی مشعلیں جلا کر جگہ جگہ رکھ دی گئی تھیں۔

اُس کے علاوہ تیر انداز گھوڑسوار خیمہ گاہوں کے اردگرد گھوم پھر رہے تھے۔

محمود غزنوی خیمے سے نکلنے لگا تو اُس کی ماں آگئی۔ محمود دوڑ کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور زاروقطار رویا۔ ماں نے اسے اٹھا کر گلے لگالیا۔

"میری عظیم ماں!" — محمود نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا — "میرے باپ کی روح مجھ پر لعنت تو نہیں بھیجے گی؟ یہ پہلی لڑائی ہے جو میں اُن کے بغیر لڑ رہا ہوں اور وہ بھی اپنے بھائی کے خلاف۔ مجھے بخش دو ماں! میں اب بھی تلوار نیام میں ڈال لوں گا۔ میں نہیں لڑنا چاہتا۔ آنے والی نسلیں کہیں گی کہ سبکتگین کے بیٹے سلطانی کے تخت پر لڑ مرے تھے۔"

"اب کچھ بھی نہ سوچو" — ماں نے کہا — "خون میلے ہو جائیں تو آنکھوں میں بھی میل آجاتی ہے۔ تمہارے بھائی کے خون میں لالچ اور ہوس کی میل آگئی ہے۔ اب کچھ نہ سوچو۔ ذہن سے وہم اور وسوسے نکال دو۔ اب اس فیصلے پر قائم رہو جو ہم کر چکے ہیں۔ میں ساری رات خدا کے حضور سجدے کرتی رہی ہوں ... جا میرے بیٹے! میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق حملے میں پہل اسماعیل نے کی۔ اُس نے تعداد کی افراط کے بل بوتے پر یلغار کے انداز سے آمنے سامنے کا حملہ کیا۔ محمود غزنوی کی ہدایت کے مطابق تیر اندازوں نے ہاتھیوں پر تیر برسائے اور ان پر برچھیاں بھی پھینکیں۔ دشمن کو ہاتھیوں پر بہت بھروسہ تھا لیکن اُس کے سالاروں کو اندازہ نہیں تھا کہ ہاتھی اپنی دہشت، طاقت اور جسامت کے باوجود کچھ کمزوریوں کا حامل ہے۔ محمود نے اسی لیے ہاتھیوں کو زخمی کرنے کو کہا۔ ان میں سے جو ہاتھی زخمی ہوئے وہ اپنی فوج کے لیے مصیبت بن گئے۔ اُن کی چنگھاڑ سے گھوڑے بھی بدکنے لگے۔

محمود غزنوی بلندی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سپاہیوں نے بیشتر ہاتھیوں کو بیکار کر دیا تھا مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اسماعیل کے حملہ آور دستوں نے ہاتھیوں کے نقصان

کی پرواہ نہ کی۔ ان کی یلغار بڑی تیز تھی۔ محمود کی ہدایت کے مطابق اس کے دستے جم کر لڑنے کی بجائے اِدھر اُدھر ہونے لگے مگر دشمن کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ محمود کی چال کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو پسپا دیکھ رہا تھا۔ ایک فرانسیسی مؤرخ ڈی ہیبلوٹ لکھتا ہے، کہ محمود غزنوی کو اپنی شکست یقینی نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے پسپائی بچا سکتی ہے، یا کوئی معجزہ۔

اسماعیل نے حکم دے دیا کہ محمود کو زندہ پکڑو۔ دونوں ا ف تکبیر کے نعرے گرج رہے تھے، اور دونوں طرف ایک ہی جیسے پرچم پھڑپھڑا رہے تھے۔ محمود کے دستوں کے نعرے دبتے جا رہے تھے۔ ان کی یہ چال کہ وہ اِدھر اُدھر ہو کر دشمن کو بکھیر دیں گے ناکام ہو گئی تھی۔ وہ اب جم کر لڑ رہے تھے۔ مؤرخوں کے مطابق یہ معرکہ بہت ہی خونریز تھا۔ دونوں فوجیں قہر اور غضب سے لڑ رہی تھیں مگر محمود غزنوی کے دستوں کا بہت جلدی ختم ہو جانا یقینی تھا۔

اپنے اِن دستوں کو بچانے کے لیے محمود نے دشمن کے دونوں پہلوؤں پر حملے کرا دیئے لیکن اس انداز سے کہ دستے حملہ کر کے دائیں اور بائیں کو نکلنے کی کوشش کریں۔ یہ چال اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اسماعیل کی فوج پہلوؤں کی طرف پھیلنے لگی۔ محمود کے دستوں نے یہی طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ گھوم پھر کر حملہ کرتے اور پہلوؤں کی طرف نکل جاتے۔ محمود نے اپنے اُن دستوں کے لیے جو آمنے سامنے کے تصادم میں اُلجھ گئے تھے، یہ حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کریں۔

اس کوشش میں ان کا مزید نقصان ہوا لیکن جو عسکری نکل سکے، وہ نکل آئے۔

سورج غروب ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی محمود غزنوی نے پہلے تو سوچا تھا کہ وہ جنگ کو طول دے گا لیکن اس نے دیکھا کہ اسماعیل کی فوج اس کی مرضی کے مطابق بکھر رہی ہے تو اس نے شام سے پہلے پہلے معرکے کا فیصلہ کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اُسے دشمن فوج کے قلب میں اسماعیل کا پرچم دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے تیر اندازوں کو میدانِ جنگ کے ارد گرد کی چٹانوں پر بھیج دیا اور اپنے محفوظہ کو حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ جنگی امور کو سمجھنے والوں کی نظر میں یہ خودکشی اقدام تھا۔

محمود غزنوی نے اپنی جان اور فوج کا باقی حصّہ داؤ پر لگا دیا۔ یہ تازہ دم محفوظہ تھا۔ محمود نے دشمن کے قلب پر برق رفتار حملے کا حکم دیا اور اس حملے کی قیادت خود کی۔ ان دستوں میں زیادہ تر سوار تھے۔ محمود نے اپنے تیر انداز دستوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ دشمن اگر بکھر کر چٹانوں کے قریب جائے تو وہ تیر برسائیں۔ محمود غزنوی کے اس حملے کی ترتیب تیر جیسی ہی تھی۔ اسماعیل کے قلب کے دستے دن بھر کی لڑائی کے تھکے ہوئے تھے۔ محمود کا محفوظہ تازہ دم تھا۔ محمود کے کہنے پر محفوظہ یہ نعرہ لگاتا جا رہا تھا ــــ "بُت پرستوں کے دوستوں کو کچل دو"۔

کچھ تو محمود کا حملہ تیز اور غیر متوقع تھا۔ اور کچھ اس نعرے کا اثر تھا کہ اسماعیل کی صفوں میں بد دلی پیدا ہونے لگی۔ محمود کے کمانداروں نے ایک اور نعرہ لگانا شروع کر دیا ــــ "اللہ کے سپاہی تنخواہ کے لیے نہیں لڑا کرتے"۔

اسماعیل کے سالاروں نے قلب کو بچانے کے لیے پہلوؤں سے کمک لینے کی کوشش کی تاکہ محمود کے محفوظہ کو گھیرے میں لیا جا سکے مگر محمود کے پہلوؤں والے دستوں نے "ضرب لگاؤ اور بھاگو" کے انداز کے چھاپہ مار حملوں سے دشمن کے پہلوؤں کو ایسا الجھایا کہ وہاں سے کمک نہ جا سکی۔ محمود غزنوی کا قہر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ہندو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ جب دشمن پر سامنے سے حملہ کیا کرتا تھا تو اس میں اتنا قہر ہوتا تھا جو دشمن پر دہشت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اسماعیل کے قلب پہ حملے میں محمود کا قہر اس کے اپنے قابو میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

معرکہ یہ بھی شدید اور خونریز تھا۔ محمود کی نظر اسماعیل کے جھنڈے پر تھی۔ یہ جھنڈا غائب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسماعیل زخمی ہو گیا یا مارا گیا ہے۔ جھنڈا فوجوں کے جذبے کو قائم رکھا کرتا تھا۔ جھنڈا غائب ہو گیا تو اسماعیل کی فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ محمود کے کہنے پر اس کے سپاہی اعلان کرنے لگے ــــ "بت پرستوں کے بھائیو! تمہارا پرچم گر پڑا ہے"۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ معرکے کا پانسہ پلٹ گیا۔ اسماعیل کی فوج کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ دستوں کو جس طرح تقسیم کیا گیا تھا، وہ ترتیب گڈمڈ ہو گئی۔

ان میں سے سپاہی اور کماندار چٹانوں کے درمیان پناہ ڈھونڈنے لگے۔ چٹانوں کے اوپر محمود غزنوی نے اپنے تیرانداز پھیلا رکھے تھے۔ ان کے تیروں نے دشمن کے لئے کوئی پناہ نہ چھوڑی سب سے پہلے قلب کے ایک سالار نے ہتھیار ڈالے۔ محمود غزنوی نے کئی ایک گھوڑ اسواروں کو حکم دیا کہ وہ تمام میدانِ جنگ میں گھوم جائیں اور اعلان کریں کہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ اسماعیل کے کسی بھی فوجی کو ہلاک نہ کیا جائے۔ جو کوئی ہتھیار ڈالنے سے انکار کرے اُسے زندہ پکڑا جائے۔ اگر وہ مزاحمت کرے تو اُسے زخمی کرکے پکڑا جائے۔ اس اعلان سے اسماعیل کے سپاہیوں کے حوصلے بالکل ہی ٹوٹ گئے۔

قلب کے جس سالار نے سب سے پہلے ہتھیار ڈالے تھے، اُس سے محمود غزنوی نے اسماعیل کے متعلق پوچھا۔

"وہ مرا بھی نہیں زخمی بھی نہیں ہوا" ___ سالار نے جواب دیا۔ "وہ حملے کی شدّت سے ایسا گھبرایا کہ کوئی حکم یا اطلاع دیئے بغیر بھاگ گیا" ___ اُس نے وہ سمت بتائی جس طرف وہ گیا تھا۔

محمود غزنوی نے ایک جیش تیار کرکے حکم دیا کہ اسماعیل کو تلاش کریں اور اُس کے ہاتھ باندھ کر اخلاقی مجرموں کی طرح پیش کریں۔

سورج غروب ہونے تک خانہ جنگی کا یہ انتہائی خونریز معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اسماعیل کے عسکری ٹولیوں میں بیٹھ گئے تھے۔ محمود کے سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے۔ بڑی ہی بھیانک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ بعض چیخ رہے تھے۔ زخمی ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ زخمی گھوڑوں کی آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی معرکے کے بعد کی آوازیں اور زیادہ بلند اور ڈراؤنی ہوتی جارہی تھیں۔ محمود غزنوی پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ دونوں طرفوں کے زخمیوں کو اٹھا کر ان کی مرہم پٹی کی جائے۔

زخمی اٹھائے جارہے تھے سینکڑوں مشعلوں کے شعلے گھوم پھر رہے تھے اور

محمود غزنوی گھوڑے سے اُتر کر لاشوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ اُسے ایک نسوانی پکار سنائی دی ـــ "محمود محمود" ـــ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ وہ اس آواز کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اُس کی ماں کی آواز تھی۔ مشعلوں کے گھومتے پھرتے شعلوں میں اُسے اپنی ماں لاشوں سے پھلانگتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ محمود نے اُس کے قریب جا کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ماں نے اُسے اُٹھا کر اس کا سر اور منہ چوما۔ دونوں پر اتنی رقّت طاری تھی کہ وہ بول نہ سکے۔

محمود نے ماں کو رخصت کر دیا۔ محمود کا وہاں کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ میدانِ جنگ سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کسی لاش کے پاس رُک جاتا۔ کوئی مشعل بردار قریب سے گزرتا تو محمود اُسے روک لیتا۔ مشعل کی روشنی میں لاش کے چہرے کو غور سے دیکھتا اور آگے چل پڑتا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی طرح کی ایک اور نسوانی آواز سنائی دی ـــ "محمود"

وہ رُک گیا۔ دو مشعل برداروں کے درمیان ایک خاتون، شاہی لباس میں ملبوس آہستہ آہستہ اُس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ شاہی خاندان کی عورت تھی۔ وہ اُس کے باپ کی بیوی تھی مگر اُسے دیکھ کر محمود غزنوی کا خون کھول اٹھا کیونکہ وہ اسماعیل کی ماں تھی۔ محمود اُس کی طرف بڑھنے کی بجائے رُک گیا۔ اسماعیل کی ماں اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"یہ دیکھنے آئی ہو کہ تمہارے بیٹے نے غزنی کی فوج کے کتنے ہزار آدمیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے؟" محمود نے پوچھا ـــ "کیا یہ سننے آئی ہو کہ آپس میں لڑ کر مرنے والے سپاہیوں کے کراہنے کی آوازیں کیسی لگتی ہیں؟"

"میں کچھ بھی دیکھنے نہیں آئی" ـــ اسماعیل کی ماں نے روتے ہوئے کہا ـــ "میں کچھ سننے نہیں آئی۔ میں اپنے بیٹے کی جاں بخشی کی التجا لے کر آئی ہوں۔"

"کہاں ہے تمہارا بیٹا؟" ـــ محمود نے کہا ـــ "میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"وہ اپنے خیمے میں ہے" ـــ ماں نے جواب دیا ـــ "بھاگ نکلنے کے رستے بند

ہو چکے ہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ سب اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں"

"کیا وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جنہیں خوشامد کی بدولت تمہارے بیٹے نے کماندار سے سالار بنایا تھا؟" محمود نے پوچھا۔ "وہ فقیر بھی اُسے تنہا چھوڑ گئے ہیں جنہیں تمہارے بیٹے نے امیر اور وزیر بنا دیا تھا؟ ... ظلِّ الٰہی اور سلطانِ عالی مقام کہلانا آسان ہے لیکن ظلِّ الٰہی اور سلطانِ عالی مقام بن کر دکھانا بڑا ہی مشکل ہے"

"محمود!" ۔۔۔ اسماعیل کی ماں نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "تمہیں حق پہنچتا ہے کہ جو اُلٹی سیدھی زبان پر آئے کہو۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں"

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنے اسماعیل کو اتنے انسانوں کا خون بخش دیتیں؟" ۔۔۔ محمود نے کہا۔ "اپنے پاپوش دیکھو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جن کے خون سے تمہارے پاؤں لتھڑ گئے ہیں اور جن کے خون کے چھینٹے تمہارے ٹخنوں کے اوپر تک جا پڑے ہیں، وہ کون تھے؟ تم ایک سلطان کی بیوہ ہو، سلطان کی بیوی ہو یا بیوہ، قوم کا ہر فرد اور سپاہی اُس کا اپنا بچہ ہوتا ہے۔ کیا یہ تمہارے بیٹے نہیں تھے جن کے خون سے پھسلتی اور جن کی لاشوں سے ٹھوکریں کھاتی تم مجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہو؟ قوم اور فوج کے خون کے ساتھ کھیلنے والے حکمران اسی انجام کو پہنچتے ہیں جس تک تمہارا بیٹا پہنچ چکا ہے۔ کل کا سلطان آج کا مفرور مجرم ہے"

"محمود! میں تمہاری ماں تو نہیں، تمہارے مرحوم باپ کی بیوہ ہوں" ۔۔۔ اسماعیل کی ماں نے کہا۔ "اپنے باپ کی روح کی خاطر مجھے میرا بچہ دے دو۔ میں اس سلطنت سے نکل جاؤں گی۔ تمہارے باپ کو میرے ساتھ اتنی ہی محبت تھی جتنی تمہاری ماں سے تھی"

"اور تم نے اس محبت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ اپنے خاوند کو اُس کے نزع کے عالم میں دھوکہ دیا اور اپنے اُس بیٹے کو سلطنت کا بادشاہ بنوا لیا جس نے سلطنت کو ڈبونے کا اہتمام کر دیا۔ تم اُس قوم کی ماں ہو جس کی مائیں میری ماں کی طرح اپنے بیٹوں کو جوان کر کے محاذ کو رخصت کیا کرتی تھیں۔ تم نے اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھا

کہ اُس کے سر پہ تاج رکھا تم نے اُسے مجرم بنایا۔"

محمود غزنوی نے اپنے پاس کھڑے دو عہدیداروں سے کہا۔ "اِس خاتون کے ساتھ جاؤ اور اس کے بیٹے کو میرے سامنے لے آؤ۔"

اُس وقت اسماعیل اپنے خیمے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے جب خیمے میں دو عہدیداروں کو داخل ہوتے دیکھا تو وہ اٹھا اور سرتاپا کانپنے لگا۔ اُس نے ان عہدیداروں سے کہا کہ وہ اُسے فرار کرا دیں تو وہ انہیں منہ مانگا انعام دے گا۔ عہدیداروں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر سلطان کے پاس لے چلو۔ وہ خود ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

اُسے جب محمود غزنوی کے سامنے کھڑا کیا گیا تو محمود نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ "تمہاری ماں نے مجھ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگی ہے میں ایک ماں کی استدعا قبول کرتا ہوں۔ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔"

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے۔ "محمود غزنوی نے اسماعیل سے پوچھا۔ اگر فتح تمہاری ہوتی اور میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ — اسماعیل نے جواب دیا۔ میں تمہیں عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیتا اور آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش دیتا۔ — محمود غزنوی نے کہا۔ اور میں تمہارے ساتھ اس سے بُرا سلوک نہیں کروں گا۔ تم ساری عمر کے لیے جرجان کے قلعے میں قید رہو گے۔ جہاں آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش اور سہولت مہیا کی جائے گی۔ اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ — اسماعیل نے باقی عمر اپنی ماں کے ساتھ اس قلعے میں گزاری۔"

ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

اُس وقت جب سلطنتِ غزنی میں ایک اور خانہ جنگی لڑی جا چکی تھی، اور غزنی کی بہترین فوج کی خاصی نفری تباہ و برباد ہو گئی تھی، لاہور میں راجہ جے پال تک یہ اطلاع پہنچی کہ سلطان سبکتگین مر گیا ہے۔ اُس نے اپنے جرنیلوں کو بلایا اور انہیں خوشی سے

یہ خبر سُنائی گئی کہ اب وہ غزنی کو آسانی سے فتح کر لیں گے کیونکہ سبکتگین مر گیا ہے۔

"کیا ہماری فوج حملے کے لیے تیار ہے"؟ ــــ راجہ جے پال نے پوچھا۔

"پہلے دو تجربوں کو سامنے رکھ کر ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے" ــــ ایک جرنیل نے جواب دیا ــــ "ایک آدمی کے مر جانے سے پوری قوم نہیں مر جایا کرتی..... غزنی کی فوج میں جو جذبہ ہے، وہ اُن کے ایک سلطان کے مر جانے سے نہیں مرے گا۔ ہماری فوج پیشقدمی کے لیے تو تیار ہے لیکن اس میں ابھی لڑنے کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہُوا جو مسلمانوں میں ہے۔ ہم وہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مندروں میں پنڈت بھی لوگوں کو یہی بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ مذہبی جنگ ہے"۔

"سبکتگین کا بیٹا محمود جوان ہو گیا ہے" ــــ دوسرے جرنیل نے کہا ــــ "میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ پوری فوج کی کمان کے قابل ہے یا نہیں۔ میں نے اس کے دو حملے دیکھے ہیں۔ مجھے اس میں قابلیت اور جرأت نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کِس حد تک قابل ہے"۔

"یہ میں ہمیں معلوم کر لوں گا" ــــ راجہ جے پال نے کہا ــــ "تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے اونچے درجے کے دو قیدی ہیں۔ میں اِن سے معلوم کر لوں گا۔ آپ لوگ فوج کی تربیت اور تیاری تیز کر دیں۔ میں اب بہت جلدی غزنی کی طرف کوچ کروں گا۔ سبکتگین کا کوئی بھی بیٹا اُس جتنا قابل جرنیل نہیں ہو سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم دو شکستوں کا انتقام لے کر سبکتگین کی سلطنت پر قبضہ کر سکیں گے۔ میں ایک لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے رہا ہوں۔ پنڈتوں نے لڑکی حاصل کر لی ہے۔ اسے خاص عمل کے بعد قربان کیا جائے گا"۔

راجہ جے پال نے غزنی کے جن دو قیدیوں کا ذکر کیا تھا وہ نظام ادریزی اور قاسم بلخی تھے۔ آپ نے اس داستان کی پچھلی قسط میں پڑھا ہے کہ راجہ جے پال اِن سے پوچھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ان دونوں نے اسے تاثر دے رکھا تھا کہ یہ ایک گہرا راز ہے جو وہ نہیں بتائیں گے۔ راجہ جے پال نے انہیں راج محل

کے ساتھ ایک کمرہ دے دیا تھا جہاں ایک مسلمان ملازم انہیں کھانا کھلاتا تھا۔ یہ مسلمان غزنی کا جاسوس تھا۔ وہ خوبرو اور ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تیز طرار تھا۔ اس کمرے کے ارد گرد پہرہ تھا۔ راجہ جے پال کو دوسری شکست نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ غزنی پر ایک اور حملے کے لیے فوج کی نئی بھرتی اور تیاری میں اتنا مصروف تھا کہ غزنی کے ان دو قیدیوں کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

یہ مسلمان ملازم جس کا نام بلاذری تھا انہیں کہ رہا تھا کہ وہ راجہ کو کوئی جھوٹ موٹ کا راز بتا دیں۔ ورنہ وہ انہیں قید خانے میں ڈال کر بڑی ہی بھیانک اذیتیں دے گا۔ بلاذری کا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں راجہ پر اپنا اعتماد پیدا کر لیں تو ان کے فرار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ راجہ کو اعتماد میں لینے سے یہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا کہ اس سے یہ معلوم کر لیا جاتا کہ وہ کب تک غزنی پر حملہ کر رہا ہے اور اب کس طرف سے حملہ کرے گا۔ پشاور کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا تھا۔

"اب راجہ تمہیں بلائے تو اسے دھوکہ دو" ــــ عمران بلاذری نے ایک روز انہیں کہا ــــ "میں نے تمہیں چھپانے کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہیں یہاں سے جلد ہی نکالنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے میں یہاں سے غائب ہو جاؤں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"ایک فرض تو سلطنت کی طرف سے مجھ پر عائد ہے جو مجھے پورا کرنا ہے، اور کرتا رہتا ہوں" ــــ بلاذری نے کہا ــــ "مگر میں انسان بھی ہوں میرے جذبات بھی ہیں۔ مجھ پر ایک اور فرض آپڑا ہے۔ میں تم دونوں سے کچھ چھپاؤں گا نہیں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے۔ پنڈتوں نے راجہ جے پال کو بتایا تھا کہ وہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اسے فتح ہو گی۔ یہ قوم وحشی ہے اور بربریت پسند کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اس کی بیوہ کو اس کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پنڈت کو کسی خاص شکل، رنگ اور عمر کی بڑی خوبصورت کنواری لڑکی مل گئی ہے۔ اسے وہ کسی مندر میں لے گئے ہیں۔ اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔ مجھے اس لڑکی کو بچانا ہے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟" نظام اور یزی نے پوچھا۔۔۔ "یہ کافر اپنی تمام لڑکیوں کو اپنے بتوں کے آگے قربان کر دیں ہمیں اس سے کیا؟"

"یہ لڑکی مجھے اس قدر چاہتی ہے کہ میرے ساتھ چلنے کو تیار تھی" عمران بلاذری نے کہا۔۔۔ "وہ اسلام قبول کرنے کا بھی فیصلہ کر چکی تھی۔ میں اسے کبھی کا لے جاتا لیکن جاسوس کی حیثیت سے میرا فرض مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دے رہا۔ میں یہاں سے کوئی کام کی اطلاع یا راجہ جے پال کے آئندہ عزائم کی صحیح خبر لے کر غزنی کو روانہ ہونا چاہتا تھا۔ لڑکی جب مجھے ملتی یہی کہتی کہ میں اُسے غزنی لے چلوں۔ اتنے میں تم دونوں آگئے۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے کہ تمہیں یہاں سے فرار کراؤں میں لڑکی کو ساتھ لے کر تمہارے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ ایک روز لڑکی مندر میں گئی اور واپس نہ آئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ پنڈتوں نے اسے قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ قربانی دینے میں ابھی بہت دن ہیں۔ مجھے مجرم کہہ لو جو جی میں آئے کہہ لو، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ محبت فرض پر غالب آجائے گی۔ تم راجہ کو اعتماد میں لو اور یہاں سے نکلو۔ میں تمہیں کچھ دن چھپائے رکھوں گا۔ پھر لاہور سے نکال بھی دوں گا۔"

"تم ہم سے جلدی فارغ ہونا چاہتے ہو" قاسمی بلخ نے کہا۔

"ہاں"۔۔۔ بلاذری نے جواب دیا۔۔۔ "بہت جلدی۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

اس سے ایک دو روز بعد انہیں راجہ جے پال نے بلا لیا۔

"کیا تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو؟"۔۔۔ راجہ نے کہا۔۔۔ "مجھے امید ہے کہ تم اپنے آپ پر رحم کرو گے۔"

"ہاں مہاراج!"۔۔۔ نظام اور یزی نے کہا۔۔۔ "آپ نے ہمارے ساتھ جو اچھا سلوک کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کو ہر سوال کا جواب دیں گے۔"

"تمہارا سلطان سبکتگین مر گیا ہے"۔۔۔ راجہ جے پال نے انہیں خبر سنائی۔

دونوں چونک اُٹھے لیکن سنبھل گئے۔

"اب غزنی کی سلطنت کو بچانے والا کوئی نہیں رہا"۔۔۔ راجہ نے کہا "تم اب میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں اپنی فوج میں عہدہ بھی دے سکتا ہوں.... مجھے یہ بتاؤ کہ اُس کا بیٹا محمود اپنے باپ کی جگہ فوج کی کمان کر سکتا ہے؟ اُس میں جنگی قابلیت کتنی کچھ ہے؟"

"اتنی نہیں جتنی سلطان سبکتگین میں تھی"۔۔۔ اوریزی نے جواب دیا "میدانِ جنگ میں وہ اپنی مخصوص چالیں چلتا ہے۔ اگر آپ کو یہ چالیں بتا دی جائیں تو آپ اسے آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔ آپ کو دوسری شکست محمود کی چالوں نے ہی دی ہے۔"

ان دونوں نے راجہ جے پال کو محمود کی چالیں بتانی شروع کردیں۔ ان کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں کو بلالیا۔ اوریزی اور بلخی انہیں چالیں سمجھانے لگے۔

"ہم آپ کو عملی طور پر بھی یہ چالیں سمجھائیں گے"۔۔۔ قاسم بلخی نے کہا۔۔۔ "لیکن ہم قیدی بن کر آپ کو ان چالوں کی عملی شکل نہیں بتائیں گے۔"

راجہ جے پال نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا دیا جائے۔ پہرہ ہٹا دیا گیا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلے روز عمران بلاذری ان کے لیے کھانا لے کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ راج محل سے اوریزی اور بلخی کا بلاوا آیا۔ بلاذری نے قاصد کو بتایا کہ وہ صبح سے کھانا لے کے بیٹھا ہے، وہ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔ وہ رات کو ہی نکل گئے تھے، اور بلاذری انہیں ایک گھر میں چھپا آیا تھا۔

مذہب، مجرم اور مجاہد

عمران بلاذری پر کسی نے شک نہ کیا کہ غزنی کے دونوں قیدیوں ــــ نظام اور یزی اور قاسم بلخی ــــ کو اُس نے راج محل سے فرار کرایا ہے۔ اُس نے یہ فرض تو ادا کر دیا تھا مگر اُسے ابھی ایک اور فرار کرانا تھا۔ یہ وہ ہندو لڑکی تھی جو اُس کی محبت کی خاطر اپنا مذہب، اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑنے کو تیار تھی مگر اسے پنڈت انسانی قربانی کے لیے لے گئے تھے۔

بلاذری خوش وضع، خوش لباس اور خوش گفتار جوان تھا۔ ہر ڈھنگ کھیلنا اور ہر بھیس بدلنا جانتا تھا۔ اُس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ اُن مردوں میں سے تھا جن کے خدوخال میں، آنکھوں میں، ڈیل ڈول اور سراپا میں ایسی کشش ہوتی ہے جو جنس مخالف کو کچھ دیر رک کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمران بلاذری شہزادہ نہیں تھا۔ راج محل کا ملازم تھا۔ ملازموں جیسے کپڑے پہنتا تھا۔ ملازموں کی طرح بولتا تھا، مگر غزنی کا جاسوس تھا۔ پنجاب کی اُس وقت کی زبان روانی سے بولتا تھا اور کسی کو کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ کہ یہ خوش طبع آدمی راجہ جے پال کی ریاست کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

وہ کچھ عرصے سے لاہور میں تھا۔ شہر میں ایک مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے اڑوس پڑوس میں رہنے والے اس کے متعلق اتنا ہی جانتے تھے کہ راج محل کا ملازم ہے ملتان کا رہنے والا ہے۔ اچھا آدمی ہے اور رات دیر سے گھر آتا ہے۔ اس کی دوستی ایک ہندو جگ موہن کے ساتھ تھی جو اُس کا ہم عمر تھا۔ اُس کا باپ تاجر

تھا۔ جگ موہن اکثر رات کو عمران بلاذری کے گھر آیا کرتا تھا۔ اُن دنوں ہندو اور مسلمان کی دوستی کم ہی دیکھنے میں آیا کرتی تھی۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو ان سے نفرت کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی، مگر جگ موہن جو ذات کا برہمن تھا، عمران بلاذری سے پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر ہوا تھا کہ اسے ملتا رہا اور ان کی دوستی ہو گئی۔

دوستی کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک رات جگموہن بلاذری سے ملنے اُس کے گھر آیا تو جگ موہن رو رہا تھا۔

"آج میری بہن زندہ جلا دی گئی ہے"۔۔۔ جگ موہن نے بلاذری کو بتایا۔

"کس نے جلائی ہے؟"۔۔۔ عمران بلاذری نے پوچھا۔

"میرے مذہب نے"۔۔۔ جگ موہن نے بتایا۔۔۔ "اُس کی شادی ہوئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اُس کا خاوند گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا۔ آج صبح وہ مر گیا ہے۔ اُس کی بیوی کو بھی اُس کے ساتھ ہی مرنا تھا۔ آج میرے بہنوئی کی لاش چتا پر رکھی گئی تو اُس کے بھائیوں نے میری بہن کو بھی چتا پر کھڑا کر دیا اور چتا کو آگ لگا دی۔ تم نے چتا نہیں دیکھی ہو گی۔ لکڑیوں کا بہت بڑا ڈھیر لگایا جاتا ہے جو چوکور اور اوپر سے ہموار ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی انسان کے قد سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور اونچائی کم و بیش ایک گز۔ اس پر لاش رکھ دیتے ہیں۔ لکڑیوں پر تیل یا گھی ڈالتے اور آگ لگا دیتے ہیں۔ میں تو لاش کو بھی جلتے نہیں دیکھ سکتا مگر میں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلتے دیکھا ہے۔۔۔۔

"کہتے ہیں کہ ہندو عورت اتنی غیرت والی ہوتی ہے کہ اُس کا خاوند مر جائے تو اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے۔ اسے ستی ہونا کہتے ہیں۔ جو عورت ستی نہیں ہوتی وہ ساری عمر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ خطرہ محسوس کرتی ہے کہ انسانی کمزوری اسے گناہگار بنا دے گی اس لیے خاوند کے ساتھ ہی مر جانا بہتر ہے۔۔۔۔ میں ستی کو اچھا سمجھتا تھا مگر جب اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا مذہب کس قدر بے رحم

ہے۔ کوئی عورت زندہ نہیں جلنا چاہتی۔ میری بہن کو گھسیٹ کر چتا تک لے گئے اور اُسے اٹھا کر چتا پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ میں اسے بچا نہ سکا۔ وہاں کم و بیش ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ کوئی بھی اسے بچانے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ سب مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے لکڑیوں کے جلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی بہن کی چیخیں سنائی دیں....

"میں نے گھوم کر دیکھا۔ شعلے بہت اُونچے تھے۔ ان میں مجھے اپنی بہن نظر آئی۔ وہ چیخ رہی تھی، پھر جلتی لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ نے اس کی چیخیں ختم کر ڈالیں۔ مجھے غشی آنے لگی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ میں ابھی تک بہن کی چیخیں سن رہا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"وہ مذہب ہی کیا جس سے انسانوں کو نفرت ہو جائے" ـــــ عمران بلاذری نے کہا۔ "وہ مذہب ہی کیا جو انسان کو جینے کے حق سے محروم کر دے۔ کوئی مذہب بربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ میں تمہیں اپنے مذہب میں لانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ صرف بتا رہا ہوں کہ میرا مذہب عورت کے لیے بہت نرم ہے۔ اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اُسے اجازت ہوتی ہے کہ تین ماہ بعد شادی کر لے۔ اگر وہ جوان ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اُس کی دوسری شادی ہو جائے۔ اسلام عورت کو ذرا سی بھی جسمانی ایذا دینے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"ہمارے پنڈت دودھ پیتے بچوں کی قربانی بھی دیا کرتے ہیں" ـــــ جگ موہن نے کہا۔ "ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خشک سالی ہو، قحط کا خطرہ ہو، سیلاب کا ڈر ہو تو کسی کا معصوم بچہ پکڑ کر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش جلا دی جاتی ہے۔ اب ہمارا راجہ غزنی سے شکست کھا کر آیا ہے تو پنڈتوں نے اسے کہا ہے۔ کہ وہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اس کی شکست فتح میں بدل جائے گی۔"

"یہ قربانی کب دی جا رہی ہے؟"

"پنڈت خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں" ـــــ جگ موہن نے جواب دیا ـــــ

"انہوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ لوگ مندروں میں اپنی کنواری بیٹیوں کو بھیجا کریں۔ لڑکیاں مندروں میں جاتی ہیں۔ ابھی پنڈتوں کو خاص قسم کی لڑکی نظر نہیں آئی۔"

"تمہاری کوئی بہن کنواری تو نہیں؟"

"میری چھوٹی بہن کنواری ہے"۔۔۔ جگ موہن نے کہا۔ "لیکن میں اسے مندر میں نہیں جانے دیتا۔ میرے باپ نے بھی اسے کہا ہے کہ وہ مندر میں نہ جایا کرے ۔۔۔ میری بہن بہت خوبصورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پنڈتوں کے سامنے گئی تو وہ اسے قربانی کے لیے منتخب کرلیں گے۔"

عمران بلاذری کو موقعہ مل گیا۔ اس نے جگ موہن کو اسلام کے بنیادی اصول بتائے اور کہا۔۔۔ "ہمارا مذہب بنی نوع انسان کی بہبود اور حقوق دینے کے لیے آیا تھا۔"

جگ موہن کا دل زخمی تھا عمران بلاذری کی باتوں سے اُسے تسکین ہونے لگی۔

"تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو پنڈتوں سے چھپا رکھا ہے"۔۔۔ بلاذری نے کہا۔۔۔ "راجہ جے پال نے شکست کھائی ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے اور اپنی قوم کو بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے تمہارے پنڈت فریب دے رہے ہیں۔ ہر کوئی بادشاہ یا مہاراجہ کی خوشنودی چاہتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے، عیسائیوں میں بھی۔ پنڈت ہو یا مولوی، اس کے پاس مذہب کی پیشوائی ہوتی ہے، اس لیے وہ مذہب کو موڑ توڑ کر اپنے بادشاہ کو خوش کرلیتا ہے۔ تمہارے پنڈتوں نے بھی یہی کیا ہے۔ راجہ جے پال کو یہ کہنے کی بجائے کہ اپنی غلطیوں اور سلطان سبکتگین کی کامیابیوں کو پرکھے اور اپنی فوج میں ردوبدل کرے، پنڈتوں نے اسے یہ کہ کر اس کا دل پرچا دیا کہ دیوتا ناراض ہیں اور وہ ایک کنواری کی قربانی مانگتے ہیں ۔۔۔۔

"تم جسے اپنے مذہب کی خرابی کہتے ہو، یہ دراصل تمہارے مذہبی پیشواؤں

کی خرابی ہے۔ انسانوں کی پیدا کردہ خرابیاں ہمارے مذہب میں بھی ہیں ہمارے مولوی اور امام بھی بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی ایسی توجیہات پیدا کر لیتے ہیں جنہیں انسانی ذہن قبول نہیں کرتا لیکن اس پر وہ مذہب کی چھاپ لگا کر لوگوں کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنے تخت و تاج کی مضبوطی کے لیے مذہب کو استعمال کرے اور مذہب کی آڑ میں بیٹھ جائے تو مذہبی پیشوا اسے مذہب کے ہی اصولوں اور فلسفوں کو توڑ موڑ کر اسے آڑ مہیا کر دیتے ہیں۔ اگر یہی بادشاہ مذہب سے نگاہیں پھیر کر رعایا پر ظلم و تشدد شروع کر دے تو یہی مذہبی پیشوا اس کی دھاندلیوں اور جھوٹ کو مذہبی جواز مہیا کر دیں گے۔ مذہب ہر کسی کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے، مذہب کو اس کے پیشوا قابلِ نفرت بنایا کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارے مذہب میں انسانوں کی قربانی دی جاتی ہے؟"— جگ موہن نے پوچھا۔

"نہیں"— عمران بلاذری نے جواب دیا— "ہمارا مذہب اسے قتل کہتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی مذہبی پیشوا کسی کو انسانی قربانی کے لیے تیار کرے گا تو وہ قاتل کہلائے گا اور سزائے موت پائے گا۔ مسلمان میدانِ جنگ میں اپنی جانیں دیا کرتے ہیں، اور یہی سلطان سبکتگین کی کامیابی کا راز ہے... میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا، حقیقت بیان کرتا ہوں۔ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں ہمارے کئی ایک خدا نہیں، اور ہمارے خدا پتھر اور مٹی کے بھی نہیں۔ اپنی عقل استعمال کرو۔ یہ بت، ایک جگہ دھرے رہتے ہیں، تم انہیں صرف مندروں میں دیکھ سکتے ہو۔ یہ اپنے اوپر بیٹھی مکھی کو بھی نہیں اُڑا سکتے۔ ان میں جان نہیں، روح نہیں۔ ہمت کرو اور ایک بُت کو توڑ دو، پھر دیکھنا کہ یہ خُدا اپنے ٹکڑے جوڑ سکتا ہے یا نہیں اور یہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ ہمارا خدا صرف مسجد میں نہیں رہتا۔ ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی رہتا ہے۔ وہ کسی انسان کا خون نہیں مانگتا، نہ کسی کنواری کو اپنے سامنے ذبح کرا کر خوش ہوتا ہے۔"

عمران بلاذری کی زبان کا جادو اس جوان سال ہندو کو مسحور کر رہا تھا۔ اس تاثر کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بلاذری کی زبان میں سحر تھا اور دوسری وجہ یہ کہ جگ موہن نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تھا۔ یہ انسانی جذبات تھے جو پنڈتوں اور پتھر کے خداؤں پر غالب آ گئے تھے۔ عمران بلاذری نے اُسے اُس کے مذہب سے منحرف کر دیا تھا، یا انحراف اور نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ جگ موہن کے آنسو بہے جا رہے تھے، اور اس کے چہرے پر دہشت کا تاثر بھی تھا۔ اسے جیسے ابھی تک اپنی بہن جلتی نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا غم ایسا ہے جو بانٹا نہیں جا سکتا" — عمران بلاذری نے کہا — "میں ہمدردی کے دو چار الفاظ کہہ سکتا ہوں۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے بتانا"۔

غمزدہ حالت میں ہمدردی کے دو چار الفاظ بھی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ جگ موہن عمران بلاذری کا مرید ہو گیا اور اس کی باتوں کو دل میں بٹھانے لگا۔ ایک روز بلاذری کو کام سے چھٹی تھی۔ وہ جگ موہن کو شکار پر لے گیا۔ اس سے پہلے کہاں تھی۔ یہ بھی جگ موہن کے دل بہلاوے کا اہتمام تھا۔ وہ شہر سے دور جنگل میں نکل گئے۔ دونوں نے بہت سے پرندے شکار کیے۔

"عمران!" — جگ موہن نے ہنس کر کہا — "تم نے مجھ سے ان پرندوں کا ناحق خون کرایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں برہمن ہوں۔ ہمیں گوشت کھانے کی اجازت نہیں"۔

"اگر تم گوشت کھاؤ تو تمہارے خیالات بدل جائیں" — بلاذری نے کہا — "میں تمہیں آج گوشت کھلاؤں گا۔ اگر پتھر کے کسی بُت نے تمہیں سزا دی تو وہ میں بھگتوں گا"۔

اُس نے پرندوں کے پر اتارے۔ پرندے صاف کیے اور لکڑیاں وغیرہ اکٹھی کر کے آگ پر پرندے بھون لیے۔ وہ نمک ساتھ لے گیا تھا۔ جگ موہن

گوشت کو ہاتھ لگاتے ڈر رہا تھا۔ عمران بلاذری نے زبان کا جادو چلایا تو جگ موہن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک پرندہ اٹھایا اور دانتوں سے ایک بوٹی منہ میں ڈالی۔ اُس نے گوشت کا ذائقہ پہلی بار چکھا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی پورا پرندہ کھالیا۔

"اور کھاؤں گا" ___ جگ موہن نے کہا۔

وہ ایک اور پرندہ کھا گیا۔

"میں ایک اور کھلاؤں گا" ___ عمران بلاذری نے کہا۔

جگ موہن نے ایک اور پرندہ کھالیا۔ پرندوں کی کمی نہیں تھی۔ بلاذری آگ پر پھینکتا، بھونتا اور نمک لگاتا جا رہا تھا۔ جگموہن نے ایک اور پرندہ اٹھایا تو بلاذری نے روک دیا۔

"زیادہ نہیں" ___ اُس نے جگ موہن سے کہا ___ "تمہارا پیٹ گوشت کا عادی نہیں۔ شاید زیادہ ہضم نہ کرسکے۔ میرے گھر آتے ہی رہتے ہو میں تمہیں گوشت کا عادی بنا دوں گا۔"

جگ موہن نے بلاذری کے منع کرنے کے باوجود ایک اور پرندہ کھالیا اور بولا ___ "بھاگیں دوڑیں گے تو سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔"

اُس روز کے بعد جگ موہن عمران بلاذری کے گھر جاتا تو گوشت کی فرمائش کرتا۔ بلاذری اس کے لیے گوشت تیار رکھتا تھا۔ یہ گوشت کا اثر تھا، یا بلاذری کی باتوں کا کہ جگ موہن اپنے مذہب سے متنفر ہو گیا۔

"تم مندر میں جایا کرتے ہو؟" ___ ایک روز عمران بلاذری نے اس سے پوچھا۔

"کبھی کبھی" ___ جگ موہن نے جواب دیا ___ "اب تو ایک رسم پوری کرنے جاتا ہوں۔"

"تم جس بت یا مورتی کے سامنے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے ہو، اُسے ایک روز کہنا کہ تم گوشت خور ہو گئے ہو" عمران بلاذری نے کہا ___ "پھر دیکھنا تمہارا یہ مصنوعی خدا تمہیں کیا کہتا ہے ..... وہ کچھ بھی نہیں کہے گا۔ تم اتنے دنوں سے گوشت

کھا رہے ہو۔ تمہیں ان بتوں نے کیا سزا دی ہے؟ البتہ تمہارے کسی پنڈت کو پتہ چل گیا تو وہ تمہارے خلاف طوفان بپا کر دے گا۔"
جگ موہن اپنے مذہب کے خلاف دلیر ہو گیا۔

شام کے بعد کا واقعہ ہے عمران بلاذری اپنے گھر میں تھا۔ ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اُس کے گھر میں آئی۔ لڑکی کا رنگ گورا، آنکھیں شربتی اور بال بھی شربتی رنگ کے تھے۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن اُس میں جو کشش تھی، وہ اُس کے جسم کی ساخت کی بدولت تھی۔ اس کی چال ڈھال میں انوکھی کشش تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔ عمران بلاذری اس لڑکی کو ایسے وقت جب شام گہری ہو گئی تھی، اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔
"عمران بلاذری تم ہو؟" — لڑکی نے پوچھا۔
"ہاں ...... میں ہی ہوں۔"
"میں جگ موہن کی بہن ہوں" — لڑکی نے کہا — "میرا نام رشی ہے جگ موہن کو دیکھنے آئی ہوں۔ میرے باپ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں جو کسی سیانے کو بلا لائے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا بھائی تمہارے پاس آیا کرتا ہے۔"
"ہاں ..... آیا کرتا ہے لیکن دیر بعد" — عمران بلاذری نے کہا — "رات گہری ہو چکی ہوتی ہے تو آتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کسی ویدیا کسی سیانے کو بلا لاؤں گا۔"
"تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟" — رشی نے پوچھا۔
"بالکل اکیلا۔"
"بیوی نہیں ہے؟" — رشی نے مسکرا کر پوچھا۔
" ابھی شادی نہیں ہوئی۔"
اس ہندو لڑکی کے چہرے کے تاثرات اور مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس گھر سے جلدی نہیں نکلنا چاہتی۔ عمران بلاذری ایک تاثر بن کر اس پر چھا

گیا تھا۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" ــــ رشی نے پوچھا۔

"تمہارا باپ بیمار ہے رشی!" ــــ عمران بلاذری نے کہا "تمہیں جلدی گھر جانا چاہیئے۔"

"اتنا زیادہ تو بیمار نہیں" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "ویسے ہی تمہارے پاس رک گئی ہوں۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا تو چلی جاتی ہوں .... میرا بھائی تمہاری بہت تعریفیں کیا کرتا ہے۔ تمہیں دیکھنے کا بہت شوق تھا.... تم واقعی اچھے آدمی ہو۔ جگ موہن بہت اداس رہتا ہے۔ اُس نے کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔"

عمران بلاذری کے منہ سے نکل چلا تھا کہ جگ موہن نے کھانا پینا اس لیے کم کر دیا ہے کہ وہ اُس سے چوری چھپے گوشت کھاتا ہے لیکن اُسے یاد آ گیا کہ یہ راز ہے۔ اُس نے کہا۔ "جس نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا ہو، وہ اداس نہ رہے تو کیا کرے .... تمہیں بھی اپنی بہن کا بہت غم ہو گا"

رشی نے آہ لی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی ــــ "میری قسمت میں بھی شاید زندہ جلنا ہی لکھا ہے۔ کبھی تو جی میں آتی ہے کہ شادی نہ کروں۔"

عمران بلاذری کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں، پھر آہستہ آہستہ نیچے کو پھسلنے لگیں۔ رشی اُسے دیکھ رہی تھی۔ بلاذری تصوّروں میں دیکھنے لگا کہ اتنی حسین لڑکی جل رہی ہے.... تصوّروں کے شعلے اُس کے اپنے سینے کو جلانے لگے۔

"نہیں رشی!" ــــ عمران بلاذری نے بےتابی سے لپک کر رشی کے کندھے پکڑ لیے اور بولا ــــ "تم نہیں جلو گی۔ تم مر گئی تو میں تمہاری لاش کو بھی نہیں جلنے دوں گا۔ تمہاری لاش اٹھا لے جاؤں گا۔"

رشی گھبرا گئی۔ بلاذری سنبھل گیا اور کھسیانی سی مسکراہٹ سے بولا ــــ "مجھے معاف کر دینا رشی! مجھے غلط نہ سمجھنا.... میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم جیسی عورتوں کو زندہ کس طرح

جلا دیتے ہیں۔ تمہارے پنڈت اور دوسرے لوگ اتنے پتھر دل کس طرح بن جاتے ہیں "۔

" تم میری قسمت نہیں بدل سکتے عمران!"

عمران نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دونوں پر خاموشی طاری ہوگئی۔ عمران بلاذری اُس کے اور قریب ہوگیا۔

" میں تمہاری قسمت بدل سکتا ہوں"۔۔۔ اُس نے زیرلب کہا۔۔۔" اگر تم نے ساتھ دیا تو خدا ہماری مدد کرے گا"۔

" کل آؤں؟"۔۔۔ رشی نے پوچھا

" اسی وقت"۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا۔۔۔" لیکن کوئی دیکھ نہ لے۔ ہمارے مذہب ہمارے لیے مشکل پیدا کردیں گے.... جگ موہن نے بتایا تھا کہ تمہیں مندر میں نہیں جانے دیا جاتا۔ اُس نے وجہ بھی بتائی تھی"۔

" میں اپنے کسی دیوتا پر قربان ہونے کے لیے تیار نہیں"۔۔۔ رشی نے کہا۔۔۔ " میں دن کو گھر سے باہر نہیں جاتی۔ رات کو نکلتی ہوں"۔

" کل آؤ گی تو باتیں کریں گے"۔۔۔ بلاذری نے کہا۔۔۔" تم گھر چلو۔ میں کسی حکیم یا سیانے کو لے کر آتا ہوں"۔

وہ رشی کے ساتھ دروازے تک گیا۔ یہ تاریک ڈیوڑھی تھی۔ رشی اس کے قریب ہوگئی۔ عمران بلاذری نے اپنا بازو اُس کی کمر میں ڈال دیا۔

" میں کسی غیر مرد کے اتنی قریب کبھی نہیں ہوئی تھی"۔۔۔ رشی نے کہا۔۔۔ " تمہارے قریب ہوتے ڈر آتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق ہمیں کبھی کوئی اچھی بات نہیں بتائی گئی۔ جگ موہن مجھے یہ نہ بتاتا کہ تم اچھے آدمی ہو تو میں یہاں کبھی نہ آتی.... تم تو بہت اچھے ہو"۔

رشی دروازے سے نکلی تو بھی اس کے ہاتھ میں عمران کا ہاتھ تھا۔ جیسے وہ اس خوبرو مسلمان کے سہارے اپنے مذہب کے سیلابی دریا میں اُتر رہی ہو۔ عمران بلاذری نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ رشی کچھ دیر رُکی رہی۔ اُس نے

بے دلی سے عمران کا ہاتھ چھوڑا اور چلی گئی۔ وہ کچھ دور چلی گئی تو عمران باہر نکلا اور ایک حکیم کے گھر کو چل پڑا۔

حکیم کو جگ موہن کے گھر میں داخل کر کے عمران بلاذری واپس آگیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آیا تو باہر کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا، وہ عورت ہی لگتی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ شاید رشی پھر آگئی تھی۔ قریب آئی تو بلاذری نے پہچان کر کہا ۔۔۔ "فاطمہ؟ ..... تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ یہ ہندوانی یہاں کیوں آتی تھی؟" ۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا ۔۔۔ "کیا میں اتنی بری ہوں کہ دور سے میرے سلام کا جواب دے دیتے ہو؟ .... اور میرے پیغام کا یہ جواب دیتے ہو کہ تمہارے خاوند سے ڈرتا ہوں، میرے گھر نہ آنا، ہم نہیں مل سکتے۔"

عمران بلاذری نے جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور فاطمہ کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے رشی آئی تھی۔

"وہ اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھی" ۔۔۔ عمران بلاذری نے فاطمہ سے کہا ۔۔۔ "میں نے آج پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں .... اور میں تمہارے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا فاطمہ! تم مسلمان ہو، خاوند والی ہو۔ تمہارے سلام اور تمہارے پیغام جسمانی تعلق کی خاطر ہیں۔ میں گناہگار نہیں کہلاؤں گا۔"

"جسے تم میرا خاوند کہہ رہے ہو، وہ مجھ اکیلی کا خاوند نہیں" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "اُس کی تین بیویاں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میری عمر بیس سال سے کچھ مہینے اوپر ہو گی۔ میرے خاوند کی عمر مجھ سے دگنی سے بھی زیادہ ہو گی۔ اس نے تین بیویاں صرف اس لیے رکھی ہوئی ہیں کہ وہ دولت مند تاجر ہے۔ خدا نے اسے ایسی شکل و صورت بھی نہیں دی کہ کوئی عورت اسے پسند کرے۔ اس کا جسم اس قابل نہیں کہ تین بیویاں اس سے خوش رہیں، مگر دولت کے زور پر اُس

نے مجھ جیسی جوان لڑکی کو تیسری بیوی بنالیا ہے۔ اگر اس قسم کا مرد تین بیویاں رکھ سکتا ہے تو کیا ایک عورت دو خاوند نہیں رکھ سکتی؟ عورت کو اس حق سے کیوں محروم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مرد کے پاس جائے؟ مرد کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ تین تین چار چار جوان لڑکیوں کو اپنے عقد میں باندھ لے؟"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں" ۔۔۔ عمران بلاذری نے بے رخی سے کہا ۔۔۔ "نہ میں نے مرد کو تین اور چار بیویاں رکھنے حق دیا ہے، نہ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کے حق سے محروم کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ تم چلی جاؤ۔ تمہارے خاوند کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں ہو تو میری مصیبت آجائے گی"

"وہ یہاں نہیں ہے" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "پشاور مال لینے چلا گیا ہے۔ وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ غائب رہے گا۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے ایسی بیماری کا بہانہ بنایا کہ وہ گھبرا گیا۔ وہ دوسری بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ جو مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ اس سے بڑی کہیں اور چلی گئی ہے۔ رات دیر سے آئے گی۔ وہ مجھے کہیں جانے سے نہیں روک سکتی اور میں اس کے راستے میں نہیں آتی ..... تم نے مجھے مسلمان کہا ہے۔ میں نام کی مسلمان رہ گئی ہوں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرے باپ کا مذہب اور ایمان سونا چاندی ہے۔ اس نے مجھے مذہب کے نام پر بیچا ہے۔ میری قیمت نقد وصول کر کے میرا نکاح پڑھوایا ہے۔ مجھے اپنے مذہب کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کو مرد کی تفریح کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ میں ایک مرد کی تفریح کا ذریعہ بن گئی ہوں۔ میں اسے اپنا حق سمجھتی ہوں کہ اپنی تفریح کا کوئی ذریعہ پیدا کروں۔ وہ ذریعہ تم ہو۔ کہو اپنی کتنی قیمت مانگتے ہو۔ کیا میں اس ہندو لڑکی جتنی خوبصورت نہیں ہوں؟"

"میں تمہارے خاوند کی قبیل میں سے نہیں ہوں" ۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا ۔۔۔ "مجھے تمہارے حسن اور تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ اگر میں ایسا

ہوتا تو میں اس وقت دو نہیں تو ایک شادی ضرور کر چکا ہوتا۔ میری نظر نہ اپنے جسم پر ہے، نہ تمہارے جسم پر۔ تم بھی جسم سے توجہ ہٹا لو۔ مسلمان کی دولت اس کی روح ہوتی ہے۔ روح کو پاک رکھو۔"

"تم پگلے ہو" ـــ فاطمہ نے کہا ـــ "ڈرتے ہو۔ اپنے آپ کو فریب دیتے ہو۔ میرا جسم روح سے خالی ہے۔ جو عورت نیلام ہو جاتی ہے اُس کی روح مر جاتی ہے۔ تم میری روح کو زندہ کر سکتے ہو۔"

"پھر اپنے خاوند سے طلاق لو اور میری بیوی بن جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں" ـــ فاطمہ نے کہا ـــ "میں تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ سکتی ہوں۔ نقدی بھی ساتھ لاؤں گی، زیورات بھی۔ جہاں کہو گے چلوں گی" ـــ وہ اُس کے قریب آ گئی، باہیں اُس کے گلے میں ڈال کر جذباتی اور مخمور آواز میں بولی ـــ "تم میری زنجیروں سے نکل نہیں سکو گے۔ اپنے خاوند کے سوا میں کسی اور مرد کے جسم سے واقف نہیں۔ تمہیں میرے دل نے چاہا ہے۔ میرا جسم بھی پیاسا ہے، میری روح بھی پیاسی ہے۔"

"تم نفس کی آگ میں نہیں، انتقام کی آگ میں جل رہی ہو" ـــ عمران نے کہا ـــ "اس میں اپنے باپ کو جلاؤ جس نے نقدی لے کر تمہاری جوانی کے خواب اُس ہوس کار خاوند کے حوالے کیے تھے۔ پھر اس خاوند کو اس آگ میں جھونکو۔"

"تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اپنے خاوند کو زہر دے دوں تو مجھے یہاں سے کہیں دور لے جاؤ گے؟"

عمران بلاذری گہری سوچ میں کھو گیا۔ فاطمہ نے اُس کے پہلو میں بیٹھ کر ایک بازو اُس کے گلے میں ڈالا اور گال اُس کے گال سے لگا دیا۔ وہ تڑپ اُٹھا جیسے پنجرے میں بند کر لیا گیا ہو۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا"۔۔۔ اس نے فاطمہ کے بازو سے آزاد ہو کر پرے ہٹتے ہوئے کہا۔۔۔ "لیکن اپنے خاوند کو اُس روز زہر دینا جس روز میں کہوں گا۔ اس سے پہلے میں کہیں اور ذریعہ معاش کا انتظام کر لوں گا۔"

"دھوکہ تو نہیں دو گے؟"

"نہیں"۔

"مجھے اپنے گھر آنے سے تو نہیں روکو گے؟"

"نہ آؤ تو اچھا ہے"۔۔۔ بلاذری نے کہا۔۔۔ "کسی کو شک نہیں ہونا چاہیئے کہ تمہارا میرے ساتھ تعلق ہے۔"

فاطمہ مطمئن ہو کر چلی گئی مگر عمران بلاذری کا دم اس طرح گھٹ رہا تھا جیسے اس کی گردن پھانسی کے پھندے میں آگئی ہو۔ فاطمہ رشی جیسی خوبصورت تھی، اور وہ جذبات کا آتش فشاں پہاڑ تھی۔ اُس کے خاوند کا گھر اسی گلی کے آخر میں تھا جو امیرانہ ٹھاٹھ کی حویلی تھی۔ فاطمہ نے عمران بلاذری کو اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے کئی بار دیکھا تھا۔ اس نے کئی بار اس خوبرو مرد کو سلام کیا، پھر ایک غریب سی عورت کی زبانی ملاقات کے لیے پیغام بھیجے تھے مگر عمران اس سے پہلو بچا رہا تھا۔ آج رات فاطمہ نے ایک ہندو لڑکی کو عمران کے گھر سے نکلتے دیکھا تو رقابت نے اسے اتنا دلیر بنا دیا کہ وہ عمران کے گھر آگئی۔ عمران کو یوں محسوس ہُوا جیسے دہکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ فاطمہ نے اپنے خاوند کو زہر دینے کی تجویز پیش کی تو عمران بلاذری کو فرار کا راستہ نظر آگیا۔ اسے فاطمہ بتا چکی تھی کہ اس کا خاوند ایک ماہ بعد آئے گا۔ بلاذری نے سوچ لیا کہ ایک ماہ تک فاطمہ دھوکے میں رہے گی۔

حقیقت یہ تھی کہ عمران بلاذری کو رشی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اُسے بار بار ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ فاطمہ رشی سے کم خوبصورت نہیں تھی لیکن یہ دل کا معاملہ تھا مگر فاطمہ چلی گئی تو بلاذری کے سامنے اپنا فرض آگیا۔ وہ جاسوسی کے لیے آیا تھا اور اب تک اُس کا بہروپ کامیاب تھا۔ راج محل کی فوجی نوعیت کی سرگرمیوں پر

اُس کی نظر تھی۔ وہ سلطان سبکتگین تک کئی اطلاعیں اور معلومات پہنچا چکا تھا۔ اُس نے جذباتی لحاظ سے اپنے آپ کو پتھر بنا رکھا تھا مگر رشی اور فاطمہ نے اُسے ایسا دھکہ دیا کہ وہ جذبات کے سیلاب میں غوطے کھانے لگا۔ فرض اُس کے ہاتھ سے چھوٹتا نظر آنے لگا تنہائی میں اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی اور وہ سنبھل گیا مگر اُسے یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ یہ دو لڑکیاں آج رات کی طرح اُس کے پاس آتی رہیں تو وہ فرض کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اُس نے اس کا علاج یہ سوچا کہ وہ یہاں سے نقل مکانی کر جائے گا اور ان لڑکیوں کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ شہر کے کونسے کونے کھدرے میں رہتا ہے۔ اُسے یہ توقع تھی کہ وہ کسی بھی روز لاہور سے غزنی چلا جائے گا۔

وہ آخر انسان تھا، پتھر نہیں تھا۔ انسانی فطرت کی اس سب سے بڑی کمزوری جسے عورت کہتے ہیں، پر قابو پانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ چکی کے دو پتھروں میں آ گیا تھا۔

اگلی شام گہری ہوئی تو رشی آ گئی۔ عمران بلاذری گھر میں اکیلا تھا۔ یہ اُن کی دوسری ملاقات تھی لیکن انہیں یوں لگا جیسے وہ بچپن سے اکٹھے کھیلتے جوان ہوئے ہوں۔

"کل تم نے کہا تھا کہ میری لاش کو بھی نہیں جلنے دو گے" — رشی نے کہا — "تم نے ایسے کیوں کہا تھا؟"

"کل تم یہاں اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھیں" — بلاذری نے رشی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا — "آج کیوں آئی ہو؟"

"تمہیں دیکھنے"

"کیوں؟"

"تم مجھے اچھے لگتے ہو نا"

"اسی لیے میں تمہاری لاش نہیں جلنے دوں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "تم مجھے

اچھی لگتی ہو۔"

"میں نے کل تمہیں بتایا نہیں تھا"۔۔۔ رُشی نے کہا۔۔۔ "میری شادی بھی ایک فوجی کے ساتھ ہو گی۔"

"جو غزنی پر حملے کے لیے جائے گا"۔۔۔ بلاذری نے کہا۔۔۔ "اور تمہاری زندگی اپنی بہن کی طرح جلتی چتا پر ختم ہو جائے گی۔"

"یہ لوگ عورت کو انسان کیوں نہیں سمجھتے؟"۔۔۔ رُشی نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا۔۔۔ "انسانی قربانی لڑکی کی کیوں دی جاتی ہے؟ کسی مرد کو قربان کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"تمہارے مذہب میں تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں"۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا۔۔۔ "میرے مذہب میں انسانی قربانی کا رواج نہیں۔"

"میں زندہ نہیں جلنا چاہتی"۔۔۔ رُشی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔۔۔ "میرے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں، کوئی پناہ نہیں۔"

یہاں سے بات چلی تو اتنی دور پہنچ گئی جہاں عمران اور رُشی ایک ہو گئے۔ اُن کی محبت رُوحوں تک اُتر گئی۔ انہیں یہ بھی احساس نہ رہا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ وہ اپنے مذہب بھی بھول گئے۔ عمران بلاذری کو اپنے فرض کا بھی احساس نہ رہا۔ رُشی کو یقین ہو گیا کہ عمران اُسے پناہ میں لے لے گا۔ وہ جانے کے لیے یوں اُٹھی جیسے جانا نہ چاہتی ہو۔ اُسے جانا تھا اور وہ چلی گئی۔

دو تین روز بعد رُشی پھر عمران کے گھر گئی۔ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ جگ موہن نے باہر سے عمران بلاذری کو آواز دی۔

"تمہارا بھائی آیا ہے"۔۔۔ عمران نے رُشی سے کہا۔۔۔ "تم ساتھ والے کمرے میں چھپ جاؤ۔"

جب جگ موہن اس کمرے میں آیا، اُس کی بہن دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔

"تم نے مجھے گوشت کا ایسا عادی بنا دیا ہے کہ اپنے گھر کی سبزی ترکاری

کو دیکھ کر بھوک مار ہی جاتی ہے"۔ جگ موہن نے کہا۔ "گھر میں کچھ ہے"؟

عمران بلاذری نے گھر میں پکا ہُوا گوشت رکھا ہُوا تھا۔ وہ جگ موہن کے آگے رکھ دیا۔ جگ موہن نے یہ بھی نہ دیکھا کہ عمران نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ وہ سارا گوشت کھا گیا۔

● "قربانی کے لیے کوئی لڑکی چن لی گئی ہے یا نہیں"؟ — بلاذری نے پُوچھا۔

"ابھی نہیں" — جگ موہن نے جواب دیا — "معلوم نہیں پنڈتوں کو کس قسم کی لڑکی کی تلاش ہے"۔

"تمہاری بہن مندر میں جاتی ہے"؟

"نہیں" — جگ موہن نے کہا — "مگر میں سوچتا ہوں کہ اُسے کب تک چھپائے رکھیں گے"۔

عمران بلاذری اس کوشش میں تھا کہ جگ موہن جلدی چلا جائے۔ وہ اُس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ تھکن اور نیند کا بہانہ کام کر گیا، اور جگ موہن چلا گیا۔ رَشی دوسرے کمرے سے نکلی تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

"کیا میرے بھائی نے گوشت کھایا ہے"؟ — رَشی نے حیرت زدہ لہجے میں پُوچھا۔

"میں اس کا یہ راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا" — عمران نے جواب دیا — "مگر میں اُسے بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ساتھ والے کمرے میں ساری باتیں سُن رہی ہو..... وہ جب سے میرا دوست بنا ہے گوشت کھا رہا ہے۔ تمہارے دیوتاؤں نے تمہارے بھائی کو کوئی سزا دی ہے؟ مذہب صرف اُن چیزوں کی مخالفت کرتا ہے جن سے نشہ ہوتا ہے اور انسان کی عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ مجھے بتاؤ تم کب آؤ گی۔ تمہیں بھی گوشت کھلاؤں گا"۔

رَشی دو روز بعد آئی۔ عمران نے اُس کے لیے مرغی بھُون کے رکھی ہوئی تھی۔ رَشی نے ڈرتے ڈرتے کھائی، پھر بولی — "میں جب بھی آؤں میرے لیے گوشت رکھا کرو"۔

انہی دنوں عمران بلاذری کو حکم ملا کہ راج محل کے ایک کمرے میں غزنی کے دو قیدی لائے گئے ہیں جنہیں کھانا دینا ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مسلمان کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ عمران اُن کے لیے کھانا لے کر گیا اور اُس کی ملاقات نظام اوریزی اور قاسم بلخی سے ہوئی پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں، انہیں کیا ہدایات دیں اور کس طرح اُن کے فرار کی راہ ہموار کرتا رہا۔

اِس دوران رَشی اُس کے پاس آتی رہی۔ اب اس کی دو ہی فرمائشیں ہوتی تھیں۔ وہ آتے ہی گوشت مانگتی پھر یہ ضد۔ ”مجھے لاہور سے جلدی نکالو۔ گھر والے میری شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“

اگر نظام اوریزی اور قاسم بلخی نہ آجاتے تو عمران بلاذری کبھی کا رَشی کو ساتھ لے کر نکل گیا ہوتا۔ وہ رَشی کے ساتھ ہر بار ایک نیا جھوٹ بولتا تھا۔ اُسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے، اور غزنی کے دو قیدیوں کو فرار کرائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ فرض اور محبت کے درمیان پس رہا تھا۔ رَشی کی والہانہ محبت اور اُس کے آنسوؤں نے اُسے کئی بار فرض سے ہٹا دیا لیکن اوریزی اور بلخی کو دیکھ کر اُسے فرض یاد آجاتا تھا۔ اِن دونوں کے فرار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے کمرے کے باہر سنتری موجود رہتے تھے۔

ایک رات رَشی عمران کے گھر سے گئی تو فاطمہ آگئی عمران پر رَشی کے حسن اور اس کی محبت کا نشہ طاری تھا۔ وہ اُسی کے تصوّر سے دل بہلا رہا تھا۔ فاطمہ نے اُسے اتنے حسین تصوّر سے بیدار کر دیا۔ اُسے غصہ آگیا۔ فاطمہ کسی اور نشے میں آئی تھی۔ یہ نشہ جسمانی تھا۔

”میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا“۔۔۔ عمران نے غصے سے کہا ۔۔۔ ”اپنے خاوند کو واپس آنے دو۔“

”تم مجھے ٹال رہے ہو“۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ ”مانگو۔ اپنی کتنی قیمت

مانگتے ہو۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے فاطمہ!"

"تمہیں وہ ہندوانی چاہیئے" ___ فاطمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ___ "وہ جو تمہارے پاس آتی رہتی ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں پکڑوا سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں ہندوؤں کا راج ہے جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ تمہاری چوری پکڑی گئی تو سیدھے قید خانے میں جاؤ گے۔"

"میں اس سے پہلے لڑکی سمیت غائب ہو جاؤں گا" ___ عمران بلاذری نے کہا ___ "تم میرے پاس جو اُمید لے کر آئی ہو وہ پوری نہیں ہو سکے گی۔ رشی کے مقابلے میں میں تم جیسی بیس لڑکیوں کو دھتکار سکتا ہوں۔"

یہ عمران بلاذری کی بڑی خطرناک غلطی تھی۔ اُسے احساس نہیں تھا کہ رقابت عورت کو چڑیل بنا دیا کرتی ہے۔ فاطمہ کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا، اس سے وہ باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے شرم وحجاب اتار پھینکا تھا۔ وہ غصے سے چلی گئی۔

•

فاطمہ کو ہندو عورتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ پنڈت راجہ جے پال کی فتح کی خاطر ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے رہے ہیں لیکن انہیں اپنے مطلب کی لڑکی نہیں مل رہی۔ فاطمہ نے اگلا دن بڑی مشکل سے گزارا۔ رات کو وہ مندر میں چلی گئی۔ اُس نے ہندو عورتوں سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑا پنڈت کہاں رہتا ہے۔ وہ پنڈت کے پاس چلی گئی۔ پنڈت اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"آپ لڑکی کی قربانی کب دے رہے ہیں؟" ___ فاطمہ نے پوچھا۔

"جب ہمیں وہ خاص قسم کی لڑکی مل جائے گی" ___ پنڈت نے کہا "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں آپ کی مدد کرنے آئی ہوں" ___ فاطمہ نے کہا ___ "آپ کو علم نہیں کہ شہر کی تمام ہندو لڑکیاں مندر میں نہیں آتیں۔ میں آپ کو ایک لڑکی دکھاؤں گی۔ مجھے امید

ہے کہ وہ قربانی کے لیے موزوں ہوگی"۔ اُس نے رشی کے باپ کا نام لیا اور پوچھا —— "آپ نے اِس کی بیٹی کو کبھی دیکھا ہے"؟

"میں نے تمہیں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا"۔ پنڈت نے کہا —"تم کس کی بیٹی ہو؟"

"میں مسلمان ہوں" —— فاطمہ نے جواب دیا —— "اور ایک تاجر کی بیوی ہوں"۔

"تمہیں ہماری قربانی اور ہمارے مذہب کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے"؟ —— پنڈت نے پوچھا ۔"تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ بتاؤ"۔

یہ مندر کے ساتھ ملا ہوا ایک کمرہ تھا ۔کسی مسلمان کو مندر کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی مسلمان کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مسلمانوں کو ناپاک سمجھا جاتا تھا، مگر پنڈت کو جب فاطمہ کے متعلق پتہ چلا کہ وہ مسلمان ہے تو اُس نے اُسے گھر سے نکالا نہیں ۔وہ چونکا اور بدکا بھی نہیں ۔وہ جان گیا کہ یہ جوان سال اور حسین لڑکی کسی اور مقصد کے لیے آئی ہے ۔پنڈت گھاگھ اور خرانٹ آدمی تھا۔ اُس نے فاطمہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ تمہارے دل میں جو کچھ ہے بتا دو۔

فاطمہ تجربہ کار اور خرانٹ نہیں تھی ۔وہ تو رقابت اور اپنی توہین کی آگ میں جل رہی تھی۔ اُس کی عقل پر شیطانی قوتوں کا قبضہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے، اپنے خاوند سے، رشی سے اور عمران بلاذری سے انتقام لینے پر تُلی ہوئی تھی ۔ اُس کی تمام تر تخریبی قوتیں بچھو کے ڈنک کی طرح تیار اور مستعد ہو گئی تھیں ۔ اُس نے پنڈت کے سوال کے جواب میں اپنے کپڑوں کے اندر سے ایک پوٹلی نکالی اور پنڈت کے آگے رکھ کر کھول دی۔ اس میں سونے کے چند ایک سکّے تھے۔ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔

"میں نے جس لڑکی کا نام لیا ہے اس کی آپ انسانی قربانی دے دیں" —— فاطمہ نے رازداری کے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ لڑکی ہمارے مطلب کی نہ ہوئی تو؟"

"وہ کنواری ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "بہت خوبصورت ہے۔ عمر سولہ سترہ سال ہے۔ اگر وہ قربانی کے مطلب کی نہیں تو کبھی اس کی قربانی دے دیں۔"

"ہمارے مذہب میں دخل انداز نہ کرو لڑکی" ــــ پنڈت نے مذہبی پیشواؤں کے رعب سے کہا۔ "ہم ایک خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں۔"

"پنڈت جی مہاراج!" ــــ فاطمہ نے کہا ــــ "کوئی مذہب انسان کی قربانی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ رسم مذہب کے اُن ٹھیکیداروں نے شروع کی ہے جو اپنے مہاراجہ کو خوش کر کے انعام و اکرام لینا چاہتے ہیں، اور جو لوگوں پہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خداؤں اور دیوتاؤں کے خاص درباری ہیں اور وہ جس کسی کی بھی جان لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ آپ لوگ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت اونچا رکھتے ہیں۔"

"میرے مذہب کی توہین نہ کرو لڑکی" ــــ پنڈت نے دبے دبے غصے سے کہا ــــ "تم نہیں جانتی کہ اس کی سزا کیا ہے۔"

"میں صرف آپ کے مذہب کی بات نہیں کر رہی مہاراج!" ــــ فاطمہ نے کہا۔ "میرے مذہب میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ صرف انسانی قربانی نہیں دی جاتی۔ جہاں تک ہمارے اماموں اور مولویوں کا تعلق ہے، وہ آپ کی طرح مذہب کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اپنی آواز کو خدا کی آواز کہتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو خدا کا حکم بتلاتے ہیں، اور اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت بلند، خدا کے قریب سمجھتے ہیں۔ اس طرح مذہب کی اصلیت پر پردے پڑے رہتے اور انسان بھٹکتے پھرتے ہیں.... پنڈت جی مہاراج! آپ نے اپنا جو درجہ بنا رکھا ہے، اس سے نیچے آئیں۔ مجھے اس مندر کے کچھ ایسے راز معلوم ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کسی کو بھی معلوم نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب زخم آتا ہے یا چوٹ لگتی ہے، وہ درد سے کراہتا ہے اور اُس کے کراہنے کو وہ لوگ سن لیتے ہیں جن کے کان ہوتے ہیں۔"

"تم کمسن ہو لڑکی!" ــــ پنڈت کے لہجے میں رعب کی بجائے اپنائیت سی آگئی۔ کہنے

لگا۔ اس عمر میں تم ایسی باتیں کرتی ہو جو پختہ عمر میں بھی نہیں سوچی جاسکتیں۔"

"میرے دل کے زخموں نے مجھے پختہ کار بنادیا ہے"۔۔۔ فاطمہ نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ میری عقل کی نہیں میرے دل کی آواز ہے۔ میرا دل کراہ رہا ہے، سسکیاں لے رہا ہے۔

"وہ کون سے راز ہیں جو تم جانتی ہو؟"

"ایک یہ کہ میں حسین اور نوجوان نہ ہوتی تو آپ اتنا ہی سن کر کہ میں مسلمان ہوں مجھے دھکے دے کر اس کمرے سے نکال دیتے۔ کمرے کو دھلاتے، یہاں لوبان جلاتے، گھنٹیاں بجاتے، تب یہ کمرہ پاک ہوتا، مگر مجھے دیکھ کر آپ بھول گئے کہ مسلمان ناپاک ہوتا ہے۔ آپ نے سونے کے سکوں کو اٹھا باہر نہیں پھینکا۔ آپ کی زبان میں اور آپ کے الفاظ میں پنڈت موجود ہے مگر جن آنکھوں سے آپ مجھے اور سونے کے ان سکوں کو دیکھ رہے ہیں، ان سے پنڈت غائب ہو چکا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مجھے اپنا خاوند دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے میرے باپ کے ساتھ میرے حسن اور میری جوانی کا سودا کیا تھا۔ میں بکی ہوئی چیز ہوں۔ میں اب سودا کرنے سے نہیں ڈرتی۔ اپنے دل کی مراد کی خاطر میں سودا کرنے آئی ہوں۔"

"تم راز کی بات کر رہی تھیں۔"

"دل پر ہاتھ رکھیں اور سنیں"۔۔۔ فاطمہ نے کہا۔ "آپ کو انسانی قربانی کے لیے خاص قسم کی لڑکی صرف اس لیے نہیں مل رہی کہ آپ نے دو دولت والوں کی بیٹیوں پر ہاتھ رکھا لیکن زر و جواہرات لے کر آپ نے ان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا خاوند بہت بڑا تاجر ہے۔ وہ نام کا مسلمان ہے۔ وہ اپنے مذہب کا صرف ایک اصول جانتا ہے کہ ایک مسلمان بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اور اس کا دوستانہ ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ اُسے بہت سی باتیں معلوم ہیں۔۔۔ میں اپنے ایمان کو ایک طرف رکھتی ہوں۔ آپ اپنے دھرم کو اس دروازے سے باہر رکھ دیں۔ سونے کے یہ ٹکڑے گن لیں، اور سودا کریں۔ کچھ اور چاہیے تو بتادیں۔"

پنڈت کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جیسے بھیڑیئے نے کمزور سا

شکار دیکھ لیا ہو۔ یہ خندۂ دنداں نما تھا۔ وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ فاطمہ اس کے سامنے دو ہاتھ دور بیٹھی تھی۔ پنڈت کا ہاتھ فاطمہ کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھ کو دبوچ لیا۔ پنڈت کے دوسرے ہاتھ نے سونے کے سکوں والی پوٹلی اپنی طرف سرکا کر گھٹنے کے نیچے کر لی۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ پنڈت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

" میں کیسے یقین کر سکتی ہوں کہ میرا کام ہو جائے گا اور میرے ساتھ دھوکہ نہیں ہو گا؟"

" تم اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہونا؟" ـــ پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جو گناہ کے تصوّر سے شرابی کے قدموں کی طرح ڈگمگا رہا تھا ـــ " ہٹ جائے گی۔"

" اگر اس کے ماں باپ نے آپ کی مٹھی گرم کر دی تو کیا ہو گا؟"

" وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو۔"

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ پنڈت نے ایک ٹانگ لمبی کر کے ایک کواڑ بند کر دیا۔ فاطمہ نے ہاتھ لمبا کر کے دوسرا کواڑ بند کر دیا۔ رات خاموش تھی۔ مندر میں رکھا ہوا اندر کا بت خاموش تھا۔ پنڈت کے کمرے میں رکھی ہوئی مورتیاں خاموش تھیں۔ کشن مراری کی مرلی خاموش تھی۔ مندر کا سنکھ خاموش اور گھنٹیاں خاموش تھیں۔ رشی اپنے گھر اور عمران بلاذری اپنے گھر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ رہے ہونگے۔

مندر میں ان کے خوابوں کا سودا طے ہو چکا تھا۔

اگلے دن کا سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا عمران بلاذری کچھ دیر پہلے گھر سے اپنے کام کو جانے کے لئے نکلا تھا۔ وہ فاطمہ کے خاوند کی محل جیسی حویلی کے سامنے سے گزرا تو چلمن کی اوٹ سے اُسے فاطمہ کی سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز سنائی دی ـــ " عمران" ـــ وہ رُک گیا۔ چلمن سے جھانکتا ہوا فاطمہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے میں اُسے کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا" — فاطمہ نے کہا۔

عمران بلاذری کا خون کھولنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا اور چل پڑا۔ راج محل کے احاطے میں جا کر وہ اُسی کمرے میں گیا جہاں غزنی کے دو قیدی، نظام اور یزی اور قاسم بلخی کو رکھا گیا تھا جیسا کہ پہلے سنایا جا چکا ہے، اُن کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے مگر کمرہ کھلا نہیں تھا۔ کمرے کے باہر اور عقب میں دو چار سنتری موجود رہتے تھے۔ چونکہ راجہ جے پال اُن سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس لئے انہیں قیدیوں کی طرح زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں نہیں رکھا تھا۔ ان کی خاطر و تواضع کا ایسا انتظام تھا جیسے شاہی مہمانوں کا ہوتا ہے۔ ان کے مطالبے پر کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کوئی مسلمان کرے، یہ انتظام عمران بلاذری کے ہاتھ میں تھا۔ عمران بلاذری ان کے فرار کا بندوبست بھی کر رہا تھا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ وہاں سنتری موجود رہتے تھے۔ عمران غزنی کے ان دونوں قیدیوں سے کہتا رہتا تھا کہ وہ راجہ کو جھوٹ موٹ راز کی باتیں بتا کر اس کا اتنا اعتماد حاصل کر لیں کہ وہ ان کے کمرے کے پہرے سے سنتریوں کو ہٹا دے۔

نظام اور یزی اور قاسم بلخی نے سوچ لیا تھا کہ وہ راجہ جے پال کو کیا بتائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ راجہ کو پیش کش کریں کہ دونوں اسی کی فوج میں رہیں گے، اور پوری مہارت اور وفاداری سے اس کی فوج کو غزنی کی فوجی قیادت کی جنگی چالوں کے مطابق ٹریننگ دیں گے۔ اس طرح فرار کی صورت پیدا ہو سکتی تھی مگر راجہ جے پال لاہور سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ نئی فوج تیار کر رہا تھا اور پڑوسی ریاستوں سے بھی فوج اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ اسے غزنی پر حملہ کرنا تھا۔

اُس روز عمران بلاذری غزنی کے دونوں قیدیوں کے کمرے میں گیا تو بھی اس نے دونوں پر زور دیا کہ وہ راجہ کو گمراہ کریں اور اس کے منظورِ نظر بن جائیں۔

وہ جس وقت ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اُس وقت اس کی محبت پر موت جھپٹ رہی تھی۔ رات فاطمہ نے پورا انتظام کر دیا تھا۔ رشی اپنے گھر میں تھی۔

گھر میں تمام افراد موجود تھے۔ انہیں سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ گلی میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی دھمک دھمک بھی سنائی دی۔ بچوں کا شور وغل بھی سنائی دیا۔ رُشی بھی بچی ہی تھی۔ وہ بھی تماشہ دیکھنے باہر کو دوڑی۔ گلی میں ایک جلوس آرہا تھا جس کے آگے آگے بڑے مندر کا بڑا پنڈت تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ایک گھنٹی تھی جو وہ بجاتا آرہا تھا۔

اُس کے پیچھے چار پانچ پنڈت اور ان کے بالکے تھے۔ وہ سنکھ اور گھنٹیاں بجارہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک خوشنما پالکی تھی جو چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ پنڈت بھجن گنگناتے آرہے تھے۔ ان کے جلوس کے پیچھے تماشائیوں کا جلوس تھا۔

رُشی اپنے دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بڑا پنڈت اُس کے قریب آرُکا اور اُس کا نام پوچھا تب رُشی پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اُسے یاد آیا کہ اس کے باپ اور اس کے بھائی نے اسے پنڈتوں کی نظروں سے بچار کر رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا نام نہ بتایا۔

"اس کا نام رُشی ہے"۔ جانے یہ کس کی آواز تھی۔

رُشی کی ماں، اُس کا باپ اور بھائی بھی باہر آگئے تھے۔ رُشی پیچھے ہٹنے لگی۔ پنڈت کے چہرے پر حیرت اور مسرت کا تاثر تھا۔ رُشی اُس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"اندرا دیوی نے اسی کو مانگا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔

"نہیں مہاراج!"۔ رُشی کی ماں چلاتی ہوئی آگے آئی اور پنڈت اور اپنی بیٹی کے درمیان کھڑی ہو کر بولی "یہ وہ لڑکی نہیں ہے جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں"۔

رُشی اپنے دروازے کی طرف پیچھے ہٹنے لگی۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔ بڑے پنڈت نے پالکی آگے لانے کو کہا۔ پالکی آگے لاکر رکھ دی گئی۔

"یہ حکم دیوی کا بھی ہے مہاراجہ کا بھی"۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "اندرا دیوی نے جس کنواری کنیا کو مانگا ہے وہ جس گھر میں رہی اُس گھر پر تمام دیوی دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا۔ اُسے جس ماں نے جنم دیا ہے وہ ماں کوڑھی ہو کر آبادیوں سے دھتکاری

جائے گی.... یہ بیٹی تمہاری نہیں یہ دیوی کی امانت ہے۔ ہم اسے لے جا رہے ہیں"

رشی کو گھسیٹ کر پالکی میں دھکیلا جا رہا تھا اور وہ روتی چلاتی اور آزاد ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ پنڈتوں کے ساتھ آتے ہوئے ایک آدمی نے رومال جتنا ایک کپڑا رشی کی ناک اور منہ پر رکھ کر ہاتھ دبایا۔ رشی تڑپی اور فوراً ہی اس کا جسم ساکن ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کا سر ڈھلنے لگا۔ اُسے پالکی میں ڈال دیا گیا، پھر جس طرح یہ جلوس سنکھ اور گھنٹیاں بجاتا آیا تھا۔ اسی طرح واپس چلا گیا۔

محلے کے لوگ رشی کے ماں باپ کو مبارک دینے لگے کہ دیوی نے اُن کی بیٹی کی قربانی قبول کی ہے۔ مذہب کے کٹر پیروکار رشی کے ماں باپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر جن کی اتنی پیاری بیٹی کو پنڈت ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے، ان کے دلوں کا حال کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے کانوں میں ابھی اُس بیٹی کی چیخیں گونج رہی تھیں جیسے چند ہی دن پہلے اس کے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا تھا۔

شام کے بعد عمران بلاذری گھر آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد جگ موہن آ گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رشی کو پنڈت لے گئے ہیں۔ بلاذری کو تو جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جگ موہن نے بتایا کہ پنڈتوں کو کسی نے بتایا ہو گا کہ رشی مندر میں نہیں جاتی اور یہی لڑکی قربانی کے لیے موزوں ہے۔

"تم معلوم کر سکتے ہو کہ اسے کہاں رکھیں گے؟" — عمران بلاذری نے پوچھا — "اور اس کی جان کی قربانی کب دیں گے؟ .... معلوم کرو جگ موہن! میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا۔"

"اُسے بڑے مندر میں ہی لے گئے ہوں گے" — جگ موہن نے کہا — "میں نے سُنا ہے کہ انسان کی قربانی یوں نہیں دی جاتی کہ کسی کو پکڑا اور اُسے مار ڈالا۔ اُسے بہت دن پنڈت اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اُسے پاک کرتے ہیں تیار کرتے ہیں اور معلوم نہیں اس پر کیا عمل کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے کہنے لگتا ہے کہ مجھے دیوی

کے چرنوں میں قربان کر دو.... میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا مگر تم اسے بچا نہیں سکو گے۔ اگر بچا لاؤ گے تو ہم اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکیں گے۔ اُسے پھر لے جائیں گے، اور ہمارے ساتھ تمہارے لیے بھی مصیبت آجائے گی"— وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ذرا سنبھلا تو بولا— "میں اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب سے گھِن آنے لگی ہے۔"

"تمہارے مذہب میں گھِن کے سوا ہے ہی کیا؟"— عمران بلاذری نے کہا — "اپنی مذہبی کتابیں پڑھ کر دیکھ لو۔ بھگوت گیتا، رامائن اور مہا بھارت پڑھو۔ یہ جنسیت اور بربریت سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں عہد شکنی اور دھوکہ دہی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ دیویاں اور دیوتا جنسی اختلاط کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک سے ایک شرمناک بات لکھی ہے۔ عورتوں اور بچوں کے قتل کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری بہن کو فوراً قتل کر دیں تو زیادہ اچھا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ جب تک زندہ رہے گی، پنڈت اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

جگ موہن کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس کا چہرہ لال ہوتا چلا گیا۔

"تم اپنے پتھر کے خداؤں سے ڈرتے ہو"، عمران بلاذری نے کہا— "تم ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے ان کا کوئی ڈر نہیں۔ میں تمہاری دیویوں اور دیوتاؤں سے تمہاری بہن چھین لاؤں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو تمہاری بہن بھی اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔"

"کہاں؟"

"یہ اُس وقت بتاؤں گا"، عمران بلاذری نے کہا— "لیکن تم دونوں کو میرا مذہب قبول کرنا پڑے گا۔"

"مجھے منظور ہے"— جگ موہن نے کہا— "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم ہم دونوں کو یہاں سے کہیں دُور لے جاؤ تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، اور رتی تمہاری بیوی ہو گی۔"

"لیکن میں رتی کو اس لالچ پر نہیں بچاؤں گا کہ اسے اپنی بیوی بناؤں گا"—

عمران بلاذری نے کہا ۔" میں تمہارے دیوتاؤں کو شکست دینا چاہتا ہوں ۔ میں بھیڑیوں کے منہ سے شکار چھیننے کا تہیہ کر چکا ہوں ۔ اس کی خاطر میں جان دینے کو تیار ہوں ۔ میں تمہارے راجہ کو بتاؤں گا کہ پتھر کے خدا، مسلمان کے سچے خدا کے سامنے بے جان پتھر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ..... تم چلے جاؤ جگ موہن! آرام کی نیند سو جاؤ ۔"

جگ موہن چلا گیا ۔ عمران بلاذری کی جذباتی کیفیت آگ کی مانند تھی جیسے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو ۔ پہلے وہ غزنی کے دو جنگی قیدیوں کو فرار کرانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا ۔ ان کے فرار کو وہ صرف اس لیے ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ وہ قید سے نکل جائیں بلکہ اس لیے کہ راجہ جے پال ان کی خاطر و مدارات مہمانوں کی طرح کر رہا تھا ۔ بلاذری کو ایک دو دنوں سے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ اور یہ دونوں جوان ہیں اور راج محل میں ایسی ایسی خوبصورت اور شوخ لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک بھی ان دونوں کے کمرے میں داخل کر دی گئی تو دونوں اپنے ملک اور اپنے مذہب کو بھول جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ راجہ کی فوج کے ہو کے رہ جائیں گے اور غزنی کی فوج کے لیے خطرہ بن جائیں گے ۔

عمران بلاذری ان کے فرار کے لیے پریشان ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی رشی کا فرار بھی اس کے کندھوں پر آ پڑا ۔ وہ رشی کو دل میں بسا چکا تھا ۔ اس طرح یہ اس کے لیے ذاتی جذبات کا مسئلہ بن گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس نے ایک چیلنج بنا لیا جیسے ہندوؤں کے دیوتاؤں نے مسلمان کے خدا کو للکارا ہو ۔ اس طرح اسے اس نے مذہب کا معاملہ بنا لیا تھا ۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا سوچتا رہا، حتیٰ کہ اس کا دماغ تھک گیا ۔

اس نے اوپر دیکھا اور اس جذباتی کیفیت میں اسے ایسے لگا جیسے چھت میں ایک ستارہ چمکا ہو ۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے ۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ اس کی زبان اپنے آپ چل پڑی ۔

" خدائے ذوالجلال! میں جو کچھ کر رہا ہوں، تیرے نام پر کر رہا ہوں ۔ مجھے ہمت اور استقلال عطا فرما کہ میں کفر کی اس دھرتی پر ثابت کر سکوں کہ تیرا نام برحق ہے، اور تیری

ذات سچی ہے۔ مَیں کوئی گناہ نہیں کر رہا میری نیت میں گناہ ہوتا تو فاطمہ مجھ سے ناراض ہو کر نہ جاتی۔ تُو دیکھ رہا تھا کہ اس دلکش لڑکی نے مجھے کیسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور مَیں کس طرح اس میں پُورا اترا تھا۔ مجھے روشنی دِکھا میرے پروردگار! میری مدد کر۔ اگر مَیں اپنی ذات کے لیے کچھ کر رہا ہوں تو میری جان لے لے۔ مجھے گناہ کے لیے زندہ نہ رہنے دے۔ اپنے نام کی لاج رکھ لے خدائے ذوالجلال!"

اُس نے منہ پر ہاتھ پھیرے تو اس کا ذہن خالی ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں بگولا سا اُٹھا۔ وہ بہت تیزی سے لکڑی کے بکس تک گیا۔ بکس کھولا اور اس میں سے خنجر نکال کر اپنے کُرتے کے نیچے ناف میں اُڑس لیا۔ وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

اُس کی چال ایسی تھی جیسے اس کے قدم خود بخود اُٹھ رہے ہوں اور اُس کا دماغ کسی اور طرف جا رہا ہو۔ وہ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا، حتیٰ کہ گلیاں ختم ہو گئیں۔ وہ درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ وہ رُک گیا۔ اُس نے پگڑی کھول کر اس طرح باندھ لی کہ اس کا چہرہ بھی ڈھانپا گیا۔ وہ چل پڑا۔ اندھیرے میں بھی اُسے مندر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جاسوس تھا۔ اُسے شہر کے کونے کھدرے سے واقفیت تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑا پنڈت مندر کے ساتھ رہتا ہے۔ رُشی یہیں ہو سکتی تھی۔

عمران بلاذری رُک گیا اور کچھ سوچا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ رُشی اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ واپس اپنے گھر نہیں جائے گا یہیں سے پشاور کا رُخ کر لے گا.... اُس نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ یُوں رُک گیا جیسے کسی غیر مرئی انسان نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا ہو۔ اسے نظام اور یزی اور قاسم بلخی کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچ بھی بیدار ہو گئی کہ رُشی کو بدکا لے جانا اس کی اپنی ذات کے لیے ہو گا۔ اُس کا اصل فرض ان دونوں قیدیوں کو رہا کرانا تھا۔

وہ پریشان ہو گیا اور آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے یہ احساس ہو گیا کہ اُسے احتیاط کرنی ہے۔ وہ دبے پاؤں چلتا مندر تک پہنچ گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ گھوم کر ادھر گیا جدھر پنڈت کا گھر تھا۔ یہ مندر ہی کا حصہ تھا۔ وہ دروازے سے چند قدم

دُور تھا کہ دروازہ کھلا۔ کمرے کی روشنی باہر آئی، اور اس روشنی میں اُسے ایک عورت اندر سے نکلتی دکھائی دی۔ پنڈت بھی باہر آیا۔ بلاذری بیٹھ گیا۔ وہاں درخت اور پودے تھے۔ وہ پاؤں پر سرکتا آگے ہُوا اور ایک پودے کی اوٹ میں آگیا۔ اس نے عورت کو پہچان لیا۔ وہ فاطمہ تھی۔

"اب اطمینان سے جاؤ" پنڈت نے اُسے بازوؤں میں لیتے ہُوئے کہا۔ "تمہارا کام ہوگیا ہے"۔

"اگر میں اُسے یہاں دیکھ لیتی تو مجھے اطمینان ہو جاتا کہ میرا کام ہوگیا ہے"۔ فاطمہ نے کہا۔ "دیکھ لیں، مَیں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو کیسی قیمت دے رہی ہوں"۔

"تو تم پھر اُسی وہم میں پڑ گئی ہو"۔ پنڈت نے کہا۔ "اُسے میں یہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُسے ٹیلوں کے مندر میں پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ اُسے کل ہی ختم کر دیا جائے تو ایسا نہیں ہوسکے گا۔ ہمارا ایک خاص طریقہ ہے۔ یہ قربانی پہلی بار نہیں دی جارہی۔ میں اپنی زندگی میں ایسی چار لڑکیوں اور دو بچوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ اس لڑکی کو ہم کم از کم ایک چاند ٹیلوں کے مندر میں رکھیں گے۔ اسے اس طرح تیار کریں گے کہ اس کی جون ہی بدل جائے گی، پھر یہ اپنی زبان سے کہے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ یہ اپنی زبان سے قربانی کا مقصد بیان کرے گی ... میں نے تمہارا مقصد پورا کر دیا ہے۔ وہ

فاطمہ کے پیچھے چلا گیا۔ آگے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ عمران فاطمہ کی دلیری پر حیران ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ اُسے قتل کرنے پر تیار ہو گیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ فاطمہ بہت تیز چلی جا رہی تھی اور عمران بلاذری اسی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ وہ اس کے قریب ہو گیا۔ فاطمہ رک گئی۔

"تمہارا باقی مقصد پورا نہیں ہو گا فاطمہ!"۔ عمران نے اُسے کہا۔ "تم نے اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا جو اوچھا طریقہ استعمال کیا ہے اس کی سزا تم اسی دنیا میں بھگتو گی۔"

"او ....." فاطمہ گھبرا گئی اور بولی۔ "میں ڈر گئی تھی کہ کوئی اور ہے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جہاں سے تم آ رہی ہو"۔ عمران نے کہا۔ "میں چاہوں تو تمہیں یہیں قتل کر سکتا ہوں۔ تمہیں غائب کر سکتا ہوں۔ تمہارے خاوند کو بتا سکتا ہوں کہ تمہاری کرتوت کیا ہے۔ کیا تم اس طرح مجھ پر قبضہ کر سکو گی؟"

فاطمہ تو جیسے مر ہی گئی تھی۔

"بولو۔ جواب دو"۔ عمران بلاذری نے گرج کر کہا۔

"ایک ہندو لڑکی کے لیے تم اتنا پریشان ہو رہے ہو؟"۔ فاطمہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میری بات غور سے سن لو"۔ عمران نے کہا۔ "پھر کبھی تم اس مندر میں آئیں تو زندہ واپس نہیں جا سکو گی۔ میرے گھر میں آؤ گی تو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ میں تمہیں گھر سے باہر نہ دیکھوں۔ اگر تم نے اس پنڈت کو یا کسی اور کو بتا دیا کہ میں تمہیں یہاں ملا تھا تو تمہارا انجام بڑا ہی بھیانک ہو گا۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا ہے"۔ فاطمہ اس کے پاؤں میں گر پڑی۔ "میں نے تمہاری ذات میں اپنی نجات دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس ہندو لڑکی کو تم نے اپنی تفریح کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کے

اتنے دیوانے ہو۔"

"یہاں سے غائب ہو جاؤ۔"

"مجھے بخش دو عمران!" فاطمہ نے روتے ہوئے کہا — "ایک ہندو لڑکی کی خاطر ایک مظلوم مسلمان لڑکی کو نہ دھتکارو۔"

"تم مظلوم نہیں ظالم ہو" — عمران بلاذری نے اُسے اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ پیچھے کو گری — "میں تمہیں بخش سکتا ہوں، تمہیں خدا نہیں بخشے گا۔ تم تڑپ تڑپ کر مروگی عمر کا پل پل سزا بھگتوگی۔ راتوں کو چین کی نیند نہیں سو سکوگی۔"

عمران اُسے زمین پر بیٹھا چھوڑ کر چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اُسے فاطمہ کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے اُسے پکارا "عمران"۔

عمران بلاذری رک گیا۔ فاطمہ دوڑی آ رہی تھی۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ بولی — "مجھے گھر پہنچا دو۔ ڈر آتا ہے۔ میں نے یہاں کچھ دیکھا ہے۔ کوئی چیز تھی۔ روشنی ہوئی تھی۔ اس میں مجھے رتی نظر آئی اور روشنی کے ساتھ ہی غائب ہوگئی۔ تم نے روشنی دیکھی تھی؟ بجلی چمکی تھی!"

"ایک عورت کو اس تنہائی میں ڈراتے مجھے شرم آتی ہے" عمران نے کہا — "لیکن یہ جان لو کہ بے گناہ لڑکی کا خون تم پر اسی طرح بجلی کی طرح چمکتا اور کوندتا رہے گا۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو" — فاطمہ نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں اکیلی نہیں پہنچ سکوں گی۔ مجھ پر رحم کرو عمران!"

عمران اُس کے ساتھ چل پڑا۔ فاطمہ نے اُس کا ایک بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی اور چلتی جا رہی تھی۔ تمام راستہ عمران خاموش رہا۔ فاطمہ بدکتی، چونکتی اور کانپتی رہی۔ اس کا گھر آگیا تو عمران رک گیا۔

"میں کیا کروں عمران؟" فاطمہ نے اس طرح پوچھا جیسے یخ ٹھنڈ سے اس کے دانت بج رہے ہوں۔

"— گناہ کا کفّارہ ادا کرو" عمران نے کہا۔

"کیسے؟"

"جب ارادہ کروگی تو مجھے بتانا"۔ عمران نے کہا۔ "میں کوئی طریقہ بتا دوں گا۔ اب چلی جاؤ"۔

عمران اپنے گھر کو چل پڑا۔

اگلے روز عمران بلاذری راج محل میں گیا اور حسبِ معمول نظام اوریزی اور قاسم بلخی کو ناشتہ دیا۔ اُسے پتہ چلا کہ راجہ جے پال آگیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد راجہ نے دونوں قیدیوں کو بلا لیا پچھلے باب میں سنایا جا چکا ہے کہ راجہ کے ساتھ ان کی کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق راجہ جے پال کو محمود غزنوی کی جنگی چالوں کے متعلق بے بنیاد باتیں بتائیں اور یہ بھی کہا کہ وہ راجہ کی فوج کو عملی طور پر یہ چالیں اور ان کا توڑ سکھا دینگے۔ انہوں نے شرط یہ پیش کی کہ انہیں قید سے رہائی نہ دی جائے صرف سنتری ہٹا دیئے جائیں تاکہ قید کا تصور ختم ہو جائے۔ انہوں نے راجہ پر ایسا اعتماد پیدا کر لیا کہ راجہ نے اُسی وقت ان کے کمرے پر پہرہ دینے والے سنتریوں کو ہٹا دینے کا حکم دے دیا۔

نظام اوریزی اور قاسم بلخی واپس اپنے کمرے میں آئے تو انہوں نے عمران بلاذری کو خبر سنائی کہ راجہ جے پال کو اطلاع ملی ہے کہ سلطان سبکتگین فوت ہو گیا ہے اور اب اس کا بیٹا محمود سلطان ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ راجہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد غزنی پر حملہ کرے گا اور وہ خوش ہے کہ سبکتگین مر گیا ہے۔ اسے توقع ہے کہ وہ محمود کو آسانی سے شکست دے سکے گا۔

اس خبر نے تینوں کو پریشان کر دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ سبکتگین کی وفات کا غزنی کی فوجی قیادت پر کیا اثر پڑے گا۔ اوریزی اور بلخی نے محمود کو ایک یا دو دستوں کی کمان کرتے اور لڑتے دیکھا تھا۔ اس حد تک وہ مطمئن تھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ محمود سپہ سالاری کی کتنی کچھ قابلیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے باپ کی طرح کم فوج سے اتنے زیادہ لشکر کو شکست دے سکے گا یا نہیں۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ قید سے فوراً فرار ہو کر غزنی پہنچ جاتے اور سلطان محمود کو راجہ جے پال کے عزائم اور جنگی طاقت سے آگاہ کیا جاتے۔

عمران بلاذری نے انہیں رتنی کے متعلق بتا دیا کہ یہ ہندو لڑکی اُسے دل و جان سے

چاہتی ہے اور وہ اسلام قبول کرنے کو تیار تھی مگر پنڈتوں نے اُسے انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ بلاذری نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ ان دونوں کو لاہور سے نکال دے گا لیکن اس لڑکی کو پنڈتوں کے چنگل سے ضرور آزاد کرائے گا۔ وہ اسے بھی اپنا فرض اور چیلنج سمجھتا تھا۔

کمرے کے سنتری ہٹائے جا چکے تھے۔ عمران بلاذری نے اُسی رات انہیں فرار کرانے کا ارادہ کر لیا۔

عمران ان کے لیے رات کا کھانا معمول سے کچھ دیر بعد لے گیا۔ کچھ وقت ان کے پاس بیٹھا رہا، پھر برتن اٹھائے، راج محل کے محافظوں وغیرہ کے سامنے گزرا۔ کہیں رکا، کہیں گپ شپ لگائی اور سب کے سامنے یوں باہر نکلا جیسے اپنے گھر کو چلا گیا ہو، مگر وہ صرف باہر نکلا تھا، گھر نہیں گیا تھا۔ وہ اُس طرف چلا گیا جدھر باغ تھا۔ وہاں رات کو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ باغ اور راج محل کے احاطے کے درمیان دیوار تھی جو اتنی بلند تھی کہ اکیلا آدمی نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ دن کے وقت عمران نے دونوں قیدیوں کو کمرے کی کھڑکی کی یہ دیوار دکھائی تھی۔ اس نے ایک درخت بھی انہیں دکھایا تھا جو دیوار سے باہر تھا۔ اس کی ٹہنیاں دیوار پر آئی ہوئی تھیں۔

مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق نظام اوریزی اور بلجی اپنے کمرے سے نکلے اور چھپتے چھپاتے کمرے سے دُور چلے گئے۔ راج محل میں تو جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ ملازم بھاگ دوڑ رہے تھے۔ محل کے اندر رقص ہو رہا تھا۔ سازوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سجی سجائی گھوڑا گاڑیاں آرہی تھیں۔ شاید دوسری ریاستوں کے مہاراجے بھی آئے ہوئے تھے۔ جشن کا سا سماں تھا۔ باہر بھی جگہ جگہ بڑے شعلوں والی مشعلیں جل رہی تھیں۔ اوریزی اور بلجی کے لیے یہ مشعلیں مشکل پیدا کر رہی تھیں۔ وہ دیواروں کی اوٹ میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ احاطے کی دیوار کی وہ جگہ ابھی دُور تھی جہاں انہیں پہنچنا تھا۔ وہ جدھر جاتے کوئی نہ کوئی آدمی سامنے سے گزرتا نظر آجاتا۔

وہ اُس مقام تک پہنچ گئے۔ وہاں تک کسی مشعل کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق اوریزی نے ایک پتھر اٹھا کر دیوار پر آہستہ آہستہ دو چار مرتبہ مارا۔ اس کے فوراً بعد دیوار سے ایک رسّہ آیا۔ دونو قیدی باری باری رسّے سے اوپر چڑھ گئے۔

"رسّہ باہر پھینک دو" — انہیں نیچے سے عمران بلاذری کی آواز سنائی دی — "اور اس درخت سے نیچے آجاؤ۔"

دونوں نے باری باری درخت کی ٹہنیاں پکڑیں اور جھولتے ہوئے دیوار سے پرے چلے گئے۔ انہوں نے ٹہنی کو پکڑا اور نیچے اُتر گئے۔ انہوں نے رسّہ اُٹھا کر لپیٹا۔ عمران اُن کے لیے لمبے چغے لے آیا تھا جن میں وہ کندھوں سے ٹخنوں تک ڈھانپے گئے۔ راج محل کے باہر کی دُنیا سوگئی تھی۔ تینوں اطمینان سے خطرے کے علاقے سے دُور چلے گئے اور عمران انہیں اپنے گھر لے گیا۔

"یہاں سے ہمیں جلدی نکل جانا چاہیئے" — اوریزی نے کہا — "گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے"؟

"تم یہاں سے اتنی جلدی نہیں جاسکو گے" — عمران نے کہا — "صبح جب راجہ جے پال کو تمہارے فرار کی اطلاع ملے گی تو وہ تمہارے تعاقب کا حکم دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ بھی نہ کرے وہ بہت مصروف ہے۔ میری نظریں اور میرے کان اُسی پر لگے رہتے ہیں۔ غزنی سے یہ جو دوسری شکست کھا کر آیا ہے، اس نے اسے باؤلا کر رکھا ہے۔ ابھی تک یہ فوج کی کمی پوری نہیں کر سکا۔ پوری قوم اس کی مدد کر رہی ہے لیکن یہ صرف مالی مدد ہے دوسرے راجے مہاراجے اسے اپنی فوجیں دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔ اس نے ساز و سامان تو بہت جمع کر لیا ہے لیکن ضرورت فوج کی ہے۔ یہاں کا دستور یہ ہے کہ کوئی راجہ دو بار شکست کھا جائے تو اُسے اپنے جانشین کے حق میں راج سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ راجہ جے پال کے دو حملے ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ہے جس نے اسے تیسرے حملے کی اجازت دے دی ہے۔ لہٰذہ اب راجہ جے پال ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے انتظامات کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس مصروفیت

میں وہ تمہارے فرار کی پرواہ ہی نہ کرے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شہر کی تلاشی اور تمہارے تعاقب کا حکم دے دے۔ مجھے کل اس کا ردّعمل معلوم کرنا ہے میں تمہیں اس کے مطابق یہاں سے نکالوں گا یا کچھ دن یہیں چھپائے رکھوں گا۔"

نظام اور یزی اور قاسم بلخی جاسوس نہیں تھے فوج کے عہدیدار تھے۔ میدان کے مجاہد تھے اور شبخون مارنے کی مہارت رکھتے تھے۔ بلاذری تجربہ کار جاسوس تھا، اس لیے اس کی سوچ ان دونوں سے مختلف تھی۔ اس نے انہیں کہا ۔۔۔"اگر تمہیں یہاں زیادہ دن رکنا پڑا اور راجہ جے پال نے کوچ میں جلدی کی تو ہم تینوں اس کے کسی نہ کسی ذخیرے کو آگ لگا دیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"کیا ممکن نہیں ہو سکتا؟" ۔۔۔ عمران نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ کام اس راجہ کے دوسرے حملے سے پہلے ہو سکتا تھا مگر یہاں اپنے جو آدمی تھے وہ آپس میں لڑ مرے۔ ان کی لاشوں کے ساتھ ایک لڑکی کی بھی لاش ملی تھی۔ ان کی آپس کی لڑائی کی وجہ شاید یہی تھی۔ ہم اتنے ناکام ہوئے کہ غزنی بروقت اطلاع نہ بھیج سکے کہ حملہ آ رہا ہے۔"

"تم بھی تو ایک لڑکی کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"لیکن میں اپنے فرض کو اس چکر میں نہیں ڈالوں گا" ۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا ۔۔۔ "میں ایک لڑکی پر غزنی کی عظمت کو قربان نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں تم دو لوگوں کو اس لڑکی پر قربان کر دوں لیکن یہ انتظام ضرور کروں گا کہ راجہ جے پال کا لشکر غزنی پر حملے کے لیے جائے تو غزنی سے دور اور پشاور کے قریب غزنی کی فوج راجہ کا استقبال کرے۔ میرے پاس خبر بھیجنے کا انتظام موجود ہے۔"

"سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان محمود پوری فوج کی کمان کر سکے گا یا نہیں" ۔۔۔ قاسم بلخی نے کہا ۔۔۔ "اسے بہت جلدی خبر مل جانی چاہیے۔ وہ پڑوس کی مسلمان ریاستوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑا ہوا ہو۔"

"غزنی کے حالات کا ہمیں کوئی علم نہیں" ۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا۔

سلطنتِ غزنی کے حالات مخدوش تھے سبکتگین کی وفات نے اُن مسلمان حکمرانوں کو پھر سے بیدار کر دیا تھا جنہیں سبکتگین نے دبا لیا تھا۔ اُن کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محمود میں وہ صلاحیت نہیں جو اُس کے باپ میں تھی، مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ سبکتگین عمل سے پہلے سوچ بچار زیادہ کرتا تھا۔ اپنے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں سے وہ لڑائی کی بجائے دوستی چاہتا تھا۔ محمود سوچ بچار میں تیز اور عمل میں تیز تر تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں تھا۔ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔

غزنی کی سلطنت کی کیفیت یہ تھی کہ کاشغر میں ایلخانیوں کی حکومت تھی۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ دوسری طرف بخارا میں سامانی حکمران تھے۔ یہ بھی مسلمان تھے تیسری طرف آلِ زیاد کی ریاست تھی، اور چوتھی طرف غوریوں کی بادشاہی تھی۔ سلطنتِ غزنی ان میں گھری ہوئی تھی۔ ان تمام ریاستوں کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی جیسے ایک مملکت کے صوبے ہوں مگر سب کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں وہ متحد نہیں تھے۔ وہ اسلام کے رشتے کو بھی بھلا بیٹھے تھے۔

ایک روز اُسے اطلاع ملی کہ بخارا کے بادشاہ نے خراسان کا علاقہ اپنے ایک امیر توزون بیگ کو دے دیا ہے۔ خراسان سلطنتِ غزنی کا علاقہ تھا سلطان محمود نے شاہِ بخارا کو پیغام بھیجا کہ ہم تو اتحادی تھے، آپ کی اس کارروائی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ہم دوستی ختم کر دیں۔ آپ خراسان سے ہاتھ اُٹھا لیں تا کہ ہمارا اتحاد برقرار رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی متحدہ فوج ہم پر حملے کے لیے آ رہی ہے۔

بخارا سے ایسا جواب آیا جیسے سلطان محمود غزنوی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اُسے [illegible] گیا کہ بلخ، ترمذ اور ہرات کے علاقے آپ کے پاس ہیں۔ ہم باقی علاقے اُن امرا میں تقسیم کر رہے ہیں جو ہمارے وفادار ہیں۔ سلطان محمود نے صلح صفائی کی ایک اور کوشش یوں کی کہ اپنے ایک حاکم ابوالحسن جمومی کو بیش قیمت تحائف دے کر بخارا بھیجا۔ اس نے ان الفاظ کا پیغام لکھا کہ میں نے یقین نہیں کیا کہ بخارا کے دربار سے مجھے یہ توہین آمیز جواب ملا ہے، نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے خاندانِ سامانی کی دوستی

ترک کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

اس پیغام کا کوئی جواب نہ آیا اور سلطان محمود کا ایلچی ابوالحسن جموی بھی واپس نہ آیا۔ تھوڑے عرصے بعد سلطان محمود کے ایک جاسوس نے اُسے بتایا کہ ابوالحسن جموی کو بخارا کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔ سلطان محمود نے یہ خبر سنتے ہی اپنے منتخب دستوں کو خراسان کے مرکزی شہر نیشاپور کی طرف پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ یہ بہت ہی تیز پیشقدمی تھی۔ نیشاپور کے امیر توزدن بیگ کو اُس وقت پتہ چلا جب سلطان محمود کی فوج شہر کے مضافات میں پہنچ چکی تھی۔ توزون بیگ بغیر مقابلے کے شہر سے نکل گیا اور بخارا جا کر شاہ منصور کو اطلاع دی۔ شاہ منصور سلطان محمود کے مقابلے کے لیے آیا۔

توزون بیگ نے حکمرانی کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اُس نے قوم کے ایک غدار امیر فائق کو جال میں پھانس لیا۔ یہ وہی امیر فائق ہے جو سلطان سبکتگین کی زندگی میں بھی خانہ جنگی کا باعث بنا تھا۔ آخر اُسے بھاگنا پڑا تھا۔ اب وہ پھر توزون بیگ کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ توزون سازشی ذہن کا آدمی تھا۔ اُس نے امیر فائق کو ساتھ ملا کر اپنے محسن شاہ بخارا کو گرفتار کر لیا اور اُس کی آنکھیں نکال دیں۔ شاہ بخارا کا چھوٹا بھائی عبدالملک ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ توزون اور فائق نے اُسے سامانی گدی پر بٹھا دیا۔

یہ لوگ جو بظاہر سلطان محمود کے خلاف متحد تھے، اندر سے آپس میں بھی پھٹے ہوئے تھے۔ محمود غزنوی نے ان کی فوج کو اپنی پسند کے میدان میں گھسیٹ لیا۔ غداروں نے مقابلہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سلطان محمود کے عتاب کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ توزون بیگ ایسا بھاگا کہ پھر اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ امیر فائق ایسا بیمار پڑا کہ چند دنوں بعد مر گیا۔

کاشغر کا حکمران ایلغ خان تھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ جنگی اور سیاسی حالات کیا ہیں۔ وہ یہی جان سکا کہ خانہ جنگی ہو رہی ہے جس سے اُسے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ آگے بڑھا اور شاہِ بخارا کے چھوٹے بھائی عبدالملک کو قتل کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ عبدالملک کے قتل سے ایلغ خان کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا کیونکہ سلطان محمود قہر اور عتاب سے سب پر چھا گیا تھا۔ اُس نے بلخ اور

خراسان کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا۔

اس خانہ جنگی کی روئیداد اتنی مختصر نہیں جتنی سنائی گئی ہے۔ یہ داستان بڑی ہی طویل اور بڑی ہی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔ سلطان محمود کی اُس فوج کو خاصا جانی نقصان پہنچا جو وہ ہندوستان کے مہاراجوں کا حملہ روکنے اور جوابی حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اُس کے خلاف جن فوجوں کو لڑایا گیا وہ بھی مسلمان فوجیں تھیں جن میں اتحاد ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی جو غدار اور باغی امراء بھاگ گئے تھے، اُن کے گھروں سے یہودی، عیسائی اور ہندو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ وہاں جو لوگ پکڑے گئے، انہوں نے بتایا کہ ان حکمرانوں اور امراء کو غیر مسلموں سے مدد اور رشوت ملتی تھی۔ ہندوستان سے ہندو لڑکیاں قرامطی فرقے کے سربراہ بھیجا کرتے تھے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا تھا مگر اس کے عقیدے غیر اسلامی تھے۔ یہ فرقہ عیسائیوں کی تخلیق تھا۔ یہی عیسائی سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبی کہلانے لگے تھے۔

راجہ جے پال کا جاسوسی نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُسے صرف یہ اطلاع ملی کہ سبکتگین فوت ہو گیا ہے۔ غزنی کے دیگر حالات کا اُسے علم نہیں تھا۔ اگر وہ اُس وقت حملہ کر دیتا جب سلطان محمود خانہ جنگی میں الجھا ہُوا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلطان محمود کے دشمن جے پال کی مدد کرتے۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ اس دشمن کی آنکھیں اور کان بند رہے۔

اس کے مقابلے میں راجہ جے پال کی سب سے بڑی چھاؤنی لاہور میں سلطان محمود غزنوی کے جاسوس بیدار اور سرگرم تھے۔ عمران رات کو غزنی کے دو نوقیدیوں ــــ نظام اور یزدی اور قاسم بلخی ــــ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اگلی صبح وہ حسبِ معمول راج محل کے احاطے کے اُس کمرے میں جہاں یہ دو نو قیدی رہتے تھے، ناشتہ لے کر گیا اور کمرہ خالی دیکھ کر دروازے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے تین چار ملازموں سے پوچھا کہ قیدی کہاں چلے گئے ہیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ کچھ دیر بعد راجہ جے پال کا بلاوا آ گیا۔ عمران بلاذری نے بتایا کہ وہ ناشتہ لے کر آیا تو قیدی یہاں نہیں تھے۔

"مجھے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے تھا"۔۔۔ راجہ جے پال کو قیدیوں کے لا پتہ ہونے کی خبر ملی تو اُس نے کہا۔"میں نے ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا کر غلطی کی تھی ..... وہ شہر میں نہیں ہو سکتے۔ تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دو۔ پشاور کی طرف سوار دوڑا دو۔ پشاور سے غزنی کی طرف نکلنے والے راستوں کی ناکہ بندی کے لیے قاصد روانہ کر دو۔"

"مہاراج!"۔۔ اُس کے وزیر نے کہا۔۔"دو قیدیوں کے فرار سے کیا نقصان ہو گیا ہے؟ آپ کی توجہ کوچ کی تیاری پر رہنی چاہیئے۔ دو قیدیوں کے لیے اتنی زیادہ نفری کو اِدھر اُدھر دوڑا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

"اِن کے فرار کا مجھے کوئی افسوس نہیں"۔۔۔ راجہ نے کہا۔"میں اُن سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ کرلیا ہے میں انہیں سزا دینا چاہتا ہوں۔ انہیں پکڑنے کا بندوبست بہت جلدی کرو۔"

اس کے ساتھ ہی راجہ جے پال کو یہ خبر سنائی گئی کہ انسانی قربانی کے لیے ایک لڑکی منتخب کر لی گئی ہے، اور تقریباً پندرہ دنوں بعد اس کی گردن کاٹ کر اس کے خون کا تلک راجہ کے ماتھے پر لگایا جائے گا۔ راجہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اب وہ جب چاہے غزنی پر حملے کے لیے کوچ کر سکتا ہے۔ فتح اُسی کی ہوگی۔

"ہم بہت جلد کوچ کریں گے"۔۔۔ راجہ نے کہا۔

شام کو جب عمران اپنے گھر آیا تو وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس پر کسی نے شک نہیں کیا تھا۔ ادریزی اور بلخی اُس کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ انہیں جلدی یہاں سے نکالے عمران نے انہیں بتایا کہ اب وہ کئی دنوں تک اس کمرے سے نہیں نکل سکیں گے کیونکہ شہر کے اردگرد ناکہ بندی ہو گئی ہے۔

دروازے پر مخصوص قسم کی دستک ہوئی۔۔ عمران بلاذری نے مسکرا کر کہا۔"دوست آئے ہیں۔ کوئی خبر لائے ہوں گے"۔۔ اس نے جا کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ دو آدمی اندر آئے۔ عمران نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ ان دونوں کو وہ ادریزی اور بلخی کے کمرے میں لے گیا اور تعارف کرایا۔ یہ دونوں آدمی پنجاب کے رہنے والے تھے۔

اُنہوں نے بتایا کہ راجہ جے پال بہت جلد کوچ کر رہا ہے۔ اب دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو غزنی روانہ کرنا ہے جو وہاں راجہ جے پال کے کوچ کی قبل از وقت اطلاع پہنچا دے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ شہر سے باہر تمام فوجوں کی رسد، خیمے اور بیل گاڑیاں جمع ہیں۔ آج اس ذخیرے میں بہت زیادہ اضافہ ہُوا ہے۔ اسے آگ لگانی ہے۔

"اس کا کیا انتظام ہے؟"— عمران نے پوچھا— "لاہور میں ایسے انتظام کی کبھی بات نہیں ہوئی۔"

"اس سے پہلے لاہور والوں نے کیا کارنامہ کر دکھایا تھا؟"— ایک جاسوس نے کہا— "ایک ہندو لڑکی کے پیچھے آپس میں لڑمرے تھے.... اب بھٹنڈہ والوں نے انتظام کیا ہے۔ یہاں کے آدمیوں کو بتانا ضروری ہے۔"

بھٹنڈہ راجہ جے پال کی راجدھانی تھی اس لیے غزنی کے زیادہ تر جاسوس وہیں رہتے تھے جب سے راجہ جے پال نے غزنی پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، اُس نے لاہور کو فوج کا مرکز اور مستقر بنا لیا تھا۔ غزنی کے جاسوسوں کے ساتھ مقامی آدمی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر جوان سال اور نوجوان تھے۔ یہ ہندو راج کے ستائے ہُوئے لوگ تھے، اور غزنی کے حکمرانوں کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اب لاہور میں راجہ جے پال اپنے لشکر کے لیے اپنی رسد اور دیگر سامان جمع کر رہا تھا۔ بھٹنڈہ کے جاسوسوں نے اس ذخیرے کی تباہی کا یہ انتظام کیا تھا کہ بیس پچیس گھوڑسوار عام مسافروں کے بھیس میں لاہور کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ وہ اکٹھے نہیں آئے ایک دوسرے سے دور دور رہے تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ لاہور کے آدمیوں کو صرف اطلاع دینا ضروری تھا۔

ایک ہی منزل کے مسافر

فوجی سازوسامان کے اس ذخیرے میں جو راجہ جے پال نے غزنی پہ حملے کے لیے لاہور کے مضافات میں ڈھیر کر رکھا تھا، جلدی آگ پکڑنے اور پھیلانے والے ڈھیر خیموں کے تھے۔ یہ ہزارہا خیمے تھے جنہیں لپیٹ کر ڈھیروں کی صورت میں رکھا گیا تھا۔ فوج کے ساتھ رسد لے جانے کے لیے بیل گاڑیاں تھیں یہ ایک دوسری کے ساتھ لگا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے انداز سامان تھا جو کم و بیش ڈیڑھ میل لمبے اور چار پانچ فرلانگ چوڑے رقبے میں پڑا تھا۔ اس رقبے میں درختوں کی بہتات تھی۔

راجہ جے پال کو جلدی کوچ کرنا تھا، اس لیے یہ سامان تیاری کی حالت میں باہر ہی پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ اس پر پہرے کا معمولی سا انتظام تھا۔ گشتی سنتری گھوڑوں پر اس کے اردگرد گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ فوجی سامان کو کسی نے کوئی نقصان پہنچایا ہو یا کوئی سامان چوری ہو گیا ہو۔ خطرہ صرف مسلمانوں کی طرف سے تھا لیکن مسلمانوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ انہیں ہندو اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ یہ تو راجہ جے پال کو معلوم تھا کہ اس کی ریاست میں غزنی کے جاسوس موجود ہیں لیکن اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمان اُس کی جنگی قوّت کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اُس نے اتنے بڑے فوجی ذخیرے کی حفاظت کا وہ انتظام نہیں کیا تھا جو ہونا چاہیئے تھا۔

ہندو رعایا کا تو اُسے ڈر ہی نہیں تھا۔ اس نے پنڈتوں کے ذریعے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اتنی نفرت پھیلا رکھی تھی کہ ہر ہندو یہ خواہش لیے ہوئے تھا کہ ان

کا راجہ مسلمانوں کے ملکوں پر حملے کرے اور مسلمانوں کو غلام بنا کر ہندو مت میں لایا جائے۔
اس مقصد کے لیے ہندوؤں نے اپنے راجہ کو مالی مدد دی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روپیہ پیسہ اور سونا دیا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہندو عورتیں سوت کات کر بازاروں میں بیچتی اور آمدنی راجہ کے خزانے میں جمع کرا دیتی تھیں۔ لہٰذا غزنی پر حملے کے لیے یہ جو فوجی سامان کے انبار اکٹھے کیے گئے تھے ان میں ہندو رعایا کا خون پسینہ شامل تھا۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی بھی ہندو اس سامان کو نقصان پہنچائے گا۔

نقصان پہنچانے والے لاہور پہنچ چکے تھے۔ یہ شہبازوں سے لڑ جانے والے ممولے تھے، آتشِ نمرود میں کود جانے والے عاشقانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ وہ اس نظریئے کے قائل تھے۔ کہ اپنے دشمن بادشاہ کا تختہ الٹنے کے لیے بادشاہ ہونا ضروری نہیں ہوتا اور فوج کو نقصان پہنچانے کے لیے فوج کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایمان مضبوط ہو تو مضبوط قلعے بھی سر کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اُس مذہب کے سرفروش تھے جو محمد بن قاسم عرب کی سرزمین سے اس دھرتی میں لایا تھا۔ وہ ہندوستان میں اسلام کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے پروانے تھے جو اسے اپنے خون سے جلتا رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

وہ آئے گھوڑوں پر تھے۔ ان کے دو ساتھی شام کو عمران بلاذری اور لاہور کے دو تین اور ذمہ دار جاسوسوں کو لاہور میں اپنی موجودگی اور مقصد کی اطلاع دے کر شہر سے نکل گئے تھے۔ وہ غریبانہ سے کپڑوں میں ملبوس ذریعہ معاش کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے مسافر لگتے تھے۔ رات کو جب شہر سو گیا تھا، وہ شہر سے دور ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس مقصد پر جس کی خاطر وہ آئے تھے، جانیں قربان کرنے کا حلف اٹھایا۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ انہیں ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھنے کی امید نہیں تھی۔ وہ زندہ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔

گھوڑے کچھ دور باندھ کر وہ ڈیڑھ میل لمبے ذخیرے کی مختلف اطراف کو دو دو ہو کر پھیل گئے۔ ان کے پاس چھوٹے مشکیزے تھے جو مسافر اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ پانی کے لیے رکھتے ہیں مگر ان کے مشکیزوں میں پانی نہیں تیل تھا اور ان کے

پاس آگ لگانے والا ساماں بھی تھا۔

ایک جگہ سے دو گھوڑ سوار سنتری آگے چلے گئے تو دو جانباز پیٹ کے بل رینگتے آگے گئے اور خیموں کے دو ڈھیروں کے درمیان جا کر رک گئے۔ انہوں نے مشکیزوں کے منہ کھولے اور تیل خیموں کے ڈھیروں پر چھڑک دیا۔ بیشتر اس کے کہ سنتریوں کو تیل کی بو آتی اسے آگ لگا دی گئی۔ عین اس وقت ایک اور جگہ سے شعلہ اُٹھا۔ سنتریوں نے شعلے دیکھے تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ وہ آگ کی دونوں جگہوں تک آئے تو کئی اور جگہوں سے شعلے اٹھے۔ چار جانبازوں نے بیل گاڑیوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ بیشتر اس کے کہ سنتری جان سکتے کہ یہ آگ کیسے لگی ہے، آگ لگانے والے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں تک پہنچے اور شعلوں کی روشنی سے دور رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔

ہوا کی رفتار کافی تھی۔ شعلے تیزی سے پھیلنے لگے۔ سوئے ہوئے سنتری جاگ اُٹھے۔ جاگے ہوئے سنتری شعلوں کے نرغے سے بچنے کے لیے بھاگ اُٹھے۔ اُن سب کے شور و غوغا اور بھگڈر ہونگ نے شعلوں کی آواز کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا۔ شہر میں جتنی بھی فوج تھی بیدار ہو گئی اور آگ پر ٹوٹ پڑی۔ آگ ڈیڑھ میل لمبے اور اس سے نصف چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ درخت جھلس رہے تھے۔ فوج کے لیے آگ پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ شعلے اتنے اُونچے جا رہے تھے کہ کوئی فوجی قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ اُس سامان کو بچائیں جس تک ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔

شہر کی تمام تر آبادی جاگ اُٹھی۔ مسلمان خوش تھے مگر ہندوؤں پر ہَول طاری ہو گیا۔ وہ اس آگ کو آگ کے دیوتا کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مندروں کے سنکھ اور گھنٹے بجنے لگے۔ پنڈت بہت سے ہاتھوں والے بتوں اور مورتیوں کے آگے دو زانو ہو کر گڑگڑانے لگے۔ عورتیں مندروں کو دوڑ پڑیں۔ مردوں کو فوجی ہانک کر لے گئے۔ پانی کنوؤں سے نکالا جا رہا تھا۔ گھوڑا گاڑیوں پر بڑے مشکیزے اور ڈول لا کر دریا سے پانی لایا جانے لگا لیکن شعلے اتنے اونچے اور ایسے ہیبت ناک تھے کہ نصف میل دور سے بھی ان کی تپش ناقابلِ برداشت تھی۔

"تمام سنتریوں کو قتل کر دو..... انہیں اسی آگ میں زندہ پھینک دو" — یہ راجہ جے پال کی آواز تھی۔ وہ چیختا، چلّاتا، حکم دیتا اور گالیاں بکتا پھر رہا تھا۔ جس گھوڑے پر وہ سوار تھا، وہ گھوڑا بھی اسی کی طرح غصّے اور بے چینی میں ہنہناتا تھا۔ اس کے درباری، وزیر اور جرنیل اس کے عتاب سے خوفزدہ فوجیوں اور شہریوں کو حکم اور گالیاں دیتے پھر رہے تھے۔

تھوڑا سا سامان بچایا جا سکا۔ راجہ اور اُس کے جرنیل وغیرہ تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئے اور بے بسی کے عالم میں آگ کے قہر کو دیکھنے لگے۔

"یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ آگ کس طرح لگی ہے" — راجہ جے پال نے کہا — "یہاں جتنے سنتری تھے، انہیں قید خانے میں لے جا کر اُلٹا لٹکا دو۔ ان میں سے جو بتا دے کہ آگ کس طرح لگی تھی، اسے اتار لینا۔ باقی سب کو اسی حالت میں مر جانے دو.... پندرہ دنوں کے اندر اندر یہ سامان پورا کرو۔ میں چند دنوں میں کوچ کرنا چاہتا تھا۔ سبکتگین کے مرنے کی اطلاع ملتے ہی ہمیں کوچ کر جانا چاہیئے تھا۔ اب جوں جوں وقت گزرتا جائے گا سبکتگین کے جانشین کو تیاری کا موقعہ ملتا رہے گا"

"یہ مسلمانوں کا کام بھی ہو سکتا ہے" — راجہ کے وزیر اُدھے شنکر نے کہا — "کیا مہاراج کے ذہن میں نہیں آئی کہ غزنی کے دو قیدی بھاگ گئے ہیں؟ یہ ان کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے"۔

"تمام مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو" — راجہ جے پال نے حکم دیا — "کسی پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے میرے سامنے لے آؤ۔ مسلمانوں کے گھروں سے جتنی نقدی، زیورات اور اناج ملے وہ اپنے قبضے میں لے لو، لیکن".... راجہ نے ذرا سوچ کر کہا — "میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اتنی جرأت نہیں کر سکتے"۔

"یہ ناپاک قوم اس سے زیادہ جرأت بھی کر سکتی ہے" — ایک جرنیل نے کہا — "آپ غزنی کے دو قیدیوں سے ان کی فتح کا جو راز معلوم کرتے رہے ہیں وہ یہی ہے کہ اس قوم میں اتنی زیادہ جرأت ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی یہ جرأت توڑنی ہے۔ میں اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں کہ یہ جرأت ہماری فوج میں نہیں اور یہ بھی کہ

ہماری فوج کی جو نفری غزنی کے حملے سے بچ کر آئی ہے، اس پر ابھی تک مسلمانوں کی فوج کا خوف سوار ہے۔"

"تو اپنے سپاہیوں کو بتاؤ کہ یہ ہمارے دیوتاؤں اور مسلمانوں کے پیغمبروں کی لڑائی ہے"۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "انہیں بتاؤ کہ مذہب کی اس لڑائی میں جو ہندو مارا جائے گا وہ دوسرے جنم میں خوبصورت پرندوں کی شکل میں دنیا میں آئے گا اور کھلی فضاؤں اور خوشنما باغوں میں چہچہاتا اور اڑتا پھرے گا"۔ راجہ جے پال کے دماغ پر پنڈت سوار تھے۔ وہ حقیقت سے دور ہٹ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "معلوم نہیں کس کے گناہوں سے دیوتا ہم سب سے ناراض ہیں۔ قربانی کے لیے وہ لڑکی مل گئی ہے جسے پنڈت تلاش کر رہے تھے۔ اسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا ہے۔ پندرہویں روز اسے ذبح کر دیا جائے گا"۔

"مہاراج!"۔ جرنیل نے کہا۔ "آپ کو برا لگے تو معاف کر دینا۔ فتح حاصل کرنے کے لیے ایک لڑکی کو ذبح کرنا کافی نہیں۔ فوج کے ہر آدمی کو ذبح ہونے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ آپ کو بھی، مجھے بھی۔ جب تک ہماری قوم ایسے بیٹے پیدا نہیں کرے گی جیسے یہ تھے جنہوں نے ہماری فوج کی ایک سال کی رسد جلا دی ہے، اُس وقت تک ہم مسلمانوں پر فتح حاصل نہیں کر سکتے"۔

"آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے؟"۔ راجہ جے پال نے پوچھا۔

"جی مہاراج!"۔ جرنیل نے جواب دیا۔ "میں سیناپتی ہوں۔ آپ کی ساری فوج کا سربراہ ہوں۔ فوج کی ہر شکست میری شکست ہوتی ہے۔ میں حقائق اور حالات پر نظر رکھتا ہوں۔ میں وہموں اور خوش فہمیوں سے اپنا جی خوش نہیں کر سکتا۔ ایسا کروں گا تو آپ کا راج اور ریاست ناپید ہو جائیں گے اور آپ کا راج محل مسجد اور مسلمانوں کا مذہبی مدرسہ بن جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ حقیقت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے۔ میں سنتریوں سے پوچھ چکا ہوں۔ آگ دیکھ بھی چکا ہوں۔ آگ سنتریوں کی غلطی سے لگتی تو کسی ایک جگہ لگتی اور سنتری خود ہی اس پر قابو پا لیتے، مگر یہ آگ بارہ چودہ جگہوں سے شروع ہوئی اور پھیل گئی"۔

"تو کیا غزنی سے آگ لگانے کے لیے فوج آئی تھی؟"۔ مہاراجہ نے کہا۔ "کیا شہر

کی ساری مسلمان آبادی نے مِل کر بارہ چودہ جگہوں پر آگ لگائی ہے؟"
"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ آگ نہ غزنی کی فوج نے لگائی ہے نہ شہر کی مسلمان آبادی نے"۔ جرنیل نے کہا۔ "یہ کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ بیس آدمیوں کا کام ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہیں، بہت دلیر ہیں۔ اس قسم کی آگ لگانے والے آگ میں جلنا بھی جانتے ہیں۔ وہ صرف جلانے کے لیے نہیں بلکہ خود جلنے کے لیے بھی آتے ہیں۔"
"کیا ہم انہیں پکڑ کر زندہ نہیں جلا سکتے؟" — راجہ جے پال نے پوچھا۔
"اگر ہم دس بیس مسلمانوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے تو کیا ہوگا؟" — وزیر اُدھے تنشکر نے کہا۔ "دس بیس اور آجائیں گے۔ ہمیں ان کی اُس آگ کو سرد کرنا ہے جو اُن کے سینوں میں جل رہی ہے۔ اسے یہ لوگ ایمان کی شمع کہا کرتے ہیں۔ ہمیں ان کا ایمان ختم کرنا ہے۔ درخت کے پتے توڑ توڑ کر مسلتے رہنے سے درخت سوکھ نہیں جایا کرتا۔ اس کی جڑ کاٹنی ہے۔ آگ پر آگ پھینک کر آپ اسے بجھا نہیں سکتے۔ آگ پانی سے بجھا کرتی ہے۔ آپ کو آگ کی طرح گرم ہو کر نہیں بلکہ پانی کی طرح ٹھنڈا ہو کر سوچنا پڑے گا.... یہاں کے مسلمانوں پر آگ کی طرح نہ برسیں۔ ان میں جو سرکردہ لوگ ہیں انہیں انعام و اکرام، دربار کے رتبوں اور عورت کے حسن و جوانی کے جال میں پھانسیں۔ میری نظر ماضی میں وہاں تک جاتی ہے جہاں محمد بن قاسم اس دھرتی پر نمودار ہوا تھا۔ اُس نے شمال مغربی ہند میں اسلام پھیلا دیا تھا اور یہ مذہب محمد بن قاسم کے دورِ حکومت میں پھیلتا اور ہمارا مذہب سکڑتا سمٹتا چلا گیا۔ محمد بن قاسم کے جانے کے بعد ہمارے پیشواؤں نے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ تشدّد اور دہشت گردی سے بھی اسلام کے فروغ کو روکا گیا اور دلکش طریقوں سے بھی۔ سب سے زیادہ کامیاب طریقہ یہ دوسرا ثابت ہوا۔ زر و جواہرات اور عورت نے مسلمانوں کے معاشرتی سربراہوں کو نہ ہندو رہنے دیا نہ مسلمان۔ اسلام کمزور ہوتے ہوتے چند ایک مسجدوں تک رہ گیا ہے۔ انہیں جسمانی مار نہ دیں۔ انہیں روحانی طور پر مردہ کر دیں۔ انہیں پیار اور محبّت کا دھوکہ دے کر ان پر اپنی تہذیب کا رنگ چڑھا دیں۔"

"اگر ہم نے غزنی فتح کرلیا تو ہم یہ طریقے استعمال کریں گے" ـــ راجہ جے پال نے کہا۔
وہ ڈیڑھ میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے شعلوں سے دُور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ جے پال پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ غزنی پر اس کا حملہ کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا اور غزنی والے فوج کے بغیر حملہ کر گئے تھے۔ اس آگ کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ غزنی کے دو مفرور قیدی ـــ نظام ادریزی اور قاسم بلخی ـــ راجہ کے ذہن سے اُتر گئے۔

ہندو لڑکی رتی کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے تھے۔

ٹیلوں والا مندر کوئی عمارت نہیں تھی۔ اُس دَور میں دریائے راوی کی گذرگاہ کوئی اور تھی۔ آج اسے بڈھا دریا کہتے ہیں۔ شہر سے تھوڑی دُور دریا سے ذرا سا ہٹ کر ڈیڑھ میل لمبا چوڑا علاقہ ٹیلوں اور گھاٹیوں کا تھا۔ ان کی مٹی کالی اور چکنی تھی۔ وہاں سِلّوں کی چٹانیں بھی تھیں۔ بعض ٹیلے سِلّوں اور کالی مٹی کی آمیزش کے تھے، لمبے بھی، گول اور مخروطی بھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ قدرتی نہیں بلکہ انہیں تراش کر ان شکلوں کا بنایا گیا ہے۔ ان کے اردگرد درختوں کی بہتات تھی لیکن ان کے اندر کوئی درخت نہیں تھا نہ کوئی سبزہ تھا۔

راجہ جے پال سے پہلے کے کسی دَور میں ہندو کاریگروں نے پختہ مخروطی ٹیلوں کو تراش کر مندر کے مخروطی اور لمبوترے گنبدوں کی شکل دے دی اور ان کے اندر تراش تراش کر وسیع غاریں بنا دی تھیں جو بلند اور کشادہ کمروں جیسی تھیں۔ ان کی دیواروں میں دیویوں اور دیوتاؤں کے بُت تراشے ہُوئے تھے۔ ان کمروں کے اندر بھی کمرے تھے تہ خانے اور بالاخانے بھی تھے۔ اُس دَور کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ اندر جا کر انسان بھول جاتا تھا کہ وہ کھودی ہُوئی زمین اور ٹیلوں کے اندر ہے۔ اندر سے یہ خوشنما اور پختہ عمارتیں لگتی تھیں۔
اس جگہ کو ٹیلوں والا مندر کہتے تھے لیکن وہاں پنڈتوں اور سادھوؤں کے سوا کوئی اور پُوجا پاٹھ کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ راہنما کے بغیر مندر تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹیلوں کے درمیانی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ چند قدم پر مڑتے اور بیشتر راستے کہیں نہ کہیں جا کر بند ہو جاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس

جگہ کے متعلق مشہور تھا کہ یہ روحوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن ہے۔ انسانی قربانی اسی مندر میں دی جاتی تھی۔ دُور سے دیکھنے سے یہ علاقہ پُراسرار اور ڈراؤنا لگتا تھا۔ کوئی اس کے قریب سے گذرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

راجہ جے پال کے دَورِ حکومت کے کچھ عرصہ بعد جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا اور بُت شکنی کا سلسلہ شروع کیا تو ٹیلوں کا مندر جس کی فضا انسانی خون اور ہندوؤں کی غیر معمولی طور پر حسین عورتوں کی عصمت کے خون سے متعفّن رہتی تھی۔ اُس کی نظروں سے بچا رہا۔ خدائے ذوالجلال نے محمود غزنوی کے مشن کو یوں مکمل کیا کہ راوی کا رُخ بدل ڈالا اور سیلاب جو ہر سال آتا تھا ٹیلوں کے علاقے کو بہانے لگا۔ دیوی دیوتاؤں کے بتوں کو راوی نے کیچڑ میں تبدیل کر کے غائب کر دیا پھر اسی کو راوی نے اپنی گزرگاہ بنا لیا۔ ٹیلوں والا مندر ہندوؤں کے کاغذوں میں رہ گیا۔

پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ جس رات راجہ جے پال کی رسد وغیرہ کے ذخیرے کو جانبازوں نے نذرِ آتش کیا، اُس شام ان میں سے دو آدمی عمران بلاذری کے گھر گئے تھے۔ وہ عمران کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے چلے گئے تو دروازے پر پھر دستک ہوئی عمران نے دروازہ کھولا تو فاطمہ تیزی سے اندر آئی۔ عمران نے دروازہ بند کر دیا۔

"مَیں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا" ___ عمران بلاذری نے فاطمہ کو غصّے سے کہا ___ "پھر کیوں آگئی ہو؟"

فاطمہ جواب دینے کی بجائے اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

"مجھے بچاؤ" ___ فاطمہ نے سسکتی اور لرزتی آواز میں کہا ___ "عمران! مجھے اپنی چڑیل سے بچاؤ۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتی۔"

ڈیوڑھی تاریک تھی۔ عمران فاطمہ کو اندر نہیں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں نظام اور یزنی اور قاسم بلخی موجود تھے۔ انہیں وہ یہ تاثر دینے سے ڈرتا تھا کہ وہ یہاں جاسوسی کے بہانے لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ فاطمہ سے وہ منہ لگانے کو تیار نہیں تھا مگر اس لڑکی کی

حالت ایسی ہوئی جارہی تھی کہ عمران نے اسے دھتکارنا مناسب نہ سمجھا۔

"کسے چڑیل کہہ رہی ہو؟" عمران نے کہا۔ "یہ تمہارا گناہ ہے جو چڑیل بن کر تمہیں ڈرا رہا ہے۔"

"میں رشی کو دیکھتی ہوں" فاطمہ نے کہا۔ "مجھے اندر لے چلو۔"

"یہیں بات کرو۔"

"مجھے اپنے ساتھ لگا لو" فاطمہ نے روتے ہوئے التجا کی۔ "اتنے ظالم نہ بنو عمران! میں خوف سے مر جاؤں گی۔ مجھے پناہ میں لے لو۔"

عمران بلاذری اِس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ فاطمہ اُس کے ساتھ لگ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"میری آنکھ لگ جاتی ہے تو رشی مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے میں گھبرا کر اٹھتی ہوں" — فاطمہ نے کہا۔ "وہ مجھے اندھیرے میں بھی نظر آجاتی ہے مگر وہ خوبصورت رشی نہیں ہوتی۔ اُس کے دانت درندوں کی طرح اور ناخن خنجروں کی نوکوں کی طرح آگے سے مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بولتی نہیں چیختی یا پھنکارتی ہے۔ مجھے چیرنے پھاڑنے کو آتی ہے لیکن قریب آکر غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے کل رات اپنے کمرے میں اس سے بچنے کے لیے بھاگتے دوڑتے گذاری ہے۔ آج دن بھر مجھ پر خوف طاری رہا۔ وہ دن کو مجھے نظر نہیں آئی لیکن تین چار بار مجھے اُس کی سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نظر نہ آیا لیکن مجھے ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے رشی کمرے میں موجود ہے... عمران! مجھے اِس سے بچاؤ۔"

فاطمہ مظلوم لڑکی تھی۔ اسے نوجوانی کی عمر میں باپ نے پیسے لے کر ایسے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا تھا جس کی عمر اُس سے دگنی سے بھی زیادہ تھی اور اُس کی دو بیویاں تھیں۔ فاطمہ صرف جوان ہی نہیں تھی خوبصورت بھی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اسے عمران اچھا لگا تو اس کے راستے میں رشی نام کی ہندو لڑکی حائل ہو گئی۔ فاطمہ نے اسے راستے سے یوں ہٹایا کہ پنڈت کو معاوضہ دے کر اس لڑکی کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کرا دیا۔ فاطمہ فطرۃً گناہگار نہیں تھی۔ انتقام اور رقابت نے اس سے بڑا ہی بھیانک گناہ کرایا۔ اس

کا ضمیر اس گناہ کو برداشت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو رشی کی قاتل سمجھنے لگی۔ یہ ضمیر کا انتقام تھا۔ بے بس اور مجبور لڑکی اب اسقدر خوفزدہ تھی کہ وہ عمران کے قدموں میں آ گری۔

" میں نے کل رات تمہیں کہا تھا کہ گناہ کا کفارہ ادا کرو، ورنہ جلتی اور کڑھتی رہو گی"۔ ــــ عمران نے اسے کہا ــ "رشی ابھی زندہ ہے جس روز پنڈت اسے ذبح کر دیں گے اُس روز اس کی بدروح چڑیل بن کر تمہارے پاس آجائے گی۔ تم جب تک زندہ رہو گی وہ تم پر غالب رہے گی۔ تم راتوں کو سو نہیں سکو گی۔ تم خودکشی کر لو گی یا پاگل ہو کر گلیوں اور بازاروں میں چڑیلوں کی طرح چیختی چلاتی پھرو گی اور لوگ تم سے دور بھاگیں گے"۔

فاطمہ اور زیادہ خوفزدہ ہو کر عمران بلاذری کے ساتھ لپٹ گئی ــــ "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اگر ایک رات اور میری یہی حالت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی"۔

"رشی کو پنڈتوں سے آزاد کراؤ" ــــ عمران نے کہا۔ اُس نے فاطمہ کو اسی لیے اور خوفزدہ کیا تھا کہ وہ رشی کو آزاد کرانے میں مدد دے۔ اُس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

" میں اُسے کیسے آزاد کرا سکتی ہوں؟"

"یہ کام میں کرونگا" ــــ عمران نے کہا ــ "تم میری مدد کرو۔ تمہاری نجات اسی میں ہے۔ رشی ذبح ہو گئی تو دنیا کے قید خانے سے آزاد ہو جائے گی مگر تمہارا جو حال ہو گا وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں"۔

"مجھے جو کہو گے کروں گی"۔

"اٹھو" ــــ عمران نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا ــ "اندر چلو"۔

عمران اسے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ وہ اسے اس کمرے میں نہیں لے جانا چاہتا تھا جس میں نظام اور یزی اور قاسم بلخی بیٹھے ہوئے تھے۔ فاطمہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا عمران نے فاطمہ کو دوسرے کمرے میں بٹھایا اور دیا جلا کر رکھ دیا۔

" اب بے خوف ہو کر اکیلی بیٹھی رہو" ــ عمران نے کہا ــ "یہاں تمہیں رشی نظر نہیں آئے گی"۔

عمران اور یزی اور بلخی کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے انہیں فاطمہ اور رشی کے متعلق

سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ فاطمہ کو رشی کے فرار کے لیے استعمال کرے گا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ہمیں فرار کرایا ہے لیکن ہمیں یہیں کسی اور مصیبت میں ڈال دو گے"۔۔۔ نظام اوریزی نے کہا۔۔۔ "تم یہاں عشق و محبت اور عیاشی میں پڑے رہو۔ ہم خود ہی نکل جائیں گے۔"

"میں عشق و محبت اور عیاشی میں نہیں پڑوں گا"۔۔۔ عمران نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں ان پنڈتوں پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے بت محض پتھر ہیں اور یہ کسی مسلمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان سے یہ لڑکی چھین کر ثابت کروں گا کہ کس کا مذہب سچا ہے... میں گھوڑوں کا انتظام کر دوں گا۔ اگر میں نے آج ہی رات اس ہندو لڑکی کو آزاد کرا لیا تو یہاں واپس نہیں آؤں گا۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو گے۔ ہم ادھر سے ہی نکل جائیں گے۔"

"تم نے سوچا کیا ہے؟"۔۔۔ قاسم بلخی نے پوچھا۔۔۔ "تم وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو کہ تم لڑکی آزاد کرا لو گے؟"

عمران بلاذری نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس نے تفصیل سے بتا دیا۔ وہ دونوں رضامند ہو گئے اور تینوں نے بحث مباحثے کے بعد ایک سکیم تیار کر لی۔۔۔ اور عمران فاطمہ کے کمرے میں چلا گیا۔

"یہاں تو رشی کی بدروح نظر نہیں آئی؟"۔۔۔ عمران نے فاطمہ سے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ فاطمہ نے جواب دیا۔۔۔ "مگر ڈر آتا ہے۔"

"تم نے اسے پنڈتوں سے بچانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لیے اب رشی کی بدروح تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ جب وہ آزاد ہو گئی تو تمہیں روحانی سکون حاصل ہو گا۔"

"مجھے یہ تو بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا ہے"۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تم کامیاب ہو گئیں تو تم اپنے گھر واپس نہیں آؤ گی"۔۔۔ عمران نے کہا۔۔۔ "تم میرے ساتھ غزنی چلو گی۔"

"سچ عمران؟"

"میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا"۔۔۔ عمران نے کہا۔۔۔ "تم پنڈت کے گھر جاؤ، ڈرنا نہیں۔

اگر وہ تمہیں مِل جائے تو اُسے کہو کہ تم ٹیلوں والا مندر دیکھنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں سونے کے سکّے دے رہا ہوں۔ یہ پنڈت کو دے دینا۔ وہ مان جائے گا۔ میں تمہارے پیچھے آؤں گا۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ پنڈت کو ٹیلوں والے مندر تک لے جاؤ۔ وہ تمہیں جو شرط بتائے مان لینا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ مندر ٹیلوں کے اندر ہے۔ وہاں تک ان پنڈتوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کسی عام آدمی کو راستہ معلوم نہیں۔"

"اگر وہ نہ مانا تو ہم کیا کریں گے؟"۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"تم اسے کسی طرح کمرے سے باہر لے آنا"۔۔۔ عمران نے کہا۔"میں اسے مندر تک لے جاؤں گا۔ اگر نہیں جائے گا تو یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔"

"پھر میرا کیا بنے گا؟"۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ تم اب اپنے خاوند کے گھر نہیں جاؤ گی"۔۔۔ عمران نے جواب دیا۔۔۔ "تم اب میری ذمّہ داری میں ہو۔ دل سے تمام خوف اور وہم نکال دو۔ ابھی پنڈت کے ہاں چلی جاؤ۔ میں اُس کے کمرے کے دروازے کے قریب چھپا ہُوا ہوں گا۔ میں جھینگر کی آواز نکالوں گا۔ تم اُسے باہر لے آنا۔"

عمران نے اُسے بہت سی ہدایات دیں۔ اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کا دل مضبوط کیا اور اُسے سونے کے چند ایک سکّے دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد عمران رشی کے بھائی جگ موہن سے ملنے چلا گیا۔ جگ موہن گھر ہی تھا اور بہت اُداس۔ وہ پہلے ہی اپنے مذہب سے متنفّر تھا۔ اب اس کی نوجوان بہن کو پنڈت دیوی کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے لے گئے تھے۔

"عمران!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"یہ لوگ میری بہن کو ذبح کرنے کے لیے لے گئے ہیں۔ میں کسی پنڈت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ ان پنڈتوں کو کون قتل کرتا چلا جا رہا ہے۔۔۔۔ تم کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ کسی پنڈت کو قتل کیے بغیر تمہاری بہن کو اُٹھا لانے اور غائب کر دینے کا بندوبست کیا جائے"۔۔۔ عمران نے کہا۔۔۔"تم یقیناً میرا ساتھ دو گے۔ جانتے ہو اُسے کہاں لے گئے ہیں؟"

"وہاں تک ہم نہیں پہنچ سکتے"۔۔۔ جگ موہن نے جواب دیا ۔۔۔ "اُسے ٹیلوں والے مندر میں لے گئے ہیں۔ ہم وہاں گم ہو سکتے ہیں۔ پنڈت ہمیں ان بھول بھلیوں میں بھٹکتا دیکھیں گے تو ہمیں قتل کر دیں گے اور ہماری لاشیں وہیں کہیں زمین میں دبا دیں گے۔ وہاں جانے کی نہ سوچو۔"

"میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں"۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "اگر تمہارے دل میں اپنے مذہب کے خلاف واقعی نفرت ہے تو تمہیں نہ صرف یہ مذہب ترک کر دینا چاہیئے بلکہ اس ملک سے ہی نکل جانا چاہیئے۔ میں تمہیں اور تمہاری بہن کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"میری بہن کہاں ہے؟"۔۔۔ جگ موہن نے پوچھا۔

"تم ایک کام کرو"۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "چار گھوڑوں کا انتظام کرو اور دریا کے کشتیوں کے پل سے دُور میرا انتظار کرو"۔۔۔ عمران نے اسے وہ جگہ بتائی جہاں اُسے انتظار کرنا تھا۔ اُس نے جگ موہن سے کہا ۔۔۔ "اس وقت مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ وقت نہیں۔ اگر میں صبح تک تمہیں دریا کے کنارے نہ ملا تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں۔"

جگ موہن بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن عمران بلاذری پر اُسے اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اُس نے اس یقین پر چار گھوڑے لے کر راوی کے کنارے انتظار کا وعدہ کر لیا کہ عمران اس کی بہن کو ساتھ لائے گا اور بہن بھائی عمران کے ساتھ ملک سے نکل جائیں گے۔ اُس نے دل میں یہ وہم پیدا نہ ہونے دیا کہ عمران ہوا میں گھوڑے دوڑا رہا ہے لیکن جگ موہن کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس پر جذبات کا غلبہ تھا۔

کچھ دیر رات کے اندھیرے میں بڑے مندر سے کچھ دُور درختوں کے ایک جھنڈ میں عمران بلاذری، نظام اور یزی اور قاسم نجی کھڑے رہے۔ ان کے قریب سے ایک سایہ سا گزر گیا۔

"میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں فاطمہ!"۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "ڈر نہ جانا۔"

سایہ رک گیا۔ عمران اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے فاطمہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ اکیلا نہیں،

اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ عمران کو آنے والے حالات کے متعلق یقین نہیں تھا کہ اس کے لیے موافق ہوں گے، اس لیے وہ اوریزی اور بلنجی کو فاطمہ سے چھپائے رکھنا بہتر سمجھتا تھا۔ اُس نے فاطمہ کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ آگے چلی گئی۔ کچھ دور گئی تو یہ تینوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم اس مہم میں کس طرح کامیاب ہو گے" ــــ بلنجی نے کہا۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں، اللہ کے نام پر کر رہا ہوں" ــــ عمران نے کہا ــــ "میں نے خدا سے مدد مانگی تھی۔ مجھے جو بھی خیال آتا ہے، وہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اگر میں سچا ہوا تو خدا مجھے کامیابی عطا کرے گا۔"

فاطمہ سیاہ سائے کی طرح چلتی گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد عمران بلاذری زور سے کھانس دیتا تھا۔ یہ فاطمہ کے لیے اشارہ تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے .... مندر بہت بڑے بھوت کی طرح کھڑا نظر آنے لگا۔ عمران نے دُور سے روشنی دیکھی۔ یہ پنڈت کے کمرے کے دروازے سے باہر آئی تھی۔ پنڈت نے فاطمہ کی دستک پر دروازہ کھولا تھا۔ عمران کو فاطمہ کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ روشنی غائب ہو گئی۔

عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے چلا گیا۔ دونوں ساتھیوں کو ذرا دُور درختوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور خود دبے پاؤں دروازے کے قریب چلا گیا۔ دروازے کی درزوں میں سے روشنی آ رہی تھی۔ دروازے تک تین چار سیڑھیاں جاتی تھیں۔ عمران سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم یہ بچوں کی سی ضد کیوں کر رہی ہو" ــــ پنڈت کہہ رہا تھا ــــ "وہاں کوئی ہندو بھی نہیں جا سکتا، تم تو مسلمان ہو۔"

"میں اُس چڑیل کو آخری بار اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں" ــــ فاطمہ نے کہا ــــ "دُور سے دکھا دینا۔"

"مجھے آج رات اُدھر جانا ہی تھا لیکن آدھی رات کے بعد جاؤں گا جب چاند اوپر آ جاتا ہے" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "تم اُس وقت تک یہاں رک سکو گی؟"

"ابھی چلیں" — فاطمہ نے کہا۔ "آپ کی اُجرت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ میں آپ کو مُنہ مانگی قیمت دے رہی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ انسانی قربانی محض فریب ہے۔ میں آپ کا بھانڈہ پھوڑ سکتی ہوں۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہُوں۔ میں آپ کے جال میں نہیں بلکہ آپ میرے جال میں آئے ہُوئے ہیں۔ اگر آپ میری یہ ذرا سی خواہش پوری نہیں کر سکتے تو میں واپس چلی جاتی ہُوں لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کا انجام کیا ہوگا۔"

فاطمہ بجائے خود ایک سحر تھا جو پنڈت پر غالب آگیا۔ اس کے ساتھ سونے کے ٹکڑے تھے۔ فاطمہ کی دھمکی بھی کام کر گئی۔ کچھ وقت اور گزرا عمران کو اندر سے کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔

"میں تمہیں دُور سے دکھا کر واپس لے آؤں گا... چلو" — یہ پنڈت کی آواز تھی۔

عمران دروازے سے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔ پنڈت اور فاطمہ باہر نکلے۔ دروازہ بند ہُوا اور وہ ایک طرف چل پڑے۔ خاصا فاصلہ رکھ کر عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے پیچھے چل پڑا۔ آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔ جنگل تھا۔ عمران کو یہ خطرہ محسُوس ہو رہا تھا کہ پنڈت کو اپنے پیچھے آہٹ سنائی دے گی اور وہ پیچھے کو آئے گا، لیکن اُسے آگے پیچھے کا خیال نہیں تھا۔ وہ فاطمہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا جا رہا تھا۔

ٹیلوں کا علاقہ آگیا۔ پنڈت اور فاطمہ دو ٹیلوں کے درمیان چلے گئے۔ عمران اور اس کے ساتھی بھی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے مگر انہیں ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ راستہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جا کر مڑ جاتا تھا اور اندھیرا تھا۔ وہ پنڈت اور فاطمہ کی باتوں کی آواز پر چلے جا رہے تھے۔ تین چار جگہیں ایسی آئیں کہ وہ غلط راستے پر ہو چلے تھے۔ انہیں ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑا۔ آگے گئے تو انہیں دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی جیسے عورتیں مل کر گا رہی ہوں۔ اگر عمران اور اس کے ساتھی یہاں اکیلے آتے اور یہ آواز سن لیتے تو وہ اسے بد روحوں کا گانا سمجھ کر واپس چلے

جاتے۔ عمران کو پنڈت کی اصلیت معلوم ہو چکی تھی، اس لیے اُسے ڈر محسوس نہ ہُوا۔
آگے جا کر راستے اس طرح الجھ گئے کہ عمران اور اس کے ساتھیوں کے لیے پنڈت اور فاطمہ کو دیکھ کر چلنا ممکن نہ رہا۔ انہیں نظر آنے لگا تھا کہ وہ بھٹک جائیں گے۔ لہٰذا انہیں فاصلہ کم کرنا پڑا اور انہوں نے اپنی رفتار بھی تیز کر دی۔ پنڈت رُک گیا۔
"کون ہو؟" — پنڈت نے پیچھے کو آتے ہوئے کہا۔
عمران اور اس کے ساتھی ایک طرف ہٹ گئے۔ بھاگنا مناسب نہیں تھا۔ وہ راستے سے اِدھر اُدھر ہو کر ٹیلوں کے دامن میں بیٹھ گئے۔ پنڈت ان کے درمیان آ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے خنجر نکالا اور اُٹھ کر خنجر کی نوک پنڈت کے دل پر رکھ دی۔
"یہیں رُکے رہو" — عمران نے کہا — "قتل ہونا پسند کرو گے یا ہمیں رشی تک لے چلو گے؟ اس مسلمان لڑکی سے جو اُجرت تم نے وصول کی ہے وہ میں جانتا ہوں۔ آج سونے کے جو سکے تم نے اس سے لیے ہیں وہ اپنے پاس رہنے دو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں رشی تک لے چلو۔"
"فاطمہ!" — پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں فاطمہ سے کہا جو اُن کے قریب آ گئی تھی — "تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔"
"تم نے میرا جو بھی کام کیا ہے اس کی تم نے پوری قیمت وصول کی ہے" — فاطمہ نے کہا — "میں نے تمہیں سونے کی شکل میں بھی قیمت دی ہے، جسم کی شکل میں بھی۔ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آئی ہوں، تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔"
دو اور خنجروں کی نوکیں پنڈت کے جسم کے ساتھ لگ گئیں۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ دور سے عورتوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹیلوں کے جھرمٹ میں یہ آواز مترنم گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔
"اس آواز پر ہم خود بھی رشی تک پہنچ سکتے ہیں" — عمران نے پنڈت سے کہا — "ہم صرف تین آدمی نہیں۔ ہمارے ساتھ بہت آدمی ہیں۔ ہم نہ تمہیں زندہ

چھوڑیں گے نہ تمہارے کسی اور پنڈت کو۔ ہم ان گانے والیوں کو بھی اُٹھا لے جائیں گے۔ خون خرابے سے بچو اور چل کر وہ ہندو لڑکی ہمارے حوالے کر دو جسے قربانی کے لیے لائے ہو۔ اپنے پتھر کے خداؤں اور مورتیوں کو پکارو، تمہاری دیویاں اور دیوتا تمہاری مدد کو نہیں آئیں گے..... چلو"

پنڈت خاموشی سے آگے آگے چل پڑا۔ اُس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ عمران اور اس کے ساتھیوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ آگے کیا ہے۔ انہیں صرف عورتوں کا گیت سنائی دے رہا تھا۔ راستہ مڑتا، کئی راستوں میں الجھتا اور ٹیلوں کے گرد گھومتا جا رہا تھا۔ عمران چوکنّا تو تھا ہی، وہ اور زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پنڈت انہیں کسی غلط راستے پر ڈال کر غائب ہو جائے اور انہیں پنڈت کے آدمی گھیر کر ختم کر دیں گے۔

راستہ ایک میدان میں داخل ہو گیا۔ یہ کوئی وسیع میدان نہیں تھا۔ چالیس پچاس گز چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ یہ گولائی میں تھا۔ اس کے گرد مندر اور کمرے تھے جو پختہ ٹیلوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ چبوترے بنے ہوئے تھے جن میں بعض پر سادھو قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی اور وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ میدان میں دس بارہ جوان لڑکیاں دائرے میں رقص کی اداؤں سے گھومتی اور گا رہی تھیں۔ بہت سی مشعلیں زمین میں گاڑھی ہوئی تھیں۔ گانے والی لڑکیوں کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سب نیم عریاں تھیں..... پنڈت رک گیا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں تینوں مسلمانوں کی طرف دیکھا۔

"لڑکی ہمارے حوالے کر دو" ــــ عمران نے پنڈت کے پہلو میں خنجر کی نوک چبھو کر کہا۔

پنڈت نے بلند آواز سے حکم دیا ــــ "رک جاؤ"

گانے والیاں خاموش ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ پنڈت اور سادھو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رشی جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ عمران اور اس کے ساتھیوں نے منہ اور سر پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے خنجر بند کر کے تلواریں نکال لیں اور پنڈت کو آگے لے گئے۔ تمام پنڈتوں، سادھوؤں اور لڑکیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ بڑا پنڈت

دو تلواروں کے درمیان کھڑا تھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر رشی کو اٹھایا۔ رشی اُسے آنکھیں کھولے دیکھتی رہی جیسے عمران کو پہچان نہ سکی ہو۔ عمران نے بلایا، اسے جھنجھوڑا مگر وہ اسے دیکھتی ہی رہی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے کچھ پلایا گیا ہے جس کے اثر سے اس کا دماغ حاضر نہیں۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور چل پڑا۔ رشی اس کے ساتھ چلتی آئی۔ عمران نے سب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو وہ مارا جائے گا۔ تم سب بہت سے آدمیوں کے گھیرے میں ہو۔"

"اس پر یہ اثر کب تک رہے گا؟"۔ عمران نے پنڈت سے پوچھا۔

"صبح تک اتر جائے گا"۔ پنڈت نے جواب دیا۔ "جاؤ۔ اسے لے جاؤ"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے"۔ عمران نے کہا۔ "ہمیں راستہ یاد نہیں رہا۔ ہمارے آگے آگے چلو"۔ عمران نے تلوار کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

پنڈت سدھائے ہوئے جانور کی طرح آگے آگے چل پڑا۔ اس پر دہشت کا غلبہ تھا۔ وہ جب ایک بار پھر ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہوئے اُس وقت رسد کے ذخیرے کو آگ لگانے والے ذخیرے میں داخل ہو چکے تھے اور تیل چھڑک کر آگ لگا رہے تھے۔ پنڈت آگے آگے چلا آ رہا تھا۔ عمران، نظام اور ریزی اور قاسم بلجی کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ فاطمہ بھی ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ رشی دماغی غیر حاضری کی کیفیت میں ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

آخر وہ اس علاقے سے نکل آئے۔ تب انہوں نے دیکھا کہ شہر کی طرف سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ پھر بلند ہوتے ہوئے شعلے بھی نظر آنے لگے۔ عمران نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ۔۔ "اللہ اکبر"۔ اور اپنے ساتھیوں سے ان کی زبان میں کہا۔ "وہ دیکھو۔ اللہ کے شیروں نے کفار کی کمر توڑ ڈالی ہے۔ غزنی پر حملہ کرنے والوں کو ہمارے خُدا نے بھسم خاکستر کر دیا ہے۔"

"یہ کیا ہوا؟"۔ پنڈت کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔ "شہر جل رہا ہے"۔

"یہ ہمارے خدا کا قہر ہے جو تم پر گرا ہے"۔ عمران نے کہا۔ "اپنی عبادت گاہوں

ہیں بلکہ تم سفلی عیاشی سے گریز نہیں کرتے اس ہندو لڑکی کی آہ نے تمہارے شہر کو آگ لگا دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ انسانی قربانی فریب ہے، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے اس لڑکی کو قربانی کے لیے کس طرح منتخب کیا تھا ہیں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دیں گے۔ ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہے ہیں کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم کسی کو لے گئے ہیں۔ تمہارے راجہ نے اس لڑکی کو ابھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی اور لڑکی لے آؤ اور اُس کی قربانی دے دینا۔ ہم تمہاری فریب کاری پر پردہ ڈالے رکھیں گے۔ اتنی زیادہ رعایت اور جان بخشی کے باوجود تم نے کوئی گڑبڑ کی تو اُن شعلوں کو دیکھ لو۔ جو اِس شہر کو آگ لگا سکتے ہیں وہ تم جیسے ایک سَو پنڈتوں کو زندہ جلا سکتے ہیں"۔

پنڈت شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس پر جیسے غشی طاری ہوئی جا رہی تھی۔ شعلے بہت اوپر چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ شہریوں اور فوج کا شور و غوغا بھی سنائی دینے لگا تھا۔ پنڈت یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اس نے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ عمران اور اس کے ساتھی تیزی سے چل پڑے۔ ہر کام خوش اسلوبی سے ہوتا جا رہا تھا۔ یہ خدائی مدد تھی۔

وہ دریا کے کنارے اُس جگہ پہنچے جہاں جگ موہن کو انتظار کے لیے کہا گیا تھا۔ جگ موہن چار گھوڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے کوئی پون میل دُور گھوڑوں اور گاڑیوں کی آوازیں اور انسانوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ آگ بجھانے کے لیے پانی لے جا رہے تھے۔

"شہر جل رہا ہے"۔ جگ موہن نے گھبرا کر کہا۔ "یہ آگ کیسے لگی؟ میرا گھر بھی جل رہا ہوگا"۔

"جل جانے دو"۔ عمران نے کہا۔ "تم اب اس گھر میں نہیں جا رہے تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ اب اپنے آپ کو ہندو سمجھنا چھوڑ دو۔ ہمارے مذہب کا کرشمہ دیکھ لو۔ تمہاری معصوم بہن کو پنڈت قربانی کے لیے لے گیا تھا میں نے اپنے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ہمت اور جرأت دے کہ میں اس لڑکی کو بچا کر ثابت کر سکوں کہ سچا خدا مسلمانوں کا ہے.... دیکھ لو۔ سارے شہر کو آگ لگ گئی ہے اور تمہاری بہن تمہارے سامنے کھڑی

ہے۔ اسے ہم دیوتاؤں سے چھین لائے ہیں۔"

"اوہ ۔میری بہن"۔ جگ موہن کے مُنہ سے نکلا اور وہ دوڑ کر اپنی بہن سے لپٹ گیا مگر بہن لاش کی طرح کھڑی رہی جگموہن کے بلانے اور جھنجھوڑنے کے باوجود اُس نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کیا۔

"اسے تمہارے پنڈتوں نے اس اثر والی کوئی دوائی پلا رکھی ہے"۔ عمران نے کہا۔"صبح تک اسی حالت میں رہے گی.... ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔ بہن کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھاؤ اور چلو۔"

جگ موہن نے رشی کو اپنے آگے سوار کر لیا اور فاطمہ کو عمران نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور یزری اور بلجی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وہ کشتیوں کے پل سے نہیں گزر سکتے تھے۔ وہاں سنتریوں کا خطرہ تھا۔ انہوں نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا اور گہرائی کم تھی۔ وہ دریا پار کر گئے۔ انہوں نے پیچھے دیکھا۔ اب شعلے درختوں کو بھی جلا کر آسمان تک پہنچ رہے تھے۔

"یہ آگ ہمیں یہ فائدہ دے گی کہ کسی کو اِدھر اُدھر کی ہوش نہیں رہے گی"۔ —— عمران نے کہا۔" راجہ جے پال کی اپنی بیٹیاں اغوا ہو گئیں تو وہ انہیں بھی نہیں ڈھونڈے گا۔"

صبح طلوع ہوئی تو جہاں ڈیڑھ میل کے علاقے میں راجہ جے پال کی فوج کی رسد اور جنگی سامان کے انبار لگے ہوئے تھے وہاں راکھ کے ڈھیر پڑے تھے۔ درخت بھی جل گئے تھے۔ ان میں سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ ابھی تک راکھ پر پانی پھینک رہے تھے کیونکہ یہ راجہ کا حکم تھا۔ مسلمانوں کے گھر لُوٹے جا رہے تھے۔ راجہ نے رات کو ہی حکم دے دیا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو اور وہاں سے جتنی نقدی اور زیورات ہاتھ آئیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دو اور فوج کے کام کا جو سامان

ملبے اُٹھالاؤ۔

رات کو جب عمران اور اس کے ساتھی بڑے پنڈت سے رشی کو چھین کر لے گئے تو پنڈت شہر کی طرف چل پڑا۔ وہ آگ سے بے نیاز اپنے مندر میں گیا اور اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آگ کی طرف چلا گیا۔ شہر کی ساری آبادی باہر آگئی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں ہر انسان نظر آرہا تھا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ پنڈت اور اس کے آدمی عورتوں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ پنڈت ایک جگہ رک گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو ایک نوجوان لڑکی دکھائی اور خود پرے ہٹ گیا۔

کچھ دیر بعد کسی طرف سے گھوڑا گاڑیاں دوڑتی آئیں۔ عورتیں راستے سے ہٹنے کے لیے اِدھر اُدھر ہٹیں۔ پنڈت کے ایک آدمی نے اس لڑکی کو پکڑ لیا جو پنڈت نے انہیں دکھائی تھی۔ دوسرے آدمی نے لڑکی کی ناک پر کپڑا رکھ دیا اور اسے دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں لے گئے۔ انہیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ وہاں سے اٹھا کر مندر میں لے گئے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے اُسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ رشی کی طرح سب کچھ دیکھتی تھی مگر اس کا دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہندومت نہ کبھی مذہب کہلا سکا ہے نہ یہ آج مذہب ہے۔ یہ توہمات، رسومات اور تعصّبات کا مرکب ہے، جسے اِس کے پیشواؤں نے مذہب کہہ دیا تھا۔ اس نام نہاد مذہب میں خدا کا تصوّر پیدا نہ ہو سکا۔ منتوں، کمزوروں، بچوں اور عورتوں کی قتل و غارت، حیوانی جذبات پرستی، دھوکہ فریب اور وعدہ شکنی اس مذہب کے اصول ہیں۔ اس کے پیشواؤں نے اپنی عیّاشی کے لیے ایسے ایسے توہّمات پیدا کیے جو اُن کے پیروکاروں کے ذہن اور دل پر غالب آگئے اور خدا کی بہت سی شکلیں گھڑ لی گئیں۔ لہٰذا چاند اور سورج گرہن، سیلاب، آگ، سانپ، بندر اور آسمانی بجلیوں وغیرہ کو انہوں نے مختلف دیوتاؤں سے منسوب کر کے اِن کی پوجا شروع کر دی۔ آج تک یہ قوم سانپ کی پوجا کرتی ہے۔

راجہ جے پال اس آگ کو جو بھٹنڈہ کے جانبازوں نے لگائی تھی، اپنے دیوتاؤں کا قہر سمجھتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ یہ غزنی کے جاسوسوں کی کارستانی ہے۔ وہ دو طرح

کی باتیں کرتا تھا کبھی کہتا۔ "پنڈت کو بلاؤ۔ دیوتا سخت ناراض ہیں۔ ایک کی بجائے دو لڑکیوں کی قربانی دو۔ فوراً... جلدی" — اور اس کے ساتھ ہی چلاّ چلاّ کر کہتا — "مسلمانوں کے گھر جلادو۔ ان کے گھر لوٹ کر فوج کو دے دو۔ ان کی عورتوں کو میرے سامنے لے آؤ۔"

دیوتاؤں پر اس کا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ وہ جانباز جو رسد کے ذخیرے اور اس کے دل کو آگ لگا گئے تھے، وہ اس کی دسترس سے دور چلے گئے تھے۔ اس کے سامنے پانچ چھ مسلمان لڑکیاں کھڑی تھیں جو اُسے پیش کی گئی تھیں۔ یہ شریف گھرانوں کی بیٹیاں تھیں جو مسلمانوں کو سزا دینے کے طور پر گھروں سے زبردستی راجہ کے پاس لے جائی گئی تھیں۔ راجہ تخت پر بیٹھا لڑکیوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں طنز بھی تھی اور ہوس بھی۔

"تم خوش قسمت ہو کہ خوبصورت ہو" — راجہ جے پال نے لڑکیوں سے کہا — "ورنہ میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتا جس سے تمہاری قوم عبرت حاصل کرتی۔ میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ تمہیں راج محل میں رکھا جائے گا۔ اپنے مذہب کو بھول جاؤ۔ جس روز تمہارے گھر والے ہمیں آکر بتادیں گے کہ آگ کس نے لگائی تھی، اُس روز تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ اُس وقت تک تم"..... راجہ طنزیہ ہنسی ہنس پڑا۔

"ہمارا مذہب تمہارے مذہب کی طرح اتنا گھٹیا نہیں کہ ہم اسے تمہارے حکم سے بھُول جائیں" — ایک لڑکی نے کہا۔

"بکواس بند کرو لڑکی" — ایک درباری نے گرج کر کہا — "تم مہاراج کے دربار میں کھڑی ہو۔"

"مہاراج ہمارا خدا نہیں" — ایک اور لڑکی نے کہا — "کمزوروں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والا مہاراجہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کی بیٹیاں اس کی عزت کریں.... یاد رکھ مہاراجہ! ہم ہنسی خوشی تمہارا ظلم و ستم سہہ لیں گی مگر تیرا انجام بہت بُرا ہو گا۔ تُو زندہ جلے گا۔ تیرا کوئی دیوتا تجھے بچا نہیں سکے گا۔ تُو دو بار شکست کھا چکا ہے۔ ایک نہیں ایک ہزار لڑکیاں اندر دیوی کے قدموں میں ذبح کر دے، شکست تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ تُو ہمیں سزا دے رہا ہے۔ ہمارا خدا تجھے سزا دے گا۔"

"لے جاؤ انہیں" ۔۔۔ راجہ جے پال نے حکم دیا۔
سپاہی لڑکیوں کو دھکیلتے گھسیٹتے لے گئے۔

سلطان محمود غزنوی خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا تھا مگر خانہ جنگی رکی نہیں تھی۔ اُس وقت خلافت بغداد کی گدّی پر القادر باللہ عباسی بیٹھا تھا۔ اسلامی نظام کے مطابق تمام مسلمان سلطنتیں اور چھوٹی بڑی ریاستیں خلافت کے تحت آتی تھیں اور خلیفہ کے حکم کی تعمیل اِن کے فرائض میں شامل تھی مگر اقتدار کی ہوس اور توسیع پسندی نے مسلمان حکمرانوں کے دلوں سے خلافت کا احترام نکال دیا اور آپس میں عداوت پیدا کر دی تھی۔ خلافت برائے نام مرکز بن کے رہ گیا تھا۔ سبکتگین نے خلافت سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ محمود نے بھی خلافت کی عظمت کو برقرار رکھا۔ خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر کے سلطان محمود نے خلیفہ کو ان الفاظ کا پیغام بھیجا:

"قوم نے پہلی خانہ جنگی میں جو زخم کھائے ہیں، وہ ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ مجھے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ایک اور جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے تھے اور خود ہی حکمران بن بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں صلح وصفائی کے پیغام بھیجے۔ انہیں غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کھیلنے سے روکا مگر میری امن پسندی کو انہوں نے میری بزدلی سمجھا۔ انہوں نے حالات اتنی جلدی خراب کر دیئے کہ میں آپ سے حکم نہ لے سکا۔ مجھے فوری طور پر جنگی کارروائی کرنی پڑی۔ یہ بظاہر خوش خبری ہے کہ میں نے خراسان اور بخارا کو ان باغیوں اور غداروں سے چھین کر سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا ہے مگر میں اسے خوشخبری نہیں سمجھتا۔ یہ ایک قومی المیہ ہے کہ ہم آپس میں لڑے اور دونوں طرف وہ فوج ضائع ہوئی ہے جس سے ہمیں سلطنت اسلامیہ کا تحفظ کرنا تھا اور اسلام کے فروغ کے لیے کفرستان کو اسلام کے پرچم تلے لانا تھا.....

"میں مردِ میدان ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ میری عمر میدانِ جنگ میں گزر جائے گی اور میری لاش کسی محاذ سے اٹھائی جائے گی۔ خدشہ یہ کہ میں اپنے بھائیوں کے خلاف

لڑتا ہوا مارا گیا تو میرا جہاد رائیگاں جائے گا اور میں خدا کے حضور سرخرو نہیں ہو سکوں گا۔ میں اپنی سلطنت کی توسیع نہیں اسلام کا فروغ چاہتا ہوں۔ مجھے تاج سر پر رکھ کر تخت پر بیٹھنے کی مہلت ہی کب ملے گی۔ مجھے ہندوستان کے بت للکار رہے ہیں۔ راجہ جے پال ہندوستان کی تمام ریاستوں کی فوجوں سے غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں اُس کی طرف بڑھتا ہوں تو میرے مسلمان بھائی میری پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے ہیں....

"کیا آپ سامانیوں، طبرستانیوں، غوریوں، اور ایلخانیوں کو بتا سکتے ہیں کہ ہم سب ایک اُمت ہیں؟ کیا وہ آپ کی بات ذہن نشین کر لیں گے کہ مرکز سے ٹوٹ کر کوئی ایک بھی مسلمان ریاست باقی نہیں رہ سکے گی؟.... خانہ جنگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مجھے آپ کی حوصلہ افزائی اور دعا کی ضرورت ہے۔ سلطنتِ غزنی کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ آپ میری مالی مدد نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے مالی مدد مانگوں گا۔ میرے لیے دعا کریں۔ میں اللہ سے مدد مانگتا ہوں۔"

بغداد سے خلیفہ القادر باللہ عباسی کا جواب آیا:

"آپ کا پیغام پڑھ کر مجھے افسوس ہوا ہے، حیرت نہیں ہوئی۔ ہماری یہ روایت نئی نہیں کہ اپنے اوپر حکمرانی کا نشہ طاری کر کے اپنے مذہب اور ملّی اتحاد کو قربان کر دو۔ یہ لوگ جو آپس کے خون خرابے کا باعث بنے ہوئے ہیں، اسلام کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اپنے بھائیوں کا خون بہانے کے لیے عیسائیوں اور یہودیوں تک سے مدد لیتے ہیں۔ اُمتِ رسول اللہ کو اپنی رعایا بنانے کے لیے جھوٹ بول بول کر لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے، اکساتے اور خانہ جنگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہ ہماری روایت بن گئی ہے اور یہی ہماری تاریخ بنے گی۔ قومِ مسلم کے اُمرا تخت و تاج کے حصول کی خاطر قوم کو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنائے رکھیں گے۔ سلطنتِ اسلامیہ ریاستوں میں بٹتی چلی جائے گی۔ کفار انہیں مدد دیتے رہیں گے۔ جلتی پر تیل ڈالتے رہیں گے اور سلطنت کو ٹکڑوں میں کاٹتے چلے جائیں گے....

"یہ اُمرا اور حکمران سمجھ نہیں سکتے کہ مرکز سے کٹ کر ان کی حالت ویسی ہی ہو رہی ہے جیسی درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخوں کی ہوتی ہے۔ انہیں پتا پتا ہو کر بکھر جانا اور سوکھ جانا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاخیں اسی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہیں تو اسلام کا درخت سوکھ جائے گا....

"خانہ جنگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اگر آپ کو ایک فیصلہ کُن خانہ جنگی لڑنی پڑے تو میں آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی نیّت میں فتور نہ ہو۔ آپ قوم کو متحد کریں۔ آپ کا مقصد اسلام کا فروغ ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمان ذلّت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہندوؤں کے ڈر سے اور ان کی فریب کاریوں سے بھی اسلام سے دستبردار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ فرض سونپتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچیں۔ ان کے وقار کا تحفظ کریں۔ ہندوستان کے بُت توڑ کر وہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھیں.... اگر آپ کی نیّت صاف ہوئی اور آپ کے دل میں جہادِ فی سبیل اللہ کا جذبہ ہُوا تو اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ سلطانی کے لیے لڑنے والوں کو اگر کامیابی حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ عارضی ہوتی ہے۔ دائمی فتح ان کی ہوتی ہے جو حق پر ہوتے ہیں۔"

اس پیغام کے ساتھ خلیفہ نے سلطان محمود کو افغانستان، سیستان اور خراسان کی سلطانی کی سند دے کر اسے یمین الدولہ اور امین الملّت کے خطابات عطا کیے۔

مشہور مؤرّخ اور وقائع نگار محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ راجہ جے پال کے دوسرے حملے کو روکنے میں اور اس کے فوراً بعد خانہ جنگی میں سلطان محمود کی فوج کا جہاں جانی نقصان ہوا وہاں مالی نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔ "فتح البلاد"، "سفرنامہ ابونصر مسقطی" اور ابوالفضل کی تحریریں شاہد ہیں کہ محمود کے دربار میں مختلف علوم کے جتنے عالم تھے اور جتنی عمدہ فوج محمود کی تھی اور جتنی عمدہ انتظامیہ تھی، اس کی مثال اُس وقت تک کوئی اور مسلمان حکمران پیش نہیں کر سکا تھا، مگر فوج اور سول انتظامیہ کے اس اونچے معیار کو برقرار رکھنے پر بہت خرچ اٹھتا تھا۔ ہندوستان میں اور اڑوس پڑوس کے دیگر ممالک میں جو جاسوسی

نظام قائم کیا گیا تھا، اس کے اخراجات بھی خاصے زیادہ تھے یہی وجہ ہے کہ سلطان محمود کو مالی پریشانیوں نے گھیر لیا۔

انہی دنوں جب سلطان محمود غزنوی ایک طرف خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا، دوسری طرف ہندوستان کا لشکر غزنی پر حملہ کرنے آ رہا تھا، تیسری طرف مالی پریشانی اور چوتھی طرف یہ عالم کہ جن سے مالی اور فوجی مدد ملنی چاہیے تھی، وہ اس کے دشمن ہو گئے تھے، ایک روز اس کے غزنی کے دربار میں دو اجنبی آئے۔ یہ سیستان کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں کو پانی دور سے ملتا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے دور ایک ویرانے میں کنواں کھودنا شروع کیا۔ زمین کی سطح کی حالت بتاتی تھی کہ پانی زیادہ گہرائی میں نہیں ہوگا اور زمین نرم ہوگی مگر تین ہاتھ نیچے تک کھدائی کی تو آگے زمین پتھروں جیسی سخت ہو گئی۔

"سلطانِ خراسان و سیستان!" — ایک مسافر نے کہا — "اگر زمین صرف سخت ہوتی اور پتھر کی سلیں ہوتیں تو ہم کھدائی ترک کر دیتے۔ ہم حیران اس پر ہوئے کہ جس نے ہماری کدالوں کو روک لیا ہے وہ چمکتی ہوئی کوئی چیز ہے۔ یہ پتھر نہیں ہو سکتے۔ پتھروں میں ایسی چمک نہیں ہوتی۔ یہ کوئی دھات ہے اور یہ کسی پرانے بادشاہ کا مدفون خزانہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں مدفون خزانہ ہوتا ہے وہاں جنات اور خزانہ دفن کرنے والوں کی بدروحیں موجود رہتی ہیں۔ ہم یہ غرض لے کر آئے ہیں کہ اگر یہ خزانہ ہی ہے تو یہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ گاؤں والوں پر خوف طاری ہے۔ کوئی بھی خزانے کے قریب نہیں جاتا۔ ہمیں ایک بزرگ نے کہا ہے کہ سلطان کو اطلاع دے دی جائے۔"

سلطان محمود نے اسی وقت ان آدمیوں کے ساتھ اپنے دربار کے دو عالموں اور فوج کے دو چار حاکموں کو اس حکم کے ساتھ بھیج دیا کہ جنات اور بدروحوں سے ڈرنے کی بجائے مزید کھدائی کریں اور معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔

کچھ دنوں بعد سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ یہ مدفون خزانہ نہیں بلکہ سونے کی کان ہے جو سطح زمین سے صرف چار پانچ ہاتھ نیچے ہے۔ اس کی کھدائی کی گئی تو (محمد قاسم فرشتہ اور گردیزی کے مطابق) خاصے وسیع علاقے میں سونا برآمد ہوا۔ اس کان کی شکل درخت

کی سی تھی جیسے درخت گرا کر زمین میں دفن کیا گیا ہو۔ کان درخت کے ٹہنوں اور ٹہنیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی، یہ خالص سونا تھا جو کسی بادشاہ کا مدفون خزانہ نہیں بلکہ زمین کا معدنی خزانہ تھا۔

مذکورہ مؤرخ لکھتے ہیں کہ محمود کے دورِ حکومت میں اس کان سے سونا نکلتا رہا۔ اُس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہُوا تو وہ اپنے باپ کے اُلٹ ثابت ہُوا۔ اس نے اپنے آپ کو روائتی بادشاہ بنا لیا۔ سلطان محمود نے سلطنت غزنی کو خدا کے جس راستے پر ڈالا تھا، وہ راستہ اس کے بیٹے کے دور میں عیش و عشرت اور گناہوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ سونے کی اس کان کی دولت رقص و سرود اور جام و مینا میں اڑنے لگی۔ ایک رات شدید زلزلہ آیا۔ زلزلے کا مرکز یہی مقام تھا جہاں سے سونا برآمد ہو رہا تھا۔ وہاں سے زمین پھٹ گئی۔ پھر زمین بیٹھ گئی، اور کان کا پورا علاقہ زمین کے پیٹ میں چلا گیا۔ مسعود نے دور گہرائی تک زمین کھود ڈالی۔ اُسے مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ نہ ملا۔

یہ کان جب برآمد ہوئی تھی اور سلطان محمود غزنوی کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ خالص سونا ہے تو وہ اپنے پیرو مرشد ابوالحسن خرقانی کے ہاں حاضری دینے گیا اور انہیں بتایا کہ اُس کے باپ نے اس کی پیدائش سے پہلے خواب میں ایک درخت دیکھا تھا جو گھر کے ایک کمرے سے اُگا، اٹھا، چھت پھاڑ کر اوپر گیا اور اس نے آدھی دنیا پر اپنے ٹہنوں اور ٹہنیوں کا چھاتہ پھیلا دیا تھا۔

”...... اور اس کے بعد میں پیدا ہُوا“ محمود نے کہا۔ ”اُس خواب کی تعبیر یہ بتائی گئی تھی کہ میں دُور دُور تک اسلام کی روشنی پھیلاؤں گا۔ اب سونے کی جو کان برآمد ہوئی ہے اس کی شکل بھی درخت کی سی ہے۔ کان گہرائی میں نہیں گئی۔ سطح زمین کے ساتھ ساتھ درخت کی شاخوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ پیرو مرشد مجھے بتائیے کہ یہ خدائے ذوالجلال کا کوئی اشارہ ہے یا کیا ہے؟“

”جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں“

—— ابو الحسن خرقانی نے کہا— "اور جو تمہارے دل میں ہے خدا کو اس کا بھی علم ہے۔ خدا تمہارے متعلق وہ بھی جانتا ہے جو تم خود بھی نہیں جانتے۔ درخت ایک اشارہ ہے جو تمہیں نہیں، ہر سلطان اور بادشاہ کو سمجھنا چاہیے۔ خدا ایسے اشارے صرف انہیں دیا کرتا ہے جو اُس کے رسول ﷺ کی اُمّت سے ہیں۔ تم نے اگر دل میں خدا اور اُس کے رسول ﷺ کو جگہ دے رکھی ہے تو اُس کے اشارے کو سمجھو۔ تم نے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ تم نے انہیں بھی شکست دی جو مسلمان ہوتے ہوئے دینِ مسلّم سے منحرف ہوئے اور تخت و تاج کی خاطر حزب اللہ کا خون حزب اللہ کے ہاتھوں بہا دیا۔ تم نے فتح پائی مگر اتنے بدحال ہوئے کہ درہم و دینار کے محتاج ہو گئے۔ تم نے کہا کہ صرف اللہ سے مدد مانگوں گا۔ پس اللہ نے تمہاری مدد کی۔ اپنی زمین کا سینہ چیر کر تیری جھولی بھر دی اور سونا درخت کی شکل میں دیا......

" ہر سلطان کو درخت کی مانند ہونا چاہیے۔ ایسے درخت کی مانند جو دھوپ کے جھلسے ہوئے انسانوں کو ٹھنڈی چھاؤں مہیّا کرتا ہے۔ زندگی کے کٹھن سفر کے تھکے ہوئے لوگ درخت کے نیچے آ گرتے اور ستاتے ہیں۔ تھکن سے چُور جسم تر و تازہ ہو جاتے ہیں تو مسافر پہلے سے زیادہ کٹھن سفر کے قابل ہو جاتے ہیں۔ درخت اپنی روزی زمین سے حاصل کرتا ہے، انسان کا خون نہیں چوستا۔ زمین سے مٹی لیتا اور لوگوں کو چھاؤں دیتا ہے۔ لوگوں سے لیتا کچھ نہیں .... محمود! ٹھنڈی چھاؤں والے گھنے درخت کو تصوّر میں لاؤ۔ اس کی خوبیاں تمہارے سامنے نکھرتی آئیں گی۔ خدا کا یہ اشارہ نہیں حکم ہے کہ اپنے آپ میں یہ خوبیاں پیدا کرو۔ یہ ذہن میں رکھو کہ انسان بڑا بے وفا اور اوچھا ہے۔ درخت کو کاٹ لیتا ہے، درخت انسان کو نہیں کاٹتا۔ درخت کٹ جائے تو انسان کے کام آتا ہے اس کا پلنگ بنتا ہے۔ اندھے اور لنگڑے کی لاٹھی بنتا ہے۔ سلطان کا تخت بنتا ہے ....

" مگر یاد رکھو محمود! جب سلطان اپنے آپ کو انسانوں کا حاکم اور روزی رساں بنا کر اپنے آپ کو درخت کی صفات سے محروم کر لیتا ہے تو تخت الٹتے دیر نہیں لگتی۔ انسان کو دو چیزیں شیطان بناتی ہیں۔ سونا اور سلطانی۔ وہ انسان بھی شیطان بن جاتا ہے جسے یہ دونوں چیزیں تو حاصل نہ ہوں لیکن وہ اپنے دل میں ان کی ہوس پیدا کر لے۔ جس سر پر

سلطانی کی دستار رکھ دی جائے وہ سر جتنا خدا کے آگے جھکے اتنا ہی بندوں کے آگے جھکے۔ اگر نہیں تو ایسے سلطان کے رکوع و سجود رائیگاں جاتے ہیں کیونکہ یہ دکھاوے کے ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کو فریب دینے کے لیے ہوتے ہیں جس نے اللہ کے بندوں کو جسمانی اور روحانی بھوک دی وہ اللہ کے حضور جا کر دوزخ کو روانہ ہوا جہاں اس کی رعایا کی آہیں اور فریادیں اور رنج و آلام جو سلطان نے دیئے، وہ سب انگارے بن کر اسے جلاتے رہیں گے، بچھو بن کر اسے ڈستے رہیں گے .....

" تو نے خدا سے مدد مانگی۔ خدا نے تجھے مدد دی مگر دیکھ اور سوچ کر تو خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر نہیں، آسمان سے اتارا ہوا فرشتہ بھی نہیں، پھر خدا نے اپنی زمین کا سینہ چاک کر کے تیری سلطنت کو سونے میں کیوں نہلا دیا؟ یہ سونا تیرا نہیں، تیری سلطنت کا ہے۔ یہ سونا تیری سلطنت کی توسیع کے لیے ہے اگر تو تخت و تاج کے نشے میں بھول جائے گا کہ تیرے فرائض کیا ہیں اور بندوں کے کتنے حقوق تیرے سر ہیں تو زمین اپنی دولت نگل لے گی۔ جو خدا دیتا ہے وہ لے بھی لیتا ہے۔ اس اشارے کو سمجھو محمود!"

اپنے پیرو مرشد ولی ابو الحسن خرقانی سے روحانی فیض حاصل کر کے سلطان محمود نے اپنی توجہ سلطنت کی انتظامیہ اور فوج پر مرکوز کر دی۔ اس نے قوم کو اتنا خوشحال کر دیا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیجنے لگے۔ سلطان محمود نے حقوق العباد پر سب سے زیادہ توجہ دی۔

سلطان محمود کو ہندوستان کی اطلاع کا انتظار تھا۔

" اُدھر سے کوئی اطلاع نہ آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ راجہ جے پال شکست تسلیم کر کے بیٹھ گیا ہے"۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔۔۔ "اس صورت میں ہمیں ہندوستان پر حملے کی تیاری کرنی چاہیے۔"

"وہ حملہ ضرور کرے گا"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس کے ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اپنے ملک سے

دُور ہمارے میدان میں آکر لڑے ؟ اگر مجھے اس کی پیشقدمی کی اطلاع قبل ازوقت مل گئی تو میں اسے اپنی پسند کے میدان میں لڑاؤں گا۔"

"اب تک لاہور سے کِسی نہ کسی کو آجانا چاہیئے تھا" ___ سپہ سالار نے کہا۔ "ہمارے آدمی پکڑے نہ گئے ہوں"۔

"چند دن اور انتظار کرلو" ___ سلطان محمود نے کہا ___ "اگر کوئی اطلاع نہ آئی تو میں یہاں سے آدمی بھیج دوں گا۔"

لاہور سے اطلاع جا رہی تھی۔ عمران بلاذری، نظام اور یزی، قاسم بلخی اُس رات جگ موہن، اس کی بہن رشی اور فاطمہ کو ساتھ لے کر لاہور سے نکلے تھے جس رات بھٹنڈہ کے جاسوس جانبازوں نے لاہور میں راجہ جے پال کی رسد کو نذرِ آتش کیا تھا۔ بڑے پنڈت نے رشی کی جگہ اسی رات ایک اور لڑکی اغوا کروالی تھی اور اُسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا تھا۔ یہ لڑکی ہوش میں تھی۔ سب کو دیکھتی تھی۔ اسے جو کہتے تھے وہ کرتی تھی ایک پنڈت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا رہتا تھا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کردو ..... مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے خون کا تلک لگادو ..... میرے خون کی چمک دشمن کو اندھا کر دے گی۔"

یہ ایک پُراسرار سا عمل تھا جس میں سے لڑکی کو گزارا جا رہا تھا۔ اُس کے گرد اُسی کی عمر کی لڑکیاں ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ لڑکی کو خاص قسم کی غذا دی جاتی تھی اور اسے کوئی ایسی چیز کھلائی جاتی تھی جس کے اثر سے اُس کا ذہن اپنے قبضے میں نہیں رہا تھا۔ تین چار دنوں بعد اُس نے وہی کہنا شروع کر دیا جو اس کے ذہن میں ڈالا جا رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ہپناٹائز ہو چکی تھی۔

ایک روز راجہ جے پال کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے۔ اُسے پنڈتوں اور سادھوؤں کے جلوس میں مندر کے اندر کئی ہاتھوں والی دیوی کے بُت کے آگے لے جا کر دوزانو بٹھا دیا گیا۔ مندر کی کنواریوں نے اُس پر پھول نچھاور کیے۔ پنڈتوں نے بھجن گائے۔ لڑکی کو ایسے لباس میں راجہ کے سامنے لایا گیا جس میں وہ پری لگتی تھی۔ لڑکی نے بازو پھیلا کر کہا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کردو۔ مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے

خون کا تلک لگا دو"۔

لڑکی نے اس عمل کے زیرِ اثر جو اُس پر کیا جاتا رہا تھا، سر جھکا دیا۔ ایک پنڈت نے راجہ جے پال کی نیام سے تلوار نکالی۔ اسے راجہ کے سر پر پھیرا اور ایک ہی وار سے لڑکی کا سر اُس کے تن سے جدا کر دیا۔ مندر کے گھڑیال اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ تمام پنڈت، سادھو اور لڑکیاں ہاتھ جوڑ کر دیوی کے بت کے آگے جھک گئیں۔ بڑے پنڈت نے لڑکی کے خون میں انگلی ڈبو کر راجہ جے پال کے ماتھے پر خون کا تلک لگا دیا۔

راجہ جب ان پُراسرار اور ڈراؤنے ٹیلوں سے باہر آیا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور چہرے پر ایسی رونق جیسے اس نے غزنی کی سلطنت فتح کر لی ہو اور محمود غزنوی نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ اس نے اُسی روز جلے ہوئے سامان کی کمی پوری کرنے کے احکام جاری کر دیئے جو اتنے سخت تھے کہ اس کی ریاست کے گھر خالی ہو گئے۔ کسانوں کے ہاں اتنا ہی اناج رہنے دیا گیا کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ ہندو رعایا تو پہلے ہی راجہ کا خزانہ بھر رہی تھی۔ مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف ایسی نفرت بھر دی تھی کہ اسے مذہب کا فریضہ اور جنون بنا دیا گیا۔ ہندو عورتوں نے زیورات تک راجہ کو دے دیئے۔ راجہ خود ہندو ریاستوں کے مہاراجوں سے ملنے اور فوجی مدد لینے کو نکل کھڑا ہوا۔ اُس نے جیسے قسم کھالی تھی کہ اب کے وہ شکست کھا کر نہیں آئے گا اور غزنی کو ہر قیمت پر اپنی راجدھانی بنائے گا۔

عمران کا قافلہ جس میں نظام اوریزی، قاسم بلخی، جگ موہن، رشی اور فاطمہ شامل تھے، راوی پار کر کے رات بھر چلتا رہا اور وہ لاہور سے بہت دور نکل گئے۔ عمران جاسوس تھا۔ راستوں سے واقف تھا۔ اپنے قافلے کو عام راستے سے دور ہٹ کر لے جا رہا تھا۔ ایک گھنے جنگل میں صبح طلوع ہوئی۔ رشی گھوڑے پر ہی سو گئی تھی۔ عمران نے سب کو وہیں آرام کے لیے روک لیا۔ سب رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی آرام، چارے اور پانی کی ضرورت تھی۔ ان کا سفر بہت لمبا تھا اور یہ مسافت چوری چھپے طے کرنی تھی۔ رشی کو گھوڑے سے اتارا گیا تو بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اسے

لٹا دیا گیا۔ سب لیٹ گئے اور فوراً ہی گہری نیند سو گئے۔

کچھ دیر بعد فاطمہ نے عمران بلاذری کو جگایا اور اُسے پرے لے گئی۔

"تم اس ہندو لڑکی کو بھی ساتھ لے جا رہے ہو اور مجھے بھی" — فاطمہ نے کہا — "میرا مستقبل کیا ہوگا؟"

"اس وقت میرے سامنے سلطنتِ غزنی کا مستقبل ہے"۔ عمران نے جواب دیا — "اپنے ملک میں پہنچ کر تمہارے مستقبل کے لیے سوچوں گا۔ میرے فرض کے راستے میں نہ آؤ۔"

"میرے دل میں وہم بھر گیا ہے اور یہ مجھے ڈرا رہا ہے" — فاطمہ نے کہا "تم اپنے ملک کا فرض ادا کر رہے ہو۔ میں نے تمہاری جو مدد کی ہے وہ تمہاری خاطر کی ہے میں نے جو گناہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کا کفّارہ اسی طرح ادا کیا ہے جس طرح تم نے کہا تھا۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں رشی مِل گئی ہے مگر تم مجھے نہیں مِل سکو گے۔ اسے تم اپنے لیے لے جا رہے ہو۔"

"کیا تمہاری روح کو چین نہیں آیا؟" — عمران بلاذری نے پوچھا — "یہی رشی تمہیں چڑیل بن کر ڈراتی رہی ہے۔ اب یہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہیں اس سے ڈر تو نہیں آتا؟ تمہاری روح پر اب گناہ کا کوئی بوجھ نہیں رہا۔"

"میرے ساتھ روح کی باتیں نہ کرو عمران!" — فاطمہ نے نیند اور تذبذب سے بوجھل آواز میں کہا — "میرا جسم بیچا گیا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ جو کچھ ہے جسم ہے۔"

"سنو فاطمہ!" — عمران نے جھنجھلا کر کہا "معلوم ہوتا ہے ہماری راہیں جدا اور ہماری منزلیں جدا ہیں۔ میں تمہیں اپنا بھید بتا دیتا ہوں۔ میں خدا کی راہ میں لڑنے والا سپاہی ہوں۔ میں تمہارے ملک کا رہنے والا نہیں، میں غزنی کے علاقے کا باشندہ ہوں اور میں غزنی کا جاسوس ہوں۔ یہ دونوں مسلمان اُس فوج کے عہدیدار ہیں جس نے راجہ جے پال کو دو بار شکست دی ہے۔ یہ دونوں پکڑے گئے تھے اور

لاہور میں راجہ کی قید میں تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ تم جسم کے حسن اور جسم کی خواہشات پر قربان ہوئی جا رہی ہو۔ ہم جسمانی خواہشات قربان کر چکے ہیں۔ یہ بہن بھائی ہندو ہیں اور اپنے مذہب سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یہ فرض بھی میں نے اپنے اوپر لے لیا تھا کہ انہیں کفر سے نکالوں۔ اب تمہیں ثابت کرنا ہے کہ اسلام ایک عظیم مذہب ہے۔ اب جسم کی باتیں چھوڑ دو۔ ہم دشمن کے ملک سے گذر رہے ہیں۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔ تمہیں اپنے مذہب کی عظمت پر قربان ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیئے"

عمران جذباتی انداز سے حقیقت کی باتیں کر رہا تھا مگر فاطمہ کے چہرے پر اکتاہٹ سی تھی جیسے عمران کی بات اس کی سمجھ سے بالا ہو، یا وہ سمجھنا ہی نہ چاہتی ہو۔ اُس کے خیالوں میں اپنا ماضی تھا جس میں وہ عمران کے حال اور غزنی کے مستقبل کو فنا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اُس نے کوئی بات کی تو دیکھا کہ عمران اُس کی طرف متوجہ نہیں۔ اس کی نظریں اپنے سامنے کہیں اور جمی ہوئی تھیں عمران کے منہ سے سرگوشی نکلی۔ "رشی" ___ اور وہ اٹھ کر چل پڑا۔ فاطمہ نے دیکھا۔ رشی آہستہ آہستہ اس طرح چلی آ رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

عمران آہستہ آہستہ چلتا اُس کی طرف گیا۔ رشی نے قریب آ کر باہیں عمران کے گلے میں ڈال دیں، پھر چہرہ اس کے سینے سے لگا کر بچے کی طرح گال اس کے سینے سے رگڑنے لگی۔ عمران نے اُس کا سر اٹھایا۔ فاطمہ قریب بیٹھی دیکھ رہی تھی اور اُس کا خون کھول رہا تھا۔

"میں کہاں تھی؟" ___ رشی نے حیرت زدہ سرگوشی کی ___ "تم کہاں تھے؟ ہم کہاں ہیں؟ میرا بھائی اور دو آدمی وہاں پڑے ہیں۔ وہ زندہ ہیں؟" ___ اُس نے فاطمہ کو دیکھا تو عمران سے الگ ہو کر بولی ___ "یہ کون ہے؟ تمہاری بہن تو نہیں ہو سکتی۔ اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"ہوش ٹھکانے کر لو رشی! سب کچھ بتاؤں گا" ___ عمران نے کہا اور اسے بٹھا لیا ___ "ہم تمہیں پنڈتوں سے چھین لائے ہیں؛"

"یاد آ گیا ہے" ___ رشی نے کہا ___ "مجھے پنڈت دیوی پر قربان کرنے کے

لئے لینے آئے تھے، پھر معلوم نہیں کیا ہوا تھا.... وہ کہاں ہیں؟ میں شاید خواب دیکھ رہی ہوں"۔

"اس لڑکی کا نام فاطمہ ہے"۔ عمران نے کہا۔ "یہ ہماری مدد نہ کرتی تو ہم وہاں تک کبھی بھی نہ پہنچ سکتے جہاں تمہیں دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا"۔

عمران بلاذری نے اُسے تفصیل سے بتا دیا کہ اسے پنڈت کس طرح اور کہاں لے گئے تھے اور اسے وہاں سے آزاد کرانے کے لیے کس طرح فاطمہ کو استعمال کیا گیا تھا۔ عمران نے یہ بھی اسے بتا دیا کہ فاطمہ ایسے بوڑھے خاوند سے بھاگی ہے جس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں۔ رشی کو فاطمہ اس لحاظ سے تو اچھی لگی کہ اُس نے اُسے موت کے منہ سے بچایا ہے مگر اس کی عمر اس کی شکل و صورت اور جسم کا حسن دیکھ کر رشی کے دل میں عمران کے متعلق وسوسے پیدا ہو گئے۔ وہ فاطمہ کو شکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں نظام اور یزی اور جگ موہن آ گئے۔ وہ رشی کو ڈھونڈ رہے تھے رشی کے دماغ سے اُس دوائی کا اثر اُتر چکا تھا جو اِسے ٹیلوں والے مندر میں پلائی جاتی رہی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا وہ کہاں رہی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔

"دوستو!"۔۔۔ عمران نے کہا۔ "ہمارے سامنے بڑی ہی لمبی اور بڑی خطرناک مسافت ہے میرے پاس سونے کے کچھ سکے ہیں جو راستے میں کام آئیں گے، لیکن ہم جنگل سے ہی پانی اور خوراک حاصل کرنے کی کوشش کریں گے"۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ رشی مل گئی تو ہم واپس نہیں آئیں گے"۔۔۔ جگ موہن نے کہا۔ "اس لیے میں گھر سے بہت کچھ چرا لایا ہوں"۔۔۔ اُس نے کپڑوں کے نیچے کمر بند کے ساتھ بندھی ہوئی ایک تھیلی کھولی۔۔۔ اس میں نقدی کے علاوہ رشی کے زیورات تھے۔

فاطمہ کو بھی عمران نے کہا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائیگا اس لیے وہ بھی نقدی اور زیورات اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ نظام اور یزی نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق عمران کو میرِ کارواں قرار دے دیا اور کہا کہ یہ تمام ترزادِ راہ عمران کے حوالے کر دیا جائے

اور اب منزل تک اسی کا حکم چلے گا۔ سب نے یہ فیصلہ منظور کر کے نقدی اور زیورات عمران کے حوالے کر دیئے۔ یہ اچھا خاصا خزانہ تھا۔ اس میں چاندی کے سکے بھی تھے۔ وزن اتنا تھا جو کمر بند کے ساتھ باندھ کر نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ چمڑے کی ایک تھیلی میں ڈال دیا گیا اور تھیلی عمران نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس نے سب کو خبردار کر دیا کہ راستے میں ڈاکوؤں کا خطرہ ہے۔ اس تھیلی کے علاوہ ڈاکوؤں کے لیے دوسری کشش دو لڑکیوں کی تھی جو عمر اور حسن کے لحاظ سے ہر کسی کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھیں۔ ڈاکوؤں، رہزنوں اور راجہ کے مخبروں سے بچنے کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو سفر کیا جائے۔ چونکہ غزنی جلدی پہنچنا تھا اس لیے کم سے کم آرام اور قیام کرنا تھا۔

سورج غروب ہو گیا تو وہ چل پڑے۔ فاطمہ عمران کے پیچھے سوار ہوئی اور رشی جگ موہن کے پیچھے۔ چلتے چلتے قاسم بلخی نے اپنا گھوڑا پیچھے کر لیا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ نظام اور یزی کی بھی یہی مشکل تھی۔ صرف عمران تھا جو ان کی زبان سمجھتا اور بولتا تھا اور وہ ہندوستان کی زبان بھی اپنی مادری زبان کی طرح روانی سے بول سکتا تھا۔ بلخی کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر نظام اوریزی نے بھی گپ شپ لگانے کے لیے اپنا گھوڑا پیچھے کر کے قاسم بلخی کے ساتھ کر لیا۔ بلخی نے گھوڑا اور آہستہ کر کے عمران وغیرہ سے زیادہ فاصلے پر کر لیا۔

"کیا تم اس عمران پر اعتماد کر سکتے ہو جو دو جوان لڑکیاں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟" قاسم بلخی نے اوریزی سے پوچھا "تم نے اتنا زیادہ خزانہ بھی اس کے حوالے کر دیا ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کا ایمان برباد کیا کرتی ہیں .... سونا اور حسین عورت۔"

"اگر عمران قابل اعتماد نہ ہوتا تو ہمیں فرار کرانے کی بجائے اس ہندو لڑکی کو پنڈتوں کے قبضے میں جانے سے پہلے ہی اپنے ساتھ لے کر لاہور سے غائب ہو گیا ہوتا" — نظام اوریزی نے کہا "فاطمہ کو اس نے غیر معمولی دانشمندی سے استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ لڑکی اپنے خاوند سے بھاگنا چاہتی تھی، اس لیے عمران نے سلطنت کے فائدے کے پیش نظر فاطمہ کو خاوند سے نجات دلائی۔"

"ان دونوں لڑکیوں کا غزنی کی سلطنت کے نفع ونقصان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" ــ قاسم بلخی نے کہا ــ "یہ اس شخص کی عیاشی کا ذاتی انتظام ہے اور اس کے اخراجات یہ سلطنت کے خزانے سے پورے کر رہا ہے۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ فاطمہ خاوند والی عورت ہے۔ جب تک طلاق نہ لے اس کی شادی کسی اور کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ تم دیکھ لینا عمران اسے اپنی داشتہ بنا لے گا اور اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر لے گا۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے بد اعتمادی کی نہیں حسد کی بو آرہی ہے" ــ نظام اوریزی نے کہا ــ "تم اپنا دھیان ان لڑکیوں سے ہٹالو تمہیں شاید احساس نہیں کہ قید سے ہماری رہائی ہماری کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔ ہمیں اس کافر راجے کے قید خانے میں تڑپ تڑپ کر مرنا تھا۔ مجاہد میدان جنگ میں مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں ہمیں غزنی پہنچ کر اپنی فوج میں شامل ہونا اور ہندوستان کے کفّار کے خلاف لڑنا ہے۔ عمران کسی کو داشتہ رکھتا ہے، کسی کے ساتھ شادی کرتا ہے، ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔"

"ہم فوج کے عہدیدار ہیں" ــ قاسم بلخی نے کہا ــ "عمران کا رتبہ ہم سے کم ہے۔ میں اس کے ذاتی کردار کی اصلاح کر سکتا ہوں۔"

"ہم اسے اس سفر میں اپنا امیر مقرر کر چکے ہیں" ــ نظام اوریزی نے کہا ــ "اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ہم اسے روکیں گے مگر اس کی ذاتی سطح پر ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں صحیح سلامت اور بہت جلد غزنی پہنچنا اور سلطان کو خبردار کرنا ہے کہ وہ راجہ جے پال کا حملہ روکنے کی تیاری کر لے۔"

"تم سادہ لوح انسان ہو" ــ قاسم بلخی نے کہا ــ "یہ شخص ہمیں دھوکہ دے گا۔"

اُدھر فاطمہ عمران بالازری کے پیچھے سوار اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ اُس کا جسم گھوڑے کی چال کے ساتھ عمران کے جسم سے مس کرتا جا رہا تھا۔ عمران محسوس کر رہا تھا کہ فاطمہ کی باتوں میں نشے کی کیفیت ہے۔

"تمہیں یہ ہندو لڑکی کیوں اتنی اچھی لگتی ہے؟" فاطمہ نے پوچھا۔ "وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔"

"فاطمہ!" عمران نے کہا۔ "میں جو باتیں تمہیں کہہ چکا ہوں انہیں دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان عورت کو غیر مسلم عورت سے مختلف اور بلند ہونا چاہیئے۔ میں اس وقت جسم سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تم بہت حسین ہو۔ تمہارا جسم آگ کی مانند ہے جو مجھ جیسے جوان آدمی کے دین و ایمان کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے اور تم کوشش کر رہی ہو کہ میں تمہاری آگ کی لپیٹ میں آجاؤں، لیکن میں دنیاوی لذتوں سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے اپنا امیر منتخب کیا ہے۔ میں نے اپنی خواہشات اور اپنے جذبات قافلے پر قربان کر دیئے ہیں۔ امیر مختصر قافلے کا ہو یا پوری قوم کا، اسے اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنی تمناؤں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اُس کے ذہن میں دوستی اور دشمنی کا تصوّر بھی بدل جاتا ہے۔ اُسے قافلے اور قوم کے مفادات دیکھنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ قوم کا مجرم ہے، غدّار ہے۔"

"تم پتھر کے بُت ہو" فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "بے جان بُت جن کی پوجا اتنی خوبصورت ہندو عورتیں کرتی ہیں مگر تراشے ہوئے ان پتھروں کے اندر نہ کوئی احساس پیدا ہوتا ہے نہ کوئی جذبہ۔"

اور عمران یوں ہنس پڑا جیسے اُس نے حسین پجاریوں اور پتھر کے بتوں کا مذاق اڑایا ہو۔

اُسی روز کا ذکر ہے کہ ایک پڑاؤ میں فاطمہ عمران کے سامنے اپنے اُبلتے کھولتے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی تشنگی بڑھتی جارہی تھی مگر عمران کا رویّہ وہی تھا جو پہلے روز تھا۔

"تم پتھر ہو"۔۔۔ فاطمہ نے دیوانگی کی کیفیت میں عمران کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا۔۔۔ "تم مٹی کی ڈھیری ہو"۔۔۔ اور وہ اُٹھ کر پرے چلی گئی۔

قافلہ پشاور سے ہٹ کر گزرتا اُن پہاڑیوں میں داخل ہو چکا تھا جہاں آج کا درّہ خیبر ہے۔ عمران اس راستے سے واقف تھا۔ اس سلسلۂ کوہستان میں پانی کی قلت تھی۔ عمران اس میں داخل ہونے سے پہلے ایک گاؤں میں جا کر قافلے کے کھانے کی چیزیں لے آیا تھا۔ اُس نے سب کو خوشخبری سنائی تھی کہ اب وہ محفوظ علاقے میں آگئے ہیں جہاں پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہا۔

اسی علاقے میں انہوں نے قیام کیا۔ موسم گرمیوں کا تھا اور یہ پہاڑ بے آب وگیاہ تھے۔ دن کے وقت ان سے شعلے نکلنے لگتے تھے۔ پتھر دہکتے انگاروں کی طرح گرم رہتے تھے۔ آدھی رات تک قافلہ چلتا رہا، پھر آرام کے لیے رک گیا۔ گھوڑے الگ باندھ دیئے گئے۔ سب اِدھر اُدھر لیٹ گئے۔ عمران ہر رات کی طرح سب سے ہٹ کر لیٹا۔ تھکن نے سب کو فوراً سُلا دیا۔ چاند جو آدھی رات کے بعد اوپر آیا کرتا تھا، پہاڑیوں کے عقب میں اٹھتا آرہا تھا۔

قاسم بلخی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اپنے قریب سے ایک سایہ گزرتے دیکھا۔ بلخی اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے ہم سفر اُس سے دُور دور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ قاسم بلخی نے سرگوشی کی۔ "فاطمہ!"۔۔۔ سایہ رک گیا۔ وہ فاطمہ ہی تھی، مگر قاسم بلخی فاطمہ کے علاوہ اور کوئی ایسا لفظ نہیں بول سکتا تھا جو فاطمہ سمجھ سکتی۔ اس نے اشاروں میں اپنا مدعا فاطمہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس طرف اشارہ کیا جدھر عمران سویا ہوا تھا، پھر نفرت کا اظہار کیا۔ اُس نے اشارے کیے جو فاطمہ سمجھ گئی۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ عمران اچھا آدمی نہیں اور وہ اسے (فاطمہ کو) دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ رشی کے ساتھ شادی کرے گا اور یہ کہ فاطمہ نے اپنے اتنے قیمتی زیورات عمران کو دے کر غلطی کی ہے۔

قاسم بلخی نے اُسکے ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیے، پھر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ فاطمہ کے دہکتے ہوئے جذبات نے اس کے جسم کو تنور بنا رکھا تھا جس میں اس کی رُوح جل گئی تھی۔ فاطمہ ان اشاروں کو سمجھ گئی۔ بلخی نے اُسے اس طرح اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا جس طرح وہ عمران کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لینے کو بیتاب رہتی تھی۔ قاسم بلخی کے بازوؤں کا گھیرا اور تنگ ہُوا تو فاطمہ کے ذہن میں عمران کی تصویر دھندلی ہونے لگی۔

قاسم بلخی اُسے ذرا اور پرے لے گیا اور ایک جگہ بٹھا کر دبے پاؤں عمران کے قریب چلا گیا۔ عمران تھکن اور جوانی کی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ چمڑے کی وہ تھیلی جس میں سونے کے سکّوں اور زیورات کی شکل میں زادِ راہ بند تھا، عمران کے سر کے قریب پڑی تھی۔ بلخی نے نہایت آہستہ آہستہ تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھیلی اٹھالی۔ عمران کی آنکھ نہ کھلی۔ بلخی جس طرح دبے پاؤں آیا تھا اسی طرح دبے پاؤں چلا گیا۔ اُس نے فاطمہ کو تھیلی دی اور اُسے اپنے ساتھ گھوڑوں تک لے گیا۔ گھوڑے کچھ دُور بندھے تھے۔ بلخی نے دو گھوڑوں پر زینیں ڈالیں۔ ایک گھوڑے کی لگام فاطمہ کے ہاتھوں میں دی، دوسرے کی خود پکڑی اور نہایت آہستہ آہستہ دونوں چل پڑے۔

کچھ دور پیدل چلے۔ قاسم بلخی نے فاطمہ کو گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ اُس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ گھوڑسواری نہیں کر سکتی۔ بلخی نے اس کے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لی اور فاطمہ کو اپنے گھوڑے پر اپنے آگے سوار کر لیا۔ تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلخی نے ایک بازو فاطمہ کے گرد لپیٹ کر اُس کی پیٹھ اپنے ساتھ لگالی اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ اُسے اب بھاگنا تھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے تو ان کے ٹاپوؤں کی آواز بے آب و گیاہ وادیوں میں گونجی۔

سب سے پہلے عمران کی آنکھ کھلی۔ رات کے سناٹے میں دو گھوڑوں کے سُموں کی آواز اتنی بلند سنائی دے رہی تھی جیسے بالکل قریب ہوں عمران نے سب سے پہلے تھیلی دیکھی۔ وہاں تھیلی نہیں تھی۔ نظام اور یزی اور جگ موہن بھی جو جبار بن چکا تھا، جاگ اُٹھے۔ انہوں نے جا کر اپنے گھوڑے دیکھے۔ دو گھوڑے غائب تھے قاسم بلخی اور فاطمہ بھی نہیں تھے۔

"وہ دُور نہیں گئے ہوں گے"۔۔۔ نظام اوریزی نے عمران سے اپنی زبان میں کہا ۔۔۔ "چلو ہم دونوں ان کا پیچھا کرتے ہیں میں اس شخص کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گا۔"

"نہیں"۔ عمران نے کہا۔ "وہ جس لڑکی کو لے گیا ہے وہ ہماری ملکیت نہیں تھی اور وہ جو رقم اور زیورات لے گیا ہے، وہ سلطنتِ غزنی کا خزانہ نہیں تھا۔ انہیں پکڑنا ہمارے فرائض میں شامل نہیں بلکہ فرض سے انحراف ہے.... نظام بھائی، میں تم دونوں کو لاہور کی قید سے اسی لیے جلدی فرار کرانا چاہتا تھا کہ راجہ کا اگلا حربہ یہ ہوتا کہ تم دونوں کے درمیان ایک بڑی ہی حسین ہندو لڑکی بٹھا دی جاتی، پھر تم دونوں بھول ہی جاتے کہ تمہارا وطن کون سا اور تمہارا مذہب کیا ہے۔ تم ہندو راج کے آلۂ کار بن کر اپنی سلطنت کے لیے خطرہ بن جاتے۔ یہ نسوانی حسن اور سونے کا جادو ہے جو پتھروں کو موم کر دیا کرتا ہے۔ یہ دین و ایمان کا بڑا ہی سخت امتحان ہوتا ہے۔"

گھوڑوں کی آواز بہت دور چلی گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد رات کے سناٹے میں تحلیل ہوگئی۔

"میری تو نیند اڑ گئی ہے"۔۔۔ نظام اوریزی نے کہا۔ "چلو، چل پڑیں۔"

ایک گھوڑے پر رشی کو اور دوسرے پر جگ موہن کو سوار کیا گیا۔ عمران اور اوریزی پیدل چل پڑے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ باری باری گھوڑے پر سوار ہوں گے۔ رشی کے گھوڑے کی باگ عمران نے پکڑ لی اور وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"وہ فاطمہ کو زبردستی لے گیا ہوگا"۔۔۔ رشی نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ عمران نے کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ خود گئی ہے، بلکہ وہ قاسم کو ساتھ لے گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ چلی گئی ہے۔"

صبح طلوع ہوئی تو قاسم بلخی اور فاطمہ بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتے رہے تھے۔ دوسرا گھوڑا ساتھ ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ بلخی کے گھوڑے

کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ قاسم بلخی اُس راستے پر جا رہا تھا جو اُن فوجوں نے بنایا تھا جو ہندوستان پر حملہ آور ہوتی رہی تھیں۔ بلخی اسی راستے سے قیدی کی حیثیت سے راجہ جے پال کی بچی کھچی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ یہ واحد راستہ تھا جس پر بھٹکنے کا خطرہ نہیں تھا، مگر سورج پہاڑوں کے عقب سے اُبھرا تو قاسم بلخی کو پہاڑوں کا ایک ایک پتھر نظر آنے لگا۔ تب اُسے خیال آیا کہ وہ مجرم ہے، چور ہے اور وہ دُور سے نظر آسکتا ہے۔ یہ خطرہ تو تھا ہی کہ عمران اور نظام اور یزی اس کے تعاقب میں آئیں گے، اسی لیے وہ گھوڑا دوڑا تا رہا تھا۔ وہ پرانا سپاہی اور تجربہ کار سوار تھا مگر ذہن پر جرم کا جو بوجھ تھا، اس نے اُسے سوچنے ہی نہ دیا کہ گھوڑے تھک جائیں گے۔ علاقہ میدانی نہیں، پہاڑی تھا۔ راستہ گھومتا اور اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

اس گھوڑے کی حالت تو بہت بُری ہو چکی تھی جس پر وہ فاطمہ کے ساتھ سوار تھا۔ اس کا پسینہ اتنا پھوٹ رہا تھا کہ جسم سے ٹپک رہا تھا۔ سانسیں پھول گئی تھیں۔ دوسرے گھوڑے کی حالت اس لیے کچھ بہتر تھی کہ اس کی پیٹھ پر وزن نہیں تھا۔ قاسم بلخی نے گھوڑا روک لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھاس کی کہیں ایک پتّی بھی نظر نہیں آتی تھی نہ کہیں پانی کا نام و نشان تھا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ اُس کے ساتھی اس کے تعاقب میں آرہے ہوں گے، وہ راستے سے اُتر گیا اور ایک عمودی چٹان کے سائے میں جا رُکا۔ ذرا سی دیر گھوڑوں کو آرام دیا پھر وہ دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اوپر آ کر راستے پر چل پڑے۔ بلخی نے فاطمہ کو رات کی طرح اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ رقم والی تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلخی نے اس گھوڑے کو بھی دوڑانا شروع کر دیا۔

اُس کے تعاقب میں کوئی بھی نہیں آرہا تھا۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ انسان کے پیدل چلنے کی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ وہ باری باری گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ رشی کو سوار ہی رہنے دیا گیا۔ سورج اوپر آگیا تو بھی وہ چلتے گئے۔ پہاڑوں کا سایہ انہیں فائدہ دے رہا تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی۔ پہاڑ جھلسنے لگے تو انہوں نے راستے سے اتر کر ایک جگہ دیکھ لی جہاں شام تک سایہ رہ سکتا تھا۔ عمران نے اپنے قافلے کو شام تک کے لیے وہاں روک لیا۔

قاسم بلخی کہیں رکنے سے ڈر رہا تھا جس جسم کی لذت کی خاطر وہ غرانے کی تھیلی اور ایک حسین لڑکی کو ساتھ لے آیا تھا، وہ جسم توانائی اور نمی سے خالی ہوتا جارہا تھا فاطمہ نے اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر اور چہرے پر درد کا تاثر پیدا کر کے قاسم بلخی کو اشاروں میں سمجھایا کہ مسلسل سواری اور گھوڑے کے دوڑنے سے اُس کی پسلیوں اور پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ بلخی نے مسکرا کر اپنا ایک بازو اس کے سینے کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ فاطمہ نے سر اتنا پیچھے کر دیا کہ بلخی کا گال فاطمہ کے رخسار کے ساتھ لگ گیا مگر اُس نے محسوس کیا کہ فاطمہ اب اتنی حسین اور دلکش نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ وہ اپنے اوپر فاطمہ کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ اُس نے فاطمہ کو آگے کر کے اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ پسینے سے دونوں کے کپڑے اُن کے جسموں کے ساتھ چپک گئے تھے۔

قاسم بلخی کو کوفت سی بھی محسوس ہوئی، پھر اُسے غصہ بھی آنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ گھوڑا بھی تھک گیا تھا۔ مسلسل چڑھائی چڑھتے چڑھتے گھوڑے کا دم ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا گھوڑا پہلے ہی تھکا ہوا تھا۔ یہ دونوں گھوڑے فوج کے نہیں بلکہ سرائے کے اصطبل میں بندھے رہنے والے کرائے کے گھوڑے تھے جو لوگ تھوڑے سے فاصلے تک جانے کے لیے کرائے پر لے جایا کرتے تھے۔ جگ موہن بھی یہ گھوڑے یہ کہہ کر لایا تھا کہ مہمانوں کو ساتھ والے گاؤں تک لے جانا اور لانا ہے۔ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دیر تک بھوک اور پیاس بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

قاسم بلخی کے پاس اس کا یہ علاج تھا کہ تعاقب کو ناکام کرنے کے لیے راستے سے ہٹ کر چلے اور وادیوں کے اندر اندر سے چھوٹا راستہ تلاش کرے۔ وہ گھوڑوں کو پیچھے لے گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ پہاڑوں نے ایسی تپش اُگلنی شروع کر دی جو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دونوں گھوڑے سے اتر کر چلنے لگے۔ فاطمہ چند قدم چل کر ہار گئی۔ اُسے پہاڑ ڈرانے لگے۔ بلخی نے اشاروں میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور مسکرایا بھی، مگر بلخی کا اپنا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ گھوڑے اب وزن کے بغیر بھی قدم گھسیٹ کر چل رہے تھے۔ بلخی نے ایک چٹان کا سایہ دیکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ فاطمہ اُس کے قریب ڈھیر ہونے کے انداز سے بیٹھ گئی۔ رقم اور زیورات کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے قاسم بلخی کے آگے یوں

پھینک دیا جیسے اس کے ساتھ اُسے کوئی دل چسپی نہ ہو۔ گھوڑے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

فاطمہ نے ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بتایا کہ وہ پیاس سے مری جا رہی ہے۔ قاسم بلخی نے سر ہلا کر بتایا کہ یہاں پانی ملنا مشکل ہے۔ فاطمہ نے اشارہ کیا کہ ادھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ بلخی اٹھا اور پانی کی تلاش میں چلا گیا۔ بہت دیر بعد مایوس واپس آیا اور فاطمہ کے پاس بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد عمران کے قافلے نے وہ خشک میوے کھائے جو وہ پشاور کے قریب کے ایک گاؤں سے خرید لایا تھا۔ پانی کا ایک چھوٹا مشکیزہ ابھی باقی تھا۔ تینوں نے پانی پیا اور چل پڑے۔ وہ قاسم بلخی اور فاطمہ سے بہت دُور تھے۔

"ہمارا سفر تھوڑا رہ گیا ہے"۔ عمران نے کہا "مگر سفر کا یہی حصہ دشوار اور صبر آزما ہے۔ گھوڑے پیاسے ہیں۔ انہیں ہم دوڑا نہیں سکتے۔ یہ پیاسے نہ ہوں تو بھی پہاڑی علاقے میں دوڑنے کے قابل نہیں ہمیں غزنی پہنچنا ہے۔ ہمیں اچھی قسم کا ایک گھوڑا مل گیا تو ہم میں سے ایک آدمی تیزی سے جا سکتا ہے۔ اگر کوئی سوار مل گیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ ہمیں گھوڑا چاہیے"۔

"عمران!"۔۔۔ رتی نے ہنس کر کہا۔ "تم اسلام کو خدا کا مذہب کہتے ہو۔ اپنے خدا سے کہو نا، گھوڑوں کو پانی دے دے"۔

"کہنے کی ضرورت نہیں"۔۔۔ عمران نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "یہ گھوڑے پیاس سے نہیں مریں گے۔ ہم خدا کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے یہ سارا سفر خدا کی عافیت میں طے کیا ہے۔ راجہ جے پال نے نظام اور ریزی اور قاسم بلخی کو پکڑنے کے لیے پشاور سے آگے تک راستے روک رکھے ہیں مگر ہم نکل آئے ہیں۔ میں تمہیں اب اپنے متعلق ایک راز بتاتا ہوں۔ میں ملتان کا نہیں غزنی کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میں غزنی کا جاسوس ہوں اور میرے دونوں ساتھی غزنی کی فوج کے عہدیدار ہیں جو راجہ کے قیدی تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ میں نے تمہیں بھی موت کے منہ سے نکالا ہے۔ چونکہ یہ دونوں کام خدا کی خوشنودی کے لیے کیے ہیں اس لیے خدا نے میری مدد کی ہے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہوگا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پتھر بھی ہمیں پانی دیں گے۔"

اور پتھروں نے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آملتی تھی۔ وہاں جا کر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہناتے اور وادی کی طرف چل پڑے۔

"اتر آؤ رشی"۔۔۔ عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جا کر رشی کو اپنی باہوں میں لے کر اتارا اور کہا۔ "انہوں نے پانی کی مشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا۔"

دوسرے گھوڑے پر نظام اور یزی سوار تھا۔ وہ بھی اتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بو دور سے سونگھ لیتے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور اندر جا کر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت قاسم بلخی اور فاطمہ غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بلخی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر اندر سے وہ لمغان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

کہ گھوم پھر کر ایک دوسری میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔ گھوڑے بھی رہ گئے تھے اور یہ دونوں انسان بھی تھک ہار گئے تھے۔ بلجی نے گھوڑا روک لیا اور دونوں اتر آئے۔

قاسم بلجی لیٹ گیا۔ اُسے بھوک اور پیاس کے ساتھ نیند بھی پریشان کر رہی تھی۔ فاطمہ اس کے پہلو میں اس طرح لیٹی کہ آدھی اُس کے سینے پر گری۔ بلجی نے اُسے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ فاطمہ نے اپنا آپ اُس کے سپرد کر دیا۔ اس کے جسم نے بلجی پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ راستے سے تو بھٹک گئے تھے مگر راہِ فرار موجود تھی جو دونوں نے ایک دوسرے میں دیکھ لی۔ وہ تھکن اور اپنے انجام کو بھول گئے۔ قاسم بلجی نے اُسے نشے کی سی کیفیت میں اشاروں میں سبز باغ دکھائے اور وہ خواب و خیال کے باغوں میں پہنچ گئے۔ پھر دونوں گہری نیند سو گئے۔

قاسم بلجی گھبرا کر اُٹھا۔ رات گذر گئی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ کل وہ اسی جگہ سے گزرے تھے۔ اُس نے فاطمہ کو جگایا۔ وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ وہ روانہ ہونے کے لیے اُٹھے تو دیکھا کہ گھوڑے غائب تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑے کہیں بھی نظر نہ آئے۔ بلجی کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ اُس کے ساتھی آ کر ان کے گھوڑے لے گئے اور ان دونوں کو بھٹک بھٹک کر پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ گئے ہیں لیکن گھوڑے پانی اور چارے کی تلاش میں دُور نکل گئے تھے۔ بلجی گھبرا کر گھوڑوں کی تلاش میں دوڑا اور مایوس اور خوفزدہ واپس آ گیا۔ اُس نے فاطمہ کا بازو پکڑا اور پاگلوں کی طرح ایک طرف دوڑ پڑا۔

فاطمہ دوڑتے دوڑتے گر پڑی۔ اُس میں تو چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بلجی نے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ رقم اور سونے کی تھیلی ہاتھ میں لی اور چل پڑا۔ اس کے دل میں یہی ڈر تھا کہ عمران اور ادریزی قریب ہی کہیں موجود ہیں اور وہ جب بے حال ہو چکا ہو گا تو وہ آ کر اُس سے تھیلی چھین لیں گے اور فاطمہ کو بھی لے جائیں گے۔ چوری کا گناہ، گذشتہ رات کا گناہ مل کر چڑیلوں اور بدروحوں کی طرح اُس کے ارد گرد ناچنے لگے۔ وہ بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو کندھوں سے اُتار کر اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا اور بازوؤں میں دبوچ لیا جس طرح بچہ شریر بچوں سے اپنا کھلونا چھپایا کرتا ہے۔ اُس نے تھیلی اپنے نیچے رکھ لی۔ وہ عقل و ہوش

کھو بیٹھا تھا۔

"قاسم!" ۔۔۔ اُسے فاطمہ کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ ہوش میں آگئی تھی ۔۔۔ "پانی" ۔۔۔
فاطمہ کا منہ کھل گیا تھا۔ زبان ہونٹوں پر آگئی تھی۔

فاطمہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر بلخی کی ذہنی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اُس نے فاطمہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑے۔

"تم میری بات نہیں سمجھ سکو گی فاطمہ!" ۔۔۔ قاسم بلخی نے اپنی زبان میں بولنا شروع کر دیا ۔۔۔ "ہم بلخ کے راستے سے نہیں، خدا کے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اس راستے سے ہٹ جانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میں مردِ میدان تھا۔ میدانِ جنگ میں، ایسی ہی پہاڑیوں میں برفباری میں، ریگستانوں میں لڑا ہوں۔ میں زخمی بھی ہوا تھا۔ میرے ساتھی بھی زخمی ہوئے تھے۔ بعض کے بازو کٹ گئے تھے، ٹانگیں بھی کٹ گئی تھیں۔ ہم بھوکے بھی رہے ہیں، پیاسے بھی رہے۔ ہمارے زخموں سے خون بہ گیا مگر ہم میں سے کوئی بھی اس طرح بے بس اور لاچار نہیں ہوا کرتا تھا۔ میرا خون اور پسینہ نکل جانے سے میرے جسم کی توانائی اس طرح ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔ جانتی ہو کیوں؟" ۔۔۔ اُس نے فاطمہ کو جھنجھوڑا مگر وہ اُس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ منہ اور آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ جس خوبرو جوان کو اُس نے جذبات کی پیاس بجھانے والا چشمہ سمجھا تھا، وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ چشمہ سوکھ گیا ہے۔

"میدانِ جنگ میں میرا جسم نہیں، میری روح لڑا کرتی تھی" ۔۔۔ بلخی نے کہا۔ "میں چور نہیں تھا۔ میں جسمانی لذت کے لیے نہیں روحانی کیف کے لیے لڑا کرتا تھا۔ اب ہم دونوں کو جسمانی پیاس اور سونے کی ہوس نے گمراہ کیا ہے۔ صرف دو تین دن پیدل چلنے سے میرے جسم میں جان نہیں رہی۔ مجھے اپنے جسم سے بدبو آتی ہے۔ تمہارے جسم سے بھی بدبو آتی ہے۔ ہم گناہگار ہیں فاطمہ! گناہگاروں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ گناہگاروں کا انجام ہوا کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں عیش کرتے اور اگلی دنیا میں جلتے ہیں یا ہم جیسے اسی دنیا میں جل جل کر مرتے ہیں۔ منزل میرے دوستوں کو ملے گی جو سیدھے راستے

پر جا رہے ہیں منزل اُس ہندو لڑکی اور اُس کے ہندو بھائی کو ملے گی جنہوں نے یہ راز پالیا ہے کہ خدا پتھر اور مٹی کے نہیں ہوا کرتے۔ عمران نے انہیں خدائے وحدہٗ لاشریک دکھا دیا ہے۔ اب ہمیں مرنا ہے۔"

اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور لب ولہجہ اکھڑتا جا رہا تھا۔ فاطمہ نے گھبرا کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

"ہوش میں آؤ قاسم!"۔۔۔ فاطمہ نے روتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں تمہارے سہارے آئی ہوں۔"

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہی ہو"۔۔۔ قاسم بلخی نے اپنی زبان میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔ "آؤ، شاید مرنے کے لیے اس سے کوئی بہتر جگہ مل جائے۔"

عمران، نظام اور یزری اور رشی چلے جا رہے تھے۔ سفر کے ڈیڑھ دو دن باقی تھے۔ اب راستہ نیچے اُتر رہا تھا۔ ان کے گھوڑوں کو راستے میں ایک اور جگہ سے بھی پانی مل گیا تھا مگر گھوڑوں کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ دو آدمیوں کو ساتھ پیدل چلنا پڑتا تھا دوسری وجہ یہ کہ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دُور تک دوڑنے کے قابل نہیں تھے۔ نظام اور یزری کو بائیں طرف دُور نیچے وادی میں دو گھوڑے کھڑے نظر آئے۔ وہاں کچھ گھاس تھی جو یہ گھوڑے کھا رہے تھے۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی تھیں کوئی سوار نظر نہیں آتا تھا۔

"عمران!"۔۔۔ نظام اور یزری نے عمران سے کہا۔۔۔ "تم نے کہا تھا کہ کوئی گھوڑا مل جائے تو تم اس کے سوار کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرو گے۔ وہ دیکھو۔ دو گھوڑے۔"

"اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تو یہ گھوڑے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں"۔۔۔ عمران نے کہا۔ نیچے اترنے کا راستہ دیکھ کر وہ نیچے اُتر گئے۔ قریب جا کر دیکھا۔ گھوڑے وہی تھے جو قاسم بلخی لے کر بھاگا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران اور نظام اور یزری نے تلواریں نکال لیں۔ خطرہ تھا کہ بلخی مقابلہ کرے گا۔ جگہ ایسی تھی کہ وہ گھات سے اٹھ کر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ تلاش کے باوجود بلخی اور فاطمہ نظر نہ آئے۔ عمران اور نظام نے بلخی کو پکارنا شروع کر

دیا ئے "سامنے آجاؤ قاسم! ہم بھول جائیں گے کہ تم نے کیا کیا ہے ... دوستوں کی طرح آجاؤ قاسم!" ۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"عمران!" ۔ نظام اور یزی نے کہا ۔ "اُدھر دیکھو ۔ گدھ اُتر رہے ہیں"۔

وہ فوجی تھا اور کئی جنگیں لڑ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ جہاں جنگ ختم ہوتی ہے وہاں گدھوں کے غول جمع ہو جاتے ہیں میدانِ جنگ کے ارد گرد کہیں بھی گدھ اُتر رہے ہوں تو یہ ثبوت ہوتا تھا کہ وہاں کسی کی لاش پڑی ہے عمران نے بھی گدھ اُترتے دیکھے ۔ وہ اور نظام اور یزی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ جگ موہن اور رُشی پہلے ہی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سب اُدھر کو گئے جہاں گدھ اُتر رہے تھے۔ وہ جگہ کم و بیش ایک میل دُور تھی۔

قریب جا کر انہوں نے گدھوں کو پتھر مارے تاکہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ وہ لاشیں تھیں ۔ ایک قاسم بلجی کی دوسری فاطمہ کی۔ گدھوں نے ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے ۔ انہیں مرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ رقم اور سونے کی تھیلی قاسم بلجی کے ہاتھ میں تھی اور ہاتھ کی گرفت اکڑ گئی تھی عمران اس کی انگلیاں کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر اکڑی ہوئی انگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔

"مر گئے دو عمران!" ۔ نظام اور یزی نے کہا ۔ "یہ خزانہ اسی کے پاس رہنے دو ۔ اسی نے اس کی جان لی ہے ۔ شاید ان دونوں کی رُوحیں اس خزانے کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں"۔

"مجھے یقین ہے ۔ یہ پیاس، بھوک اور تھکن سے مرے ہیں"۔ اگر یہ رہزنوں کے ہاتھ چڑھ گئے ہوتے تو یہ تھیلی اور فاطمہ یہاں نہ ہوتیں۔ اکیلا قاسم قتل ہوتا" ۔ عمران نے کہا "یہ بدنصیب تھوڑا اور آگے تک جا سکتے جہاں ان کے گھوڑے کھڑے تھے تو انہیں پانی مل جاتا ... عبرت حاصل کرو دوستو! اتنی رقم اور اتنا زیادہ سونا انہیں موت سے بچا نہیں سکا۔ سونا کھایا نہیں جا سکتا، پیا نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ اُن انسانوں کو کھا جاتا ہے جو اس کی ہوس میں دیوانے ہو جاتے ہیں"۔ اُس نے رُشی سے کہا ۔

"دیکھ لو رضیہ! حُسن کا انجام دیکھ لو۔ فاطمہ اسی جوانی اور اسی حسن کے جال میں مجھے پھانسنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ قاسم پھنس گیا۔ فاطمہ کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا"۔

رشی کے جواب رضیہ بن چکی تھی، آنسو نکل آتے۔
اب وہ چار تھے اور اُن کے پاس چار ہی گھوڑے تھے۔ وہ روانہ ہو گئے اور شام کو اُس خطے میں داخل ہو گئے جسے اُس دور میں لمغان کہتے تھے۔ یہ سرسبز خطہ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کو جب اطلاع دی گئی کہ لاہور کے تین آدمی ایک لڑکی کے ساتھ آئے ہیں تو وہ جس کام میں مصروف تھا، اسے الگ رکھ کر لاہور سے آنے والوں کو بلا لیا۔ اندر عمران اور نظام اور یزی گئے۔ جبّار اور رضیہ کا سلطان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ عمران نے سلطان کو اپنی پوری کارگزاری سنائی۔ بٹھنڈہ کے جاسوسوں کا کارنامہ بھی سنایا اور یہ بھی سنایا کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو کس طرح انسانی قربانی سے بچا لایا اور اسے اور اُس کے بھائی کو مسلمان کر لایا ہے۔ قاسم بلخی کی واردات اور انجام سن کر سلطان محمود کا چہرہ بجھ گیا۔

"قوم میں زر اور زن کی جو ہوس پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے، یہ قوم کو تاریخ سے ناپید کر دے گی"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "انہی دو چیزوں نے ہمیں خانہ جنگی میں اُلجھا رکھا ہے... کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ راجہ جے پال غزنی پر ضرور حملہ کرے گا؟"

"پورے یقین کے ساتھ"۔ عمران نے جواب دیا۔ "اُس کی رسد تباہ ہو گئی لیکن وہاں رسد اور سامان کی کمی نہیں۔ راجہ جے پال اب تک یہ کمی پوری کر چکا ہوگا"۔

"تمہارے دوسرے ساتھی وہاں کیا کر رہے ہیں؟"۔ سلطان محمود نے پوچھا۔ "مجھے صحیح اطلاع ملنی چاہیئے کہ وہ کتنی فوج لا رہا ہے اور کب آ رہا ہے"۔

"بٹھنڈہ کے آدمیوں کا کارنامہ آپ کو سنا چکا ہوں"۔ عمران نے کہا۔ "وہ وہیں کے رہنے والے جوشیلے نوجوان ہیں اور اویس الطیب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اویس ادھر کا رہنے والا ہے اور بٹھنڈہ کی ایک مسجد میں امام بنا ہوا ہے۔ راجہ جے پال نے جونہی کوچ کیا، اویس اطلاع بھیج دے گا"۔

"سلطانِ صد احترام!"۔ نظام اور یزی نے کہا۔ "آپ کسی کے انتظار میں نہ بیٹھے

رہیں۔ تیاری اور پیش بندی ابھی سے کرلیں۔ راجہ جے پال کی باتیں میرے ساتھ بھی ہوئی ہیں اور میری موجودگی میں وہ اپنے سالاروں اور سپہ سالار کے ساتھ جو باتیں کرتا رہا ہے وہ بھی میں نے غور سے سُنی ہیں۔ اب کہ یہ راجہ شکست کھانے نہیں آتے گا۔ ہم اتنی فوج کبھی اکٹھی نہیں کر سکتے جتنی وہ لائے گا۔ مقابلہ چھ اور ایک کا ہو گا۔ ہمیں یہ جنگ بھی گھات اور شبخون کے طریقے سے لڑنی پڑے گی۔ جے پال اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ سلطان سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی میں کوئی قابل فوجی قائد نہیں رہا۔"

"میرے پاس فوج کی کمی نہیں ہونی چاہیئے تھی" سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن فوج ہماری فوج ریاستوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلامی فوج کے سالاروں میں بھی حکمران بننے کی ہوس پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اب اسلام کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں رہے ہے جب سالار سلطانی کے خواب دیکھنے لگتے ہیں تو ملک و قوم اپنی موت خود ہی مرنے لگتی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی غزنی، بلخ اور خراسان کی سلطنت کے انتظامی امور سلجھانے اور انہیں بہتر طریقے سے چلانے میں مصروف تھا۔ اس کی توجہ فوج کی بھرتی اور ٹریننگ پر بھی مرکوز تھی۔ اُس نے اُسی وقت اپنے سپہ سالار اور دیگر سالاروں کو بلایا۔ فوج کی بالائی کمان اس کے اپنے ہاتھ تھی۔

"یہ یقین ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی مشترکہ فوج تیسرے حملے کے لیے آ رہی ہے"۔۔۔ سلطان نے کہا۔ "کمان پہلے کی طرح راجہ جے پال کی ہو گی۔ اس کی نفری کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ ہماری تعداد بہر حال کم ہو گی۔ لاہور میں ہمارے آدمیوں نے اس کی رسد اور سامان کا ذخیرہ جلا دیا ہے۔ اس سے اُس کے کوچ میں تاخیر ہو گئی ہے۔ آپ اپنی بدنصیبی کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنی پوری فوج جنگ میں نہیں جھونک سکتے۔ آپ کو کچھ دستے غزنی اور دیگر جگہوں پر رکھنے ہوں گے کیونکہ ہم جب دشمن کے خلاف لڑ رہے ہوں گے، آپ کے بھائی آپ کی پیٹھ پر وار کریں گے۔۔۔

"یہ ہمارے قومی جذبے کا بڑا ہی سخت امتحان ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا حملہ کامیاب ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ آپ سلطنتِ غزنی کے نہیں خانہ کعبہ کے

پاسبان ہیں۔ مجھے میرے عالموں نے بتایا ہے کہ ہندو دعوے کرتے ہیں کہ ہندوستان کی سرحد دجلہ اور فرات سے بھی آگے ہے اور اس پر مسلمان قابض ہیں۔ ہندوؤں کو صرف حملہ آور قوم نہ سمجھنا۔ وہ اپنے ساتھ جغرافیائی دعوے اور باطل مذہب لا رہے ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو روکنے کے لیے اسلام کے اعصابی مرکز پر وار کرنے آ رہے ہیں۔ آپ اپنی سلطنت یا اپنے گھروں کے تحفظ کے لیے نہیں، خدا کے گھر کے تحفظ کے لیے لڑیں گے۔۔۔

"آپ کو ایک فائدہ یہ حاصل ہے کہ ہندوؤں کی فوج پر تمہاری دہشت طاری ہے۔ لاہور سے جو دو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوؤں کے پچھلے حملے سے جو فوج بچ کر واپس گئی تھی اُس نے اپنے ملک جا کر خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس کا اثر نئی بھرتی پر بھی ہے۔ میں آپ کو دُوسرا فائدہ یہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی سلطنت سے دُور دشمن کی ریاست کے قریب لڑیں اور میدان آپ کی مرضی اور آپ کی سہولت کا ہو۔ یہ میدان پشاور کے قریب ہوگا۔ ہم جیش گھات میں بٹھائیں گے۔ آپ کے پاس لمغان کے چند ایک قلعے ہیں۔ ہم انہیں دھوکے کے لیے استعمال کریں گے۔۔۔۔

"راجہ جے پال ہاتھی بھی لائے گا۔ آپ جان چکے ہیں کہ ہاتھی جتنا خوفناک لگتا ہے، اس میں اتنی ہی خوفناک کمزوریاں ہیں۔ ہم بھی ہاتھیوں کا دستہ استعمال کریں گے لیکن یہ جوابی حملے میں استعمال ہوں گے جو ہم دشمن کے عقب سے کریں گے۔ یہ آخری اور فیصلہ کُن حملہ ہوگا۔ طریقہ وہی اختیار کریں کہ آمنے سامنے کے تصادم سے بچیں۔ دشمن کے پہلوؤں پر حملے کریں اور پہلوؤں کو ہی نکل جائیں۔ دشمن کے دستوں کو اپنے پیچھے گھسیٹ گھسیٹ کر گھات تک لائیں۔۔۔

"دشمن کو کمزور نہ سمجھیں اور اب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ خدا نے اگر آپ کو فتح دی اور دشمن پسپا ہوا تو پشاور تک اس کا تعاقب کیا جائے گا اور پشاور کو اپنے قبضے میں لیا جائے گا۔ میں آپ کو ابھی اس زمین کا نقشہ دکھاؤں گا، اس سے پہلے آپ دل میں یہ حقیقت اور یہ جذبہ نقش کر لیں کہ آپ خدا کے عظیم مذہب کی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ یہ حق اور باطل کی جنگ ہے۔ ہمارے رسولؐ نے ان جنگوں کی ابتدا کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے رسولِ مقبول صلعم کی روایت مقدسہ کو ختم کر ڈالیں اور ہماری رُوحیں آنے

والی نسلوں کے آگے شرمسار ہوتی رہیں۔ ہمارا نعرہ ہوگا ــــ فتح یا موت!"

اس کے بعد سلطان محمود نے سب کے آگے نقشہ پھیلا کر جنگ کی ٹیکنیکی ہدایات دینی شروع کر دیں۔ انہیں گھات اور شبخون کی جگہیں بتائیں۔ آخر میں حکم دیا کہ کل صبح صادق کے وقت فوج کوچ کر جائے گی اور پشاور کی قریبی پہاڑیوں میں جا ٹھہرے گی۔ دستوں کو ہر وقت تیاری کی حالت میں رکھنا ہوگا۔

محمد قاسم فرشتہ، گردیزی اور عطبی کی تحریروں کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے اگست ۱۰۰۱ عیسوی (شوال ۳۹۱ ہجری) میں غزنوی سے کوچ کیا۔ اس کی فوج دس ہزار منتخب سواروں کی تھی پچاس کے لگ بھگ جنگی ہاتھی تھے جو راجہ جے پال کی فوج سے اُس کے پہلے حملوں میں چھینے گئے تھے۔ پیادہ نفری بہت ہی کم تھی۔ سلطان کی مجبوری تھی کہ اُسے پیادہ فوج اپنی سلطنت میں چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ وہاں سلطانی کے ہوس کاروں کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ سلطان چونکہ گھوم پھر کر لڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ سوار دستے ہی ساتھ لایا تھا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اکثر تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ محمود غزنوی نے پشاور پر حملہ کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ یہ ہندوستان میں لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں حقائق اور واقعات کو موڑ توڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ تمام نامور مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حملہ راجہ جے پال نے کیا تھا۔ اور محمود غزنوی یہ حملہ روکنے کے لیے پہلے ہی اپنی سلطنت سے نکل آیا اور پشاور کے قریب جنگی پوزیشن میں خیمہ زن ہو گیا تھا۔

راجہ جے پال نے رسد اور سامان کی کمی چند دنوں میں پوری کر لی تھی۔ وہ بہت جلد حملہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے جرنیلوں سے یہی کہتا پھر رہا تھا کہ وہ سبکتگین مر گیا ہے جس نے میرے حملے روک لیے تھے۔ اب میری راجدھانی غزنی ہوگی۔ اب اُس نے ایک کنواری لڑکی کی قربانی بھی دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اب دیوتا اُس کے ساتھ جا رہے ہیں۔

اس کے باوجود اب دوسرے مہاراجوں نے اُسے اتنی فوج نہیں دی تھی جو پہلے دی تھی۔ سامان بہت دے دیا تھا۔ راجہ جے پال نے لاہور سے کوچ کیا تو اُس کی فوج کی تفصیل یہ تھی۔ بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیادہ اور تین سو جنگی ہاتھی۔ رسد اور سامان والی بیل گاڑیوں کی قطار میلوں لمبی تھی۔ جے پال فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے سال بھر کی رسد ساتھ لے جا رہا تھا۔ اُسے فتح کا اتنا یقین تھا کہ (مورخوں کے مطابق) وہ بے انداز خزانہ، سونے اور ہیروں کے ہار اور جواہرات ساتھ لے گیا۔ اس خزانے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غزنی کے راستے میں افغان سرداروں کو زر و جواہرات دے کر اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اُس نے کوچ بہت تیز کرایا۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ غزنی والوں کو بے خبری میں جا لے گا۔ اس نے پشاور صرف ایک رات قیام کیا تاکہ بیل گاڑیاں پہنچ جائیں۔ اُس نے پشاور سے کوچ کیا تو غزنی کے جاسوسوں نے اُس کی ساری فوج اور کوچ کی ترتیب دیکھ لی انہوں نے قبل از وقت سلطان کو بتا دیا کہ راجہ کی نفری کتنی اور کیسی ہے۔ راجہ جے پال کو پشاور سے نکلتے ہی پتہ چل گیا کہ سلطان محمود پہاڑیوں میں خیمہ زن ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ چوکس ہو گیا۔ اُس نے پشاور اور پہاڑی سلسلے کے درمیان پڑاؤ کا حکم دے دیا تاکہ آگے کی کوئی اطلاع حاصل کر سکے۔ رات کو اُس نے دیکھ بھال کے لیے ایک جیش بھیجا مگر وہ واپس نہ آ سکا۔ غزنی والوں نے راجہ جے پال کے ساتھ حساب کتاب کھول لیا تھا۔

صبح ابھی تاریک تھی جب جے پال کی فوج کی خیمہ گاہ کے ایک کونے پر غزنی کے سواروں نے شب خون مارا اور افراتفری پیدا کر گئے۔ ہندوؤں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ جے پال نے تیاری کا حکم دے دیا۔ صبح طلوع ہوئی تو اُسے غزنی کی فوج کے دو چار دستے نظر آئے جو سامنے کھڑے تھے۔ جے پال نے حملے کا حکم دے دیا۔ غزنی کے یہ سوار دستے آگے آ کر پھیل گئے۔ ہندوؤں نے ہاتھیوں کو آگے کر رکھا تھا۔ سلطان کے سوار ہاتھیوں سے لڑ گئے اور پیچھے ہٹنے اور پھیلنے لگے۔ اُس وقت سلطان محمود چند ایک دستوں کے ساتھ پہاڑی علاقے سے بڑھتا ہوا دشمن کے عقب میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہندوؤں

نے اُسے دیکھ لیا اور پیچھے کو مڑے۔

سلطان محمود نے حملے کا حکم دے دیا۔ سوار آگے بڑھے۔ گھمسان کا رن پڑا لیکن مسلمان معرکے سے ہٹنے لگے۔ ہندو اُن کے تعاقب میں آئے۔ اس طرح جے پال کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ پہاڑیوں کی طرف منہ کیے بڑھ رہا تھا، دوسرا پیچھے پشاور کی طرف۔ اُس وقت سلطان کے کچھ سوار دستے دونوں حصوں کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے دونوں حصوں کے عقب پر ہلّہ بول دیا۔ راجہ جے پال کا ہیڈکوارٹر درمیان میں تھا۔ اُس کا جھنڈا ایک سوار نے اٹھا رکھا تھا۔ چند ایک مسلمان سواروں نے جھنڈے پر ہلّہ بول دیا مگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہا۔ جھنڈا نہ گر سکا۔

دوپہر تک میدانِ جنگ کی صورت یہ ہو گئی کہ راجہ جے پال کی فوج جو دو حصوں میں کٹ چکی تھی، بکھر گئی۔ راجہ جے پال آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ چونکہ سلطان محمود یہیں ہے اس لیے وہ آگے بڑھ جائے اور غزنی پر جا دھمکے۔ اس کوشش میں راجہ کے جیش ملمالوں کی گھات میں آنے لگے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑیں پڑیں اور وہ گرتے چلے گئے۔ سلطان محمود کے سوار گھوم پھر کر لڑنے لگے۔ دس ہزار سواروں کا مقابلہ بارہ ہزار سواروں اور تیس ہزار پیادوں سے تھا۔ مسلمانوں کا جانی نقصان خاصا ہو رہا تھا مگر شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جا رہا تھا۔

راجہ جے پال کی یہ کوشش بُری طرح ناکام ہو رہی تھی کہ مسلمان کہیں جم کر لڑیں۔ وہ جم کر لڑنے کے لیے آیا تھا۔ اس کی فوج کی ٹریننگ انہی خطوط پر ہوئی تھی۔ سلطان محمود نے لڑنے کے لیے جس زمین کا انتخاب کیا تھا، وہ اُس کے طریقۂ جنگ کے لیے موزوں تھی۔ جے پال تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔ وہ یہاں لڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم اُس نے جنگی اہلیت کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اُس کی جنگی قوت زیادہ بھی تھی مگر میدان مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ جے پال تعداد کی برتری کے سہارے لڑ رہا تھا۔ اُس نے یہ کوشش بھی کی کہ جنگ ملتوی ہو جائے تاکہ اسے طول دیا جا سکے لیکن مسلمان سواروں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

یہ معرکہ بڑا ہی خونریز تھا۔ شام سے پہلے سلطان محمود غزنوی نے پچاس ہاتھیوں

اور دو ہزار گھوڑ سواروں سے جے پال کے عقب پر شدید حملہ کر دیا۔ سوار جے پال کے ہیڈ کوارٹر کو گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں بڑا سخت معرکہ لڑا گیا مگر جے پال نکل نہ سکا۔ وہ پندرہ حکام کے ساتھ زندہ پکڑا گیا۔ اس کی فوج جو بکھر گئی تھی، پسپا ہونے لگی۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور وہ پشاور تک جا پہنچے۔ پشاور کے قریبی مضافات میں بھی معرکے لڑے گئے جن کی صورت یہ تھی کہ ہندو جانیں بچانے اور جنگی قید سے بچنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ راجہ جے پال کا جھنڈا گرنے اور اس کی مرکزی کمان ختم ہو جانے سے جنگ کا پانسہ ایسا پلٹا کہ مسلمان سوار جو تعداد میں بہت تھوڑے رہ گئے تھے، ہندو فوج کو ٹولیوں میں بکھیر کر اُن کی وہی حالت کر رہے تھے جو بھیڑیے بھیڑوں کے ریوڑ کی کیا کرتے ہیں۔

شام تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ راجہ جے پال کو صحیح معنوں میں شرمناک شکست ہوئی تھی مگر غزنی کے غازیوں نے خون اور جان کے جو نذرانے دیئے اس کی مثال خود غزنی والے بھی کبھی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ مشہور مؤرخ گردیزی اور عطبی لکھتے ہیں کہ مسلمان سواروں نے اس احساس کے تحت کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے، تھوڑی تھوڑی نفری کے جیشوں کی صورت میں اس قدر شدید اور برق رفتار حملے کیے کہ ہندوؤں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ دوپہر تک پانچ ہزار ہندو سوار اور پیادے مارے جا چکے تھے، اور جنگ کا فیصلہ اُسی وقت ہو گیا تھا۔

جنگی مبصرین نے مسلمانوں کی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندو فوج پر مسلمانوں کی دہشت پہلے ہی طاری تھی اس لیے ان کا لڑنے کا جذبہ بہت جلدی مجروح ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جو ہدایات دی تھیں، ان میں زور اسی پر دیا تھا کہ دشمن کا جذبہ توڑنے کی کوشش کرنا۔ اُس نے اس کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ پہلوؤں پر کم تعداد میں حملہ کرو اور نکل جاؤ، پھر گھوم کر آؤ اور یہ سلسلہ جاری رکھو۔ دشمن کو پتہ نہ چلنے دو کہ اب مسلمان سوار کدھر سے آئیں گے اور کتنے آئیں گے۔ سلطان محمود کی کامیابی کی دوسری وجہ اس کا جاسوسی کا نظام تھا جس کے ذریعے اُسے قبل از وقت دشمن کی آمد اور نفری وغیرہ کی اطلاع مل گئی۔ اس سے اُس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے

ملک سے دُور آکر اپنی پسند کی زمین کا انتخاب کر لیا۔ یہ کیفیت جو سلطان محمود نے پیدا کر لی تھی، راجہ جے پال کے لیے غیر متوقع تھی۔ کوشش کے باوجود جے پال اس کیفیت کو اپنے حق میں نہ کر سکا۔ آخر گھیرے میں آکر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پشاور سے کچھ دُور میرانند نام کا ایک گاؤں ہُوا کرتا تھا، وہاں راجہ جے پال اور اُس کے اعلیٰ حکام کو سلطان محمود غزنوی کے سامنے لے جایا گیا۔ ایک ترجمان کے ذریعے سلطان اور راجہ کی باتیں ہوئیں۔

"یہ فتح و شکست میری اور آپ کی نہیں" — سلطان محمود نے راجہ جے پال سے کہا — "یہ اسلام کی فتح ہے۔ اس عظیم مذہب نے ثابت کر دیا ہے کہ تراشے ہوئے پتھر اور خیالی مورتیاں انسان کا نہ کچھ بگاڑ سکتی ہیں نہ اُسے کچھ دے سکتی ہیں۔ انسان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ زندگی اور موت، فتح و شکست اُسی کے اختیار میں ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ آپ کا تیسرا حملہ ناکام ہو چکا ہے۔ اب آپ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے کر آئے تھے۔ دیوتاؤں نے آپ کو اس ناحق قتل کی سزا دی ہے۔ قربانی ہم بھی دیا کرتے ہیں لیکن کسی کو خدا کے آگے ذبح نہیں کیا کرتے۔ میدانِ جنگ میں لاشیں دیکھ لو۔ ہم یہ قربانی دیا کرتے ہیں اور خدا اُسے قبول کر لیا کرتا ہے۔ کیا آپ ہمارے ایمان کو برحق تسلیم نہیں کرتے جنھوں نے دس ہزار کی تعداد میں آپ کے پچاس ہزار کے لشکر کو میدان سے بھگا دیا ہے؟"

"میں مذہبوں کی بحث میں نہیں اُلجھوں گا" — راجہ جے پال نے کہا — "میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہار گیا ہوں۔ میں جان بخشی کی درخواست کرتا ہوں اور یہ معاہدہ کروں گا کہ آئندہ آپ پر فوج کشی نہیں کروں گا۔"

"پھر آپ اپنے مذہب کا فریضہ سمجھ کر معاہدہ توڑیں گے" سلطان محمود نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کروں گا" — راجہ جے پال نے کہا — "آپ قیمت بتائیں۔"

"میں اس قیمت میں آپ کا یہ خزانہ شامل نہیں کروں گا جو میرے ہاتھ لگا ہے" —

سلطان محمود نے کہا۔ "یہ مالِ غنیمت ہے۔"

خزانے کا مالِ غنیمت کم نہیں تھا۔ راجہ جے پال افغانیوں کو ساتھ ملانے کے لیے بے اندازہ خزانہ ساتھ لایا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ دیگر زرو جواہرات اور نقدی کے علاوہ ہیروں کے پندرہ ہار تھے جن میں ایک کی قیمت اسی ہزار دینار تھی۔ معاہدے کی رُو سے طے پایا کہ راجہ جے پال کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے عوض وہ اڑھائی لاکھ دینار اور پچاس ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرے گا۔ اُس کے نہایت اہم حکام کو یرغمال کے طور پر قید میں رکھا گیا اور راجہ جے پال کو رہا کر دیا گیا۔ سلطان محمود نے پشاور تک کو اپنی عملداری میں لے لیا اور آج کے درۂ خیبر اور تمام تر سلسلۂ کوہ پر قبضہ کر لیا۔

یہ جنگ بروز جمعرات ۸ محرم ۳۹۲ ہجری (۲۷ نومبر ۱۰۰۱ عیسوی) کے روز لڑی گئی اور اِسی روز فتح اور شکست کا فیصلہ ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی اس مقبوضہ علاقے کے انتظامی امور کے لیے کچھ عرصہ پشاور میں رہا۔ اُسے یہاں زیادہ عرصہ رہنا تھا مگر اُس کی اپنی سلطنت کے اردگرد مسلمان حکمران پھر سر اٹھانے لگے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے ۱۰۰۲ عیسوی کے موسم بہار میں غزنی چلا گیا۔

اسی موسم میں راجہ جے پال اپنی قوم کے ہزار ہا جوان بیٹے اور قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی پشاور کے مضافات میں تباہ و برباد کر کے لاہور میں واپس آیا۔ وہ بوڑھا تو تھا ہی، اس شکست نے اُسے اور زیادہ بوڑھا کر دیا۔ آتے ہی اس نے دربار منعقد کیا اور یہ اعلان کیا کہ آج سے اس کا بیٹا انند پال اس کا جانشین ہو گا۔ اس اعلان کے ساتھ وہ راج سے دستبردار ہو گیا۔

اُس نے سب کو راج محل کے پچھواڑے اُسکے باغ میں چلنے کو کہا۔ خود اپنے بیٹے کے ساتھ چل پڑا۔

"تم جیسے بہتر سمجھو گے ویسے راج کرنا۔" اُس نے اپنے بیٹے انند پال سے کہا۔ "لیکن یہ میری وصیت ہے کہ غزنی پر حملے کے لیے نہ جانا۔ ہماری فوج مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑ سکتی۔ اُن کی فوج کی چالیں نہایت اچھی ہیں لیکن ان کی اصل قوت ان

کا جذبہ ہے اور جوش و خروش ہے جو ہماری فوج میں کوشش کے باوجود پیدا نہیں ہو سکا۔ محمود کو اڑھائی لاکھ دینار کی مالیت کا سونا بھیج دینا، ورنہ وہ تم پر حملہ کرے گا اور تمہاری فوج کا یہی حشر ہوگا جو تم پشاور میں دیکھ آئے ہو۔"

وہ جب پچھواڑے کے باغ میں پہنچے تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں چتا بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کا یہ چوکور انبار کسی مرے ہوئے کی لاش کو جلانے کے لیے لگایا گیا تھا مگر راج محل میں کوئی بھی نہیں مرا تھا۔ چتا پر تیل انڈیل دیا گیا تھا اور ایک آدمی جلتی مشعل اٹھائے کھڑا تھا۔

راجہ جے پال کسی سے کوئی اور بات کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا اور چتا پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مشعل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چوبدار نے مشعل اُسے دے دی۔ راجہ نے تیل میں بھیگی ہوئی لکڑیوں پر مشعل کا شعلہ رکھ کر آگ لگا دی۔ اُس کا بیٹا اُس کی طرف دوڑا لیکن شعلے اتنے اونچے اور اتنے ہیبت ناک ہو گئے تھے کہ کوئی قریب نہ جا سکا۔ راجہ جے پال نے اپنے آپ کو نہایت خاموشی سے جلا ڈالا۔

تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ راجہ جے پال نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو تاوان ادا کر دے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کو دل سے اتار دے لیکن انند پال نے جو سلطان محمود کا ہم عمر تھا، اپنے باپ کی جلتی چتا کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کیا "میں غزنی والوں کو ایک پیسہ تاوان ادا نہیں کروں گا۔۔۔ میں باپ کے خون کا انتقام لوں گا۔"

بہشت ایک رات کی

ملتان برِّصغیر کا واحد مقام ہے جو محمد بن قاسم کے دور سے لے کر اُس وقت تک مسلمان ریاست رہا ہے جب مغلوں کا سورج غروب ہو گیا تھا۔ گیارہویں صدی میں بھی ملتان اسلامی ریاست تھا اور اس کے اردگرد ہندو ریاستیں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب محمد بن قاسم کے بعد دوسرا مجاہد، سلطان محمود غزنوی ہندوؤں سے نبرد آزما تھا۔ اُس نے ہندوستان کے سب سے طاقتور راجہ جے پال کا غزنی پر تیسرا حملہ اس بُری طرح پسپا کیا تھا کہ اس راجہ نے اپنی راجدھانی میں واپس آکر خودکشی کر لی تھی۔ محمود غزنوی نے پشاور کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر کے پشاور کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اس طرح اُس نے غزنی اور اپنی تمام تر سلطنت کو محفوظ کر لیا تھا۔

اُس نے راجہ جے پال کو اس شرط پر رہا کیا تھا کہ وہ واپس جا کر اڑھائی لاکھ دینار تاوان ادا کرے گا اور پچاس ہاتھی بھی بھیجے گا۔ راجہ جے پال نے لاہور پہنچ کر اپنے بیٹے انند پال سے کہا کہ وہ محمود غزنوی کو تاوان ادا کر دے۔ اس کے فوراً بعد اُس نے اپنے آپ کو چتا میں جلا لیا۔ انند پال نے وہیں اعلان کر دیا کہ وہ تاوان ادا نہیں کرے گا اور اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا۔

یہ واقعہ ۱۰۰۲ عیسوی کا ہے۔

دو سال اور گزر گئے۔ تاوان کی بجائے سلطان محمود غزنوی کو جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ انند پال اپنے باپ کی شکست کا انتقام لینے کی تیاری کر رہا ہے۔

"..... اور یہ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں" ــــ محمود غزنوی نے کہا "میں ذہنی طور پر ایسی

ہی صورت حال کے لیے تیار تھا، میں نے جے پال کے علاقے پر اسی لیے قبضہ کیا ہے کہ اس کے ساتھی راجوں کو اور اُسے مشورے دینے والوں کو سلطنت غزنی آسمان کے ستارے کی طرح دُور نظر آئے۔ میں نے اپنی سلطنت کو نہیں، خانہ کعبہ کو اور خلافت کی گدّی کو محفوظ کر لیا ہے۔"

"راجہ جے پال مر گیا ہے"۔۔۔ ایک سالار نے کہا۔۔۔ "اُس کے بیٹے کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔"

"ذرا اور گہرائی میں سوچو میرے دوستو!"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "راجہ جے پال کے مر جانے سے بُت پرست ہندوؤں کا عقیدہ نہیں مر گیا۔ یہ دو عقیدوں کی جنگ ہے جو ہند کے راجے نہیں لڑنا چاہیں گے تو اُن کے مذہبی پیشوا اور دانشور لڑائیں گے۔ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ اب یہ سوچو کہ ہم اس دشمن کو کس طرح گھٹنوں بٹھا سکتے ہیں۔"

"اگر آپ ہم سے مشورہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں لاہور کی طرف پیشقدمی کرنی چاہیے"۔۔۔ ایک سالار نے کہا۔ "لیکن ہمیں ہندوستان میں اپنا ایک اڈہ قائم کرنا پڑے گا تاکہ ہم اور آگے بڑھ سکیں اور محمد بن قاسم کی سلطنت کو بحال کریں۔"

"اڈہ موجود ہے"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "کیا ملتان ہمارا اڈہ نہیں بن سکتا؟ ملتان کا حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر مسلمان بھی ہے اور ہمارا دوست بھی۔"

"سلطانِ عالی مقام!"۔۔۔ محمود غزنوی کے وزیر نے کہا۔ "داؤد بن نصر مسلمان تو ہے، یہ نہ بھولیں کہ وہ قرامطی ہے۔ آپ قرامطیوں کی تاریخ سے واقف ہیں۔"

"اُس نے سلطان سبکتگین مرحوم کے ساتھ دوستی اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کا معاہدہ کر رکھا تھا"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "وہ ہمیں دھوکہ نہیں دیگا۔"

"عالی جاہ!"۔۔۔ وزیر نے کہا۔ "دشمن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اپنی قوم کے غدّار پر کبھی اعتبار نہ کریں۔"

"ایک ایلچی کل صبح ملتان روانہ کر دو"۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ محمد بن قاسم کی سلطنت کی اس آخری ریاست سے ہمیں پورا تعاون ملے گا۔ داؤد بن نصر ہندوؤں میں رہتا ہے۔ وہ اُن کی نیّت اور عزائم کو ہم سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا

ہوگا۔ وہ اُن میں گھِرا ہُوا ہے۔ وہ خوش ہوگا کہ ہم اپنی فوجیں ملتان لا رہے ہیں جنہیں اُس کی اور اُسے ہماری مدد کی ضرورت ہے..... میں کوئی فوجی ایلچی بھیجوں گا۔"

"عاصم عمر بہتر رہے گا"۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔" ابھی جوانی کی عمر میں ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے اور خوش طبع بھی ہے۔"

"عاصم عمر!"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔" اُس کے متعلق مجھے کس نے بتایا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ خوش طبع ہے"؟

"عاصم جنگی امور کو سمجھتا ہے"۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔" اور سمجھا بھی سکتا ہے۔ وہ جب میدانِ جنگ میں دشمن کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو اور زیادہ خوش طبع ہو جاتا ہے۔ یہ کمزوری نہیں خوبی ہے۔"

"اگر تمہیں یقین ہے کہ وہی بہتر رہے گا تو اُسی کو بلاؤ"۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔" میں اُسے زبانی پیغام دوں گا کیونکہ اُسے دشمن کے علاقے میں سے گزر کر جانا ہے۔ تحریری پیغام پکڑا جا سکتا ہے۔"

عاصم عمر جب ملتان کے حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر کے دربار میں گیا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اس دربار کی شان و شوکت دیکھ کر اُسے شک ہُوا جیسے داؤد بن نصر سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو۔ وہ سلطان سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی کے دربار کا عادی تھا جہاں وہ اُن کے برابر بیٹھا کرتا تھا اور مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ ملتان کے دربار میں وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھنے لگا۔ داؤد بن نصر تخت پر بیٹھا تھا۔ دو بڑی ہی حسین لڑکیاں اُس کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ درباری یوں بیٹھے تھے جیسے بُت دھرے ہوئے ہوں۔

"رعایا کے اَن داتا!"۔۔۔ ایک آواز بلند ہوئی۔" سلطان محمود بن سبکتگین کا ایلچی حاضر ہے۔"

عاصم عمر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ جان نہ سکا کہ یہ صدا کس کی تھی۔

"غزنی کے ایلچی کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں"۔۔۔ داؤد بن نصر نے بادشاہوں کی

طرح کہا۔ "کیا پیغام لائے ہو؟"

"کچھ تحفے لایا ہوں"۔ عاصم عمر نے بوکھلا کر کہا۔ "پہلے یہ پیش کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیا سلطان محمود نے تمہیں دربار کے آداب نہیں سکھائے؟" ۔۔۔ داؤد بن نصر نے مسکرا کر کہا۔

"ہمارے ہاں ایسا دربار نہیں ہوتا عالی جاہ!"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "سلطان کا دربار کسی خیمے میں ہوتا ہے یا کسی وادی میں جس پر چٹانوں کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم وہاں اکٹھے بیٹھتے ہیں"۔

"یہ میدان جنگ نہیں ہمارے معزز مہمان!"۔۔۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "یہاں کوئی درباری ہماری اجازت کے بغیر کھانس بھی نہیں سکتا"۔

"پھر سلطان نے مجھے غلط جگہ بھیج دیا ہے"۔۔۔ عاصم عمر نے جرأت مندی سے کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں محمد بن قاسم کی سلطنت کی آخری ریاست کے حکمران کے پاس جا رہا ہوں میں اس امید پر آیا تھا کہ ریگزاروں اور چٹانوں کو روند کر اس سرزمین پر آنے اور اسلام کا پرچم لہرانے والے محمد بن قاسم کے جانشین بھی عرب کے مجاہدوں کی طرح بوریا نشین ہوں گے"۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں؟"۔۔۔ داؤد بن نصر نے گرج کر کہا۔ "ہم اس خطے کے فاتح ہیں۔ تم تاریخ سے بے خبر ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے دادا حمید خان لودھی قرامطی نے یہاں آکر ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ پھر بھی ہم تمہیں اجازت دے دیتے ہیں کہ اسے محمد بن قاسم کی فتوحات کی آخری نشانی کہو۔ ہم مسلمان ہیں ہمیں غیر نہ سمجھو، مگر ہمارے دربار کے کچھ آداب ہیں"۔

"اگر ان آداب کا پابند نہ رہ سکنا گناہ ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں"۔۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "میں ان آداب سے واقف نہیں ۔۔۔۔ کیا میں تحفے پیش کردوں؟"

"اجازت ہے"۔

دربار کے باہر عاصم عمر کے ساتھ آئے ہوئے چار محافظ کھڑے تھے۔ تحفے

اُن کے پاس تھے۔ عاصم عمر نے باہر جاکر اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ تحفے اندر لے چلیں..... ان میں بیش قیمت ہیرے بھی تھے اور غزنی کے علاقے کی دلکش اور قیمتی اشیا بھی تھیں۔ ایک تلوار بھی تھی جس کے متعلق عاصم عمر نے داؤد بن نصر کو بتایا کہ یہ راجہ جے پال کی تلوار ہے جو اُس نے آخری حملے کی ناکامی کے بعد سلطان محمود غزنوی کے قدموں میں رکھی اور التجا کی تھی کہ اُسے بخش دیا جائے، وہ آئندہ غزنی پر حملے کی جرأت نہیں کرے گا۔

عاصم عمر نے آگے بڑھ کر یہ تلوار داؤد بن نصر کے قدموں میں رکھ دی۔

"پیغام کیا ہے؟" — داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"کیا مجھے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؟" — عاصم عمر نے پوچھا۔

داؤد بن نصر نے درباریوں پر نگاہ دوڑائی تو تمام درباری اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ صرف دو لڑکیاں رہ گئیں جو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ داؤد کے اشارے پر عاصم عمر اُس کے قریب چلا گیا اور اُس کے اشارے پر وہ تخت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں دربار کی اس شان و شوکت کو برقرار رکھنا پڑتا ہے" — داؤد بن نصر نے عام انسانوں کے لہجے میں کہا — "یہ ہماری مجبوری ہے اور آپ ایسے درباروں سے واقف نہیں۔ یہ آپ کی مجبوری ہے..... کیا آپ کوئی تحریری پیغام لائے ہیں؟"

"راستے میں دشمن کے خطرے کی وجہ سے سلطان نے تحریری پیغام نہیں دیا" — عاصم عمر نے کہا — "میں سالار ہوں پیغام چونکہ عسکری نوعیت کا ہے اسلئے سلطان نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ راجہ جے پال ہماری سلطنت پر تین حملے کر چکا ہے۔ ہر بار اُسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اُس نے تاوان اور اپنی جان بخشی کے عوض وعدہ کیا کہ وہ آئندہ حملہ نہیں کرے گا۔ اُس نے ہر بار وعدہ توڑا۔ آخر اُسے خودکشی کرنی پڑی۔ اُس کا بیٹا انند پال اُس کا جانشین ہے۔ اس نے تاوان ادا کرنے

سے انکار کر دیا اور اب سلطان کو اطلاعیں مل رہی ہیں کہ وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

دونوں لڑکیاں داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں اور وہ عاصم عمر کی باتیں غور سے سن رہی تھیں۔

"آپ کو یہ علم ہے کہ اپنی سلطنت کو محفوظ کرنے کے لیے ہم نے لمغان اور پشاور پر قبضہ کر لیا ہے۔ معاہدے کے مطابق پنجاب ہماری سلطنت کا حصہ بن چکا ہے اور اننند پال اور بھاٹنہ (بھیرہ) کا راجہ بجی رائے ہمارے باجگزار بھی ہیں اور ہمارے مقرر کیے ہوئے حاکم بھی۔ اُن کا کوئی حکم اور فرمان سلطان محمود غزنوی کی مہر کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا، مگر دونوں اس معاہدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ سلطان نے فیصلہ کیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہ دونوں دوسرے راجاؤں کے ساتھ اتحاد کر کے ہم پر فوج کشی کریں، سلطان ان پر فوج کشی کریں جس کے دو مقاصد ہوں گے۔ ایک یہ کہ انہیں شکست دے کر اقتدار سے محروم کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ ہند میں محمد بن قاسم کا دورِ حکومت واپس لایا جائے۔ کم از کم شمال مغربی ہند سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہونا چاہیے۔ یہ کارروائی اسلام کے فروغ کے لیے ہو گی۔ ایک اسلامی سلطنت بُت خانہ بن چکی ہے۔"

"اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہے؟" — داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"میں چونکہ سالار ہوں، اس لیے عسکری رنگ میں بات کروں گا" — عاصم عمر نے کہا۔ "ہمیں اننند پال اور بجی رائے کے علاقوں کے درمیان ایک مقام کی ضرورت ہے جسے ہم اپنا عسکری مستقر بنائیں گے۔ رسد ہمارے قریب ہو جاتی ہے۔ آپ کی ریاست چونکہ اسلامی ہے اس لیے یہاں سے عسکری نقل و حرکت بھی کر سکیں گے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہو گا کہ ہماری فوجیں آ جانے سے ہندو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں آپ سے اور آپ کو ہم سے مدد ملے گی۔ سلطان کو آپ کی طرف سے یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں یقین دلا دیں کہ جب ہم پشاور سے ملتان کی طرف کوچ کریں گے تو آپ اپنی فوج کو اس مقصد کے لیے تیار

رکھیں گے کہ اگر انند پال یا بجی رائے نے ہم پر راستے میں حملہ کیا تو آپ عقب یا پہلوؤں سے ان پر حملہ کر کے اُلجھا لیں گے۔ ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر سلطان محمود فوج کشی کرنا چاہتے ہیں تو کریں، ہم انہیں روک تو نہیں سکتے" — داؤد بن نصر نے کہا "میرے پاس اتنی فوج نہیں کہ میں دو راجاؤں کی فوج کا مقابلہ کر سکوں۔"

"اگر میں آپ کا یہ جواب لے کر سلطان کے پاس گیا تو وہ مطمئن نہیں ہوں گے" — عاصم عمر نے کہا "میں خود بھی آپ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ فوج میری اور مجھ جیسے سالاروں کی قیادت میں پیش قدمی کرے گی۔ خطروں اور مشکلات کا جائزہ ہمیں لینا ہے۔ میں ادھر آتے ہوئے راستہ اور ارد گرد کی زمین دیکھتا آیا ہوں۔ میں کھیوڑا کے چٹانی علاقے سے گزر کر آیا ہوں۔ میرے لیے یہی راستہ محفوظ تھا۔ فوج کو اس راستے سے نہیں گزارا جائے گا کیونکہ فوج کو روکنے کے لیے یہ علاقہ تیر اندازوں کے لیے نہایت اچھا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے تیر انداز پہلے ہی اس علاقے میں بھیج دیں۔ یہ ہماری فوج کی پیشقدمی کی حفاظت کریں گے۔"

"اگر ہم نے یہ اقدام کیا تو ہمیں اپنے تیر انداز اپنی ریاست سے نکال کر ہندو راجاؤں کے علاقوں میں بھیجنے پڑیں گے۔"

"لمغان اور غزنی راجہ جے پال کے علاقے نہیں تھے" — عاصم عمر نے کہا — "اور لمغان اور ہند ہمارے علاقے نہیں ہیں مگر جے پال نے ہمارے علاقے پر فوج کشی کی اور ہم ان کے علاقوں پر فوج کشی کر رہے ہیں۔ یہ نہ بھولیں کہ جن علاقوں پر یہ راجے قابض ہیں یہ سلطنتِ اسلامیہ کے علاقے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو بھی ہمیں ان علاقوں کو اسلام کے پرچم تلے لانا ہے۔"

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد بولا "آپ کے سلطان کا مطالبہ ایسا نہیں کہ اسے فوراً تسلیم کر لیا جائے۔ ہمیں جنگی نوعیت کا اقدام کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں گہری سوچ بچار کرنی پڑے گی اور اپنے مشیروں سے مشورہ لینا ہو

گا۔ آپ کو تین چار دن رکنا پڑے گا۔"

"کیا میں امید رکھوں کہ مجھے اطمینان بخش جواب ملے گا؟"

"امید رکھنے میں کوئی حرج نہیں"۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "آپ ملتان کی سیر کریں۔ شہر کی دیواریں دیکھیں۔ اس کے برج دیکھیں۔ شاید آپ شہر کے دفاع کے لیے کوئی بہتر مشورہ دے سکیں گے..... آپ ہمارے شاہی مہمان ہیں۔ آج رات آپ کے اعزاز میں جشن منایا جائے گا اور بہت بڑی ضیافت ہو گی۔"

ضیافت اتنی بڑی تھی جو عاصم عمر دیکھ کر بھی تصوّر میں نہیں لا سکتا تھا۔ محل کے باغ میں جشن اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اوپر جو شامیانے اور ارد گرد جو قناتیں لگائی گئی تھیں، وہ یوں لگتا تھا جیسے سونے اور چاندی کے تاروں سے تیار کی گئی ہوں۔ شامیانوں کے ساتھ جو فانوس لٹک رہے تھے، ان کی روشنیوں کے کئی رنگ تھے۔ یہ روشن رنگ شامیانوں اور قناتوں کے چمکتے ستاروں سے منعکس ہو کر ماحول کو طلسماتی بنا رہے تھے۔ کالے رنگ کے چہرے بھی گورے لگتے تھے۔

عاصم عمر پر ایسی پُرکیف کیفیت طاری ہونے لگی جیسے وہ قوس وقزح پر خراماں خراماں چلا جا رہا ہو۔ طاؤس اور طبلے کی ہلکی ہلکی سُر تال پر ایک نوجوان لڑکی یوں رقص کر رہی تھی جیسے کوئی حسین ناگن بین کی لَے پر بل کھا رہی ہو۔ اُس کے کندھے اور بازو عریاں، ڈھکے ہوئے سینے کے نیچے پیٹ کا خاصہ حصہ عریاں تھا۔ ناف کے نیچے سے ٹخنوں تک اسکا جو لباس تھا، وہ ریشم کی رنگ برنگی رسیاں تھیں جو لٹک رہی تھیں۔ سر کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب رقص کی اداؤں سے بل کھاتی تھی تو اُس کی کبھی ایک کبھی دوسری ٹانگ ریشم کی رسیوں میں سے ٹخنے سے لے کر کولہے تک عریاں ہو جاتی تھی۔ اس کے جسم کا قدرتی رنگ گورا ہو گا لیکن روشنیوں کے رنگوں نے مل جل کر اُسے ایسا رنگ دے رکھا تھا جو دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔

یہ رقاصہ تماشائیوں پر سحر طاری کرتی ہوئی یوں نظروں سے اوجھل ہو گئی جیسے جل پری نیلے شفاف سمندروں میں تیرتے تیرتے لہروں کے جل ترنگ میں تحلیل ہو گئی

ہو۔ ایسی ہی ایک اور جل پری موسیقی کی لہروں پر تیرتی آئی اور پہلی سے زیادہ کیف پیدا کرنے لگی۔ عاصم عمر داؤد بن نصر سے دور بیٹھا تھا۔ وہاں سینکڑوں مہمان تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ ضیافت سلطان محمود غزنوی کے ایلچی کے اعزاز میں دی گئی ہے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ سب کی نظریں ان نوجوان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں جن کے جسم سُر تال پر تھرک رہے تھے۔

عاصم عمر نے تو جیسے میدانِ جنگ میں آنکھیں کھولی تھیں بیس بائیس سال سے وہ تھرکتے اور تڑپتے جسم دیکھ رہا تھا لیکن وہ جسم نوجوان رقاصہ لڑکیوں کے نہیں، زخموں سے کٹے ہوئے سپاہیوں اور کمانداروں کے تھے جو تپتی ہوئی زمین پر، پتھروں پر اور ریت پر تھرکتے، تڑپتے اور ہمیشہ کے لیے بے حس ہو جاتے تھے۔ یہ سپاہی اُس کے اپنے بھی تھے، اُس کے دشمن کے بھی۔ اُس نے گھوڑوں، ہاتھیوں اور رتھوں تلے آکر مرنے والے سپاہیوں کو بھی تڑپتے اور مرتے دیکھا تھا۔ اِن جسموں کا رنگ ایک ہی ہوتا تھا ـــ لال سرخ ـــ مرتے وقت دوست اور دشمن اسی ایک رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ اس ماحول پر روشنیوں کے رنگ نہیں، ایک ہی رنگ کی گرد چھائی رہتی تھی۔

عاصم عمر کو خاک و خون کے اسی ایک رنگ اور اس میں رنگے ہوئے ایک ہی جیسے ماحول سے پیار ہو گیا تھا۔ اُسے میدانِ جنگ کی ہولناکی اور ہیبت سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے سلطان کا جو دربار دیکھا تھا وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔ دربار میں اُس کے چہرے پر جو گرد کی تہہ جمی ہوتی تھی، ویسی ہی تہہ اُس کے سلطان پر جمی ہوتی تھی۔ اُس دربار میں موت کے سائے رقص کرتے تھے۔

داؤد بن نصر کے جشن میں روشنیوں کے رنگوں اور اِن رنگوں سے زیادہ حسین جسموں کو موسیقی کی لہروں پر بل کھاتے اور تیرتے دیکھا تو اُس کے سینے کا سپاہی مدہوش ہونے لگا۔ اُسے میدانِ جنگ کے تصوّر سے گھن آنے لگی ـــ اُسے خون کی بدبو سے نفرت ہونے لگی۔ داؤد بن نصر کے طلسم ہوش رُبا میں اُسے محسوس ہُوا جیسے وہ پے بہ پے معرکوں سے تھک کر شل ہو چکا ہو اور اب وہ رکاب میں پاؤں جمانے اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بھی قابل نہ رہا ہو۔ اُس کی جو قوّت تھی وہ کمزوری بن گئی۔ اُس کا جو عزم تھا وہ

جوانی کا سِفلی جذبہ بن گیا۔

دو لڑکیاں رقص کر کے جا چکی تھیں اور اب تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے جو لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھے، جذبات میں ہلچل بپا کرنے والا رقص کر رہے تھے۔ ہر لڑکے کے صرف کولہے رنگدار اور چمکدار ریشمی کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسیقی میں عربی رنگ بھی تھا۔ عاصم عمر ان لڑکوں میں کھویا ہوا تھا کہ عطر اور حسن کا ایک بگولہ اس کے سامنے آ رکا۔ اُس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں جیسی ایک لڑکی اُسکے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ عاصم عمر نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی نے چاندی کی طشتری اُٹھا رکھی تھی۔ اُس پر ایک صراحی اور پیالہ تھا۔

"یہ شاید شراب ہے؟" — عاصم عمر نے گھبرا کر کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔ مسلمان ہوں۔"

"شراب نہیں" — لڑکی نے کہا "شربت ہے" — لڑکی نے عاصم کے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر طشتری رکھ کر صراحی سے پیالہ بھر دیا۔

عاصم عمر نے ڈرتے ڈرتے پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک ہی گھونٹ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا ہو کہ یہ جنّت کی نہر کا پانی تو نہیں؟ — لڑکی کے ہونٹوں کے تبسّم نے ایک طاقتور سالار کی قوتِ گویائی جیسے سلب کر لی ہو۔ اتنے میں ایک نوعمر لڑکا جو اس لڑکی کی طرح دلنشیں تھا، ایک بڑی طشتری اٹھائے ہوئے آیا۔ اس میں چھوٹے بڑے سالم پرندے رکھے تھے جو روسٹ کئے ہوئے تھے۔ اُن سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، امراء کے آگے ایسے ہی پرندے اور پیالے رکھے جا رہے تھے۔

لڑکی اور لڑکا چلے گئے۔ عاصم نے پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر اُس نے ایک پرندہ اُٹھا لیا — اور پھر اُسے یوں کیف آنے لگا جیسے وہ پرندوں کی طرح اڑ رہا ہو، نیچے آ کر پھولوں کا رس چوس رہا ہو۔ لڑکی کئی بار آئی۔ لڑکا بھی آیا۔ وہ اُس کے آگے کچھ رکھ بھی دیتے تھے اور کچھ اُٹھا بھی لیتے تھے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کچھ اور کتنا کچھ کھا چکا ہے اور کتنا شربت پی گیا ہے۔

یہی لڑکی اُسے اُس کمرے میں لے گئی جو اُس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ خوشبو، سجاوٹ اور مسہری نے جیسے اُسے دھکیل کر پیچھے کر دیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس کمرے اور اس مسہری کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اُس کے قدم رُکنے لگے لڑکی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ پھر اُس کی پگڑی اتار کر پرے رکھ دی۔

"یہ شربت نہیں شراب تھی"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔

"ہم سب مسلمان ہیں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔ "یہاں وہ شراب نہیں آسکتی جو کافر پیا کرتے ہیں۔ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں۔ ہم اسلام کے پیروکار ہیں۔"

لڑکی نے صراحی میں سے پیالہ بھرا اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پینے لگا۔ جب اُس نے پیالہ رکھ دیا تو لڑکی نے اُس کے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"یہی زندگی ہے"۔۔۔ لڑکی نے خوابناک آواز میں کہا۔ "یہی اسلام ہے۔ کوئی سزا نہیں، کوئی جزا نہیں۔"

عاصم عمر کی آنکھوں کے آگے اس لڑکی کی آنکھیں اور مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ دھندلاتا گیا۔ عاصم عمر کا ذہن اُس کے قابو سے نکل گیا تھا۔ اُس کے ذہن نے قبول کر لیا تھا کہ یہی زندگی اور یہی اسلام ہے۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا تھا۔ ایک نیم عریاں اور حسین لڑکی کی گرم سانسوں نے ایمان کی شمع گل کر دی۔

شام کو جب مہمان جشن اور ضیافت کے لیے آ رہے تھے محل کے ایک کمرے میں اُن دو میں سے ایک لڑکی جو دن کو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں، ایک آدمی کو بتا رہی تھی کہ غزنی کا ایلچی داؤد بن نصر کے لیے کیا پیغام لایا ہے، اور جب رقص کے دوران ایک لڑکی نے عاصم عمر کو شربت پیش کیا تھا، اُس وقت وہ آدمی داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا جسے لڑکی نے عاصم عمر کا پیغام سنایا تھا۔

"آپ کو سلطان محمود سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔۔۔ "کیا آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ مہاراج انندپال اور مہاراج بجی رائے آپ کی ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے چکے ہیں؟ میں ان دونوں کی نمائندگی کے

لیے آپ کے ہاں مقیم ہوں۔ سلطان محمود کو آپ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنی سلطنت کی توسیع کر رہا ہے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔"

"کیا آپ کو میری وفاداری پر شک ہے؟"۔۔۔ داؤد بن نصر نے پوچھا۔۔۔ "آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں نے اسلام کی رُوح مار دی ہے اور مسلمانوں کے دلوں سے سزا اور جزا کا تصوّر ختم کر دیا ہے؟ آپ سے کس نے کہا ہے کہ میں سلطان محمود کا مطالبہ پورا کر رہا ہوں؟ وہ دیکھیں، میں نے اُس کے لیے کیا انتظام کر دیا ہے۔ اس لڑکی کو ہم نے انسانوں کو مسحور کرنے اور انہیں اپنا مذہب اور اپنا نام بھی فراموش کرا دینے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔"

"یہی کافی نہیں"۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔ "جس طرح یہ ایلچی سالار ہے، اسی طرح میں بھی اونچے رتبے کا فوجی ہوں۔ میں آپ کو جنگی مشورہ دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سلطان محمود کو پسند نہیں کرتے۔ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سلطان محمود کو دور ہی دور تباہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے آپ اس آدمی کو تیار کر سکتے ہیں۔ اسے کہیں کہ سلطان محمود اپنی فوج ملتان لے آئے اور آپ راستے میں اس کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ میں آپ کو وہ راستہ بتاؤں گا جس سے وہ فوج لائے۔ میں انتظام کر دوں گا کہ انندپال کی فوج اُسے راستے میں بے خبری میں تباہ کر دے۔"

"میں نے ایلچی کا ذہن صاف کرنے کا بندوبست کر دیا ہے۔" داؤد بن نصر نے کہا ۔۔۔ "وہ دیکھو۔ اُس نے ایک پیالہ خالی کر دیا ہے۔ وہ شربت سمجھ کر پی گیا ہے۔ کوئی کسر رہ گئی تو یہ لڑکی پوری کر دے گی۔"

عاصم عمر کے چاروں محافظ داؤد بن نصر کے محافظوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اُن کا سالار جیتے جی بہشت میں داخل ہو گیا ہے، اور اُسے معلوم نہیں کہ یہ ایک رات کی بہشت ہے۔

صبح طلوع ہوئی تو علی الصبح جاگ اٹھنے والا عاصم عمر ابھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ سورج اوپر اُٹھ آیا تو اس کی آنکھ کھُلی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کا دماغ واپس آ رہا تھا۔ رات والی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں طشتری تھی۔

"تم نے رات مجھے گناہگار کر دیا ہے؟"۔ عاصم عمر نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔ "میں یہاں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔"

لڑکی نے طشتری اُس کے آگے رکھ کر ایک پیالہ اُس کے ہاتھ میں دیا جس میں دودھ تھا۔ اُس نے پیالہ رکھ دیا۔ اور بولا۔ "میں تمہارے ہاتھ سے کچھ بھی قبول نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ رات مجھے کیا ہُوا تھا؟"

"تم جہنم سے جنّت میں آئے ہو"۔ اُسے ایک آواز سنائی دی۔

اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا سفید ریش بزرگ کھڑا تھا۔ اُس کے سپیدی مائل چہرے پر بڑھاپے کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اُس کی داڑھی دودھ کی طرح سفید اور لمبی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہُوا تھا۔

"تمہیں گناہوں سے ڈرانے والے خود گناہگار ہیں"۔ سفید ریش نے کہا۔ "یہ تمہارے بادشاہ اور تمہارے سلطان ہیں۔ تم میدانِ جنگ کے خون خرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ یہ آسائش تمہیں گناہ کی طرح بُری لگتی ہے۔ یہ آسائشیں تمہارا حق ہے جو تم سے چھین لیا گیا ہے۔ تم سے جنگیں لڑائی جاتی ہیں اور تمہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ تم لڑتے ہوئے مارے گئے تو سیدھے بہشت میں جاؤ گے، مگر تمہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ بہشت اسی دنیا میں ہے۔ تمہارے بادشاہ اور سلطان تمہیں اس لیے مرواتے ہیں کہ وہ زندگی کے بہشت میں محفوظ رہ سکیں۔ تمہیں کس نے بتایا ہے کہ اسلام نے عیش و عشرت کو گناہ کہا ہے؟"

سفید ریش کے بولنے کے انداز اور لب و لہجے میں ایسا تاثر تھا کہ عاصم عمر پر خود سپردگی کی وہی کیفیت طاری ہو گئی جو رات لڑکی کو دیکھ کر طاری ہوئی تھی۔ یہ دراصل انسانی فطرت کی کمزوریاں تھیں جو مجسّم گناہ کو دیکھ کر اُس کے اندر بیدار ہو گئی تھیں۔ سفید ریش بزرگ اُسے جو کہہ رہا تھا وہ وہی کچھ سننا چاہتا تھا۔ اُسے گناہ کے لیے جواز کی ضرورت تھی جو یہ بوڑھا پوری کر رہا تھا۔ یہ اُسی انتظام کے تحت ہو رہا تھا جس کا ذکر داؤد بن نصر

نے اپنے ایک ہندو مہمان کے ساتھ کیا تھا۔ عاصم عمر سالاری کے رتبے کا آدمی تھا۔ اسی ایک آدمی کے ذہن اور دل پر قبضہ کر لینے سے سلطان محمود غزنوی کی فوج کے چوتھائی حصّے سے آسانی سے ہتھیار ڈلوائے جا سکتے تھے۔

عاصم عمر اس جال میں آچکا تھا۔ اُسے داؤد بن نصر کا پیغام ملا کہ آج اُسے ملتان کی سیر کرائی جائے گی۔ اُس کے لیے داؤد کی ذاتی بگھی آگئی جس کے آگے اعلیٰ نسل کے چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ ساتھ زرق برق لباس میں داؤد کے اپنے محافظ تھے۔ جہاں اُسے سیر کے لیے جایا گیا وہ دریا کے کنارے بڑی خوشنما جگہ تھی۔

عاصم عمر اپنے آپ کو بادشاہوں کے درجے کا آدمی سمجھنے لگا۔

اس کے اپنے جو چار محافظ آئے تھے، اُن کے متعلق اُس نے پوچھا ہی نہیں کہ کہاں ہیں ــــ انہیں بھی دربار سے اطلاع دی گئی تھی کہ آج اُن کا سیر کا دن ہے۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ شہر میں چلے گئے تھے۔

وہ ایک درویش صورت انسان تھا۔ لباس سے بھی درویش ہی لگتا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی اور چہرے کے نور سے عالم فاضل لگتا تھا۔ ایک پختہ مکان کے دروازے میں داخل ہوتے ہوتے رُک گیا۔ اُسے چار لمبے تڑنگے عسکری آتے نظر آئے جن کا لباس بتا رہا تھا کہ مسلمان ہیں اور اجنبی۔ وہ ملتان کے تو لگتے ہی نہ تھے، وہ ہندوستان کے کسی خطّے کے بھی نہیں تھے۔ درویش ان کے راستے میں رُک گیا۔

"غزنی؟" ــــ درویش نے مسکرا کر کہا۔

چاروں رُک گئے اور مسکرانے لگے۔

"کیا آپ لوگ تھوڑی سی دیر کے لیے میرے گھر میں آنا پسند کریں گے؟" ــــ درویش نے فارسی زبان میں کہا۔ "مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔"

اپنی زبان سُن کر چاروں درویش کے ساتھ اندر چلے گئے۔ خاطر تواضع کے دوران محافظوں نے درویش کو بتایا کہ وہ سالار عاصم عمر کے ساتھ آئے ہیں جو داؤد بن نصر کے لیے سلطان محمود کا پیغام لایا ہے۔

"عاصم عمر اس وقت کہاں ہے؟" درویش نے پوچھا۔

"ہم نے انہیں شاہی بگھی پر سیر کو جاتے دیکھا تھا" ایک محافظ نے جواب دیا۔

"میں عاصم عمر سے ملنا چاہتا تھا" درویش نے کہا "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شاید اپنے محافظوں سے بھی نہیں مل سکے گا"

"کیوں؟" ایک محافظ نے حیران ہو کر پوچھا "یہاں ایسا خطرہ تو نہیں کہ اُسے قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ راجہ جے پال نے ایک بار ہمارے دو ایلچیوں اور اُن کے محافظوں کو لاہور میں قید میں ڈال دیا تھا۔ وہ قید میں ہی بھوک کے پیاسے مر گئے تھے"

"وہ قید اچھی ہے جس میں انسان اذیّت، بھوک اور پیاس سے مر جاتا ہے" — درویش نے کہا "مگر جن زنجیروں میں آپ کے سالار عاصم عمر کو باندھا گیا ہے وہ بہت بُری ہیں۔ اس قید میں انسان تو زندہ رہتا ہے، اُس کا ایمان اور اُس کا مذہب مر جاتا ہے۔ وہ سپاہی نہیں رہتا۔ یہ اُن حسین اور بے حجاب لڑکیوں کے گیسو اور اُن کے نازک اور بل کھاتے جسموں کی زنجیریں ہیں جنہیں محل میں اسی مقصد کے لیے پالا جاتا ہے۔ وہ جب رات ضیافت میں گیا تھا تو آپ نے اُسے وہاں دیکھا تھا؟"

"ہمیں الگ کھانا دیا گیا تھا" — ایک محافظ نے کہا۔

"اُسے رات شراب پلائی گئی تھی" — درویش نے کہا "اور باقی رات وہ ایک ایسی لڑکی کے قبضے میں رہا ہے جنہیں ہم جادو گرنیاں کہا کرتے ہیں"

"کیا آپ بھی رات کے جشن میں گئے تھے؟"

"نہیں" — درویش نے جواب دیا "شاہی دربار کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لیکن میری آنکھیں اور میرے کان دربار میں رہتے ہیں۔ عاصم عمر جو پیغام لایا ہے، میں وہ بھی جانتا ہوں"

"خطرہ کیا ہے؟"

"خطرہ یہ ہے کہ عاصم عمر داؤد بن نصر کا مرید اور ہندو راجوں کا نمائندہ بن کر

واپس جائے گا اور سلطان کے لیے ایک دھوکہ لے کر جائے گا"۔ درویش نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ میں عاصم عمر تک یا آپ لوگوں تک کس طرح پہنچوں۔ ارادہ نیک ہو تو خدائے ذوالجلال سبب پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ شہر کی سیر کے لیے آ رہے تھے اور خدا نے مجھے آپ کے راستے میں کھڑا کر دیا"

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ ملتان اسلامی ریاست ہے"۔ ایک محافظ نے کہا ——
"اور داؤد بن نصر مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان سبکتگین کے دور سے ہمارا دوست چلا آ رہا ہے"۔

"میں حیران ہوں کہ سلطان محمود نے سب کچھ جانتے ہوئے آپ کو یہاں کی حقیقت کیوں نہیں بتائی"۔ درویش نے کہا۔ "یہ مجھ سے سن لو تاکہ تم بھی انہی زنجیروں میں نہ بندھ جاؤ جن میں تمہارا سالار گرفتار ہو چکا ہے .... ملتان پر قرامطی فرقہ حکمران ہے یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن ان کے عقیدے اسلام کے منافی ہیں، مثلاً یہ کہ نیکی اور بدی، جزا اور سزا محض ڈھکوسلے ہیں۔ انسان کو خدا نے عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے باوجود یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے۔ اس فرقے کے دو بانی تھے۔ ایک عبداللہ اور دوسرا میمون .... انہوں نے تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں کہیں عرب میں اس کی بنیاد رکھی تھی مگر اس فتنے کے اصل بانی عیسائی مبلّغ تھے، اور انہیں یہودیوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ بعض مؤرخوں نے اسے ایرانی فرقہ کہا ہے ....

"اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ کیوں پیدا کیا گیا تھا .... اسلام کی رُوح کو مسخ کرنے کے لیے —— اسلام آدھی دنیا میں پھیل چکا تھا۔ لوگ جب سچے مذہب کی تلاش میں تھے، اسلام قبول کر رہے تھے۔ اسلام کا نور بحیرہ روم کے دوسرے کنارے سے بھی دُور آگے کفرستان میں چلا گیا تھا۔ عیسائی مبلّغوں اور یہودی فتنہ پردازوں نے اس اصول پر عمل کیا کہ کسی مذہبی نظریئے کو تلوار سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ اس نظریئے کے پیروکاروں کے قتلِ عام سے نظریہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر نظریہ برحق ہو تو یہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مذہبی نظریئے کو تباہ کرنے کے لیے اس میں ملاوٹ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے قائدین اور پیروکاروں کے ذہنوں پر قبضہ کیا جائے۔
اس کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ان میں ذہنی عیاشی اور لذّت پرستی پیدا کی جائے.....
"انسان کی سب سے بڑی کمزوری جنسی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ خدا کی نگاہ میں مقدّس ہے کیونکہ اسی سے انسان پیدا ہوتا ہے مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے کیونکہ اس کے ساتھ لذّت اور فرار وابستہ ہیں۔ ہمارے دشمنوں نے اسلام کو جب بھی نقصان پہنچایا ہے، ہماری قوم کے اسی جذبے کو مشتعل کرنے کے سامان مہیّا کیے ہیں جن میں دولت اور عورت سرفہرست ہیں....
"عیسائیوں اور یہودیوں نے عبداللہ اور میمون کو زروجواہرات اور اپنی دلکش بیٹیوں کے ذریعے اپنا غلام بنالیا اور اُن کے ہاتھوں قرامطی فرقے کی بنیاد رکھوائی اور اِسے سچّا اسلام کہا۔ بظاہر مذہب پر حملہ نہ کیا، مذہب کے اصولوں میں ردّوبدل کرکے کہا گیا کہ اصل اصول یہ تھے جنہیں دوسرے فرقے بدلتے رہے تھے۔ اس فرقے نے مسلمان عورتوں کو بے حجابی کی اجازت دی اور مردوں سے کہا کہ کوئی بھی عرکت گناہ نہیں ہے جہنّم اور جنّت عالموں کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ انسان کا حق ہے کہ وہ اسی دنیا کو اپنے لیے جنّت بنالے....
"انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا اور کبھی پیچھے بھی ہٹ آتا ہے لیکن بدی کی طرف لپکتا ہے۔ قرامطی فرقہ پھلنے پھولنے لگا۔ تھوڑی سی مدت میں اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے ۲۹۰ ہجری میں شام کے مسلمانوں کو پہلے ذہنی پھر جسمانی طور پر تباہ کیا، پھر باقاعدہ حملہ کرکے اِن کے گھر تباہ کردیئے اور قتلِ عام بھی کیا۔ ۳۱۱ ہجری میں انہوں نے دو شہروں کُوفہ اور بصرہ کو لُوٹا اور یہ شہر اجاڑ دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ابوطاہر نام کے ایک آدمی کو جو مشہور بدکردار تھا، خلافت کی گدّی پر بٹھا دیا اور مکّہ معظّمہ پر قبضہ کرلیا.....
"قرامطیوں نے اسی پر اکتفا نہ کی، خانہ کعبہ سے حجر اسود (سیاہ پتھر) بصرہ کو اُٹھا لے گئے۔ یہ تاریخی پتھر بیس سال تک اُن کے قبضے میں رہا خدا نے انہیں جو ڈھیل دے

رکھی تھی، وہ روک لی اور اُن پر ہلاکو خان کی شکل میں ایسا عذابِ الٰہی نازل ہوا کہ ان کی زیادہ تر تعداد ماری گئی اور اس فرقے کے جو لوگ بچ نکلے، وہ ایران چلے گئے۔ وہاں اُن پر خدا نے زمین تنگ کر دی تو وہ ہندوستان کے ان علاقوں میں آ گئے جہاں آج آپ انہیں دیکھ رہے ہیں....

" داؤد بن نصر کے دادا احمید خان قرامطی نے ملتان کو تباہ کر دیا تھا۔ اسے پھر سے آباد کیا اور اس طرح اپنی دہشت پھیلا کر اپنے فرقے کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اپنے ساتھ اصل اسلام لائے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ ریاست جو مسلمانوں کی ریاست تھی اور محمد بن قاسم کی آخری یادگار، قرامطیوں کا مرکز اور اڈہ بن گئی۔ انہوں نے یہاں بدی اور عیش و عشرت رائج کی اور اسے اسلام کہا۔ موجودہ حکمران داؤد بن نصر کے باپ نے ہندو راجاؤں اور مہاراجوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ پہلے اس فرقے کو عیسائی اور یہودی مدد دیتے تھے۔ اب ہندو ان کی پشت پناہی کرنے لگے ہیں....

" میں نے آپ کو قرامطیوں کی تاریخ اس لیے سنائی ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ ایک زہریلے سانپ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔ اگر اس نے مدد کا وعدہ کیا تو یہ دھوکا ہوگا۔"

" آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ سالار عاصم عمر کیا پیغام لائے ہیں؟" ___ ایک محافظ نے پوچھا ___ " اور آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا ہے کہ انہیں رات شراب پلائی گئی ہے؟.... کیا آپ غزنی کے جاسوس ہیں؟"

" نہیں" ___ درویش نے جواب دیا ___ " میں سلطان محمود کا نہیں، محمد بن قاسم کا جاسوس ہوں۔ ہم اُس اسلام کے پاسبان ہیں جو محمد بن قاسم یہاں لایا تھا۔ ہم نے زمین دوز جماعت بنا رکھی ہے جو اصل اسلام کا پرچار اور قرامطیوں کے اسلام کے خلاف کام کر رہی ہے۔ ہمارے بعض آدمی شاہی محل میں بھی ملازم ہیں۔ وہ اندر کے بھید معلوم کرتے رہتے ہیں۔ داؤد کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ اُس کے خلاف ایک جماعت سرگرم ہے۔ اُس کے مخبر ابھی تک اس جماعت کا سراغ نہیں لگا سکے۔ ہمیں قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہونے

والی ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہئیے؟"

"آپ کو سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ داؤد آپ کا نہیں ہندوؤں کا دوست ہے"۔۔۔ درویش نے جواب دیا۔۔۔"دوسرے یہ کہ آپ کو اپنے اس سالار پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہئیے۔ یہ اگر واپس جا کر سلطان کو کوئی جواب دے تو آپ سلطان کو یہ بتائیں کہ وہ داؤد پر بھروسہ نہ کرے، اور اگر آپ کا سلطان ہندو ریاستوں پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے ملتان آئے اور ان قرامطیوں کو ختم کرے.... میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ مسلمان ہو کر اسلام کے ساتھ کھیلنے والی قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس فرقے کو بھی تباہ ہونا ہے۔ داؤد بن نصر اسلام کا جھانسہ دے کر مسلمانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ تباہی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ سالار عاصم عمر کیا کرتے ہیں"۔۔۔ ایک محافظ نے کہا ۔۔۔"ہو سکتا ہے وہ داؤد بن نصر کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اگر وہ اُس کے جال میں پھنس گئے تو ہم واپس جا کر سلطان کو یہ باتیں بتادیں گے جو آپ نے ہمیں بتائی ہیں۔"

عاصم عمر داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے ایک نقشہ رکھا تھا جو کسی نے ہاتھ سے بنایا تھا۔

"آپ یہ نقشہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں"۔۔۔ داؤد بن نصر نے کہا۔۔۔"میں نے آپ کو راستہ بتادیا ہے۔ سلطان کی فوج اِس رستے سے آئے۔ میں نے آپ کو وہ جگہ بھی بتادی ہے جہاں سے آپ کی فوج دریائے چناب پار کرے گی۔"

"راستے میں انندپال یا بجی رائے کی فوج ہمارا راستہ ضرور روکے گی"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔۔۔"آپ نے جو راستہ دکھایا ہے اسے میں محفوظ نہیں سمجھتا.... آپ کی فوج کس طرح ہماری فوج کی حفاظت کرے گی؟"

داؤد نے جواب دیا جس سے عاصم عمر مطمئن نہ ہوا۔ وہ داؤد کی باتوں اور اُس کے وعدوں کو فنِ حرب و ضرب کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ شک سا ہونے لگا۔ اُس نے

داؤد کے ساتھ اتنی بحث کی کہ داؤد پریشان ہو گیا۔

"کیا آپ یہاں کچھ دن اور رہنا پسند نہیں کریں گے؟" داؤد نے اُس سے پوچھا۔

"مَیں اپنے فرض کی خاطر جا رہا ہوں" ۔۔۔ عاصم عمر نے کہا ۔"ورنہ مَیں تو جانا ہی نہیں چاہتا۔"

"پھر آپ اپنا فرض اس طرح پُورا کریں جس طرح میں بتاتا ہوں" ۔۔۔ داؤد بن نصر نے کہا ۔۔۔ "اپنے سلطان کو اِسی راستے سے لائیں اور آپ ہمارے پاس آجائیں۔ آپ ہماری فوج کے سالار ہوں گے اور آپ کو یہی عیش وعشرت ملے گی جو آپ کو مل رہی ہے۔ اگر آپ سلطان محمود کو کامیابی سے ہمارے پھندے میں لے آئے تو مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی ریاست کا کچھ علاقہ دلا کر خود مختار حاکم بنا دوں گا۔ اتنی جنگیں لڑ کر آپ کا حق ہے کہ آپ اس دنیا کو اپنے لیے جنّت نظیر بنائیں۔"

داؤد بن نصر نے وہی باتیں شروع کر دیں جو ایک سفید ریش بزرگ اُس کے دل میں اتار چکا تھا۔ داؤد نے یہ بھی کہا کہ ہندوؤں سے بڑھ کر کوئی اچھا دوست آپ کو نہیں ملے گا۔ ان کے ساتھ رہ کر دیکھو۔ اپنے سلطان کی خواہشات اور اُس کے عزائم پر اپنی جانیں قربان نہ کرو۔ کل صبح روانہ ہو جاؤ اور سلطان سے کہو کہ داؤد بن نصر آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔

اسی شام کا ذکر ہے۔ عاصم عمر اپنے کمرے میں تھا۔ اُس نے اپنے چاروں محافظوں کو بلا رکھا تھا۔ وہ اُن سے کہہ رہا تھا کہ کل صبح واپسی ہو گی۔ انہیں روانگی کے احکام دے کر اُس نے محافظوں کو فارغ کر دیا۔ چاروں محل کی ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چاروں نے پیچھے دیکھا۔ ایک عورت آ رہی تھی۔ اُس نے ان کے قریب سے گزرتے دھیمی آواز میں کہا "تم میں سے ایک اسی وقت اُس عالم کے پاس چلا جائے جس نے چاروں کو اپنے گھر میں بٹھایا تھا" ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ آگے نکل گئی۔

ان میں سے ایک محافظ محل میں سے نکل گیا اور درویش کے دروازے پر جا دستک دی۔ دروازہ درویش نے کھولا اور وہ محافظ کو اندر لے گیا۔

"عاصم عمر قرامطیوں کے خوبصورت پھندے میں آگیا ہے" ــــ درویش نے کہا۔" اُس نے داؤد کے ساتھ سودا طے کرلیا ہے۔ نقشہ اس کے پاس ہے۔ آپ لوگ کل صبح روانہ ہو رہے ہیں۔ عاصم عمر یہ نقشہ سلطان محمود کو دکھائے گا اور اُس پر اُسے ایک راستہ دکھائے گا۔ تم سلطان سے کہنا کہ وہ اِس راستے سے نہ آئے۔ اُسے یہ کہنا کہ جنہیں آپ اپنا مسلمان بھائی سمجھتے ہیں وہ ہندوؤں سے زیادہ خطرناک ہیں .... جاؤ، زیادہ دیر یہاں نہ رکو۔"

"وہ کون تھی جس نے ہمیں پیغام دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی آپ سے ملے؟" ــــ محافظ نے پُوچھا۔

"وہ ایک مظلوم عورت ہے" ــــ درویش نے جواب دیا ــــ "آپ نے اس کی خوبصورتی دیکھی ہوگی۔ اس کے ماں باپ نے منہ مانگی رقم اور کچھ زمین لے کر اس کی شادی ایک بڑے ہی امیر آدمی کے ساتھ کردی تھی۔ اس آدمی نے ایک سال بعد اسے تحفے کے طور پر داؤد بن نصر کو دے دیا۔ اس کے پاس ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اس نے ڈیڑھ دو سال حرم میں رکھ کر اسے شاہی دربار کی ملازمت دے دی یہ میری بیٹی کی سہیلی تھی، کبھی کبھی گھر آیا کرتی ہے اور میری بیٹی سے بھی ملتی ہے پہلے پہل بہت روتی تھی میرے کہنے پر میری بیٹی نے اسے کہا کہ وہ اس خوبصورت جہنم میں رہ کر اسلام کے لیے بہت کچھ کرسکتی ہے چنانچہ وہ مجھے محل کے اندر کی خبریں دیتی رہتی ہے ....

"آج جب داؤد بن نصر آپ کے سالار عاصم عمر کو اپنے پھندے میں پھانس کر اُسے بتا رہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو فلاں راستے سے لائے، اُس وقت یہ عورت اِن دونوں کو شراب اور شربت پیش کررہی تھی۔ اس نے دونوں کی باتیں سنیں۔ اسے جونہی وہاں سے چھٹی ملی وہ میرے گھر آگئی اور ساری بات سنا گئی۔ اب یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ سلطان سے منوالو کہ عاصم عمر اُسے دھوکہ دے رہا ہے اور آپ جو کہہ رہے ہیں یہ صحیح ہے۔"

"یہ عورت آپ کے پاس آتی رہتی ہے؟" محافظ نے کہا ــــ "اُسے محل سے نکلنے کی اجازت مِل جاتی ہے؟ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسے آپ کہیں غائب کردیں؟

کوئی مسلمان اسے ساتھ لے کر کہیں اور چلا جائے اور اس کے ساتھ شادی کر لے؟"

"کئی بار سوچا ہے"۔۔۔ درویش نے جواب دیا "لیکن ایسا مسلمان نہیں ملتا جو اسے لے کر کہیں چلا جائے۔ آج اُس نے مجھے کہا تھا کہ اگر آپ لوگ پسند کریں اور ہمت کریں تو اُسے اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ اگر اس کے ساتھ کسی نے شادی نہ کی تو وہ باقی عمر کسی مزار پر گزار دے گی یا کسی عالم یا ولی کی خدمت کرے گی"۔

"ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں"۔۔۔ محافظ نے کہا۔۔۔ "لیکن اسے سب کے سامنے لے جانا ناممکن ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ اسے کوئی شہر سے دور ہمارے راستے میں کہیں تک پہنچا دے۔ ہمارے لیے دوسری مشکل یہ ہے کہ سالار عاصم عمر شاید ہمیں لڑکی کو ساتھ نہ لے جانے دے.... اسے ہم سنبھال لیں گے"۔

اگلے روز طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے سالار عاصم عمر اپنے چاروں محافظوں کے ساتھ روانہ ہُوا۔ اُن کے ساتھ اب ایک اونٹ بھی تھا جو [illegible] بن نصر کے دیئے ہوئے تحفوں سے لدا ہُوا تھا۔ ایک محافظ کی برچھی کے ساتھ چھوٹا سا سفید جھنڈا بندھا تھا جو اُس نے بلند کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم دوست ہیں۔

قافلہ شہر سے دور نکل گیا۔ دریا بھی پار کر لیا گیا۔ سالار عاصم عمر جب ملتان کی طرف آ رہا تھا تو محافظوں کے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کرتا آیا تھا مگر اب وہ خاموشی سے آگے آگے جا رہا تھا۔ اُس کی گردن بادشاہوں کی طرح تنی ہوئی تھی۔ وہ محافظوں کے ساتھ کوئی بات کرتا بھی تھا تو یہ کوئی حکم ہوتا تھا، یا کوئی ہدایت۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب یہ لوگ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ ایک محافظ نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا گھنی جھاڑیوں میں چار آنکھیں اور دو چہروں کے ذرا ذرا سے حصے نظر آ رہے تھے۔ عاصم عمر آگے نکل گیا تھا۔

محافظوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا جو انہوں نے گزشتہ رات تیار کیا تھا۔ اس کے مطابق ایک محافظ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے کو آہستہ آہستہ گھنی جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں لے گیا۔ وہی جوان عورت جس نے انہیں درویش کے گھر جانے کا پیغام دیا تھا، اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی

بھی تھا۔ اس نے عورت اس محافظ کے حوالے کی اور خاموشی سے چلا گیا۔ محافظ عورت کو ساتھ لیے وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سوائے مسکرانے کے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ عورت اُسے اشاروں کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ چلیں مگر محافظ اُسے بیٹھے اور چھُپے رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ عاصم عمر نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ ایک محافظ غائب تھا۔ اُس نے دوسروں سے پوچھا تو تینوں محافظ حیران بھی ہوئے اور کھسیانے بھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پیچھے پیچھے آرہا تھا اور اب انہیں پتہ چلا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ عاصم عمر آگ بگولہ ہو گیا۔ تینوں پر خوب برسا۔

"وہ واپس ملتان چلا گیا ہے"۔۔۔ ایک محافظ نے کہا۔ "اُس نے ہمیں کہا تھا کہ ملتان اسے اتنا پسند آیا ہے کہ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ ہم اسے مذاق سمجھتے رہے ہیں"

"وہ کسی بازاری رقاصہ کو دل دے بیٹھا ہے"۔ دوسرے نے کہا۔ "اُسے تلاش کرنا بیکار ہے"۔

عاصم عمر نے بہت سوچا اور بولا۔ "ہاں، تلاش اور تعاقب بے کار ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُسے ذلیل و خوار ہونے کے لیے وہیں جانے دیا جائے جہاں وہ گیا ہے"۔۔۔ اس نے ایک اتنے اہم محافظ کی گمشدگی کو ذہن سے اتار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا اپنا ذہن ملتان میں داؤد بن نصر کے محل میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر وہاں سے آگیا تھا، ذہنی طور پر وہ وہیں تھا۔ ایک محافظ تو معمولی سا آدمی تھا، اُس کی نظروں میں سلطان محمود کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

یہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ جب اپنے تین محافظوں کے ساتھ سویا ہوا ہو گا، اُس کا گمشدہ محافظ ایک عورت کے ساتھ دور آگے جا چکا ہو گا۔

سلطان محمود غزنوی پشاور میں اپنے ایلچی سالار عاصم عمر کا انتظار بے تابی سے کر رہا تھا۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ سلطان محمود نے کئی بار اس خطرے کا اظہار کیا کہ عاصم عمر اپنے محافظوں سمیت مارا گیا ہے یا ہندوؤں کے کسی قید خانے میں پہنچا دیا گیا ہو گا۔ اُس

نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ عاصم عمر اور اُس کے محافظوں کو ہندوؤں نے قید میں ڈالا تو وہ اُن کی ریاستوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور وہاں اُسی ہندو کو زندہ رہنے کا حق دے گا جو اسلام قبول کرے گا۔

ایک روز اُسے اطلاع دی گئی کہ سالار عاصم عمر کا ایک محافظ ہندوستان کی بڑی حسین عورت کے ساتھ آیا ہے اور سفر، بھوک، پیاس، شب و بیداریوں اور گرد سے دونوں کی حالت بہت بُری ہے۔

"انہیں فوراً اندر بھیجو"۔۔۔ سلطان محمود نے گھبرا کر کہا۔۔۔ "کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔"

محافظ اندر آیا تو اُس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور اُس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ عورت کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ سلطان محمود کے حکم پر دونوں کو پانی پلایا گیا۔

"سلطانِ عالی مقام!"۔۔۔ محافظ نے کہا۔۔۔ "ہم راستے میں ذرا سی دیر اس لیے رکتے رہے کہ گھوڑا آرام کر لے۔ میں آپ کے حضور سالار عاصم عمر سے پہلے پہنچا تھا۔ وہ شاید ابھی نہیں پہنچا۔ وہ آپ کے پیغام کا جواب لا رہا ہے جو سراسر فریب ہے۔ ملتان کا حکمران داؤد بن نصر ہندوؤں سے بڑھ کر آپ کا دشمن ہے۔ بجی رائے اور انند پال نے اُسے اپنا اتحادی بنا رکھا ہے۔ انہوں نے آپ کو مروانے اور ہماری فوج سے ہتھیار ڈلوالے کا کام داؤد بن نصر کے سپرد کیا ہے۔ اس قرامطی نے عاصم عمر کو ایک نقشہ دیا ہے جس پر وہ راستہ دکھایا گیا ہے جس سے آپ اپنی فوج ملتان لے جائیں گے۔ ہندو مہاراجوں نے آپ کے لیے ایک پھندا تیار کیا ہے!"

"کیا عاصم عمر کو داؤد بن نصر کی نیت کا پتہ چلا ہے؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"عاصم عمر اپنا ایمان فروخت کر کے آرہا ہے"۔ محافظ نے سلطان محمود کو بتایا کہ عاصم پر کیسے طلسم طاری کیے گئے ہیں اور وہ اب ہمارا سالار نہیں، داؤد بن نصر کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ اُس نے کہا۔ "وہ اس فریب میں برابر کا شریک ہے جو آپ کو دیا جائیگا۔"

محافظ نے اس عورت کے متعلق سلطان محمود کو بتایا کہ اُسے کس طرح محل میں پہنچا دیا

گیا تھا اور اس نے اپنی رُوح کو مطمئن کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کر لیا تھا.... ایک ترجمان کے ذریعے عورت نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ داؤد بن نصر کے محل میں کیا ہوتا ہے، وہاں کیسا مذہب رائج ہے اور عاصم عمر کو کس طرح جال میں پھانسا گیا ہے اس نے داؤد اور عاصم عمر کی پوری گفتگو سنائی جو اُس نے اپنے کانوں سنی تھی۔

"اس عورت کو زنانہ میں بھیج دیا جائے" سلطان محمود نے کہا۔ "اور اس محافظ کو ہمارے مہمان خانے میں رکھا جائے جب عاصم عمر آئے تو اُسے پتہ نہ چلنے دیا جائے کہ یہ دونوں اُس سے پہلے آ گئے ہیں"

عاصم عمر پانچ چھ روز بعد آ گیا اور سیدھا سلطان محمود کے پاس گیا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ داؤد بن نصر نے بیش قیمت تحفے بھیجے ہیں اور کہا ہے کہ وہ سلطان کے انتظار میں بے تاب ہو رہا ہے۔ عاصم عمر نے نقشہ سلطان محمود کے آگے رکھ کر بتایا کہ داؤد بن نصر نے ہماری فوج کے لیے یہ راستہ بتایا ہے۔ اس کی فوج اس راستے کے دائیں بائیں کے علاقے میں موجود ہوگی۔ عاصم عمر نے کہا کہ داؤد بن نصر ہمارا مخلص دوست ہے۔

"میں نے اپنی فوج ملتان تک لے جانے کا راستہ دیکھ لیا ہے" ــ سلطان محمود نے کہا۔ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ بجی رائے اور انند پال کی فوجیں کہاں کہاں ہماری فوج پر شبخون ماریں گی اور گھات کہاں کہاں لگائیں گی؟"

عاصم عمر نے حیرت سے سلطان محمود کی طرف دیکھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا۔ "اُن دونوں کو لے آؤ۔"

ذرا سی دیر میں عاصم عمر کا چوتھا محافظ ایک عورت کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اس عورت کو پہچانو" سلطان محمود نے عاصم عمر سے کہا۔ "اور یاد کرو کہ جب تم داؤد کے ساتھ اپنے ایمان کا اور میری جان کا سودا طے کر رہے تھے، یہ عورت تم دونوں کو شراب پلا رہی تھی.... کیا اپنے گناہ کی ہر ایک تفصیل میری زبان سے سننا چاہتے ہو یا اس عورت کی زبانی؟.... کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اپنی زبان سے اپنے گناہ کا اعتراف کر لو؟"

عاصم عمر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ایمان فروشی اور گناہوں کے اثرات نے اُس کے جسم کی طاقت سلب کر لی۔ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا۔ اُس نے اپنی تلوار نکال لی اور بجلی کی سی تیزی سے اُس کی نوک اپنے پیٹ پر رکھی پیشتر اس کے کہ کوئی اُس تک پہنچتا اُس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار اتنے زور سے اپنے پیٹ میں داخل کر دی کہ اس کی نوک پیٹھ سے باہر آگئی۔

" اِس کی لاش شہر سے باہر پھینک دو" سلطان محمود نے کہا۔ "ایمان فروشوں کو گور و کفن کا حق نہیں ملنا چاہیئے"

عاصم عمر ابھی تڑپ رہا تھا جب اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ سلطان محمود نے اپنے سپہ سالار کو جو وہاں موجود تھا، حکم دیا "فوج کو کُوچ کے لیے تیار کرو۔ ہم ملتان پر حملہ کریں گے لیکن ہمیں راستے میں کئی معرکے لڑنے پڑیں گے۔ بُت پرستوں کے ساتھ ہمیں قرامطیوں کا بھی خاتمہ کرنا ہے"

باپ کا پاپ

عاصم عمر نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر غدّاری کے گناہ کی سزا پالی۔ وہ باہر دھوپ میں پڑا تڑپ تڑپ کر مرا کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اُس کے منہ میں پانی کے دو قطرے ٹپکا دیتا۔ سلطان محمود غزنوی نے اُس کے پسماندگان پر یہ کرم کیا کہ انہیں لاش اٹھا لے جانے کی اجازت دے دی۔

عاصم عمر سلطان کی فوج کے پرانے اور تجربہ کار سالاروں میں سے تھا مگر نسوانی حُسن، شراب اور تھوڑے سے علاقے کی حکمرانی کے لالچ نے بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کرنے والے اور لاکھوں کے لشکر کو دین و ایمان کی درانتی سے کاٹ پھینکنے والے سالار کی اپنی تلوار اُس کے اپنے پیٹ میں اتار دی۔ عاصم عمر کا بیٹا قاسم بن عمر اسی فوج میں ایک جَیش کا کماندار تھا۔ وہ خوبرو نوجوان تھا، دلیر تھا اور فنِ حرب و ضرب کی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔ باپ نے اسے بچپن میں ہی سپاہی بنا دیا تھا۔ اِسے جب اطلاع دی گئی کہ اپنے باپ کی لاش لے جائے تو اسے ایک صدمہ تو یہ ہُوا کہ اس کا باپ جو نامی گرامی سالار تھا، مر گیا ہے، اور دوسرا صدمہ یہ ہُوا کہ وہ ملتان گیا تھا اور اُسے ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ وہ سمجھا شاید اُس کی لاش ملتان سے آئی ہے۔

اسے باپ کی مَوت کا پیغام دینے والا شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے باپ کی لاش باہر دھوپ میں پیٹھ کے بل خون میں ڈوبی پڑی تھی اور اس کے پیٹ میں تلوار اُتری ہُوئی تھی۔ قریبی عمارت کے برآمدے میں سُلطان محمود کی فوج کا سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی کھڑا تھا۔ ابوعبداللہ وہ سپہ سالار تھا جس کا ذکر تاریخوں میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا ہے۔ قاسم بن عمر کو اپنے باپ کی لاش کے پاس حیران و پریشان کھڑے

دیکھ کر ابوعبداللہ اُس کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اُسے اِس نوجوان کماندار پر ترس آرہا تھا۔ وہ قاسم کے قریب گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجّہ کیا۔

"تمہیں اور زیادہ حیران ہونا چاہیئے تھا" — سپہ سالار نے کہا "دِل سے اپنے باپ کی محبّت نکال کر اپنے عقیدے، اپنے مذہب اور اپنے فرض کی محبّت پیدا کرو تاکہ جب سنو کہ تمہارا باپ کس طرح مرا ہے تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ ہو"۔

"خون کی تازگی بتاتی ہے کہ انہیں یہاں اور ابھی ابھی قتل کیا گیا ہے" — قاسم بن عمر نے کہا — "ان کا قصور کیا تھا؟ یہ تو ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہیں کس نے قتل کیا ہے؟"

"تمہارا باپ اپنا قاتل خود ہی ہے" — ابوعبداللہ نے کہا "یہاں اس کا کوئی دشمن نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ خود دشمنی کی۔ اپنے مذہب، اپنے ملک اور اپنی فوج کے ساتھ دشمنی کی"۔

ابوعبداللہ محمد الطائی نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُس کے باپ کا گناہ کیا تھا۔ قاسم بن عمر توجہ سے سنتا رہا۔

"کیا اپنے باپ کے گناہ کی سزا مجھے بھی بھگتنی پڑے گی؟" — قاسم نے پوچھا — "کیا مجھے میرے عہدے سے ہٹا دیا جائیگا؟"

"سلطان نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا" — سپہ سالار نے جواب دیا "سلطان کے بعد میں ہوں جو تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہارے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم نوجوان ہو۔ تمہارے سامنے ساری عمر پڑی ہے۔ تمہیں میرے عہدے تک پہنچنا ہے۔ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرو۔ سوچو اور سمجھو کہ گناہ میں کشش کتنی ہوتی ہے کہ عاصم عمر جیسا دیندار سالار اس خوبصورت جال میں آگیا۔ دیکھو کہ گناہ میں کتنی قوت ہوتی ہے کہ عاصم عمر جیسے فاتح سالار نے اپنی پوری فوج کو تباہ کرنے اور محمود جیسے سلطان کو شکست دلانے اور ہندوؤں کے ہاتھوں مروانے کا انتظام کر دیا تھا، پھر اس سے عبرت حاصل کرو کہ گناہ جب سزا دینے پر آتا ہے تو عاصم عمر جیسا شیر دل سالار بھی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔ تم نوجوان ہو۔ نوجوانوں کا ذہن ذرا سی انگیخت پر گناہ آلود خیالوں کا آشیاں بن جاتا ہے"۔

"کیا مجھے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کرنے کا موقع دیا جائیگا؟"

"تمہیں موقع دیا جا رہا ہے"۔ ابوعبداللہ نے جواب دیا۔ "لاش کے پیٹ سے تلوار نکالو اور لاش لے جاؤ"۔

"کیا میں اُس عورت سے مِل سکتا ہوں جو ملتان سے آئی ہے اور میرے باپ کے گناہوں کی عینی شاہد ہے؟"

"تم لاش لے جاؤ"۔ سپہ سالار ابوعبداللہ نے کہا۔ "میں اس عورت کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔ وہ تمہاری ماں کو بھی ساری بات سنا دے گی۔ تم محافظ دستے کے اُس آدمی سے بھی مل لینا جِس کے ساتھ یہ عورت آئی ہے"۔

قاسم بن عمر نے اپنے باپ کی لاش کے پیٹ سے تلوار نکالی۔ سپہ سالار نے لاش قاسم کے گھر لے جانے کا انتظام کر دیا۔

عاصم عمر اپنی بیوی کو پشاور اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ یہ عورت اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ راجہ جے پال نے جب ۹۷۷ء میں غزنی پر فوج کشی کی اور سلطان سبکتگین کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تھا تو بہت سی نوجوان لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جنہیں راجہ جے پال کی فوج کے بڑے بڑے افسروں نے آج کے پنجاب اور سرحد کے علاقوں سے اغوا کیا اور اپنے ساتھ میدانِ جنگ میں لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ساتھ عاصم عمر نے شادی کر لی تھی۔ اس کے بطن سے قاسم پیدا ہُوا تھا۔ وہ ان علاقوں کی زبان بول سکتی تھی جن پر راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ قاسم نے بھی ماں سے یہ زبان سیکھ لی تھی۔

عاصم عمر کی لاش گھر پہنچی تو قاسم کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔ باپ کی خون آلود تلوار قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ ماں نے تلوار دیکھی تو اس کی چیخیں تھم گئیں۔ اُس نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ شخص اس قابل نہیں تھا کہ آپ جیسی عورت اس کا ماتم کرے"۔ قاسم نے کہا۔ "اس نے اپنی تلوار سے اپنی جان لی ہے"۔ قاسم نے تلوار پھینک دی اور بولا۔ "ماں! مجھے سچ بتاؤ، کیا میں اسی باپ کا بیٹا ہوں؟ آپ ہندو تو نہیں تھیں؟ کیا میں نے غدّار

ماں باپ کے ہاتھوں میں پرورش پائی ہے؟"

"قاسم!۔۔ اُس کی ماں نے بلبلا کر پوچھا"۔ "تم کیا کہ رہے ہو؟ یہ سب کیا ہے ہم کسے غدّار کہ رہے ہو؟ بلخ اور بخارا کی باغی فوجوں سے ہتھیار ڈلوانے والا اور بُت پرستوں کے ہاتھیوں کے پہاڑوں سے ٹکرا جانے والا غدّار نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ملتان گئے تھے۔ وہاں سے کب آئے ہیں؟"

"آپ کو تمام سوالوں کے جواب ملتان کی ایک عورت دے گی"۔۔ قاسم بن عمر نے کہا۔ "وہ آتی ہو گی۔ پھر آپ کو ان سوالوں کے جواب اُن محافظوں میں سے ایک دے گا جو اس کے ساتھ ملتان گیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا ہے۔ وہ آ رہا ہو گا"۔

محافظ سے پہلے ملتان سے آنے والی عورت آ گئی۔ اُسے سپہ سالار ابوعبداللہ نے بھیجا تھا۔ قاسم نے دیکھا کہ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی اور وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب وہ معصومیّت نہیں رہی تھی جو جوانی میں ہُوا کرتی تھی۔ اب وہاں مظلومیّت کے آثار تھے اور بڑے لمبے سفر کی تھکان کے اثرات، پھر بھی اُسکے نقش و نگار میں کشش اور جاذبیت باقی تھی۔

"میرا نام رالعبہ ہے"۔۔ اُس نے کہا۔ "مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے"۔

"میرے خاوند نے ملتان میں کیا کیا تھا؟"۔۔ عاصم عمر کی بیوی نے پوچھا۔

"انہوں نے وہاں وہی کچھ کیا تھا جو ایسے ماحول میں جا کر ہر مرد کیا کرتا ہے"۔۔۔ رالعبہ نے جواب دیا اور بتایا کہ عاصم عمر کو داؤد بن نصر نے کِس طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ اُس نے کہا۔۔۔ "وہاں تو حُسن اور گناہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آپ کے خاوند کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن داؤد بن نصر نے ان کے ساتھ سلطان محمود کو شکست دلوانے اور ان کی فوج کو راستے میں تباہ کرانے کا سودا طے کر لیا۔ میں اُس وقت دونوں کو شراب پلا رہی تھی اور ان کی حاضری میں موجود رہنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں اس طلسم کا ایک کل پرزہ بن چکی تھی۔ مجھے میرے باپ نے ایک آدمی کی بیوی بنایا اور اس آدمی نے مجھے داؤد بن نصر کے حرم میں تحفے کے طور پر دے دیا تھا۔ میرا من مر چکا تھا لیکن ایک درویش صفت انسان نے مجھے ایک راستہ دکھا کر میرے ضمیر کو زندہ کر دیا۔ وہ میرے بچپن کی ایک سہیلی کا باپ ہے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا میں داؤد کے دربار اور محل کے بعض راز اُن تک پہنچا کر اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتی ہوں۔"

اُس نے تفصیل سے بتایا کہ قرامطی فرقہ کیا ہے، اور اس فرقے کے اعمال کیا ہیں۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن عیش و عشرت اور ہر گناہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

"ملتان اس فرقے کا مرکز بن گیا ہے"۔۔۔ رابعہ نے کہا۔"اور مسلمان تیزی سے اسے قبول کرتے جا رہے ہیں۔ وہیں ایسے مسلمان بھی ہیں جنہوں نے قرامطیوں کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے۔ یہ درویش اسی محاذ کے قائد ہیں۔ وہ صحیح اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ان کے مالی وسائل محدود ہیں اس لیے غزنی تک کا سفر نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو اکسانا چاہتے ہیں کہ وہ ملتان پر چڑھائی کرے اور اس فرقے کو ختم کرے کیونکہ اسلام کے لیے ہندوؤں کا مذہب اتنا خطرناک نہیں جتنا یہ فرقہ ہے....

"میں ان کے ہاں جاتی رہتی تھی اور داؤد کے محل میں جو کچھ ہوتا تھا وہ انہیں بتاتی رہتی تھی۔ میں نے وہیں سلطان محمود کا نام سنا تھا۔ وہاں ہندو راجے انند پال اور بجی رائے آتے رہتے ہیں اور غزنی کی فوج کو شکست دینے اور سلطان محمود کو ختم کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ آپ کے خاوند کے متعلق مجھے پتہ چلا تھا کہ سلطان کی فوج کے سالار ہیں، اس لیے میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی مگر محل کی بڑی ہی حسین اور چالاک لڑکیوں کے جال میں آکر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ہی فوج کی شکست کا سودا کر لیا۔ میں نے اپنی سہیلی کے باپ کو بتایا۔ انہوں نے آپ کے خاوند کے ایک محافظ کو بلا کر بتایا۔ اس محافظ نے مجھے وہاں سے نکالنے کا انتظام کر لیا۔ ہم دونوں آپ کے خاوند کو دھوکہ دے کر ان سے پہلے سلطان کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کے خاوند بہت بعد میں آئے اور انہوں نے سلطان کو دھوکہ دینے کے لیے جھوٹی اطلاعیں دیں۔ سلطان نے مجھے اور محافظ کو ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے ان کے سامنے ان کی قلعی کھول دی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تلوار نکالی اور اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔"

قاسم اور اُس کی ماں خاموشی سے سُن رہے تھے۔ رابعہ سنا چکی تو ماں نے اپنے

خاوند کی تلوار اُٹھالی اور قاسم کی طرف بڑھا کر بولی ـــ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اُتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اِس تلوار سے اپنے جیسے ایک سَو دشمنوں کو کاٹو گے۔"

"یہ تلوار مجھے نہ دو ماں!" ـــ قاسم بن عمر نے کہا ـــ "اِس پر جو خون لگا ہوا ہے اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے۔"

عاصم عمر کو معمولی سے ایک آدمی کی طرح دفن کر دیا گیا۔ اُس کی بیوی نے اُس کا ماتم ویسے نہ کیا جیسا ایک سالار خاوند کا ہونا چاہئیے تھا اور وہ اپنے سینے میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کا طوفان روکے ہوئے تھی۔ اسے نوجوانی میں ہندوؤں نے گھر سے اُٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ تو کہا کرتی تھی کہ یہ اُسی کی دعاؤں کا اثر تھا کہ راجہ جے پال کو شکست ہوئی تھی اور خدا نے اُسے ایک مسلمان خاوند دیا جو کچھ عرصہ بعد سالار بن گیا، مگر اسی خاوند کو ہندوؤں کے دوست نے ایسے جال میں پھانسا کہ اُسے خودکشی کرنی پڑی۔ یہ عورت یہ سُن کر بہت خوش ہوئی تھی کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اسی لیے عاصم عمر کے ساتھ پشاور آ گئی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئی تھی۔ اس کا دل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا مگر صورتِ حال ایسی بدلی کہ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اُس نے اپنی امیدیں اپنے بیٹے کے ساتھ وابستہ کر دیں اور اُسے انتقام کے لیے تیار کرنے لگی۔ اُس نے رابعہ کو ایک فریب خوردہ عورت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رابعہ کا یہ کارنامہ تو اُسے بہت ہی پسند آیا کہ اُس نے سلطان محمود کی فوج کو ایک بہت بڑے دھوکے سے بچا لیا تھا۔

جس روز عاصم عمر ملتان سے نقشہ لے کر چلا تھا جس میں وہ راستہ دکھایا گیا تھا جس سے سلطان محمود کی فوج کو ملتان جانا تھا، اُس سے اگلے روز داؤد بن نصر بھیرہ کے راجہ بجی رائے سے ملنے بھیرہ چلا گیا اور اُسے بتایا کہ اُس نے غزنی کی فوج کو کیا دھوکہ دیا ہے، اور

اب یہ بجی رائے کا کام ہے کہ وہ اس فوج کو راستے میں تباہ کرے۔ بجی رائے اُسی روز لاہور راجہ انندپال سے ملنے چلا گیا اور اُسے بتایا کہ داؤد کے ہاتھوں اُس نے کیا انتظام کرادیا ہے
"کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ داؤد مسلمان ہے اور وہ ہمیں بھی دھوکہ دے سکتا ہے؟"
—"راجہ انندپال نے کہا "مسلمان پر اتنی جلدی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔"
"کیا آپ ابھی تک داؤد کو مسلمان سمجھتے ہیں؟"۔ بجی رائے کہا "آپ اس فرقے کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر اُس نے ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو یہ اُس کی آخری غلطی ہوگی۔ وہ ہم میں گھِرا ہُوا ہے۔ ہم اُس کی ریاست پر قبضہ کرکے اُسے قتل کردیں گے، یا قید میں ڈال دیں گے۔ یہ پیشِ نظر رکھیں کہ محمود کی فوج ابھی حملہ کرنے نہیں آرہی، ملتان میں رہنے اور یہاں اڈہ بنانے آرہی ہے۔ یہاں سے محمود میرے اور آپ کے علاقوں پر حملے کرے گا۔ میں نے اپنے دو آدمی پشاور بھیج دیئے ہیں۔ جونہی وہاں سے محمود کی فوج ملتان کے لیے کُوچ کرے گی، یہ آدمی تیز رفتار گھوڑوں پر آکر مجھے اطلاع دیں گے۔ میں اپنے چھاپہ مار اُن پہاڑی علاقوں میں بھیج رہا ہوں جو راستے میں آتے ہیں۔ وہ راتوں کو محمود کے ہر پڑاؤ پر حملے کرتے رہیں گے۔ وہ ہماری فوجوں کو ڈھونڈتا رہے گا لیکن اُسے ہمارا ایک بھی سپاہی نظر نہیں آئے گا۔ اگر وہ ملتان پہنچ گیا تو اُس کے ساتھ آدھی فوج ہوگی اور وہ بھی بغیر ساز و سامان کے ہوگی۔ میں نے ملتان میں محمود کے قتل کا انتظام بھی کردیا ہے۔"

وہ تو بہت دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ انندپال اپنے باپ راجہ جےپال کی تین شکستوں کی وجہ سے محمود غزنوی کا باجگزار تھا اور اُس نے اُسی معاہدے کے مطابق جو اُس کے باپ نے آخری شکست کے بعد سلطان محمود سے کیا تھا، تاوان بھی ادا نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج اُس کے علاقے میں داخل ہو۔ اُسے یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ بجی رائے کی فوج کے چھاپہ مار سلطان محمود غزنوی کی فوج کو نقصان پہنچاتے پہنچاتے اپنا نقصان کرا بیٹھیں گے۔
"چھاپہ مارنے کا جو کمال مسلمانوں کو حاصل ہے وہ ہمارے سپاہیوں میں نہیں ہے"

— انند پال نے کہا۔ "اس کے لیے عقل، دلیری اور پھرتی کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے چھاپہ مار بھیج دیں لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ محمود کو پشاور سے ادھر آنے کے لیے دریائے سندھ پار کرنا ہے۔ وہاں کشتیوں کا پل ہے جو ہم نے بنایا تھا۔ میں محمود کو یہ پل پار نہیں کرنے دوں گا۔ اپنی فوج کو اِدھر اُدھر چھپا کر رکھوں گا اور وہیں اُس سے ٹکر لوں گا۔ اگر وہ آگے آ گیا تو راستے میں اُسے آپ سنبھال لیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ آ جائے تو زندہ واپس نہ جائے۔"

اور وہ آ رہا تھا۔ سلطان محمود نے فوری کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کے پاس رسد اور دیگر سامان کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے کوچ سے ایک روز پہلے اپنے سالاروں، نائب سالاروں اور کمانداروں وغیرہ کو بلا کر انہیں کوچ کی ترتیب اور انداز بتایا۔ انہیں تکنیکی ہدایات اور احکام دیئے اور انہیں بتایا کہ راستے میں کم سے کم پڑاؤ ہوں گے، اور جہاں بھی پڑاؤ ہو گا وہاں شبخون مارنے والے جیش باری باری ارد گرد کے علاقے میں گھومتے پھرتے رہیں گے کیونکہ ملتان تک تمام راستے میں ہندوستان کے چھاپہ ماروں کا خطرہ ہے۔

اُس نے ہراول کا دستہ منتخب کرنے کے لیے سپہ سالار ابو عبداللہ محمد الطائی سے کہا اور ساتھ یہ بھی کہا۔ "خیال رکھو، ابو عبداللہ! یہ ہراول ویسا نہیں ہو گا کہ آپ کسی ایک دستے کو فوج کے آگے آگے روانہ کر دیں اور اس کے سپاہی آزادی سے لوگوں کے کھیتوں سے بھٹے اور درختوں سے پھل توڑتے اور کھاتے چلے جائیں گے۔ اِس کوچ میں یہ خطرہ ہے کہ جس راستے سے ہم جا رہے ہیں، اس کے درخت، جھاڑیاں، پتھر اور چٹانیں بھی آپ کی دشمن ہیں۔ ہراول دستے کو تیز بھی چلنا ہو گا، اور قدم پھونک پھونک کر بھی رکھنا ہو گا۔ نظر یہی آ رہا ہے کہ ہراول دستے کو معرکے لڑنے پڑیں گے۔"

کمانداروں کو معلوم نہیں تھا کہ سلطان محمود ہراول کے لیے ایسے سخت احکام کیوں دے رہا ہے۔ عاصم عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کو ان احکام کے پس منظر کا علم تھا۔ وہ

اِن خطروں سے آگاہ تھا جن کی طرف سلطان محمودؒ اشارہ کر رہا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"سلطانِ عالی مقام!" قاسم بن عمر نے کہا۔ "اگر میری تجویز آپ کے منصوبے میں مداخلت بے جا نہ ہو تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہراول میں میرے جیش کو بھیجا جائے۔"

"تمہارا نام؟" سلطان نے پوچھا۔

قاسم کی بجائے سپہ سالار ابوعبداللہ نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "اس کا نام قاسم بن عمر ہے..... عاصم عمر کا بیٹا۔"

سلطان محمودؒ کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی سی آئی۔ اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔ "ہراول دستے کا انتخاب ہم بعد میں کریں گے۔ اس کماندار کو یہیں رہنے دینا میں اسے الگ کچھ سمجھاؤں گا۔"

کوچ کا دن اور وقت بتا کر اور ہدایات دے کر سلطان محمودؒ نے سب کو رخصت کر دیا۔ سپہ سالار اور قاسم وہیں رہے۔ سلطان نے دونوں کو اپنے قریب بلایا۔

"تم نے اپنے آپ کو ہراول کے لیے کیوں پیش کیا ہے؟" سلطان محمودؒ نے قاسم سے پوچھا۔

"کیوں کہ راستے میں وہ خطرے ہیں جو ہماری فوج کے لیے میرے باپ نے پیدا کیے ہیں۔" قاسم نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جو خطرے باپ نے پیدا کیے ہیں، اُن کا پہلا شکار اُس کا بیٹا ہونا چاہیے۔"

"محترم سلطان!" سپہ سالار ابوعبداللہ نے کہا۔ "اس کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ اُسے اپنے خاوند کی خودکشی کا کوئی غم نہیں۔ وہ شرمسار ہے کہ اُس کے خاوند نے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ میں اس عورت کی قدر کرتا ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ اس کے بیٹے کو پیش قدمی اور میدانِ جنگ میں اُس جگہ رکھا جائے جہاں موت یقینی ہو اور اسے اپنے جوہر دکھانے کا ایسا موقع ملے کہ یہ بھاگ نہ سکے۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنے بچے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم میں بھی اپنی ماں کا جذبہ ہے؟" سلطان نے قاسم سے پوچھا۔ "یا کیا تم میں

بھی اپنے باپ کی کمزوریاں ہیں۔"

"میں آپ کو حلف اور قسم کے سوا کسی اور طریقے سے یقین نہیں دلا سکتا کہ مجھ میں ماں کا جذبہ زیادہ اور باپ کی کمزوریاں کم ہیں"۔ قاسم نے کہا۔ "سپاہ گری میں میرا استاد میرا باپ تھا۔ میں اس کے متعلق یہی جانتا تھا کہ وہ خوش طبع اور زندہ دل انسان تھا۔ میں صرف سپاہ گری پر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے باپ کی لاش دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس کی غدّاری کا ازالہ کروں گا۔"

"تم شاید نہ جانتے ہو کہ تمہاری ماں کے سینے میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اُسے نوجوانی میں ہند کے فوجی اغوا کر لائے تھے۔ وہ اِن کفّار کی ہوس کا نشانہ بنی رہی۔ وہ خوش قسمت تھی کہ ہند کی فوج کو شکست ہوئی۔ تمہاری ماں جیسی بہت سی مسلمان لڑکیاں پیچھے رہ گئیں۔ ہم نے سب کی شادیاں اپنی فوج کے آدمیوں سے کر دیں...... تم نوجوان ہو قاسم! شاید تمہارے دل میں ابھی یہ احساس پیدا نہ ہُوا ہو کہ مسلمان کو دو چیزوں پر مر مٹنا چاہیئے۔ ایک ہے مذہب اور دوسری چیز جسے میں مذہب جتنا مقدّس سمجھتا ہوں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت ہے۔ ہند میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ بھی ہماری قوم کے افراد ہیں۔ مسلمان لڑکی کی عزّت لوٹنا ہندوؤں نے اپنے مذہب کا فریضہ بنا رکھا ہے۔ ہمارے مذہب کا حکم یہ ہے کہ لڑکی کسی بھی مذہب کی ہو، اُس کی عزّت پر ہاتھ ڈالنا گناہِ کبیرہ ہے اور جب مسلمان کی ایک بیٹی کی عصمت پر کوئی کافر حملہ کرے تو عالمِ اسلام کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔ مسلمان کا ایمان ہونا چاہیئے۔۔۔ انتقام ۔۔۔ اپنی بیٹی کی عصمت کا انتقام!"

"میں انتقام لوں گا سلطانِ عالی مقام"۔۔۔ قاسم نے کہا۔

"جوانی اندھی ہوتی ہے قاسم"۔ سلطان نے کہا۔ "لیکن میرے پیرو مُرشد نے مجھے لڑکپن میں بتایا تھا کہ انسان میں گناہوں کو قبول کرنے کی جتنی کمزوری ہوتی ہے اس سے زیادہ اس میں گناہ سے بچنے کی قوّت بھی ہوتی ہے مگر قوّت کردار میں ہے۔ کردار کی تلوار کو مضبوطی سے پکڑے رکھو تو گناہوں کو شکست دے سکتے ہو۔ مجھے تمہارے باپ کی جسمانی موت کا کوئی غم نہیں، غم اس کی روحانی موت کا ہے۔ وہ اپنی روح کو ملتان مار آیا تھا۔ یہاں آ کر اُس نے اپنے

جسم کو مارا ہے۔ تم اپنے جسم کو بھول جاؤ۔ روح کو سامنے رکھو۔ میرے پیرو مرشد ابوالحسن خرقانی نے مجھے بتایا تھا کہ انسان کے پاس رُوح خدا کی امانت ہے۔ اگر اسے ناپاک کرو گے تو خدا کی امانت میں خیانت کرو گے۔ تمہارے باپ نے رُوح کو پراگندہ کیا اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسی موت مرا ہے....

"اس سے تو یہ لڑکی خدا کے زیادہ قریب ہے۔ عیش و عشرت اور گناہوں کی دنیا میں رہی مگر اُس نے ایمان اور روح کو بچائے رکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کفار کے چنگل سے آزاد ہو آئی ہے۔ اسی نے مجھے تمہارے باپ کا دھوکہ بتایا تھا۔ یہ اسلام کی بیٹی کا کردار ہے.... تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے کوچ کے راستے میں کیا خطرہ ہے؟"

"معلوم ہے سلطانِ عالی مقام!" — قاسم نے کہا — "مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنی پسند کے سپاہی منتخب کر سکوں۔ کفار کا کوئی چھاپہ مار فوج کے قریب نہیں آسکے گا۔"

سلطان محمود غزنوی نے سپہ سالار ابو عبداللہ سے کہا کہ قاسم کو اس کی پسند کے آدمی دیئے

ہراول کا دستہ جس میں پانچ سو سوار تھے، سب سے پہلے پشاور سے نکلا۔ قاسم بن عمر کا گھوڑا آگے آگے جا رہا تھا اور راستے کے ساتھ ساتھ، قاسم سے چند قدم دُور ایک اور گھوڑا چلا جا رہا تھا جس پر ایک عورت سوار تھی۔ سیاہ نقاب سے اُس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ قاسم کو اس سوار کی موجودگی کا پورا پورا احساس تھا۔ پشاور سے کچھ دُور جا کر قاسم نے بازو بلند کیا اور گھوڑا روک لیا۔ ہراول کا دستہ رُک گیا۔ قاسم گھوڑے سے اُترا۔ اُدھر وہ عورت گھوڑے سے اُتری۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

"اب مجھے خدا کے حوالے کر دو ماں!" — قاسم نے عورت کے پاؤں چھو کر کہا۔

ماں نے قاسم کے دائیں بازو کے ساتھ ایک تعویذ سا باندھ دیا اور بولی — "یہ قرآن کی وہ آیت ہے جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے دین و ایمان کو مضبوط رکھا جائے۔ انسان کے جسم کی مضبوطی ایمان کی مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ الوداع میرے بیٹے! زندہ آؤ گے تو ماں کو خوشی ہوگی۔ تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہوگی لیکن میں فتح کی خبر سنوں"— ماں کی آواز حلق میں دب کے رہ گئی۔ اس پر رقت

طاری ہوگئی تھی۔
قاسم کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ہراول دستہ چل پڑا۔ بہت دور جا کر قاسم نے پیچھے دیکھا۔ اسے صبح کے دھندلکے میں ایک چٹان پر ایک گھوڑا کھڑا نظر آرہا تھا۔ اس کی ماں کا بازو ہوا میں ہل رہا تھا پھر ایک بلند چٹان نے درمیان میں آکر انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا جب سلطان محمود غزنوی پشاور کے ایک وسیع میدان میں اپنی فوج کے سامنے کھڑا تھا۔ رسد کا بڑا ہی لمبا قافلہ چل پڑا تھا۔ فوج کوچ کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔

"اسلام کے سپاہیو!" سلطان محمود اپنی فوج سے مخاطب ہوا۔ "آج تم میرے حکم سے نہیں، اپنے خدا کے حکم سے کوچ کر رہے ہو۔ تم اس ملک میں جا رہے ہو جہاں محمد بن قاسم کے مجاہدوں کی اذانیں گونجی تھیں۔ کفار نے وہ اذانیں خاموش کر دی ہیں۔ وہاں اسلام کی شمع بجھ رہی ہے۔ مسجدیں ویران ہوگئی ہیں۔ ان پر بت پرستوں کی حکمرانی ہے۔ تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ وہ مظلوم تمہیں پکار رہی ہیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے کہ دنیا میں کہیں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے کہ کفار کے خلاف اس وقت تک لڑو جب تک کہ یہ فتنہ ختم نہ ہو جائے۔ ہندوؤں کی فوج تم پر تین حملے کر چکی ہے اور تم تینوں بار اسے شکست دے چکے ہو۔ ہندو راجے تمہارے ملک کو صرف اس لیے فتح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے سرچشموں کو بند کر دیں۔ یہ جنگ دو فوجوں کی نہیں، دو مذہبوں کی ہے۔ آج ہم یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام سچا مذہب ہے، ایک اجنبی ملک میں جا رہے ہیں مگر اس ملک میں اپنے آپ کو اجنبی نہ سمجھنا۔ وہ زمین مسلمانوں کے گھوڑوں کے سموں سے آشنا ہے اور انہی سموں کی دھمک اور نعروں کی گرج کا انتظار کر رہی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کا خطاب جذباتی ہوتا چلا گیا۔ وہ ضروری ہدایات سالاروں اور کمانداروں کو دے چکا تھا۔ اس نے سپاہیوں کو یہ ذہن نشین کرانا ضروری سمجھا تھا کہ یہ جنگ ملک گیری اور سلطنت کی توسیع کے لیے نہیں بلکہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جذباتی الفاظ

نے فوج میں ولولہ اور جوش پیدا کر دیا اور سپاہی کوچ کے لیے بےتاب ہونے لگے۔

قاسم بن عمر کا ہراول دستہ دوپہر سے ذرا بعد دریا کے اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں کشتیوں کا پُل تھا۔ دستہ پُل کے وسط میں پہنچا تو تیروں کی بوچھاڑ آئی جو قاسم کے گھوڑے سے چند قدم آگے کشتیوں کے اوپر رکھے ہوئے تختوں میں پیوست ہو گئی۔ قاسم نے گھوڑا روک لیا۔ دوسرے کنارے سے آواز آئی ۔۔۔ ”آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ سب کے سب تیروں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔“

”تم کون لوگ ہو؟“ ۔ قاسم نے بلند آواز سے پوچھا ۔۔۔ ”ہم سلطان محمود غزنوی کے سپاہی ہیں۔ راجہ انندپال ہمارا باج گزار ہے۔ ہمیں اس پل سے گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”یہ مہاراج انندپال کا حکم ہے کہ کوئی مسلمان سپاہی اس پُل سے آگے نہ آئے“ ۔۔۔ قاسم کو جواب ملا ۔۔۔ ”واپس چلے جاؤ۔“

سامنے والے کنارے پر پہاڑیاں اور چٹانیں تھی۔ قاسم سمجھ گیا کہ وہاں پل کا محافظ دستہ چھپا ہوا ہوگا۔ اُسے صرف ایک آدمی نظر آرہا تھا۔ اُس نے اپنے دستے کو پُل سے پیچھے چلے جانے کو کہا اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہاں صرف ایک ہندو فوجی کھڑا تھا۔ اُس نے قاسم کو بڑے رعب سے پوچھا کہ وہ اِن سواروں کو کیوں پُل سے گزار رہا ہے؟

”ہم کسی پر حملہ کرنے نہیں آرہے“ ۔۔۔ قاسم بن عمر نے جواب دیا ”حملہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس جگہ کا راجہ ہمارا باجگزار ہے۔ ہم خیر سگالی کے لیے آئے ہیں۔“

”جو راجہ تمہارا باجگزار ہے، اُسی نے حکم دیا ہے کہ مسلمان فوج آرہی ہے۔ اِسے پل سے نہ گزرنے دیا جائے“ ہندو فوجی نے جواب دیا۔

”تمہارا راجہ تو یہاں ہو نہیں سکتا“ ۔ قاسم نے کہا ۔۔۔ ”وہ لاہور میں ہوگا یا بھٹنڈہ میں۔“

”مہاراج یہاں سے دو فرسنگ (تقریباً سات میل) دور پڑاؤ کیے ہوئے ہیں“ ۔۔۔ ہندو فوجی نے اُسے بتایا ۔۔۔ ”اگر اُن سے اجازت لینی ہے تو اپنے سلطان کو یا

اپنے وزیر کو اُن کے پاس بھیجو۔"

"میں ہی سلطان ہوں اور میں ہی وزیر ہوں"۔ قاسم نے کہا۔ "مجھے اپنے راجہ کے پاس لے چلو۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہارے اِن تیر اندازوں سے نہیں ڈروں گا جو یہاں پہاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ ہم پُلوں کے بغیر دریا پار کرنا جانتے ہیں۔ ایک غلط حکم پر اپنی جانیں ضائع نہ کرو۔"

ہندو اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم اِدھر اُدھر دیکھتا گیا۔ اُسے چٹانوں پر تیر انداز پھیلے ہُوئے نظر آئے۔ ان چٹانوں سے نکل کر آگے گئے تو اُسے راجہ انند پال کی فوج کے خیمے نظر آنے لگے۔ قاسم اِس زمین کے خدوخال کو دیکھتا گیا۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں انہیں لڑنا پڑے گا، اس لیے زمین سے واقفیت ضروری تھی۔ اُس ویرانے میں راجہ کی موجودگی بتا رہی تھی کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔

ہرے بھرے درختوں نے اُس جگہ کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا جہاں راجہ انند پال کی شاہی خیمہ گاہ تھی۔ ہر طرف گھنا سبزہ تھا۔ قاسم کو جب ایک چوکور اور وسیع خیمے میں داخل کیا گیا تو اُسے محل کا گماں ہُوا۔ راجہ جے پال اونچی اور سجی سجائی مسند پر بیٹھا تھا۔ اُس کے پیچھے دو بڑی خوبصورت لڑکیاں کھڑی مور چھل ہلا رہی تھیں۔ راجہ کو پہلے بتا دیا گیا تھا کہ اُسے ملنے کون آرہا ہے اور وہ کیوں آیا ہے اس لیے وہ چہرے پر رعونت کے آثار لئے ہوئے تھا۔ اُس کے دائیں بائیں فوج کے بڑے افسر اور درباری بیٹھے تھے۔

"کیا تمہارا سلطان دریا پار کرنے کی اجازت چاہتا ہے؟"۔ راجہ انند پال نے پوچھا ۔۔۔ "اُس کا ارادہ کیا ہے؟ وہ کہاں جا رہا ہے؟"

"آپ ہمارے باجگزار ہیں"۔ قاسم نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک تاوان بھی نہیں دیا۔ معاہدے کے مطابق آپ ہمارے مطیع ہیں۔ آپ یہ پوچھنے کے حق سے محروم ہیں کہ سلطان کیوں دریا پار کرنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری فوج آپ پر حملہ کرنے نہیں آ رہی۔ ہم امن اور اطمینان سے گزر جائیں گے۔"

"ہم تمہاری گستاخی معاف کرتے ہیں"۔ راجہ انند پال نے کہا۔ "ہم کسی کے باجگزار

نہیں ہیں۔ معاہدے کرنے والا میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ تمہارے سلطان نے مجھے شکست نہیں دی تھی۔ میں کوئی تاوان ادا نہیں کروں گا۔ اپنے سلطان سے کہنا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی فوج کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم تمہیں ملتان جا کر اڈہ نہیں بنانے دیں گے۔ ہماری نظریں ان پہاڑوں کو چیر کر دیکھ لیا کرتی ہیں کہ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ ہم تمہیں بتا سکتے ہیں کہ تمہارا سلطان اس وقت کہاں ہے اور اُس کے ساتھ کتنی فوج ہے۔ اُسے کہو واپس چلا جائے۔ ہم اُس کے مطیع نہیں۔ اُسے اگر دریا پار کرنے کی اجازت چاہیئے تو خود ہمارے دربار میں آئے۔"

"ہم اپنے سلطان کو کسی ایسے اوچھے مہاراجہ کے دربار میں نہیں جانے دیا کرتے جو غرور سے گردن اکڑا کر بات کرنے کا عادی ہو۔" قاسم نے کہا۔ "وہ اگر یہاں آنا چاہے گا تو بھی میں اُسے یہاں نہیں آنے دوں گا۔"

"تمیز سے بات کرو۔" ایک درباری نے گرج کر کہا۔ "تم ہمارے مہاراج اور راج دربار کی توہین کر رہے ہو۔" اُس نے راجہ انند پال کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ راجہ مسکرا رہا تھا۔

"تم جا سکتے ہو۔" راجہ نے کہا۔ "ہم تمہاری جوانی پر رحم کرتے ہیں۔ اس پل پر پھر کبھی قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ اگر تمہارا سلطان لڑنے کے ارادے سے آیا ہے تو ہم تیار ہیں۔ اُسے کہو کہ دریا پار کرنے کی جرأت کرے۔"

"ہم لڑنے نہیں آئے۔" قاسم نے غصہ پی لیا اور اُسے دھوکہ دینے کے لیے کہا۔ "سلطان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم جب لڑنے آئیں گے تو آپ سے دریا پار کرنے کی اجازت نہیں لینے آئیں گے۔ ہم آ جائیں گے۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے اُسے کہا تھا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، واپس جا رہے ہیں؟" ــــ سلطان محمود نے قاسم سے پوچھا۔ قاسم سلطان کو اطلاع دینے کے لیے کہ انندپال نے دریا پار کرنے سے روک دیا ہے، پیچھے چلا گیا تھا اور اُس نے انندپال کے ساتھ جو باتیں

کی تھیں وہ من وعن سنادی تھیں۔

"میں تمہاری دانشمندی کی تعریف کرتا ہوں"۔ سلطان محمود نے کہا ۔"اُسے ایسا دھوکہ ملنا چاہیئے تھا۔ میں آج ہی رات دریا پار کروں گا۔ تمہارا سوار دستہ کشتیوں کے پُل کے قریب پہاڑیوں میں چھپا رہے گا۔ تمہاری مدد کے لیئے ایک اور دستہ آجائے گا۔ باقی فوج کسی اور جگہ سے دریا پار کرے گی اور انندپال پر حملہ کرے گی۔ تم میرے پیغام کا انتظار کرنا۔ اشارہ ملتے ہی تمہارا دستہ اور حفاظتی دستہ کشتیوں کے پُل سے دریا پار کرے گا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہارے سامنے دشمن کا پہلو ہوگا یا عقب، تم اپنی عقل استعمال کر کے کارروائی کرنا۔ تم واپس پُل کے قریب چلے جاؤ۔ احتیاط کرو کہ تمہیں یا تمہارے کسی سوار کو دشمن دیکھ نہ سکے۔ پُل پر نظر رکھو۔ کوئی بھی آدمی خواہ وہ کوئی درویش اور فقیر ہی ہو، پل سے گزر کر اِدھر آئے تو اُسے پکڑ لو۔ وہ دشمن کا جاسوس ہو سکتا ہے"۔

سلطان محمود غزنوی نے سپہ سالار ابوعبداللہ کو بلا کر اُسے بتایا کہ راجہ انندپال دریا کے پار فوج لے کر بیٹھا ہے اور اُس نے ہمیں دریا پار کرنے سے روک دیا ہے۔ فوراً ماہی گیروں کے بھیس میں خود جائیں یا کسی اور سالار کو بھیجیں اور دیکھیں کہ دریا کہاں سے پار کیا جا سکتا ہے۔ آج ہی رات دریا پار کر کے انندپال پر حملہ کیا جائے گا۔

سلطان محمود نے قاسم بن عمر سے دریا کے پار کی زمین کے خدوخال کی تفصیل معلوم کر لی تھی۔ اُدھر راجہ انندپال نے اپنی فوج کا کچھ حصہ دریا کے اُس حصے کے سامنے تیار کھڑا کر دیا جہاں کشتیوں کا پُل تھا۔ یہ جگہ اُس مقام سے ذرا ہی اوپر کی طرف تھی جہاں دریائے کابل دریائے سندھ سے ملتا ہے۔ یہ اٹک کا مقام ہے۔ مشہور تاریخ دانوں نے جن میں فرشتہ، عتبی اور گردیزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمود کی فوج نے اُوپر جا کر اُس جگہ سے دریا پار کیا جہاں پاٹ چوڑا اور پانی کی گہرائی کم تھی۔ صبح کا اجالا نکھرنے سے پہلے فوج دریا پار کر گئی تھی۔ ان تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ یہ ۱۰۰۶ء کا موسم بہار تھا۔

راجہ انندپال کو توقع نہیں تھی کہ مسلمانوں کی فوج اتنی جلدی دریا پار کر آئے گی۔ وہ بے خبری کی نیند سویا ہوا تھا جب سلطان محمود کی ذاتی قیادت میں اُس پر حملہ ہو گیا۔ اُس کی فوج پوری طرح تیار نہیں تھی۔ تاہم ہندوؤں نے مقابلہ کیا۔ انندپال کی وہی فوج تیاری

کی حالت میں تھی جسے پُل کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ اسے جوابی حملے کے لیے بلایا گیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ قاسم کا سوار دستہ بے تابی سے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے ایک اونچی پہاڑی پر دو آدمی بٹھا رکھے تھے جو دریا پار کے میدانِ جنگ کو دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ دریا کے قریب ہندوؤں کا جو دستہ تھا، وہ میدانِ جنگ کو دوڑ پڑا ہے تو انہوں نے اُوپر سے قاسم کو اشارہ دے دیا۔ قاسم نے اپنے دستے کو برق رفتار یلغار کا حکم دے دیا۔ اُس کے پیچھے ایک اور سوار دستہ تھا۔ دونوں دستے کشتیوں کے پُل سے بہت تیزی سے گزر گئے، اور پھیل کر ہندوؤں کے اُس دستے پر عقب سے ٹوٹ پڑے جو جوابی حملے کے لیے جا رہا تھا۔ راجہ انند پال کو سنبھلنے اور میدانِ جنگ کو سنبھالنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اُس کے لیے اب یہی چال رہ گئی تھی کہ اپنی جان بچائے۔ وہ بھاگ نکلا۔ اُس کی فوج بکھر گئی۔ سلطان محمود نے تعاقب کا حکم دے دیا لیکن انند پال بہت پہلے نکل گیا تھا، پھر بھی تعاقب جاری رکھا گیا۔ اُس کی فوج دُور دُور تک بکھر گئی تھی۔ اِن میں سے بہت سے سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا، باقی بھاگ نکلے۔

مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق جب سلطان محمود کا دستہ جو تعاقب کے لیے گیا تھا، دریائے چناب کے کنارے پہنچا، اُس وقت راجہ انند پال دریا پار کر گیا تھا۔ یہ مقام اُس دَور میں سوہدرا کہلاتا تھا اور اب اسے وزیر آباد کہتے ہیں۔ راجہ انند پال کو غریب سے ملاحوں نے اپنی کشتی میں دریا پار کرایا تھا۔ تاریخ دانوں نے اس لڑائی کو معرکۂ دریائے سندھ کہا ہے۔

تعاقب میں سلطان محمود کی فوج بھی بکھر گئی تھی لیکن اُس نے قاصدوں کے ذریعے فوج کو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر جمع کر لیا۔ اس اجتماع کی تکمیل میں ایک ماہ

بجی رائے کی فوج کے ساتھ ٹکر نہ ہو کیونکہ فوج تھک چکی ہے اور ہمارے ساتھ رسد اتنی زیادہ ہے کہ لڑائی کی صورت میں ہم اسے سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس کی حفاظت میں دشواری پیش آئے گی ہمیں اب ملتان پہنچنا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ داؤدِ بن نصر کو پہلے ٹھکانے لگایا جائے۔ آستین کے سانپ کو مارنا ضروری ہے۔

وہاں سے فوج نے کوچ کیا تو بھی قاسم بن عمر کا دستہ ہراول میں تھا۔ اُس کے دستے کے کچھ ساتھی مارے گئے تھے۔

تیسرے روز قاسم اپنے دستے کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس علاقے کے دو گائیڈ تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ قاسم کو چار یا پانچ سو گز دُور ایک آدمی نظر آیا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا تھا اور وہ قاسم کے دستے کو دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگا دی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فوج سے ڈر کر بھاگ اُٹھا ہو لیکن قاسم کو یہ خطرہ محسوس ہُوا کہ یہ آدمی بجی رائے کی فوج کا آدمی ہو سکتا ہے اور وہ بھیرہ میں اطلاع دے گا کہ فوج آ رہی ہے۔ قاسم نے اپنے گائیڈوں سے پوچھا کہ بھیرہ کتنی دُور ہے اور کس سمت کو ہے۔ اسے سلطان محمود کی یہ ہدایت یاد تھی کہ بھیرہ کے دُور سے گزرنا ہے۔ اپنے گائیڈوں کو اس نے یہی بتایا تھا۔ گائیڈوں نے اُسے بتایا کہ بھیرہ قریب ہی ہے اور یہ سوار بھیرہ کی سمت گیا ہے۔

قاسم بن عمر نے دو سوار اپنے ساتھ لیے اور اس آدمی کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا دیا۔ وہ خاصا آگے نکل گیا تھا لیکن قاسم اور اُس کے دو سواروں کے گھوڑے بہت تیز تھے۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر انہیں بھیرہ کے قلعے کے بُرج نظر آنے لگے۔ بھاگنے والے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان فاصلہ اور تھوڑا ہو گیا۔

" کمانیں نکالو"۔۔۔ قاسم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔۔۔ "یہ شہر تک زندہ نہ پہنچے"۔

دونوں سواروں نے دوڑتے گھوڑوں سے تیر چلائے ایک تیر سوار کی پیٹھ میں اور دوسرا گھوڑے کی پیٹھ میں لگا۔ گھوڑا اور تیز ہو گیا۔ قاسم کے سواروں نے دو اور تیر چلائے لیکن بھاگنے والا ۔۔۔ پیٹھ میں ایک تیر لیے ہوئے دُور نکل گیا تھا۔ دونوں تیر ضائع گئے۔ اب شہر کی دیوار نظر آنے لگی تھی جو عام قلعوں کی نسبت زیادہ اونچی تھی۔ گھوڑا سوار شہر کے دروازے

میں داخل ہوگیا۔ قاسم اور اُس کے ساتھیوں نے گھوڑے موڑے اور اپنے دستے کی طرف چل پڑے۔

راجہ بجی رائے اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ اُسے اُس کی فوج کا سپہ سالار جسے وہ سینا پتی کہا کرتے تھے، رپورٹ دے رہا تھا کہ چھاپہ ماروں کو گئے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے، ابھی تک سلطان محمود غزنوی کی فوج نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے سامنے وہی نقشہ رکھا ہُوا تھا جو داؤد بن نصر نے عاصم عمر کو دیا اور اس پر وہ راستہ بنایا تھا جس سے اُسے سلطان محمود کی فوج کو لانا تھا۔ بجی رائے نے اس فوج کو راستے میں شبخونوں سے نقصان پہنچانے کے لیے چھاپہ ماروں کی خاصی تعداد بھیج دی تھی اور انہیں علاقے تقسیم کر دیئے تھے۔ وہ ہر روز اس خبر کی امید لے کر جاگتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج پر چھاپے اور شبخون شروع ہو گئے ہیں مگر ہر روز مایوسی کے سوا اُسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔

"پھر یہ فوج گئی کہاں؟"— بجی رائے نے اپنے سیناپتی سے غصّے سے کہا۔ "پشاور سے اطلاع آئی تھی کہ وہاں سے فوج چل پڑی ہے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"مَیں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ یا داؤد نے آپ کو دھوکہ دیا ہے یا سلطان محمود کا جو سالار داؤد کے پاس آیا تھا وہ دھوکہ دے گیا ہے"— سیناپتی نے کہا۔ "آپ مسلمانوں پر بھروسہ کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔"

اتنے میں بجی رائے کو اطلاع دی گئی کہ اپنا ایک سوار آیا ہے جس کی پیٹھ میں تیر اُترا ہُوا ہے۔

بجی رائے ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ آدمی اندر آ گیا۔ اُس کی پیٹھ میں تیر اُترا ہُوا تھا اور خون سے اُس کے کپڑے لال ہو گئے تھے۔

"مَیں نے مسلمانوں کی فوج کا ایک سوار دستہ دیکھا ہے"۔ اس آدمی نے کہا اور سمت بتائی جدھر سے دستہ آ رہا تھا۔ "تین سواروں نے میرا تعاقب کیا اور مجھ پر تیر چلائے۔ ایک مجھے لگا ہے اور دوسرا میرے گھوڑے کو۔ یہ دستہ ہراول کا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہے وہ فوج جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں"۔ بجی رائے نے کہا اور خبر لانے والے زخمی کو نظر انداز کر کے سیناپتی سے کہا۔ "ہم محمود کو اتنی مہلت نہیں دیں گے کہ وہ شہر کا محاصرہ کر سکے۔ اُس کی فوج کوچ کی تھکی ہوئی ہوگی۔ ہم اسے راستے میں روکیں گے اور شہر سے دُور لڑیں گے۔"

ذرا ہی دیر بعد سنکھ اور نقارے بج اُٹھے۔ بھیرہ کی فوج میں ہڑبونگ مچ گئی۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دینے لگی۔ ہزاروں گھوڑے ہنہنانے لگے۔ فوج کے دیکھ بھال کے آدمیوں کو یہ دیکھنے کے لیے دوڑا دیا گیا کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آگئی کہ سلطان محمود کی فوج شہر سے آٹھ دس میل دُور سے گزر رہی ہے۔ بجی رائے نے حکم دیا کہ فوج کو اُس راستے پر جنگی ترتیب میں کر دیا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بجی رائے کی فوج شہر سے نکل گئی۔

قاسم بن عمر واپس جا کر اپنے ہراول کے دستے سے پیچھے سپہ سالار ابو عبداللہ کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ ایک سوار نے انہیں دیکھ لیا ہے اور ہمارے تیروں سے زخمی ہو کر شہر میں چلا گیا ہے۔ ابو عبداللہ نے سلطان محمود کو اطلاع دی۔ سلطان پریشان سا ہو گیا تاہم اُس نے رسد کے قافلے کو وہیں روک کر اس کے ارد گرد حفاظت کا انتظام کر دیا۔ قاسم کو ہی دیکھنے کے لیے بھیجا گیا کہ بجی رائے کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر اطلاع دے۔

قاسم بن عمر جو اطلاع لے کر آیا، وہ تشویش ناک تھی۔ بجی رائے نے بھیرہ شہر سے تین چار میل دُور ایسی زمین پر جس کے نشیب و فراز اور خدوخال اُسی کو فائدہ دے سکتے تھے اپنی فوج کو جنگی ترتیب میں پھیلا دیا تھا۔ سب سے آگے ہاتھی تھے۔ سلطان محمود نے اس کے مطابق اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور آگے بڑھا۔ اُسے ہاتھیوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے کو بھاگتے اور اپنی ہی فوج کو کچلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اُن پیادوں سے آمنے سامنے کا حملہ کیا جو تیروں اور برچھیوں سے مسلّح تھے۔ ہاتھیوں نے حملہ روکنے کے لیے پیش قدمی کی۔ کئی ہاتھی زخمی ہو کر بے قابو ہوئے۔ پیچھے کو بھاگے مگر پیچھے بجی رائے کی کوئی فوج نہیں تھی جسے ہاتھی کچلتے۔ ہاتھیوں کے بھاگنے اور گھوم

پھر کر لڑنے کے لیے زمین خالی رکھی گئی تھی۔

سلطان محمود ایک جگہ سے میدانِ جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جہاں متفکر ہوا وہاں وہ بجی رائے کی عقل پر عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے پہلی بار ہاتھیوں کا اتنا دانشمندانہ استعمال دیکھا تھا۔ بجی رائے کے ہاتھیوں اور اُن کے سواروں سے مسلمان پیادہ حملہ آوروں کا بے دردی سے نقصان ہو رہا تھا۔ سلطان محمود نے پیادوں کی مدد کے لیے ایک سوار دستے کو حملے کا حکم دیا۔ کم و بیش ایک ہزار سواروں نے ہلہ بولا تو بجی رائے نے اِس دستے کے دونوں پہلوؤں پر اپنے سوار دستوں سے حملہ کرا دیا۔ مسلمان سوار اپنے پیادوں کی مدد کو پہنچ ہی نہ سکے۔

ہندو بہت دلیری سے اور اُن کے کمانڈر فنی فہم و فراست سے لڑ رہے تھے۔ سلطان محمود نے دشمن کے عقب میں دستے بھیجے مگر بجی رائے نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ اُس کے دستوں نے سلطان محمود کے دستوں کو راستے میں ہی روک لیا اور کسی سمت سے اُن پر ہاتھی دوڑا دیئے۔ ہاتھیوں کے سوار تیروں کا مینہ برساتے آ رہے تھے مسلمان دستوں کے لیے آگے بڑھنا ناممکن اور پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا۔ اور اس بھیانک جنگ کے پہلے دن کا سورج غروب ہو گیا۔

سلطان محمود کو شکست اور پسپائی صاف نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے سپہ سالار ابو عبداللہ کو ساتھ لے کر اور دُور کا چکر کاٹ کر بھیرہ شہر کے قریب جا کر اندازہ لگایا کہ بجی رائے کی توجہ میدانِ جنگ سے ہٹانے کے لیے شہر پر یلغار کی جا سکتی ہے یا نہیں لیکن شہر کے باہر بجی رائے نے تیر انداز دستے مورچہ بند کر رکھے تھے۔ اس دوران رات کو سلطان محمود کی رسد پر حملہ ہو گیا۔ یہ سلطان کا طریقۂ جنگ تھا جسے ہندو فوج اُس کے خلاف استعمال کر رہی تھی۔

رات جاگتے گزر گئی۔ سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی دشمن کے ایک پہلو پر پیادہ دستے سے حملہ کرایا مگر یہ پیادے کچلے گئے کیونکہ جسے سلطان محمود پہلو سمجھ رہا تھا وہ پہلو نہیں تھا۔ سلطان کا یہ دستہ پھندے میں آ گیا۔ ابو عبداللہ نے قاسم بن عمر کے سوار دستے کو مدد کے لیے آگے بھیجا۔ اِس دستے نے ایک قسم کا خودکش حملہ کیا۔ بے تحاشا کشت و خون ہو رہا تھا۔ معرکہ بڑا ہی خونریز اور بھیانک تھا۔ مورخوں کے مطابق، دونوں فوجوں کا بے انداز نقصان

ہورہا تھا زمین لال سُرخ ہوگئی تھی ـــــ اور دوسرے دن کا سورج بھی گرد وغبار، زخمیوں کی آہ وبکا اور جانوروں کے شوروغل میں ڈوب گیا۔

تیسرے دن سلطان کی فوج تقریباً آدھی رہ چکی تھی اور اُس کی رسد کا خاصا حصہ بھی تباہ ہوچکا تھا۔ اس روز کی لڑائی نے سلطان محمود کو مایوس کردیا معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے اس خوفناک منظر کا آنکھوں دیکھا حال اِن الفاظ میں بیان کیا ہے ـــ "سلطان محمود اس حد تک مایوس ہوگیا کہ اُس نے جنگ بندی کا فیصلہ کرلیا۔ اُس نے جب اپنی فوج کو بے جگری سے لڑتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ بجی کھچی فوج کا جذبہ ابھی زندہ ہے تو اُس نے اپنے محفوظہ کے دستوں سے ان الفاظ میں خطاب کیا کہ میں فتح کے لیے اپنی جان خدا کے حضور پیش کرتا ہوں ـ حملے کی قیادت مَیں خود کروں گا۔ سلطان کے الفاظ اور لہجے اور انداز میں جادو کا اثر تھا۔ محفوظہ کے دستوں کے نعرے نے بھیرہ کے آسمان کو ہلا ڈالا۔ سلطان نے خود اِن دستوں کی قیادت کی اور برق رفتار حملہ بول دیا مگر بجی رائے کے دستوں نے یہ حملہ بھی بیکار کردیا۔ سلطان نے اپنے دستے پیچھے کرلیے۔ بجی رائے اب زیادہ تر دفاعی جنگ لڑ رہا تھا۔ سلطان محمود گھوڑے سے اُترا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل پڑھے۔ سلام پھیرتے ہی وہ تیزی سے اُٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُس نے گلا پھاڑ کر کہا ـــ مجھے خدا نے فتح کا اشارہ دیا ہے۔ مسلمانو! آگے بڑھو ـــ مسلمان سپاہیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دوسری بار حملہ بولا۔"

فرشتہ لکھتا ہے کہ بجی رائے بھی مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا تھا۔ اِدھر جب سلطان خدا کے حضور سجدہ ریز تھا بجی رائے اپنے دو پنڈتوں کے درمیان اپنے کسی دیوتا کے بُت کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کی فوج کا بہت سا حصہ مارا گیا اور باقی فوج تھک چکی تھی۔ بجی رائے کو دوسرے ہلّے کی اطلاع ملی تو وہ بُت کے پاؤں کو چوم کر میدانِ جنگ میں آیا۔ اُسے ایک بڑی ہی بلند آواز سنائی دے رہی تھی ـــ

"مسلمانو! فتح یا موت ... مسلمانو! یہ بتوں اور ہمارے رسولؐ کی جنگ ہے۔ ... اسلام کے سپاہیو! تمہارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ لڑتے ہوئے مرو۔ ہتھیار نہ ڈالنا۔"

اب مسلمان جذبے کی جنگ لڑ رہے تھے، اور قیادت سلطان کر رہا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ سلطان کے پہلوؤں اور عقب کا خیال رکھے ہوئے تھے مسلمانوں کی تعداد

تھوڑی رہ گئی تھی، اور دوسرا خطرہ یہ کہ سلطان جذبات کے جوش میں آگیا تھا۔ ابوعبداللہ نے میدانِ جنگ کے حقائق اور احوال و کوائف پر نظر رکھی اور دائیں بائیں سے دشمن پر حملے کراتا رہا۔ اس سے سلطان کا یہ ہلّہ کامیاب رہا۔

بجی رائے نے جو دستے شہر کے اردگرد پھیلا رکھے تھے انہیں بھی جنگ میں جھونک دیا۔۔۔ اور سورج غروب ہوگیا۔ اگلے روز بجی رائے کا جھنڈا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس کی فوج بکھر رہی تھی۔ ابوعبداللہ نے شہر پر یلغار کردی۔ دروازے توڑ دیئے۔ بجی رائے لاپتہ تھا۔ آخر وہ شہر سے کچھ دور ایک وسیع نشیب میں مسلمان سواروں کو مل گیا۔ اُس کا محافظ دستہ بھاگ گیا۔ بجی رائے کو للکارا گیا کہ ہتھیار ڈال دے مگر اُس نے تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔

سلطان کی فوج نے دو سَو اسّی ہاتھی زندہ پکڑے اور وہ بھیرہ میں داخل ہُوا۔

رات کو میدانِ جنگ میں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔۔۔ ان میں زخمی بھی تھے، زخمی جانور بھی تھے۔ ان کے درمیان مشعلیں گھوم پھر رہی تھیں۔ ایک جگہ قاسم بن عمر زخمی پڑا تھا۔ اور اُسے ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "قاسم.... قاسم... زندہ ہو تو بولو۔"

چار کنواریوں کی حویلی

بھیرہ کی وہ رات آج کی راتوں کی طرح پُرسکون اور خاموش نہیں تھی۔ نُو سو پچھتر سال پہلے بھیرہ کی اُس رات کے چاند کا رنگ بھی لال تھا۔ اس چاند کے آگے محمود غزنوی کی فوج کے گھوڑوں اور پیادوں کی تین دنوں اور راتوں کی لڑائی ہوئی گرد نے پردہ سا ڈال رکھا تھا، اور اس میں سے چھن چھن کر آتی چاندنی میں دُور دُور تک ہزاروں زخمی تڑپ رہے تھے، اور ہزاروں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ زخمیوں کی آہ و بکا سے زخمی گھوڑوں کی کربناک اور بھیانک چیخوں جیسی ہنہناہٹ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے رات کانپ رہی تھی۔ میلوں وسیع میدان میں جیسے لہو کا موسلا دھار مینہ برس گیا تھا۔

آج وہاں خون کا نشان تک نہیں رہا۔ جن شہیدوں کو وہاں دفن کیا گیا تھا، اُن کی ہڈیاں کبھی کی بھیرہ کی خاک میں مل گئی ہیں ___ اور اس خاک میں سے پاکستان کا خمیر اُٹھا ہے۔ یہ سرزمین اللہ کے اُن سپاہیوں کے لہو سے دُھلی ہوئی ہے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ بہت دُور سے آئے تھے۔ وہ غزنی کی زمین کے سپوت تھے جنہوں نے بھیرہ کی اُن مسجدوں میں اذانیں دیں جنہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی دلآزاری کے لیے بت خانے اور اصطبل بنا رکھا تھا۔ انہوں نے محمد بن قاسم کے نعروں کو زندہ کیا تھا۔ زخمی مجاہدین کراہتے تھے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ اُن کے سینوں سے اللہ اکبر کے نعرے اُٹھ رہے ہوں ___ اور جب کسی زخمی مجاہد کے جسدِ خاکی سے روح نکلنے لگتی تھی تو وہ اپنے عزیزوں کا نہیں، اللہ کا نام لیتا تھا۔

لاریب وہ ایمان والے تھے۔ وہ جذبۂ اسلام سے سرشار تھے۔ وہ تراشے ہوئے اُن پتھروں کو ضربِ کلیمی سے توڑنے آئے تھے جنہیں گنگا جمنا کے پجاریوں نے "خدا" بنا رکھا تھا۔ وہ اسلام کی اُن بیٹیوں کی عصمت کی پاسبانی کے لیے آئے تھے جنہیں ہند کے راجاؤں

اور رعایا نے اپنی لونڈیاں سمجھ رکھا تھا۔

نو سو چھپتر سال پہلے کی اُس رات اسلام کی آبرو کے پاسبانوں کے جسموں سے لہو نکل گیا تھا اور جو زندہ سلامت تھے، وہ لاشوں کو اور زخمیوں کو مشعلوں کی روشنی میں پہچان اور اُٹھا رہے تھے۔ دُور دُور تک پھیکی پھیکی کبھی کبھی چاندنی میں مشعلوں کے شعلے تیر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے زخمیوں کی آہ و بکا، زخمی گھوڑوں اور ہاتھیوں کے قیامت خیز شور و غل میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی "قاسم..... قاسم..... کہاں ہو..... زندہ ہو تو بولو..... مجھے آواز دو" ـــ اور مشعلوں کی کہکشاں میں ایک مشعل بے تابی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی کہیں رُکتی تھی، اس کا شعلہ نیچے کو ہوتا تھا، مایوسی سے اُوپر اٹھتا تھا اور بے قراری سے موت کے میدان میں بھاگتا دوڑتا نظر آتا تھا۔

قاسم بن عمر موت کے اسی میدان میں کہیں زخمی پڑا تھا۔ اُس کا سارا جسم چھوٹے بڑے زخموں سے کٹا پڑا تھا۔ اُسے دُور کی یہ آواز "قاسم..... قاسم" ـــ کبھی کبھی سنائی دیتی تھی، اور اُسے یہ آواز لہو اور گرد سے بوجھل فضا میں تیرتی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی وہ اس آواز کو اگلے جہان کی آواز سمجھ لیتا اور سکون کا سانس لیتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کر کے اور اپنا فرض پورا کر کے خدا کے حضور آیا ہے اور اسے فرشتے پکار رہے ہیں۔

پھر اُسے یہ آوازیں اپنی ماں کی محسوس ہونے لگیں۔ اُسے یاد آگیا کہ اُس کے باپ نے سلطان سے غدّاری کی اور کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا، اور اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔ قاسم بن عمر کا زخمی جسم جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُسے ماں کے الفاظ یاد آنے لگے۔ ماں نے اسے اسکے باپ کے پیٹ سے نکالی ہُوئی تلوار دے کر کہا تھا ـــ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اس تلوار سے اپنے جیسے ایک سَو دشمنوں کو کاٹو گے۔"

قاسم بن عمر کو یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے یہ تلوار جس سے اس کے باپ نے خودکشی کی تھی، اپنی ماں کی طرف پھینک کر کہا تھا ـــ "یہ تلوار مجھے نہ دو ماں! اس پر جو خُون لگا ہُوا ہے، اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے" ـــ اور وہ جب اپنی فوج کے ساتھ

پشاور سے کوچ کر کے آرہا تھا تو ماں نے اُس کے بازو کے ساتھ قرآن کی ایک آیت کا تعویذ باندھ کر کہا تھا ۔۔ "الوداع میرے بیٹے! زندہ واپس آؤ گے تو ماں کو خوشی ہوگی۔ تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہوگی لیکن میں فتح کی خبر سنوں"۔۔۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس کی ماں نے اُس کے سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا تھا کہ میں اپنے اس اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

قاسم بن عمر کے جسم سے خون نکلتا جا رہا تھا۔ وہ خون سے تر زمین پر نہیں شہادت کی گود میں پڑا تھا۔ جوں جوں یادیں آوازیں بن کر اُس کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی جا رہی تھیں، اُس کا دماغ بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ اور یہ سوال اُسے پریشان کرتا جا رہا تھا "کیا ہم نے فتح حاصل کر لی ہے؟... کیا میں نے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے؟"۔۔ اور پھر بہت سے سوال اُس کے ذہن میں رینگنے لگے "سلطان محمود کہاں ہیں؟ ... سالار ابوعبداللہ کہاں ہے؟ ... میرے جانباز جیش کے مجاہدین کہاں ہیں؟ .... وہ سب پکڑے تو نہیں گئے؟ مارے تو نہیں گئے؟ ... سلطان پسپا تو نہیں ہوگیا؟ بھیرہ کا قلعہ سر ہوا تھا یا نہیں؟ .... میری خون آلود تلوار میری ماں تک کون پہنچائیگا؟ .... کون اُسے بتائے گا کہ تیرے بیٹے نے اس تلوار سے اپنے آپ کو نہیں سینکڑوں کفّار کو ہلاک کیا ہے۔"

قاسم بن عمر کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ فتح حاصل کی جا چکی ہے اور سلطان محمود اس وقت بھیرہ میں بجی رائے کے محل میں بیٹھا سالاروں اور کمانداروں سے رپورٹیں لے رہا ہے اور احکام دے رہا ہے، اور بجی رائے اپنی تلوار سے اپنے آپ کو ہلاک کر چکا ہے۔ قاسم بن عمر نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اُس نے ہر سو دیکھا۔ اُسے بیشمار مشعلیں گھومتی پھرتی نظر آئیں۔ چاندنی جو کبھی کبھی تھی، بالکل ہی پھیکی پڑ گئی ۔۔ اُسے پھر نسوانی آواز سنائی دی "قاسم .... قاسم .... کہاں ہو" ۔۔ آواز دور تھی۔ اُسے ایک مردانہ آواز سنائی دی ۔۔ "یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟ کوئی اس کے ساتھ ہو جاؤ۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"قاسم بن عمر کی لاش تلاش کر رہی ہے۔"

"اسے کہو ہم زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا رہے ہیں .... دیکھو یہ کون ہے"۔

یہ لوگ غزنی کی زبان بول رہے تھے۔ قاسم بن عمر نے بلند آواز سے انہیں بتانا چاہا کہ وہ یہاں ہے مگر اُس کی آواز اُسے خود بھی نہ سنائی دی۔ نقاہت زیادہ تھی اور جنگ کے بعد کا بھیانک شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا مشعلیں دُور تو نہیں تھیں لیکن اس کے لیے کوسوں دُور تھیں کیونکہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ دو تین قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بل گرا۔ اُس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر بڑی مشکل سے بیٹھ سکا۔ اُسے سِکی کی طرح آواز سنائی دی۔ "پانی"۔

اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک زخمی پڑا تھا۔ اُس نے "آب" نہیں "پانی" کہا تھا۔ قاسم سمجھ گیا کہ ہندوستانی سپاہی ہے۔ قاسم کی ماں ہندوستانی تھی، اس لیے وہ اس ملک کی زبان سمجھتا تھا۔ اس ہندوستانی نے اُس سے پانی مانگا تو قاسم بن عمر کو پیاس کا احساس ہونے لگا۔ اُسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اُس نے کب پانی پیا تھا۔ اُس کے ذہن پر ماں غالب تھی، اور فتح۔ وہ ہراول میں رہا۔ اُس کے جیش نے چھاپہ مار لڑائی بھی لڑی اور جب سلطان محمود غزنوی نے اپنی قیادت میں بجی راے پر آخری حملہ کیا تو قاسم بن عمر اس حملے میں بھی شامل تھا۔ وہ سلطان ہی کی طرح بھوک اور پیاس سے بے نیاز تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو رہی تھی اور پلّہ ہندوستانیوں کا بھاری تھا۔ فتح دور ہٹتی جا رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" ــــ اُسے آواز سنائی دی۔ "بھگوان کے نام پر میرے منہ میں پانی کے دو قطرے ڈال دو" ــــ اور سپاہی کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ یہ شدید درد کی سسکیاں تھیں۔ بھگوان کا نام سن کر قاسم بن عمر کو آگ لگ گئی۔ اُس نے تلوار نکالنی چاہی تو نیام خالی تھی تلوار کہیں گر پڑی تھی۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ عین اُس وقت اُسے زخمی سپاہی کی درد سے کراہتی ہوئی آواز سنائی دی ــــ "تم شاید مسلمان ہو"۔

"ہاں! میں مسلمان ہوں" ــــ قاسم بن عمر نے خنجر نیام میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مسلمان اپنے دشمن کو پیاسا نہیں مارا کرتا، اور بھگوان تمہیں پانی پلانے نہیں آئے گا ... مگر میرے پاس پانی نہیں۔ میں تمہیں پیاسا نہیں مرنے دوں گا۔ ذرا انتظار کرو میرے آنے تک زندہ رہنا"

وہ اُٹھا اور چلا مگر ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ بیٹھ کر پاؤں پر سرکتا قریب ایک لاش کے پاس

جا رکا۔ لاش کے ساتھ پانی کی چھوٹی سی چھاگل بندھی ہوئی تھی۔ اس نے چھاگل کھولی اور سرکتا ہوا زخمی ہندوستانی کے پاس گیا۔ بولا "منہ کھولو"۔

"تم مسلمان ہو؟" — ہندوستانی نے پوچھا۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں"۔

"پھر رہنے دو" — ہندوستانی سپاہی نے کہا — "میں پانی نہیں پیوں گا"۔

اتنی نفرت! قاسم بن عمر نے سوچا، ہندو مسلمانوں کو اتنا ناپاک سمجھتے ہیں کہ مرجانا قبول کر لیتے ہیں مگر مسلمان کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے!

"پھر اپنے بھگوان کو آواز دو" — قاسم نے کہا — "اگر تم بھگوان کی خاطر لڑے تھے تو انتظار کرو۔ شاید تمہیں پانی پلانے آجائے۔ میں خدا کے نام پر لڑتا رہا ہوں۔ میرا جسم قیمہ بن گیا ہے لیکن مجھے پیاس نہیں لگی۔ خدا نے میری روح کو تر بتر کر رکھا ہے"۔

ہندو نے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا اور چھاگل اپنی طرف گھسیٹ لی۔ قاسم نے چھاگل اٹھا کر اُس کے منہ سے لگا دی۔ ہندو آدھی چھاگل پی گیا۔

"جنگ کا فیصلہ کیا ہوا ہے؟" — قاسم بن عمر نے پوچھا "تم کچھ جانتے ہو؟"

"میں معمولی سا سپاہی نہیں" — ہندوستانی نے جواب دیا — "دو سو سپاہی میری کمان میں ہوتے ہیں۔ میں راجہ کے مرنے کے بعد زخمی ہوا تھا"۔

"ہمارا سلطان کہاں ہے۔؟"

"شہر کے اندر ہو گا" — ہندوستانی نے جواب دیا — "اور سنو ..... تم نے مجھے پانی پلایا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ تمہیں ایک بات بتا دوں، ہمیشہ یاد رکھنا۔ میری قوم پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ یہ ہمارا دھرم ہے کہ مسلمان کو ختم کرنا ہے۔ ہم یہاں کے مسلمانوں کو پریشان بھی کرتے رہے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کو اپنا دوست بھی بنا لیا ہے۔ ہمیں پنڈتوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تمہاری جنگ مذہب کی جنگ ہے جو اسلام کے خاتمے تک لڑی جائے گی۔ یہ جنگ ہمارے مرنے کے بعد بھی لڑی جاتی رہے گی"۔

قاسم بن عمر بیدار ہوتا جا رہا تھا اور ہندوستانی کی آواز دبتی جا رہی تھی — اور پھر اُس

کی آواز بالکل خاموش ہوگئی۔ اُس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل گیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ شہر میں فاتح بن کر داخل ہوا تھا تو شہر کے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے باہر نکل آئے تھے۔ وہ خوشی سے چیخ اور چلّا رہے تھے۔ بعض سلطان کے گھوڑے کے آگے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان پر رقّت طاری ہوگئی تھی۔ اُس نے اِس خطّے کے مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کرایا تھا لیکن اس کی توجہ کسی اور طرف ہوگئی۔ شہر کے ہندو اپنے بال بچوں کو ساتھ لیے، سروں پر گٹھڑیاں اور بکس اٹھائے شہر سے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے۔

"روک لو انہیں" ــــ سُلطان نے حکم دیا ــــ "سُورج غروب ہو رہا ہے۔ یہ کہاں جائیں گے ــــ ہم کسی کو اجاڑنے نہیں آئے۔ ہم شہر کو لُوٹ نہیں رہے۔ آگ نہیں لگا رہے۔ . . . روک لو انہیں اور انہیں کہو کہ میدانِ جنگ سے اپنی فوج کے زخمیوں کو اُٹھا کر اُن خیموں تک پہنچائیں جن میں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس اس کام کے لیے اتنے آدمی نہیں جو ہیں وہ اپنے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا رہے ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے زخمیوں کو اٹھائیں۔"

شہر سے جانے والے ہندوؤں کو روک لیا گیا۔ وہ بہت ڈرے ہُوئے تھے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ جنگ اُن کے راجہ اور فوج کے خلاف تھی شہریوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شہر میں یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ ہندو شہری میدان سے اپنے زخمیوں کو اٹھائیں اور اپنے سپاہیوں کی لاشیں بھی اٹھا کر جلا سکتے ہیں۔

یہ اعلان مسلمانوں نے بھی سنا۔ وہ سُلطان کی فوج کے زخمیوں کو اٹھانے، انہیں پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرانے کے لیے شہر سے نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ ان کی عورتیں بھی میدان میں چلی گئیں۔

اس اعلان کے فوراً بعد شہر کے بڑے پنڈت نے اپنے چیلوں کے ذریعے شہر کے بہت سے ہندوؤں کو مندر میں بلا لیا۔ یہ لوگ جب مندر میں گئے تو مندر کی گھنٹیاں

خاموش تھیں، سنکھ خاموش تھے، بت اور مورتیاں اداس تھیں۔ بہت سارے ہاتھوں والی دیوی کا بت مسکرا رہا تھا لیکن یہ مسکراہٹ کھسیانی سی تھی۔ مندر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ پنڈت نے کوئی اشلوک نہ پڑھا۔ اُس نے پرارتھنا نہ کی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی کے گہرے تاثرات تھے۔

"ہماری فوج ہار گئی ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "ہم نہیں ہارے۔ مسلمانوں کے سلطان نے ہمیں شہر میں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور یقین دلایا ہے کہ مسلمان فوجی ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔ اگر وہ شہر کو لوٹنا اور جلانا چاہتے تو اب تک یہ کام کر چکے ہوتے۔ ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور شکست کا انتقام لے سکتے ہیں۔ رات گہری ہوگئی ہے۔ ہم اپنا کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ سلطان نے آپ سب کو اپنی فوج کے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کی اجازت دے دی ہے۔ ..... آپ لوگ اس کام کے لیے چلے جائیں۔ مشعلیں ساتھ لے جائیں۔ مسلمانوں نے فتح تو حاصل کرلی ہے لیکن ان کی فوج آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اس میں سے زیادہ تر نفری زخمی ہے۔ جو زخمی چل سکتے تھے وہ چل کر آگئے ہیں۔ باقی سب میدانِ جنگ میں پڑے ہیں ....

"آپ اپنے زخمی اٹھانے کے لیے جائیں۔ کلہاڑیاں، تلواریں اور خنجر ساتھ لے جائیں۔ ہندو اور مسلمان فوجی کو پہچاننا مشکل نہیں۔ جو مسلمان زخمی اُٹھ اور چل نہیں سکتے، انہیں وہیں ہلاک کر دیں۔ اگر یہ زخمی مرہم پٹی کے لیے پہنچ گئے تو چند دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے، اور یہ ہندوستان اور ہمارے مذہب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ شہر کے ہر ہندو گھرانے تک یہ خبر پہنچاؤ تو اچھا ہے، ورنہ کوئی ہندو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے انہیں بتا دے گا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ ہی کافی ہیں جو یہاں موجود ہیں۔ اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مسلمان عورتیں بھی گئی ہیں۔ صبح تک آپ لوگ جتنے مسلمان زخمیوں کو مار سکتے ہیں مار ڈالیں۔ اپنے ملک اور مذہب کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمان فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ وقت کم ہے۔ فوراً چلے جاؤ"۔

قاسم بن عمر اب کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ پڑا تھا جدھر کوئی آ بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے "قاسم .... قاسم" کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں، وہ بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اُسے دُور دُور مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اُسے مایوسی یہ نہیں تھی کہ اُسے اٹھانے کوئی نہیں آ رہا اور وہ خود مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچنے کے قابل نہیں، وہ سلطان محمود تک یا اپنے سپہ سالار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ انہیں یہ بتا کر مرنے کی سوچ رہا تھا کہ اُس نے باپ کے گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے۔

اُس پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تو اُسے دو مشعلوں کے بڑے بڑے شعلے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی اپنی فوج کے آدمی ہو سکتے تھے۔ اُسے نسوانی پکار ایک بار پھر سنائی دی "قاسم .... قاسم .... زندہ ہو تو بولو" ــــ وہ بول نہ سکا۔

دو مشعلیں اُس کے قریب اس طرح آ رہی تھیں کہ رکتی تھیں، جھکتی تھیں، اوپر اٹھتی تھیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتی تھیں، پھر دو آدمی اُس کے قریب آ کر رک گئے۔ دونو پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ دونو کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔

قاسم بن عمر کو ان میں سے ایک کی دبی دبی سی آواز سنائی دی "مسلمان ہے۔ تیرھواں ہے .... ہماری نہیں سمجھتا"۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں" ــــ قاسم نے نحیف آواز میں کہا ــــ "مجھے فتح کی خوشخبری سناؤ۔ تم اس شہر کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم میری زبان نہیں بول سکتے۔ میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتا ہوں۔"

دونو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونو مسکرائے۔ ایک نے تلوار نکالی اور طنزیہ لہجے میں بولا ــــ "میں تمہیں تلوار کی زبان میں فتح کی خوشخبری سناؤں گا"ــــ اُس نے تلوار اُوپر اٹھائی۔ قاسم بن عمر بچنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اُس کی زندگی اور موت میں صرف ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تلوار اُس کی گردن کی طرف چلنے لگی تھی کہ ایک مشعل کا

شعلہ تلوار والے کے چہرے پر آ لگا۔ اُس نے چیخ ماری اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اُس کے ہاتھ سے مشعل بھی گر پڑی۔

یہ ایک تیسری مشعل تھی جو ان دونوں کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دونوں قاسم کو قتل کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ بارہ مسلمان زخمیوں کو قتل کر آئے تھے۔ قاسم بن عمر ان کا تیرھواں شکار تھا، لیکن تیسری مشعل نے اُسے ایک تلوار سے بچا لیا۔ قاسم نے مشعلوں کی روشنی میں دیکھا۔ وہ رابعہ تھی جو ملتان سے قاسم کے باپ عاصم عمر کے محافظوں کے ساتھ آئی تھی اور اُس نے سلطان محمود غزنوی کو بتایا تھا کہ عاصم عمر ملتان سے بڑا ہی خطرناک غدار بن کر آ رہا ہے۔ عاصم عمر کی خودکشی کا باعث یہی لڑکی بنی تھی۔ وہ اب پشاور سے اتنی دور پھیرے کے میدانِ جنگ میں عاصم عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کی زندگی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

رابعہ نے ایک ہندو کو تو گرا دیا، دوسرا پیچھے ہٹ گیا اور اُس نے تلوار نکال لی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اس جواں سال لڑکی کے ہاتھ میں صرف مشعل ہے ہتھیار کوئی نہیں اور قاسم بن عمر اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ دونو ہندو اپنے پنڈت کی اُس سکیم کے تحت آئے تھے جو اُس نے مندر میں ہندوؤں کو بتائی تھی۔ وہ اپنی فوج کے زخمیوں کو اُٹھانے کے بہانے مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ دوسرے ہندو نے تلوار نکال کر رابعہ پر حملہ کیا۔ رابعہ تیغ زنی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اُس نے مشعل اس ہندو کے آگے کر دی اور خود ایک طرف ہو گئی۔ جو ہندو رابعہ کی مشعل کے شعلے سے گرا تھا اُس کی آنکھیں جھلس گئی تھیں۔ وہ ایک طرف بیٹھا درد سے کراہ رہا تھا۔

قاسم بن عمر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے پاس خنجر تھا، تلوار نہیں تھی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ رابعہ مشعل کے شعلے سے اپنا دفاع کر رہی تھی۔ جونہی ہندو کی پیٹھ قاسم کی طرف ہوئی، قاسم نے خنجر اُس کی طرف پوری طاقت سے پھینکا۔ خنجر ہندو کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ وہ پیچھے کو گھوما تو رابعہ نے مشعل سے اُس کے کپڑوں کو آگ لگا دی۔ ہندو اُس کی طرف گھوما تو لڑکی نے مشعل کا شعلہ اُس کے چہرے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ آخر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیٹھ میں خنجر بھی اُترا ہوا تھا۔

لاشیں اور زخمی اٹھانے والوں نے دُور ایک آدمی کو جلتے دیکھا تو وہ دوڑتے

آئے۔ یہ غزنی کی فوج کے آدمی تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ ان دونوں نے کیا کیا ہے۔ ان میں سے جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا، وہ بات کرنے کے قابل تھا۔ اُس کے پیٹ پر تلوار کی نوک رکھی گئی تو اُس نے بتا دیا کہ وہ قاسم کو قتل کرنے لگے تھے، اور انہیں پنڈت نے کہا تھا کہ مسلمان زخمیوں کو قتل کر دو۔

اُسی وقت یہ آدمی میدانِ جنگ میں دوڑنے لگے۔ انہوں نے بہت سے ہندوؤں کو پکڑا جو مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ پھر ہندو شہریوں کو میدانِ جنگ میں آنے سے روک دیا گیا۔ پنڈت کو بھی جا کر پکڑ لیا گیا۔

قاسم بن عمر کو وہاں سے اٹھا لے گئے اور اُسے مرہم پٹی والے خیمے میں جا ڈالا۔

سلطان محمود غزنوی کی فوج پشاور سے چلی تھی تو سالاروں اور بعض کمانداروں کی بیویاں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان کی پالکیاں رسد کے قافلے کے ساتھ تھیں۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں۔ یہ بڑے افسروں کی بیویوں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ تھیں اور ان کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ مرہم پٹی کے بعد زخمیوں کی دیکھ بھال کریں۔ یہ کام بھی فوج کو کرنا پڑتا تھا۔ سلطان محمود نے یہ سوچ کر عورتوں کو ساتھ آنے کی اجازت دے دی تھی کہ فوج تھوڑی ہے اور مختلف لڑائیوں میں یہ اور کم ہو جائے گی، اس لیے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام عورتوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

"مجھے تمہاری ماں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا"۔۔۔ رابعہ قاسم بن عمر کو اُس کی مرہم پٹی کے بعد سنا رہی تھی۔۔۔ "جب تمہیں کوچ کا حکم ملا تو مجھے تمہاری ماں نے بتایا کہ عورتیں بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ بھجوا دے۔ میرے سینے میں جو آگ لگی ہوئی تھی وہ آج کچھ ٹھنڈی ہوئی ہے۔ یہ پوری طرح اُس روز ٹھنڈی ہو گی جس روز سلطان محمود ملتان فتح کرے گا اور میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گی۔ مَیں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ مجھے اگر اس نیکی کا انعام دینا چاہتے ہو کہ مَیں نے اُس کے ایک سالار کی غدّاری بے نقاب کی اور اُس کی فوج کو بہت بڑی شکست

اور تباہی سے بچایا ہے تو ملتان کے والی داؤد بن نصر کو میرے سامنے گرفتار کر کے لاؤ اور اُس کے محل کو زمین سے ملا دو ....

"تمہاری ماں کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا کہ جانا تو میں بھی چاہتی ہوں لیکن کہتے ہیں کہ بیویاں جاسکتی ہیں، کسی کی ماں ساتھ نہیں جاسکتی۔ وہ بہت روئی تھی۔ اُس نے معلوم نہیں کس کے ساتھ بات کر کے مجھے ان عورتوں کے ساتھ جانے کی اجازت لے دی جو فوج کے ساتھ آئی ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ 'میرا بیٹا میدانِ جنگ میں انشاء اللہ سخت جان ہوگا۔ اُس کا جسم دو حصّوں میں نہ کٹ گیا تو وہ گرے گا نہیں۔ میں نے اُسے کہا ہے کہ تمہاری لاش واپس آئے گی تو مجھے خوشی ہوگی، لیکن رابعہ میں ماں ہوں۔ جب سوچتی ہوں کہ میرا بیٹا پیاسا جان دے گا تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے میں قاسم کی ماں نہیں مجاہد کی ماں بن جاتی ہوں اور کہا کرتی ہوں کہ یہ اللہ کا سپاہی ہے جو میرے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ اللہ کی امانت ہے جو مجھے واپس کرنی ہے، پھر مجھے تسکین سی ہو جاتی ہے' ....

"اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ 'مجھے خود غرض کہہ لو۔ کچھ کہہ لو۔ مجھ پر یہ احسان کرنا کہ جب زخمیوں کو اٹھانے کا وقت آئے تو تم سب سے پہلے میرے بیٹے کو تلاش کرنا۔ اُسے پانی پلا دینا۔ دل میں میرا خیال رکھ لینا اور اُس کی ماں بن جانا۔ میرا بیٹا پیاسا اس دنیا سے رخصت نہ ہو۔ رابعہ! تم ماں نہیں ہو۔ دل میں ماں کا پیار کر لینا۔ میں اپنے بیٹے کو خدا کے اور تمہارے سپرد کرتی ہوں' ....

"اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ 'میں تمہیں اس کی بھی اجازت دیتی ہوں کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میرے بیٹے نے پیٹھ دکھائی ہے یا کہیں چھپ گیا تھا تو اپنے ہاتھوں اسے تلوار سے، تیر کمان سے، برچھی سے ختم کر دینا۔ یہی سمجھوں گی کہ خاوند غدّار تھا اور اُس کا نطفہ بھی غدار نکلا۔ میں باقی زندگی کسی پیر فقیر کی درگاہ پہ جھاڑو دیتے گذار دوں گی'۔"

"تمہیں میرے متعلق کچھ پتہ چلا ہے؟" ـــ قاسم بن عمر نے پوچھا۔

"پشاور سے آتے جب دریا پار کرتے لڑائی ہوئی تھی تو میں نے سپہ سالار ابو عبداللہ

سے پوچھا کہ قاسم کی کیا خبر ہے؟ سپہ سالار کو معلوم تھا کہ مجھے تمہاری ماں نے بھیجا ہے۔ اُس نے بتایا تھا کہ تم بہت بہادری سے لڑے ہو۔ میں نے سپہ سالار سے کہا تھا کہ قاسم کو پتہ نہ چلے کہ میں بھی ساتھ آئی ہوں۔ میں نے یہ اس لیے اُسے کہا تھا کہ تمہاری توجہ میری طرف نہ ہو جائے ....

" یہاں ہمیں میدانِ جنگ سے بہت دُور رکھا گیا تھا۔ تین دن لڑائی ہوتی رہی۔ ہمیں اس طرف نہ آنے دیا گیا۔ ہم سب اپنی فوج کے لیے دعائیں کرتی رہیں اور ہمیں خبریں ملتی رہیں اور ایک روز تو کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنی فوج کو شاید پسپا ہونا پڑے .... تمہارے متعلق مجھے بتانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ تمام عورتیں لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی پسپائی کا نام سننے کے لیے تیار نہیں تھی ....

" آج دوپہر کو ہمیں اطلاع ملی کہ دشمن کو شکست دے دی گئی ہے لیکن دونوں فوجوں کا جانی نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے کہ لاشوں کے اوپر لاشیں پڑی ہیں اور زخمیوں کو اٹھانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمیں شام سے ذرا پہلے یہاں لایا گیا لیکن ہمیں اُن خیموں میں بھیج دیا گیا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ طبیب زخموں کو صاف کرتے اور اُن پر دوائیاں لگاتے تھے اور عورتیں پٹیاں باندھتی اور زخمیوں کو کھلاتی پلاتی تھیں۔ اپنے زخمیوں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں۔ اِن میں بہت سے بیہوش تھے۔ کئی ہمارے ہاتھوں میں شہید ہو گئے۔ میں ہر ایک زخمی کو دیکھتی تھی۔ بعض کے چہرے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے دھو کر انہیں دیکھتی تھی۔ میں ہر اُس زخمی سے جو ہوش میں تھا، پوچھتی تھی کہ قاسم بن عمر کو تم نے کہیں دیکھا ہے؟ تین نے مجھے ایک ہی جیسا جواب دیا ــــ 'قاسم کا جَیش جس طرف گیا تھا وہاں سے شاید ہی کوئی زندہ واپس آیا ہو' ....

" سورج غروب ہونے کے بعد تمہارے جیش کا ایک زخمی سپاہی مل گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ قاسم بن عمر اگر ابھی تک نہیں آیا تو وہ مر چکا ہو گا۔ اُس نے بتایا کہ تم اُس کے سامنے زخمی ہوئے تھے۔ اُس نے یہ بھی کہا ــ 'میں اپنے جیش کا شاید ایک ہی آدمی زندہ بچا ہوں' ــ تمہارے متعلق اُس نے کہا 'قاسم بن عمر ہمارا کماندار تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ہمیں بھگا کر ہی دم لیں گے جب آخری حملے کا حکم ملا تو ہمارے

جیش کو دشمن پر اُس جگہ حملہ کرنے کو بھیجا گیا جہاں بھیرہ کے راجہ کا جھنڈا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ نے اُسے کہا تھا کہ قاسم! ہندیوں کا جھنڈا گرادو تو جو انعام مانگو گے دُوں گا۔ سپہ سالار نے ہمیں خدا حافظ کہا تھا'۔۔۔۔

" تمہارے جیش کے اس آدمی نے بتایا کہ قاسم پاگل ہو گیا تھا۔ اُسی نے ہمیں حکم دیا تھا کہ راجہ کا جھنڈا گرے گا یا ہم گریں گے۔ ہم ہندیوں کے دل میں اُتر گئے جھنڈا گرا لیا گیا مگر ہم سے کوئی ایک بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر نہ رہ سکا اور کوئی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہا۔ راجہ نکل گیا۔ ہندیوں پر یہ ضرب کاری لگی کہ اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اُس نے بتایا تھا کہ قاسم اگر یہاں نہیں لایا گیا تو وہ زندہ نہیں ہو گا۔۔۔۔

" میں اُسی وقت وہاں سے چل پڑی۔ ایک مشعل ہاتھ آگئی۔ اگر میرے ہاتھ میں مشعل نہ ہوتی تو میں ہر قدم پر لاشوں سے ٹھوکر کھا کر لاشوں پر گرتی۔ میں نے مرا ہوا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا مگر یہاں لاشیں اس طرح پڑی ہیں جیسے جنگل کاٹ کر لکڑیاں پھینکی ہوئی ہوں۔ میں نے شاید ہر ایک لاش کا چہرہ دیکھ ڈالا ہے۔ اُن کے زخم بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے کٹے ہوئے چہرے بھی دیکھے ہیں۔ میں نے ہندوؤں کی لاشیں بھی دیکھی ہیں اور مجھے روحانی سکون ملا ہے مگر اپنی فوج کی ہر لاش کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے کراہتے ہوئے زخمی بھی دیکھے ہیں۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ رات گزرتی جارہی تھی۔ زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جارہے تھے۔۔۔۔

" پھر میں نے تمہیں پکارنا شروع کر دیا۔ زخمیوں کو اٹھانے والوں نے مجھے کہا بھی کہ یہاں تمہیں قاسم نہیں ملے گا مگر میں وہاں تک چلی گئی جہاں لاشوں کا یہ سمندر ختم ہو جاتا ہے۔ میرے اندر تمہاری ماں کی روح اُتر آئی تھی۔ تم یہاں نہ ملتے تو میں رات یہیں گذار دیتی اور دن کی روشنی میں تمہیں تلاش کرتی۔ میں اس طرف آگئی۔ دو مشعلیں دیکھیں۔ میں اِن آدمیوں کے عقب میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ اِدھر آئی۔ مجھے ان سے بھی تمہارے متعلق پوچھنا تھا۔ قریب آئی تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا۔ تم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو مشعلوں کی روشنی میں مَیں نے تمہیں پہچان لیا۔ میں آگے بڑھی۔ معلوم نہیں تم مجھے کیوں نہیں دیکھ سکے۔۔۔۔

" اِن دونوں کے لباس دیکھے تو خیال آیا کہ یہ فوجی نہیں اور یہ مسلمان بھی نہیں لگتے۔ مجھے

کوئی شک نہ ہُوا۔ ان میں سے ایک اپنی تلوار نکال کر تم پر وار کرنے لگا تو میں نے دوڑ کر اپنی مشعل کا شعلہ اُس کے مُنہ کے ساتھ لگا دیا۔ قاسم! یہ خدا کا حکم تھا کہ تم زندہ رہو۔ تمہارا فرض ابھی پورا نہیں ہُوا۔"

ملتان میں داؤد بن نصر قرامطی کے محل سے ذرا ہٹ کر محمد بن قاسم کے دَور کی ایک حویلی ہُوا کرتی تھی جس کی ساخت قلعے کی طرح تھی۔ اس کے اندر بے شمار کمرے تھے۔ غلام گردشیں اور راہداریاں تھیں۔ میدان جیسا صحن بھی تھا۔ اندر کنواں بھی تھا۔ اس قلعہ نما حویلی کے متعلق مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ اندر جاؤ تو عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آہٹیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بچے بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ بچوں کے قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حویلی آباد ہو۔ اس کے متعلق بڑی ہی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگ اس حویلی کے قریب سے گزرتے بھی ڈرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے حویلی کی چھتوں کے اوپر مشعلوں کے شعلے ہوا میں تیرتے دیکھے ہیں۔ ایک روایت یہ مشہور تھی کہ محمد بن قاسم کے دَور کے بعد جب یہ خطّہ ہندوؤں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے حویلی میں رہنے والے مسلمان خاندان کو قتل کر دیا تھا۔ مقتولین میں بچے بھی تھے اور چار کنواری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں کو بے آبرو کر کے قتل کیا گیا۔ اب چار کنواریوں اور بچوں کی بدروحیں حویلی میں رہتی ہیں۔ کوئی اندر چلا جائے تو اُسے بچوں اور کنواریوں کے رونے کی اور پھر ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں۔ بچے بھاگتے دوڑتے ہیں اور بڑی بہنیں بین کرتی ہیں۔ کہتے تھے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود مقتولین کی ہڈیاں وہیں پڑی ہیں جہاں انہیں قتل کیا گیا تھا۔

جن دنوں سلطان محمود غزنوی نے بھیرہ فتح کیا اور وہ اپنی فوج کی کمی پوری کرنے میں مصروف تھا، ملتان کی آسیب زدہ حویلی میں راتوں کو میلے کا سماں ہوتا تھا۔ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر قرامطی تھا۔ اس فرقے کے متعلق تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے مگر اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب، بدکاری اور بے حیائی جائز ہے۔ جی میں جو آئے کرو، یہی اسلام ہے۔ ان کا پیرو مرشد داؤد بن نصر تھا جو ملتان کا حاکم یعنی والی بھی تھا۔ آسیب زدہ

حویلی میں میلے کا اہتمام اسی نے کرایا تھا۔ اس کی طرف سے شہر اور گردو نواح کے دیہات میں اعلان ہوا تھا ــــ "داؤد بن نصر حاکم ملتان، ولی اللہ قرامطی نے اُن بد روحوں اور جنّات کو حاضر کر لیا ہے جو اُجڑی ہوئی حویلی میں رہتے ہیں۔ یہ جنّات ہر رات ایک آدمی یا ایک جانور کا خون پیتے ہیں۔ داؤد بن نصر نے مخلوقِ خدا کے سکون اور امان کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال کر بد روحوں اور جنّات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ رات کو لوگ آ کر انہیں قیدی حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔"

لوگ شام کے بعد حویلی میں جاتے تھے۔ منڈیروں پر چراغاں ہوتی تھی۔ کمروں اور برآمدوں میں اس قدر خوشبو چھوڑی گئی تھی کہ جو اندر جاتا وہ باہر کی دنیا کو بھول جاتا تھا۔ کمروں کو صاف نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی چھتوں سے لٹکتے ہوئے جالے جو میلے کچیلے کپڑوں کی صورت اختیار کر گئے تھے، اسی طرح رہنے دیئے گئے تھے۔ فرشوں پر جو کائی اُگی ہوئی تھی، اسے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا۔ حویلی کی ہیبت جیسی تھی ویسی ہی رہنے دی گئی تھی ــــ اور شام کے بعد لوگ ان کمروں اور برآمدوں میں گھومتے پھرتے اور حویلی کے صحن میں جمع ہو جاتے تھے جہاں ایک چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اس پر خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک مسند رکھی تھی جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ روشنی میں جھلمل کرتے ستاروں کی طرح چمکتے اور ٹمٹماتے تھے۔ چبوترہ برآمدے کے بالکل ساتھ تھا۔

دو چار دنوں میں ہی شہر اور دیہات میں صرف ایک ہی موضوع رہ گیا جس پر لوگ باتیں کرتے تھے۔ یہ موضوع تھا "چار کنواریوں کی حویلی" ــــ لوگ حیرت زدہ ہو کر بھی اور اپنے اوپر وجد طاری کر کے بھی داؤد قرامطی کی کرامات کا ذکر کرتے تھے۔ ان سب کو چاروں کنواریاں جنہیں سینکڑوں سال پہلے قتل کیا گیا تھا، حویلی کے صحن میں رکھے ہوئے چبوترے پر داؤد بن نصر نے اس طرح دکھائی تھیں کہ وہ جیسے ہوا میں سے نمودار ہوئیں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ ان لوگوں نے کنواریوں کی آوازیں سنی تھیں۔ بچوں کے قہقہے سنے اور بچوں کو چبوترے پر آتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔

بعض مسجدوں میں بھی قرامطیوں کی کرامت کا ذکر ہونے لگا اور پھر ملتان کی ریاست میں یہ تغیر آیا کہ مسجدوں کے امام بھی داؤد قرامطی کا ذکر اپنے وعظ اور خطبے میں کرنے لگے ــــ

اور پھر یہ انقلاب آیا کہ پنڈتوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ داؤد بن نصر صرف حاکم یا والی نہیں، اُس کے ہاتھ میں تو خدا کی قوت ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ پنڈتوں نے یہ بھی کہا کہ یہی اسلام ہے جسے مولویوں نے بے معنی پابندیاں عائد کر کے اور نیکی اور بدی کو الگ کر کے بگاڑ دیا ہے۔

ملتان میں ایک اور حویلی تھی۔ یہ ویسی ہی تھی جیسی گلی محلوں میں حویلیاں اور مکان ہوتے ہیں۔ یہ آباد تھی۔ اس میں مسلمانوں کا ایک کنبہ رہتا تھا۔ ملتان میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی کیونکہ یہ مسلمان ریاست تھی۔ ہندو ریاستوں کے مسلمان بھی ملتان جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان غیر قرامطی تھے یعنی وہ صحیح معنوں میں مسلمان تھے، مگر ملتان کا سرکاری نظم و نسق اور تجارت قرامطیوں کے ہاتھ میں تھی۔ قرامطی اپنے باطل عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے رہتے تھے۔

یہ حویلی شہر کے اندر ایک گنجان آباد محلے میں تھی۔ یہ کوئی آسیب زدہ اور پُراسرار حویلی نہیں تھی مگر ایک رات اس کے ایک کمرے میں جو چند ایک آدمی بیٹھے تھے، وہ پُراسرار طریقے سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک تو وہ درویش تھا جس نے عاصم عمر کے محافظوں کو اپنے ہاں بلایا اور انہیں بتایا تھا کہ تمہارا سالار عاصم عمر جو داؤد بن نصر کے پاس سلطان محمود کا ایلچی بن کر آیا ہے، وہ قرامطیوں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا ہے۔ رابعہ کو اسی درویش نے داؤد بن نصر کے محل سے نکالا اور اسے عاصم عمر کے ایک محافظ کے ساتھ پشاور روانہ کیا تھا۔

"حکومت کی گدی پر قرامطی بیٹھا ہے"۔۔۔ درویش معمولی سی حویلی کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "ہم آزادی سے لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتے کہ قرامطی فرقے کے لوگوں کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسلام انسان کو گناہوں سے بچاتا اور نیکی کی طرف لاتا ہے۔ اسلام کا تعلق روح سے اور قرامطی عقیدہ جسم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے جسمانی عیاشی، شر اور شراب کی کھلی اجازت دیتا ہے اور یہ اجازت بھی کہ خوبصورت عورت کسی ایک آدمی کی بیوی تو بن سکتی ہے لیکن وہ اپنے خاوند پر اور خاوند اُس پر پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں عیش و عشرت کریں اور جسمانی لذت حاصل کریں کیونکہ خدا نے انسان کو عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے.... آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس فرقے کی تعداد بڑھتی

جا رہی ہے۔"

"انسانی فطرت لذّت پرستی کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے"۔۔۔ اس کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش عالم نے کہا۔ "نیکی میں جسمانی لذّت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اصل چیز روح ہے جو نظر نہیں آتی۔ روحانی لذّت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے دل میں بنی نوع انسان کی محبّت پیدا کر کے اور اللہ کی عبادت کر کے روحانی لذت حاصل کی ہو۔ انسان یہ نہیں سمجھتے کہ روح علیل ہو تو جسم بھی علیل ہو جاتا ہے اور جب جسم کی ناجائز ضروریات پوری کی جائیں تو روح مُرجھا جاتی ہے۔ پھر جسم وقت سے پہلے کمزور اور نحیف ہو کر قبر میں جا دفن ہوتا ہے اور رُوح خدا کے حضور چلی جاتی ہے۔"

"ہم سب جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔۔۔ ایک جواں سال آدمی نے کہا ۔۔۔ "آپ اس مسئلے کے متعلق بات کریں جو ہم پر آپڑا ہے۔ داؤد قرامطی نے جب سے ویران حویلی میں بدروحوں اور جنّات کو حاضر کرنا شروع کیا ہے، لوگ جوق در جوق اُس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ میں نے ایک مسجد میں امام کو وعظ کرتے سُنا ہے جس میں وہ کہہ رہا تھا کہ سچّا اسلام قرامطی ہے۔ جب ایک باطل عقیدہ مسجد پر قبضہ کر لیتا ہے تو لوگ اسے باطل نہیں سچّا سمجھنے لگتے ہیں۔"

"کیا آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ ہندوؤں کے پنڈت بھی قرامطی عقیدے کو سچّا اسلام کہہ رہے ہیں؟" ایک اور نے کہا۔

"مگر کوئی ہندو اپنا مذہب چھوڑ کر قرامطی نہیں ہوگا"۔۔۔ درویش نے کہا ۔۔۔ "لوگوں کو ہم کس طرح بتائیں کہ قرامطی فرقہ عیسائیوں کا پیدا کردہ فتنہ ہے اور ہندوستان میں ہندو راجے مہاراجے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ کفّار کا ایک مقصد یہ ہے کہ اسلام کا چہرہ گناہوں اور عیش و عشرت سے گندہ کر دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ملتان کی گدّی کو مسلمان گدّی کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا جائے اور ملتان کی فوج استعمال کی جائے ۔۔۔۔ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش ہو رہی ہے۔ بچار کنواریوں کی حویلی، نے ملتان کی آدھی مسلمان آبادی کو قرامطی بنا دیا ہے۔ یہ سوچیں کہ ہم اس کی روک تھام کیسے کریں۔ ہم میں سے کوئی بھی حویلی میں یہ دیکھنے کے لیے نہیں گیا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ ہر رات چار کنواریاں اور تین چار بچے حاضر کیے جاتے اور لوگوں کو دکھائے جاتے ہیں"۔ عالم نے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدروحیں ایک دھوئیں میں سے نمودار ہوتی ہیں اور کچھ باتیں کر کے وہیں کہیں غائب ہو جاتی ہیں..... ہم میں سے کسی کو وہاں جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم اس لیے نہیں جاتے کہ یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے"۔

"ہم آج اسی لیے یہاں جمع ہوئے ہیں"۔ جواں سال آدمی نے کہا۔ "اگر وہاں کوئی فریب کاری یا شعبدہ بازی ہو رہی ہے تو ہم اس حویلی کے قرامطیوں کے پردے چاک کر دیں گے"۔ اُس نے وہاں بیٹھے ہوئے اپنے جیسے جوانوں اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ہم اسلام کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں وہاں نقب لگانی پڑی تو لگائیں گے۔ آپ عالم اور درویش ہیں۔ آپ کتابوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں سیاہ وسفید سمجھا دیں۔ ہماری راہنمائی کریں۔ عمل ہم کریں گے جن کے جسموں میں جوانی کا خون اور سینے میں ایمان کی حرارت ہے"۔

"غور سے سنو ہمارے بیٹو!"۔ عالم نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے کہ قرامطی فرقہ کفار کی پیداوار ہے۔ اُن کے مقاصد تم جانتے ہو۔ جاننے اور سمجھنے والی ایک بات یہ ہے کہ مذہب انسان کی کمزوری بن جاتا ہے۔ ہم مسلمان مذہب پر مرتے ہیں۔ دشمن ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزائم کی تکمیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ داؤد حکومت کی گدی کا شیدائی ہے۔ وہ بھی مذہب کی آڑ اور سہارا لے کر اپنی گدی کو محفوظ اور مستحکم کر رہا ہے۔ ہماری قوم جب بھی دھوکہ کھاتی ہے مذہب کے نام پر کھاتی ہے۔ وہ خلفائے راشدین اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں جنہوں نے صحیح اسلام کی پابندی کی بھی اور کرائی بھی تھی۔ اب وہ خلیفے آگئے ہیں جو مذہب کو حربے اور جھانسے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور مذہب کے اَن پڑھ اور پسماندہ ذہن شیدائی جذبات میں آ کر اُن کے مرید بن جاتے ہیں۔ انہیں بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ مرید نہیں بنے، ایک ہوس کار اور اقتدار پرست حکمران کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے خلاف بات کرو تو وہ کفر کا فتویٰ لگاتے اور سزا دیتے ہیں.... یہ ثابت ہو چکا ہے کہ داؤد بن نصر مسلمان نہیں اور یہ بھی کہ وہ اسلام کی روح کو مار رہا ہے اور

یہ بھی کہ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں کا دوست ہے۔ جو اسلام کے بدترین اور بہت خطرناک دشمن ہیں۔ ہم لوگ اُس کے خلاف کھلے بندوں کچھ نہیں کہہ سکتے نہ کچھ کر سکتے ہیں۔"

"اس لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی خفیہ کاروائی کریں"۔ ایک نوجوان نے کہا۔

"آج رات ہم سب چار کنواریوں کی حویلی میں جائیں گے، اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔" درویش نے کہا۔

حویلی میں انہوں نے جو رونق دیکھی اس نے انہیں حیران کر دیا۔ لوگوں کی بیتابی اور بے قراری اور زیادہ حیران کن تھی۔ یہ وہی حویلی تھی جس کے قریب سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ لوگ کمروں اور برآمدوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ ہر جگہ دیئے جل رہے تھے۔ درویش کے ساتھ چھ سات جواں سال آدمی تھے جن میں دو سترہ اٹھارہ سال عمر کے نوجوان تھے۔ وہ بھی لوگوں کی طرح حویلی کے اندر گھومتے پھرتے اُس جگہ تک چلے گئے جہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے آگے بھی حویلی کے کمرے تھے اور ان سے آگے برآمدہ اور اس کے ساتھ چبوترہ تھا جس پر داؤد بن نصر بدروحوں اور جنّات کو حاضر کرتا اور لوگوں کو دکھاتا تھا۔

وہاں ایک آدمی کھڑا تھا جو لوگوں کو وہاں سے واپس بھیج رہا تھا۔ درویش اور اس کے ساتھی بھی وہاں تک گئے۔ اُس آدمی نے انہیں روکا۔ درویش اس سے پوچھنے لگا کہ آگے کیا ہے۔ اُس آدمی نے کچھ بتانے کی بجائے غصّے سے درویش کو وہاں سے واپس چلے جانے کو کہا۔ اس دوران اِس آدمی کی توجہ کسی اور کی طرف ہوگئی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ وہ آدمی دوسری طرف ہُوا تو درویش نظر بچا کر وہاں سے اس طرح آگے چلا گیا کہ وہیں سے راہداری مڑتی تھی جو اندھیری تھی۔ وہ آدمی واپس ہُوا تو اُس نے سب کو پیچھے ہٹا دیا۔ درویش کے ساتھی باہر آگئے اور اُس ہجوم میں شامل ہو گئے جو چبوترے کے سامنے جمع تھا۔

درویش اندھیری راہداری میں جاتے جاتے رُک گیا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کی درزوں سے روشنی باہر آرہی تھی۔ اُس نے ایک درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا۔ کمرہ سجا ہُوا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیے بھی تھے اور رنگ برنگے فانوس جل رہے

تھے۔ پانچ چھ لڑکیاں نیم برہنہ حالت میں اچھل کود رہی تھیں۔ دو آدمی تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ اُن کے آگے صراحی اور پیالے تھے جن میں شراب ہی ہو سکتی تھی۔ وہ لپک کر کسی لڑکی کو بازو سے پکڑتے اور گھسیٹ کر اپنے اوپر گرا لیتے تھے۔ لڑکی کو بالکل برہنہ کر کے چھیڑ چھاڑ کرتے اور قہقہے لگاتے تھے۔

درویش وہاں سے آگے چلا گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر روشنی تھی۔ درویش وہاں جا رکا۔ اندر کوئی نہیں تھا صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں فرش کے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ نیچے تہہ خانہ ہو سکتا تھا، یا یہ سُرنگ کا دہانہ تھا۔ وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ چار پانچ سیڑھیاں تھیں جو پرانے زمانے کی نہیں تھیں، نئی بنائی گئی تھیں۔ سُرنگ اتنی کھلی تھی کہ اس میں اچھے قد کا آدمی چل سکتا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ کہیں کہیں ایک دیا رکھا تھا۔

وہ آگے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ ایک آدمی خنجر ہاتھ میں لیے اُس کے پیچھے تین چار قدم دُور رہ گیا ہے۔ خنجر والا دبے پاؤں اُس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اُس نے درویش پر وار کرنے کے لیے خنجر والا ہاتھ دائیں کو زور سے کیا۔ وہ درویش کے پہلو میں خنجر گھونپنا چاہتا تھا مگر اُسے خیال نہ رہا کہ سُرنگ اتنی چوڑی نہیں کہ بازو پورا گھما سکتا۔ اُس کا ہاتھ سُرنگ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ آواز پیدا ہوئی تو درویش تیزی سے گھوما۔ خنجر والا خنجر پر گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ درویش نے بجلی کی پھرتی سے اپنی ناف میں سے خنجر نکالا اور وار کیا۔ اُدھر وہ بھی وار کر چکا تھا۔ دونوں کے خنجروں والے بازو ٹکرائے۔ درویش نے اُس آدمی کے پیٹ میں بایاں گھونسہ مارا۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ درویش نے نیچے سے وار کیا اور خنجر اس آدمی کے دل میں اُتار دیا۔ اس آدمی نے گرتے گرتے کسی کو پکارا۔

درویش وہاں سے دوڑ پڑا اور سُرنگ کے دہانے پر آ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ آیا۔ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل رہا تھا کہ تین چار آدمی تیز دوڑتے آئے۔ انہوں نے مرنے والے کی پکار سن لی تھی۔ درویش اُن سے ٹکرا گیا لیکن حاضر دماغ تھا۔ گھبراہٹ کے لہجے میں بولا ــــ "نیچے جاؤ۔ دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں" ــــ وہ سب سُرنگ کی طرف دوڑ پڑے اور درویش

باہر نکل گیا۔ اُس نے خون آلود خنجر ناف میں اڑس لیا تھا۔ باہر جا کر وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اور سر پر چادر ڈال لی۔

لوگوں کی نظریں چبوترے پر لگی ہوئی تھیں جہاں شاہانہ مسند پڑی تھی۔ روشنی کم تھی۔ درویش نے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر کے انہیں بتایا کہ اُس نے اندر جا کر کیا دیکھا اور وہ کیا کر آیا ہے۔ ساتھیوں نے اُسے کہا کہ وہ وہاں نہ رُکے، ورنہ پکڑا جائے گا۔ وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نقارے اور نفری بجنے لگے۔ یہ داؤد بن نصر کی آمد کا اعلان تھا۔ وہ حویلی کے کسی اور حصے میں چلا گیا۔ چبوترے پر ایک آدمی نے بلند آواز سے اعلان کیا ـــ "والیٔ ملتان، قرامطی پیغمبر ابوالفتح داؤد بن نصر بن شیخ حمید قرامطی جن کے قبضے میں ارواح اور جنات ہیں جو سچے اسلام کے علمبردار اور پیغمبر ہیں تشریف لاتے ہیں۔ سب پر لازم ہے کہ سب سر جھکا لیں۔"

نقارے اور نفری بجتے رہے اور ایک وجیہہ آدمی جس کے سر پر تاج تھا، چبوترے پر آیا۔ تمام لوگوں نے سر اس طرح جھکا لیے جیسے سجدے میں چلے گئے ہوں۔ چوبدار نے اعلان کیا کہ صدیوں سے یہ حویلی بد روحوں اور جنات کا مسکن بنی رہی تھی۔ یہ ہر روز ایک انسان یا ایک جانور کا خون پیتے تھے۔ سچے مذہب کے پیغمبر نے اپنی خاص کرامات اور خدائی طاقت سے ارواح اور جنات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ قرامطی پیغمبر کا حکم ہے کہ تم لوگوں نے اِن کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو یہ ارواح اور جنات تم سب کو پریشان کرتے رہیں گے۔

یہ اعلان ایسے جذباتی اور سنسنی خیز انداز سے کیا گیا کہ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کے بعد رباب کی قسم کے کسی ساز کی دھیمی دھیمی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ چند اور سازوں کا ترنم سنائی دینے لگا۔ یہ سب تاروں والے ساز تھے۔ داؤد بن نصر مسند سے اُٹھا اور پیٹھ لوگوں کی طرف کر لی۔ اُس نے بازو پھیلا کر اوپر کیے اور ترنم سے کچھ بڑبڑایا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ وہاں سے پہلے شعلہ اُٹھا، پھر دھواں پھیلنے لگا۔ داؤد نے بلند آواز سے کہا ـــ "خدائے ذوالجلال! جن و انس کے پیدا کرنے والے خدا! مجھے اپنی خدائی قوت عطا کر کہ تیری مخلوق کو اِن بدروحوں اور جنات سے جو آزاد ہیں، اسے محفوظ کر دوں" ـــ اُس نے دھماکے کی سی آواز میں کہا ـــ "آجاؤ میرے سامنے"

دُھواں چبوترے تک آگیا تھا۔ دھواں کم ہونے لگا اور اس میں سے چار نوجوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور گورے رنگ کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے لباس ریشمی اور چمکدار تھے۔ سازوں کا ترنّم اور زیادہ پُرسوز اور بلند ہو گیا۔ اُن کے ساتھ گھنگھرو بج رہے تھے۔ لڑکیوں نے داؤد بن نصر کے آگے سجدہ کیا۔ داؤد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دُھواں چھٹا تو لڑکیاں غائب تھیں اور وہاں بونے بونے سے پانچ چھ انسان کھڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک اُن کے جسم سیاہ تھے۔ اُن کے دانت لمبے اور سر پر نئے چاند کی شکل کے سینگ تھے۔ وہ بے ہنگم سا ناچ ناچنے لگے۔ اعلان ہُوا کہ یہ جنّات ہیں۔ انہی کے رنگ کا ایک قوی ہیکل آدمی آیا جس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اُس نے ان بونوں کو جن کے قد تین ساڑھے تین فٹ سے زیادہ نہیں تھے، پیٹنا شروع کر دیا۔ بونوں نے ایسا واویلا بپا کیا کہ لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی۔

داؤد بن نصر کے حکم سے کوڑا زنی روک دی گئی۔ جنات نے مل کر ایک آواز میں کہا "ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ اب ہم داؤد بن نصر کے مرید ہیں اور ہم جو غیب کے بھید جانتے ہیں، حلفیہ کہتے ہیں کہ داؤد بن نصر خدا کا پیغمبر اور ایلچی ہے۔"

دُھواں پھر پھیلا اور جب دُھواں چھٹا تو وہاں نہ داؤد بن نصر تھا نہ اُس کے جنّات۔ چبوترہ خالی تھا۔ اعلان ہُوا کہ قرامطی پیغمبر خدا کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اب نئے چاند کی رات اسی جگہ نمودار ہوں گے۔

"یہ سب اُس سُرنگ کا کمال ہے جس کے اندر میں ایک آدمی کو قتل کر آیا ہوں" ــــ درویش اپنے ساتھیوں سے اُسی حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا جس میں وہ دن کو بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس فتنے کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اُس نے کہا "جن لڑکیوں اور جنّات کے متعلق تم بتا رہے ہو کہ دھوئیں میں سے نمودار ہوئے تھے، اُن لڑکیوں کو میں نے ایک بند کمرے کے دروازے کی درز میں سے دیکھا تھا۔ سُرنگ تازہ کھدی ہوئی ہے۔ میں آخر تک نہ جا سکا۔ یہ باہر والے چبوترے کے

قریب جا کھلتی ہے۔ دھواں سُرنگ میں سے چھوڑا جاتا ہوگا اور لڑکیاں سرنگ میں چبوترے پر جاتی اور واپس آتی ہوں گی۔"

"ہمیں پہلے ہی شک تھا کہ بدروحوں اور جنّات کا کم از کم اس حویلی میں کوئی وجود نہیں"۔ عالم نے کہا۔ "اب آپ اتفاق سے دیکھ آئے ہیں کہ یہ سُرنگ اور دھوئیں کا کمال ہے اور سیدھے سادے لوگوں کو قرامطی فرقے میں شامل کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ لوگ اس باطل فرقے میں شامل ہو رہے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ اس فرقے کو ختم کس طرح کیا جائے اور لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ ڈھونگ ہے۔"

وہ اس سوچ بچار میں اُلجھے ہوئے تھے کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ حویلی کا مالک باہر گیا۔ باقی تمام آدمی وہاں سے بھاگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ خطرے کی صورت میں حویلی کے مالک کو دروازہ کھولتے ہی کھانسنا تھا۔ اُس کی کھانسی کی بجائے اُس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کمرے میں آیا تو اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جسے یہ سب جانتے تھے۔ وہ بھی انہی کے گروہ کا مخبر تھا۔

"اگر یہ خبر صحیح ہے جو میں سن کر آیا ہوں تو خدا نے قرامطی فرقے کے خاتمے کا انتظام کر دیا ہے"۔ اُس آدمی نے کہا۔ "بھیرہ سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ بھیرہ کی ریاست پر سلطان محمود نے قبضہ کر لیا ہے، اور بھیرہ کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین دن تک اتنی خونریز لڑائی ہوئی ہے کہ نہ غزنی کی فوج کا کچھ بچا ہے، نہ بھیرہ کی فوج کا۔ غزنی کے سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ بھیرہ میں سے وہاں کا کوئی باشندہ کہیں باہر نہیں جا سکتا۔ یہ معلوم نہیں کہ محمود ملتان پر بھی حملہ کرے گا یا نہیں۔ اس وقت اُس کی فوج بہت کم ہے۔ کمک آتے بہت وقت لگے گا۔"

سب گہری سوچ میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد عالم نے کہا۔ "ہم بادشاہی سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم یہی کر سکتے ہیں جو ہمارے درویش دوست نے کیا ہے کہ قرامطیوں کے اندرونی حلقے کے آدمیوں کو ایسے طریقے سے قتل کرتے رہیں کہ کوئی ہمارا سُراغ نہ پا سکے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو چار جانباز تیار کیے جائیں جو داؤد بن نصر کو قتل کر دیں۔ اگر یہ شخص قتل

ہو جائے تو یہ فرقہ مر سکتا ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم دو چار آدمی بھیرہ چلیں اور اگر سلطان محمود واقعی وہاں آ گیا ہے تو اُس کے حضور عرض کریں کہ اگر تم یہاں اسلام کے فروغ کے لیے آئے ہو تو پہلے ملتان آؤ اور اس فرقے کو ختم کرو جو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا ہوا ہے"۔

سب اس تجویز پر متفق ہو گئے اور انہوں نے طے کیا کہ عالم، درویش دو آدمیوں کو ساتھ لے کر صبح بھیرہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

جس وقت ان لوگوں کو وہ آدمی بھیرہ میں سُلطان محمود کی آمد اور لڑائی کی خبر سنا رہا تھا، اُس وقت داؤد بن نصر کو بھی یہی خبر سنائی جا رہی تھی۔ اُس وقت وہ اپنے ان آدمیوں کو جو چار کنواریوں کی حویلی میں کام اور شعبدہ بازی کرتے تھے، اپنے سامنے کھڑا کیے ہوئے تھا۔ وہ اس قدر غصّے میں تھا کہ شراب کا نشہ بھی اُتر گیا تھا۔ وہ ان سے ایک ہی سوال کا جواب مانگ رہا تھا۔ "اُس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

اُسے بتایا جا رہا تھا کہ ایک آدمی سرنگ والے کمرے میں سے دوڑتا باہر نکلا۔ وہ ان چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ٹکرایا جو سرنگ میں سے مقتول کی پکار پر دوڑے آتے تھے۔ اس آدمی نے انہیں کہا۔ "نیچے جاؤ، دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں"۔ اس آدمی کی داڑھی تھی۔ چہرہ کسی کو یاد نہیں تھا۔ داؤد بن نصر ان کی یہ بات مان نہیں رہا تھا۔ کہتا تھا کہ تم میں سے کسی نے کسی لڑکی کے چکر میں آ کر اپنے ساتھی کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سب آدمی اُس کے پاؤں میں لیٹ لیٹ جاتے تھے، اور داؤد گرج رہا تھا۔

اس دوران اُس کے سالار نے اندر آ کر کہا کہ بھیرہ سے بڑی بُری خبر آئی ہے۔ ایک آدمی کو اندر لایا گیا۔ وہ بھیرہ سے آیا تھا۔ اُس نے داؤد بن نصر کو وہی خبر سنائی جو حویلی میں ایک آدمی عالم، درویش اور ان کے ساتھیوں کو سنا رہا تھا۔

"ان سب کو قید میں ڈال دو"۔ داؤد بن نصر نے حکم دیا۔ "انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دو۔ پھر بھی کچھ نہ بتائیں تو انہیں شکنجے میں ڈال دو"۔

انہیں لے گئے تو داؤد بن نصر نے اپنے سالار سے کہا۔ "اگر محمود بھیرہ پر قابض ہو

گیا ہے۔ تو بہت بُرا ہُوا ہے۔ صبح فوج کے کچھ آدمی تاجروں کے بھیس میں بھیرہ روانہ کردو۔ وہ اچھی طرح دیکھ کر آئیں کہ محمود کے پاس کتنی فوج ہے۔ اگر اُس کے پاس ملتان پر حملہ کرنے کے لیے فوج کم ہے تو ہم مہاراجہ انندپال کو پیغام بھیجیں گے کہ بھیرہ پر حملہ کردے۔"

صبح کے وقت چھوٹے چھوٹے دو قافلے ملتان سے نکلے۔ دونوں کا رُخ بھیرہ کی طرف تھا۔ ایک قافلے میں عالم، درویش اور ان کے ساتھ تین آدمی تھے۔ دوسرے قافلے میں ملتان کی فوج کے چھ آدمی تاجروں کے بھیس میں تھے۔ ان کے کمانڈر نے دوسرے قافلے کو دیکھا تو بولا "وہ لوگ بھی اُدھر ہی جا رہے ہیں۔ چلو ان کے ساتھ مِل جاتے ہیں۔"

حق جب باطل کے نرغے میں آیا

داؤد بن نصر نے اپنے سالار کو حکم دے کر فوج کے جو چھ آدمی ملتان سے بھیرہ یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیے تھے کہ یہ اطلاع لائیں کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس کتنی فوج ہے، اور کیا وہ فوری طور پر ملتان پر حملہ کرنے کے قابل ہے یا نہیں، وہ چھ آدمی معمولی قسم کے فوجی نہیں تھے۔ وہ سب کمانداری کے عہدے کے ذہین اور تجربہ کار فوجی تھے۔ جاسوسی اور سراغرسانی کی مہارت بھی رکھتے تھے۔ بھیرہ سے مطلوبہ اطلاع وہی لا سکتے تھے۔ وہ تھے تو مسلمان لیکن عقیدے کے کٹر قرامطی تھے۔

انہوں نے تاجروں کے بھیس میں بھیرہ کو جاتے ہوئے ملتان سے کچھ دور عالم، درویش اور ان کے تین ساتھیوں کو اُسی سمت جاتے دیکھا جدھر وہ خود جا رہے تھے تو وہ اُن سے جا ملے تاکہ دونوں قافلوں کا ایک قافلہ بن جائے اور ہو سکتا ہے ان لوگوں سے کام کی کوئی خبر مل جائے۔ ملتان کے ان فوجیوں کے پاس چھ گھوڑے تھے جن پر وہ سوار تھے اور تین اونٹ تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ عالم اور درویش کے پاس گھوڑے تھے اور ان کے تین ساتھی تین اونٹوں پر سوار تھے۔ یہ کٹر اہلِ سنّت مسلمان تھے جو بھیرہ سلطان محمود غزنوی سے کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو مسلمان ریاست نہ سمجھے اور فوراً حملہ کرے کیونکہ یہاں قرامطی فرقہ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہا تھا۔

دونوں قافلوں میں سلام دعا ہوئی لیکن اپنے اپنے تعارف میں دونوں محتاط تھے۔ عالم نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق بتایا کہ ملتان کے دکاندار ہیں اور بھیرہ کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔ اس کے بدلے وہ وہاں سے سامان لائیں گے۔ قرامطیوں نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ لاہور کے تاجر ہیں، ملتان آئے تھے اور بھیرہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے

"اگر آپ لوگ ملتان کے رہنے والے ہیں تو آپ قرامطی مسلمان ہوں گے" — ایک قرامطی فوجی نے پوچھا۔

"نہیں" — درویش نے جواب دیا۔ "ہم پکے مسلمان ہیں۔ قرامطی فرقے کو ہم مسلمان نہیں سمجھتے .... آپ لوگ یقیناً سُنّی مسلمان ہوں گے۔ قرامطی صرف ملتان میں ہیں۔"

"ہمارا اس فرقے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں" — قرامطی فوجیوں کے کمانڈر نے جھوٹ بولا — "ہم آپ کی طرح سُنّی مسلمان ہیں .... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے؟" — ان فوجیوں کو سب کچھ معلوم تھا۔

"سنا تو یہی ہے" — عالم نے کہا۔ "اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم اور آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ محمد بن قاسم کے بعد کسی مسلمان سلطان نے ہندوستان کا رُخ کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں کس تیزی سے ہندو مذہب اسلام پر غالب آ رہا ہے۔"

"ہم بہت خوش ہیں" — قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "ہم تو چاہتے ہیں کہ لاہور پر بھی سلطان محمود قبضہ کر لے۔ اس ملک کو اسلامی ملک بننا چاہیئے۔"

"لاہور سے پہلے سُلطان محمود ملتان پر قبضہ کرے تو زیادہ بہتر ہوگا" — درویش نے کہا — "سب سے زیادہ خطرناک فتنہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر سے اٹھتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر عیسائیوں اور ہندوؤں کا آلۂ کار ہے، اور وہ اسلام کا نقاب چڑھا کر اسلام کی بیخ کنی کر رہا ہے۔"

"معلوم نہیں سلطان محمود کو داؤد بن نصر کی اصلیّت کا علم ہے یا نہیں" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "سلطان دھوکے میں نہ ہو۔"

"سُلطان کو حقیقت کا علم ہونا چاہیئے" — عالم نے کہا۔

"کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اتفاق سے بھیرہ جا رہے ہیں، ہم سلطان محمود کو بتائیں کہ وہ داؤد بن نصر کو اپنا دوست نہ سمجھے؟" — قرامطی کمانڈر نے کہا۔

"کیوں نہیں!" — درویش نے کہا۔ "ہمیں یہ فرض ادا کرنا چاہیئے۔"

وہ چلے جا رہے تھے۔ عالم اور درویش یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ وہ سلطان محمود کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ قرامطیوں کو ان پر ایسا شک بھی نہیں تھا۔ قرامطی زیادہ ذہین اور چالاک تھے۔ وہ بھی اپنی اصلیت بے نقاب نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے عالم اور درویش کے ساتھ ایسی باتیں شروع کر دی تھیں جو عالم اور اس کے ساتھیوں کا ایمان تھا وہ ان قرامطیوں کو فی الواقع تاجر اور اپنا ہم خیال سمجھ بیٹھے۔ وہ تمام راہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے انہوں نے دریائے راوی پار کر لیا۔ یہ مقام ملتان سے بہت دور تھا جہاں دریا کا پاٹ چوڑا اور پانی کم گہرا تھا۔ پار جا کر انہوں نے پڑاؤ کیا دونوں قافلوں کے پاس کھانے کے لیے جو کچھ تھا، وہ انہوں نے سامنے رکھ دیا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑے کی زین اتار رہا تھا اس کے ساتھ اس کا ایک ساتھی تھا۔ کمانڈر نے ساتھی سے کہا۔ "یہ لوگ لگتے تو دوکاندار ہی ہیں لیکن ان کی بعض باتوں سے مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ ہمارے خلاف کوئی فتنہ پیدا کرنے بھیرہ جا رہے ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے دلوں پر پوری طرح قبضہ کر لیں۔ یہ دو آدمی جو ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے ہیں علم و فضل والے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ ہمارے خلاف یعنی ملتان کی قرامطی ریاست کے خلاف کوئی کارروائی کرنے نہیں جا رہے تو بھی ہمیں چاہیے کہ انہیں اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ دو آدمی عالم ہیں ان کے ساتھ رہ کر بھیرہ کے لوگ ہمارا بھی احترام کریں گے۔"

"پھر آج رات ہم شراب نہیں نکالیں گے"۔ قرامطی کمانڈر کے ساتھی نے کہا۔ "تاکہ یہ لوگ ہمیں مومن قسم کے مسلمان سمجھتے رہیں۔ یہ بوڑھا عالم بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ اسے ہم اکسائیں گے کہ سلطان محمود سے ملے۔ ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ سلطان کی نیت اور ارادے کا علم ہو جائے گا۔"

کھانے کے دوران قرامطی کمانڈر نے اسی موضوع کو جاری رکھا جس پر وہ سارا دن تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے۔ عالم اور درویش تربیت یافتہ جاسوس نہیں تھے۔ یہ تو اُن کا جذبہ تھا جو انہیں اسلام کی پاسبانی کے لیے اکساتا رہتا تھا۔ وہ قرامطیوں کو اپنی طرح

اسلام اور سلطان محمودؒ کے بہی خواہ سمجھ بیٹھے۔ بات سے بات نکلی تو قرامطی فرقے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"ہم اس فرقے کو جھوٹا مانتے ہیں" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "لیکن ملتان میں رہ کر ہم جیسے بھی ملے وہ داؤد بن نصر کا پیروکار نکلا۔ وہاں چار کنواریوں کی حویلی کے چرچے سنے تو کل رات ہم بھی لوگوں کے ساتھ اُس حویلی میں چلے گئے۔ ہم نے جنّات کو دیکھا جنہیں داؤد نے حاضر کیا تھا، پھر ہم نے چار کنواریوں کو بھی دھوئیں میں سے نمودار ہوتے اور دھوئیں میں ہی غائب ہوتے دیکھا۔ ہم تو اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ داؤد کے ہاتھ میں کوئی طاقت ضرور ہے۔"

"جہاں سے یہ جنّات اور چار کنواریاں نکلی تھیں، وہاں سے آپ نے ایک لاش نکلتی نہیں دیکھی" — درویش نے قرامطیوں کی باتوں سے متاثر ہو کر راز اُگل دیا۔

"لاش؟" — قرامطی کمانڈر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس کی لاش؟"

"داؤد کے ایک خاص آدمی کی لاش" — درویش نے کہا۔ "دھوئیں میں سے نمودار ہونے والے جنّات اور چار کنواریوں کی اصل حقیقت کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔"

"خدا کے لیے ہمیں بتاؤ یہ راز کیا ہے؟" — قرامطی کمانڈر نے اشتیاق اور حیرت سے پوچھا۔ "ہم میں سے کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک باطل فرقے کے کسی آدمی میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ جنّات اور ارواح کو حاضر کر سکے۔ ہم تو داؤد کا یہ کمال دیکھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تھے۔ ہمارے دلوں کو شکوک سے پاک کرو۔ یہ آپ کی نیکی ہوگی۔"

درویش نے مِن وعَن سنا دیا کہ وہ کس طرح حویلی کے اندر اُس سرنگ میں داخل ہو گیا تھا جس میں سے چار لڑکیاں گزر کر دھوئیں میں جاتی اور لوگ انہیں دھوئیں میں سے نمودار ہوتا دیکھتے تھے۔ درویش نے بتایا کہ اُس نے یہ لڑکیاں ایک کمرے میں دیکھی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح سرنگ میں ایک آدمی کو دیکھا۔ اُس سے بچنے کے لیے درویش نے اُسے قتل کر دیا اور سرنگ سے نکل آیا۔

قرامطی کمانڈر اور اُس کے ساتھیوں نے درویش کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان قرامطیوں کو معلوم تھا کہ داؤد بن نصر اُس آدمی کے قاتل کو ڈھونڈ رہا ہے اور

اُس نے حویلی میں کام کرنے والے آدمیوں کو قید خانے کی اذیّتوں میں ڈال رکھا ہے۔
کچھ دیر اور باتیں کر کے وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ قرامطی کمانڈر اب درویش میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ سونے کی جگہیں دیکھنے لگے تو قرامطی کمانڈر نے درویش سے کہا کہ وہ اُس کے قریب سوئے۔ وہ عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ اُس نے سب سے الگ ایک جگہ دیکھی اور وہاں اپنا اور درویش کا بستر بچھا دیا۔ دن بھر کی مسافت کے تھکے ہوئے لیٹتے ہی سب سو گئے۔

آدھی رات کے قریب درویش کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے بولنا چاہا مگر بول نہ سکا۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہُوا تھا۔ دو آدمی اس کے پاؤں رسیّوں سے جکڑ رہے تھے۔ وہ اٹھا تو دو آدمیوں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اُسے اُٹھا کر ایک اونٹ پر ڈال دیا گیا اور اُسے اونٹ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اونٹ اٹھا۔ اس کی مہار ایک گھوڑے کے پیچھے باندھ دی گئی۔ گھوڑا چل پڑا۔ اس کے ساتھ ایک اور گھوڑا چلا۔
درویش کے ساتھی اُس سے دُور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اونٹ اور دو گھوڑ سوار واپس ملتان کو چلے جا رہے تھے۔ قرامطیوں کو اپنے خاص آدمی کا قاتل مل گیا تھا۔ انہیں داؤد سے انعام کی توقع تھی۔
صبح سب سے پہلے عالم کی آنکھ کھلی۔ اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ درویش کو جگانے گیا تو اُس کا بستر خالی تھا۔ قرامطی جاگ اٹھا۔ عالم کا خیال تھا کہ درویش وضو کرنے دریا پر چلا گیا ہوگا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑوں اور اونٹوں کی طرف گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد قرامطیوں نے واویلا بپا کر دیا کہ ان کا ایک اونٹ اور دو گھوڑے اور ان کے دو ساتھی غائب ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا قیمتی سامان بھی چوری ہو گیا ہے۔
"چلو ..... اِدھر اُدھر دیکھو ..... وہ دوُر نہیں گئے ہوں گے" گھوڑوں پر زینیں ڈالی جانے لگیں۔ اونٹوں پر سامان رکھا جانے لگا۔ تب عالم نے کہا۔ "ہمارا درویش ساتھی بھی غیر حاضر ہے۔"
"یہ اُسی کی کارستانی ہے"۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "اُس نے بڑی دلیری سے سُرنگ کے

اندر جاکر ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ میں اسے درویش سمجھتا رہا لیکن وہ پیشہ ور ڈاکو اور قاتل ہے۔ وہ ہمارے آدمیوں کو ورغلا کر لے گیا ہے۔"

"ان کا تعاقب بیکار ہے" — ایک قرامطی نے کہا "معلوم نہیں وہ کس طرف گئے ہیں اور یہاں سے کس وقت بھاگے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" — قرامطی کمانڈر نے کہا "ہمیں اس بیابان میں مارے مارے نہیں پھرنا چاہیئے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

عالم چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ تین آدمی بھی حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ درویش کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں درویش اور مردِ مومن تھا۔ اُس کی فطرت میں یہ تھا ہی نہیں کہ قیمتی مال کے لالچ میں آ جاتا۔ اُس کی جوانی اسلام کی پاسبانی اور زمیں دوز جہاد میں گزر گئی تھی۔ جب سے اُس نے سُنا تھا کہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں آ گیا ہے، اُس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ ہماری منزل خود چل کر ہمارے پاس آ گئی ہے۔

"مجھے تم لوگ بھی رہزن لگتے ہو" قرامطی کمانڈر نے عالم سے کہا۔

"اگر ہم رہزن ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہ ہوتا" عالم نے کہا — "اور یہاں تمہاری لاشیں پڑی ہوئی ہوتیں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے؟"

"آدمی تمہارے غائب ہوئے ہیں" — عالم نے کہا "اگر تم لوگ میری بات پر غور کرو تو تمہیں بتاتا ہوں.... تمہارے آدمی جو لاپتہ ہوئے ہیں، وہ رات سامان چُرا لے جانے کے لیے باندھ رہے ہوں گے۔ درویش نے انہیں دیکھ لیا ہو گا اور ان کے پاس جا کر پوچھا ہو گا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ تمہارے آدمیوں نے اس ڈر سے کہ پکڑے جائیں گے، درویش کو سر پر چوٹ لگا کر یا کسی طرح بے ہوش کیا اور اُسے اونٹ یا گھوڑے پر ڈال کر ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔ وہ ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہو گا اور اس کی لاش دریا میں بہا دی گئی ہو گی۔"

قرامطیوں کو تو معلوم تھا کہ اُن کے دو ساتھی اور درویش کہاں گئے ہیں۔ عالم اور اس

کے ساتھی پریشان ہو رہے تھے۔ قرامطی اب یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ درویش کے یہ چار ساتھی بھی اس کی زمین دوز سرگرمیوں میں شریک ہیں؟ قرامطی کمانڈر نے بہتر سمجھا کہ عالم اور اس کے ساتھیوں کو ناراض نہ کیا جائے ورنہ ان سے کوئی راز نہیں لیا جا سکے گا۔

☙

دونوں قافلے پہلے کی طرح بھیرہ کی سمت اکٹھے چلے جا رہے تھے۔ قرامطی آگے اور عالم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیچھے تھا۔

"مجھے یہ لوگ مشکوک نظر آتے ہیں"۔ عالم نے اپنے ساتھیوں سے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں صبح سے انہیں بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تاجر معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی باتوں کا انداز اور چال ڈھال بتاتی ہے کہ یہ اور کچھ ہو سکتے ہیں، تاجر نہیں ہو سکتے۔ درویش کو انہوں نے خود غائب کیا ہے۔ درویش نے جذبات میں آکر انہیں بتا دیا تھا کہ اس نے سرنگ میں داؤد بن نصر کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے درویش کو اغوا کر کے ملتان بھیج دیا ہے۔ مجھے تو یہ جاسوس لگتے ہیں جو بھیرہ یہ دیکھنے جا رہے ہوں گے کہ سلطان محمود کی فوج کتنی ہے اور اس کا ارادہ کیا ہے"۔

"ہمیں محتاط رہنا چاہیئے"۔ عالم کے ایک جوان سال ساتھی نے کہا۔ "ہمیں یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ درویش کے ساتھ ہمارا کوئی گہرا تعلق نہیں"۔

"اگر یہ واقعی جاسوس ہیں تو میں انہیں بھیرہ میں پکڑوا دوں گا"۔ عالم نے کہا۔ "ہمیں ان کے ساتھ دوستی اور زیادہ گہری کرنی چاہیئے"۔

"یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ یہ سب قرامطی فرقے اور ہمارے حاکم اور پیر و مرشد داؤد بن نصر کے دشمن ہیں"۔ قرامطی کمانڈر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کی در پردہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ انہیں ہم دوست بنائے رکھتے ہیں"۔

سورج جب سر پر آگیا تو قرامطی کمانڈر نے جانوروں کو پانی اور چارے کے لیے اور خود بھی کھانا کھانے اور ذرا آرام کے لیے قافلے کو روک لیا۔ کھانے کے دوران قرامطی کمانڈر نے عالم سے پوچھا کہ وہ درویش کو کب سے جانتے ہیں۔ عالم نے بتایا کہ وہ اسے اتنا ہی جانتے

ہیں کہ ملتان میں اس کی دکان ہے۔ اُسے پتہ چلا کہ ہم بھیرہ جا رہے ہیں تو وہ ساتھ چل پڑا۔
"کیا آپ لوگوں کو معلوم تھا کہ اُس نے حیل میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے؟"

"اگر پتہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ نہ لاتے۔" عالم نے جواب دیا "اگر اس نے یہ قتل مذہبی جنون کے تحت کیا تھا تو بھی میں اسے پسند نہیں کرتا۔ قتل بہر حال قتل ہے۔ مذہب قتل جیسا جرم بخشا نہیں کرتا۔"

قرامطی کمانڈر نے بہت کوشش کی کہ عالم کے سینے سے کوئی راز نکال سکے۔ اُسے کوئی راز نہ ملا۔ قرامطی کمانڈر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ قرامطی نہیں پکا مسلمان ہے۔

راجوں، مہاراجوں اور سلطانوں کی دُنیا سے دُور جنگل بیابان میں یہ دو قافلے ایک قافلے کی صورت میں چلے جا رہے تھے۔ وہ حق و باطل کے میدانِ جنگ سے بہت دُور تھے لیکن اس جنگ سے لاتعلق نہیں تھے۔ دونوں قافلے بظاہر اکھٹے جا رہے تھے لیکن اِن کے درمیان در پردہ حق و باطل کی جنگ جاری تھی۔ دونوں اپنے اپنے عقیدے اور نظریے کے پکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کی سوچ رہے تھے۔ عالم کو یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کے قافلے والے تاجر نہیں اور یہ قرامطی ہیں۔ عالم کے تین ساتھی جواں سال آدمی تھے اور قرامطی بھی چار تھے۔ عالم سوچ رہا تھا کہ یہ تربیت یافتہ فوجی ہوئے تو ان سے لڑائی ہو جانے کی صورت میں اُس کے تین ساتھی مقابلہ کر سکیں گے یا نہیں عالم خود بوڑھا تھا۔

عالم کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اُس کے سینے میں اللہ کا ایمان تھا، کسی انسان کا ڈر اور خوف نہیں تھا۔ وہ اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ بھیرہ پہنچ جائیں تو انہیں پکڑوا دے گا۔ درویش کے متعلق وہ بہت پریشان تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ درویش کو اگر واقعی ملتان بھیج دیا گیا ہے تو اُسے بڑی اذیتیں دی جائیں گی۔ درویش کب تک برداشت کرے گا۔ وہ سب کی نشاندہی کر دیگا۔ ان سب کے بیوی بچے اور عزیز و اقارب ملتان میں تھے۔ نشاندہی ہو جانے کی صورت میں وہ جانتے

تھے کہ ان کے بچوں کو بھی غیر انسانی اذیتیں دی جائیں گی۔

اسلام کی پاسبانی ان سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی تھی۔ عالم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "عزیز بیٹو! ہم جس راستے پر جا رہے ہیں، اس میں ایسے خطرے ہیں جن سے گھبرا کر تم بھاگ جاؤ گے، لیکن یاد رکھو کہ جس قوم اور جس مذہب میں بھاگ جانے والے موجود ہوں وہ قوم اپنے مذہب سمیت تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں اپنی بہنیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی قربان کرنے پڑیں۔ اگر تم نے یہ قربانی خندہ پیشانی سے دے دی تو خدا کی خوشنودی حاصل کرو گے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر تمہارے دلوں میں کوئی شک ہے تو یہیں سے واپس چلے جاؤ۔"

ان میں سے کوئی بھی واپس نہ گیا۔ تینوں نے یقین دلایا کہ وہ اُس کے ساتھ رہیں گے۔ عالم کے پاس علم تھا۔ اس کی نظر قوموں کی تاریخ پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قوموں کے عروج اور بادشاہوں کی فتح کے پیچھے چند ایک گمنام لوگوں کی قربانیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ تاریخ ان لوگوں کو نہیں جانتی کیونکہ تاریخ میدانِ جنگ میں نہیں جاتی اور تاریخ زمین دوز محاذ پر بھی نہیں جایا کرتی۔ ان مجاہدین کو خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ عالم بھی خدا کے سامنے جوابدہ تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ قرامطی کمانڈر رات کے پڑاؤ کے لیے اچھی سی جگہ دیکھ رہا تھا۔ یہ علاقہ سرسبز تھا۔ چٹانیں تھیں۔ درختوں کا جنگل اور سبزہ تھا۔ ایک جگہ ایک خاندان بیٹھا نظر آیا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا اور دو جوان لڑکیاں تھیں جو بہت خوبصورت تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان کے لباس بتاتے تھے کہ یہ ہندو ہیں۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں۔ وہاں دو مشعلیں جل رہی تھیں۔

قرامطی کمانڈر نے عالم سے کہا۔ "آپ آگے چلیں، کوئی اچھی جگہ نظر آئی تو ہمیں بلا لینا۔ میں بھی کوئی جگہ دیکھتا ہوں۔"

عالم اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے نکل گیا۔ اُسے ایک بڑی سرسبز جگہ نظر آئی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارہ بھی تھا اور پانی بھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہیں

ڈیرے ڈال دیں۔ قرامطی کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ عالم نے ان کی پروانہ کی۔ اسے خیال تھا کہ وہ خود ہی آجائیں گے۔

رات گہری ہوگئی۔ قرامطی نہ آئے۔ عالم نے ایک مشعل جلا کر اس کا ڈنڈہ زمین میں گاڑ دیا۔ اُسے تھوڑی ہی دور شور شرابہ سنائی دیا اور دوڑتے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ عالم اور اس کے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں۔ مشعل کی روشنی میں عالم کو وہ بوڑھا اور ایک جوان آدمی اپنی طرف آتے نظر آئے جنہیں انہوں نے تھوڑی دور پیچھے ایک جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت اور دو خوبصورت لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اب اِن کے ساتھ نہیں تھیں۔

عالم اور اس کے ساتھی تلواریں ہاتھوں میں لیے ان کی طرف بڑھے تو وہ آدمی دوسری سمت دوڑ پڑے۔ عالم نے انہیں للکار کر کہا۔ "مت بھاگو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ نہیں رکو گے تو گھوڑوں سے تمہارا تعاقب کریں گے اور تمہیں جان سے مار ڈالیں گے"۔

وہ ڈر کے مارے رُک گئے۔ جب عالم اور اس کے ساتھی ان کے قریب گئے تو انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور التجا کی کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ عالم نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ وہ ان کی مدد کرے گا، وہ بتائیں کہ وہ کیوں بھاگے جا رہے ہیں۔

"تمہارے ساتھیوں نے ہم سے دونوں لڑکیاں چھین لی ہیں"۔ بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے پاس سونے کی ڈلیاں اور بہت سی رقم تھی، انہوں نے وہ بھی چھین لی ہے"۔

"لڑکیاں تمہاری کیا لگتی ہیں؟"

"میری بیٹیاں ہیں"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ "اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ان کی ماں بھی ساتھ ہے۔ ہم بھیرہ سے بھاگ کر آرہے ہیں۔ شہر پر غزنی کے مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہم ہندو ہیں"۔

"کیا غزنی کے مسلمانوں نے تمہارے گھر لوٹے ہیں؟ قتلِ عام کیا ہے؟ تمہاری عورتوں کو بے آبرو کر رہے ہیں؟"

"نہیں"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ "ان کے سلطان نے حکم دیا ہے کہ ہندوؤں

کے گھروں کی اوران کی عزت کی حفاظت کرو، لیکن آپ نے ہمارے قریب سے گزرتے میری بیٹیاں دیکھی ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ انہیں مسلمان فوجیوں سے بچانے کے لیے ہم بصرہ سے بھاگ آئے ہیں۔ اب پتہ چلا ہے کہ بصرہ میں رہتے تو ہماری عزت محفوظ رہتی۔ آپ کے ساتھیوں سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ بزرگ انسان ہیں۔ وہ چار آدمی ہیں یہ تین آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ میری بیٹیوں پر رحم کریں۔ وہ مر جائیں گی۔ ہمارے پاس جو سونا اور رقم ہے وہ لے لیں ہمیں جانے دیں۔ میری بیٹیوں کو چھوڑ دیں"۔

عالم کو یقین ہو گیا کہ اُس کے ساتھ آنے والے چھ سوار ملتان کے فوجی ہیں اور وہ قرامطی ہیں۔ ان میں سے دو تو درویش کو ساتھ لے کر جا چکے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر قرامطیوں کی نیت بدل گئی اور ان کے سامنے ان کے فرقے کا یہ اصول آگیا کہ انسان عیش و عشرت کے لیے پیدا ہوا ہے اور گناہ کا کوئی وجود نہیں۔

"کیا تم دونوں خالی ہاتھ ہو؟" — عالم نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہماری تلواریں سامان کے ساتھ پڑی تھیں"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ "تمہارے ساتھی ہم پر ٹوٹ پڑے ہمیں تلواریں اٹھانے کا موقعہ نہ ملا۔ ہم ان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا کہ ہمیں قتل نہ کرو۔ انہوں نے ہمیں بہت مارا پیٹا اور بھگا دیا۔ ہم واپس بصرہ کو بھاگے جا رہے تھے"۔

عالم نے اپنے تین جواں سال ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں ان ہندوؤں پر ثابت کرنا ہے کہ بیٹی اپنے مذہب کی ہو یا کسی کے مذہب کی، اس کی عزت بچانا مسلمان کا فرض ہے.... اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ ہمارے سامنے دو لڑکیوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے ہمیں عملاً ثابت کرنا ہے کہ اس صورتِ حال میں اسلام کا حکم کیا ہے.... میں تم تینوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم ان لڑکیوں کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

عالم چل پڑا۔ اُس نے اپنے تین ساتھیوں سے کہا کہ جذبات میں آکر جلد بازی

نہ کریں۔ پہلے دیکھیں گے کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تربیت یافتہ فوجی معلوم ہوتے ہیں ..... وہ دبے پاؤں بڑھتے گئے۔ وہ جگہ کچھ دور تھی۔ آگے چٹان آگئی یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ چٹان سے گھوم کر عالم نے اوٹ سے دیکھا۔ دو مشعلیں جل رہی تھیں قرامطیوں نے ہلٹر بپا کر رکھا تھا۔ وہ گھاس پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پیالے تھے۔ دونوں لڑکیاں بالکل برہنہ تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں صراحیاں تھیں۔ یہ صراحیاں اور شراب قرامطی اپنے ساتھ لائے تھے۔

لڑکیاں ان کے پیالوں میں شراب ڈالتی تھیں۔ کبھی ایک قرامطی ایک لڑکی کو اپنے اوپر گرا لیتا کبھی دوسرا۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ انتہائی بیہودہ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ عالم اور اس کے ساتھی اوٹ سے دیکھتے رہے۔ قرامطی ہنسی مذاق اور چھیڑ خانی میں زیادہ پی گئے تھے۔ قرامطی کمانڈر اٹھا اور اس نے کپڑے اتار دیئے وہ اتنی زیادہ پیے ہوئے تھا کہ پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک لڑکی کو بازوؤں میں لیا اور اسے گھاس پر گرا دیا۔

"ٹوٹ پڑو" — عالم نے کہا۔

عالم کے ساتھی اتنی تیزی سے جھپٹے کہ قرامطیوں کو سنبھلنے کا موقعہ نہ ملا۔ شراب نے بھی انہیں مقابلے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ قرامطی کمانڈر کی گردن تو عالم کی تلوار کے ایک ہی وار سے الگ جا پڑی جس لڑکی کو اس قرامطی نے نیچے گرا رکھا تھا، وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ قرامطی کے خون نے اسے نہلا دیا۔ باقی تین کو بھی ختم کر دیا گیا۔

بے ہوش لڑکی کے اوپر پانی پھینکا گیا تب ہوش میں آئی۔ دونوں سے کہا گیا کہ وہ کپڑے پہن لیں خود فرد گی کا یہ عالم تھا کہ ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ چار وحشیوں سے بچ کر وہ دوسرے چار وحشیوں کے قبضے میں آگئی ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انہیں پتہ چل گیا کہ یہ وحشی نہیں ہیں۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا کہ وہ ان مرے ہوئے آدمیوں کے سامان پر قبضہ کر لیں اور اسے اپنا سامان سمجھیں۔ ان کے گھوڑے اور اونٹ بھی لے لیں اور ان سے اپنا سونا اور رقم بھی برآمد کر لیں۔

ہندوؤں نے لاشوں کی تلاشی لی تو انہیں اپنا سونا اور رقم مل گئی۔ عالم نے ان سے پوچھا کہ اتنی دولت پاس ہوتے ہوئے وہ پیدل کیوں آئے ہیں۔ کیا وہ گھوڑے یا اونٹ یا خچریں خرید نہیں سکتے تھے؟ ہندوؤں نے بتایا کہ بھیرہ سے کسی کو باہر نہیں آنے دے رہے تھے۔ وہ سارا کنبہ ایک ایک فرد چھپ چھپا کر باہر نکلے اور شہر سے دُور آ کر اکٹھے ہُوئے تھے۔

"تم ہماری حفاظت میں ہو"۔ عالم نے انہیں کہا۔ "کہو تو ہم تمہیں واپس بھیرہ لے چلتے ہیں۔ کہو تو ملتان تک تمہیں اپنی حفاظت میں پہنچا دیتے ہیں"۔

بوڑھے ہندو نے کچھ سونا اور کچھ رقم عالم کے آگے رکھ کر کہا۔ "ہم خود ملتان چلے جائیں گے۔ ہمیں گھوڑے اور اونٹ مل گئے ہیں۔ آپ یہ نذرانہ قبول کریں"۔

"کیا تم نے ہمیں کرائے کے قاتل سمجھ لیا ہے؟"۔ عالم نے غصّے سے گرج کر کہا۔ "اٹھالو۔ اگر ہم اس کے لالچ میں ہوتے تو تم سے تلوار کی نوک پر یہ دولت لے سکتے تھے ..... آج رات آرام کرو ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ اس لڑکی کو چشمے پر لے جاؤ۔ اس کا جسم خون میں ڈوبا ہُوا ہے"۔

ہندوؤں کو ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے بھائی کے ساتھ چشمے پر چلی گئیں۔ عالم نے بوڑھے سے پوچھا کہ بھیرہ کے حالات کیسے ہیں۔ بوڑھے نے بتایا کہ بھیرہ کے باہر بڑی خونریز جنگ ہوئی ہے۔ راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے اور دونوں فوجوں کا نقصان اتنا زیادہ ہُوا ہے کہ آدھی آدھی نفری ماری گئی ہے۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کی فوج اتنی تھوڑی رہ گئی ہے کہ اگر کسی طرف سے بھیرہ پر حملہ ہو جائے تو سلطان محمود بھیرہ کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے گا۔

"حملہ کون کر سکتا ہے؟"۔ عالم نے پوچھا۔

"راجہ انند پال"۔ بوڑھے نے کہا۔ "لیکن سنا ہے کہ انند پال لاہور میں نہیں ہے۔ اُس نے پشاور کے قریب کہیں سلطان محمود کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن مسلمانوں نے دریا پار کر کے انند پال کو ایسا گھیرے میں لیا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکل

بھاگا۔ ہم نے سنا ہے کہ لاہور میں راجہ انند پال کا نوجوان بیٹا سکھ پال ہے۔ وہ شاید بھیرہ پر حملہ کر دے"۔ بوڑھے نے ذرا سا خاموش رہ کر عالم سے پوچھا ”آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”ملتان سے..... ہم ملتان کے رہنے والے ہیں“۔

”پھر آپ قرامطی مسلمان ہوں گے“۔ بوڑھے ہندو نے کہا ”آپ ہمارے دوست ہیں“۔

”ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں“۔ عالم نے کہا ”ہم قرامطی نہیں۔ تم بات کرو اور ہم سے ڈرو مت“۔

عالم نے اس ہندو کو غور سے دیکھا پھر اس عورت کو دیکھا جسے وہ اپنی بیوی کہہ رہا تھا۔ اتنے میں دونوں لڑکیاں نہا کر آگئیں۔ عالم نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔ ان کا حسن دھل کر نکھر آیا تھا۔ عالم نے اس جوان آدمی کو دیکھا جو اپنے آپ کو ان لڑکیوں کا بھائی کہتا تھا۔ ان سب میں ذرہ بھر مشابہت نہیں تھی۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں اور ان کی ماں ان کی خادمہ۔ بوڑھا اور جوان آدمی گہرے سانولے رنگ کے تھے اور لڑکیوں کے رنگ گورے تھے۔

”یہ جو چار آدمی مرے پڑے ہیں، انہوں نے تم دونوں کو بھاگ جانے کی اجازت دے دی تھی“۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا ”ہم تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ ان عورتوں کے سامنے تمہیں قتل کریں گے، پھر ان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں گے اور اس عورت کو اس جنگل بیابان میں کسی درندے کا شکار ہونے کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ ہمیں دھوکہ دینے کی نہ سوچو۔ سچ بتاؤ تمہارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان کی ماں نہیں اور تم ان کے باپ نہیں۔ ہندوؤں والی ذہنیت کو الگ رکھ دو۔ ہم نے تم پر جو احسان کیا ہے اسے مت بھولو۔ ہم نے تمہیں مدد اور منزل تک حفاظت کی پیش کش کی ہے اور تم جھوٹ بول رہے ہو“۔

دونوں ہندو خاموشی سے سنتے رہے۔

"کیا تم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ تم قرامطیوں کو دوست سمجھ کر ملتان جا رہے ہو؟" عالم نے پوچھا۔

"بتایا تھا"۔ بوڑھے ہندو کے منہ سے نکل گیا۔ "اسی لیے انہوں نے ہماری جان بخشی کر دی تھی۔ کہتے تھے تم ملتان پہنچو۔"

"اگر تم صحیح بات بتا دو گے تو بھی ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے"۔ عالم نے کہا۔ "ہمارا بادشاہوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہم تاجر ہیں۔"

"آپ لوگوں نے ہم پر واقعی احسان کیا ہے"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "آپ ہمیں قتل کر سکتے تھے مگر آپ نے ہماری مدد کی۔ آپ نے ہمارا انعام بھی قبول نہیں کیا۔ اگر آپ ہمارے منہ سے سچ سن کر خوش ہو سکتے ہیں تو مجھے خوشی ہو گی کہ میں نے آپ کو احسان کے بدلے میں کچھ دیا۔۔۔ میں ان میں سے کسی کا بھی باپ نہیں۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان لڑکیوں کی نوکرانی ہے جو ان کے ساتھ ملتان جا رہی ہے۔"

"اور تم کسی خاص مقصد کے لیے ملتان جا رہے ہو؟" عالم نے کہا۔ "ہم مکمل اور سچی بات سننا چاہتے ہیں۔"

"ہاں!" ہندو نے کہا۔ "ہم ملتان کے والی داؤد بن نصر قرامطی کے پاس یہ پیغام لے کر جا رہے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاس فوج کی کمی ہے اور داؤد بن نصر فوراً آکر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے۔ محمود بھیرہ کو نہیں بچا سکے گا۔ اس کے پاس راجہ بجی رائے کی فوج کے کم و بیش تین ہزار جنگی قیدی ہیں جنہیں وہ غلاموں کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ ان قیدیوں سے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ اگر داؤد بن نصر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے تو یہ ہندو جنگی قیدی شہر کے اندر باغی ہو کر مسلمان فوج کے لیے مصیبت بن جائیں گے۔"

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"جس طرح تمہاری فوج کے سالار ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری فوج کے سالار ہوتے ہیں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "راجہ بجی رائے کی زیادہ تر فوج ماری گئی ہے، باقی مسلمانوں کی قید میں ہے اور کچھ ادھر ادھر بھاگ گئی ہے۔ چند ایک اعلیٰ عہدیدار زندہ بچ گئے ہیں

ان میں سے کچھ لاہور چلے گئے ہیں اور دو تین بھیرہ کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں میں بھی رائے کے راج دربار کا عہدیدار ہوں۔ میں بھی شکست کے بعد مندر میں جا چھپا تھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کسی ہندو کو پریشان نہ کیا جائے اور کسی ہندو گھرانے میں کوئی مسلمان داخل نہ ہو۔ اس حکم کی وجہ سے ہم محفوظ ہو گئے۔۔۔۔

"مندر میں ہماری فوج کے جو اعلیٰ حکام چھپے ہوئے تھے، انہوں نے سر جوڑے اور فیصلہ کیا کہ داؤد قرامطی تک اطلاع بھجوائی جائے کہ وہ بھیرہ پر فوراً حملہ کر دے۔ ایسا ہی پیغام لاہور راجہ انند پال کے لیے بھی بھیجا گیا ہے لیکن اُدھر سے حملے کی توقع نہیں کیونکہ راجہ انند پال وہاں نہیں۔ داؤد بن نصر کو سب راجے جانتے ہیں کہ عیاش آدمی ہے۔ اِس کے ساتھ ہندو راجے حسین لڑکیوں اور زر و جواہرات کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اِس کے مطابق فوجی حاکموں نے ان دو لڑکیوں کا انتظام کیا۔ یہ دونوں راج محل کی لڑکیاں ہیں۔ یہ بھی ایک ہندو گھر میں چھپی ہوئی تھیں۔ انہیں بلا کر سمجھایا گیا کہ انہیں داؤد کے ہاں تحفے کے طور پر بھیجا جا رہا ہے اور داؤد کو بھیرہ پر حملے کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان کے علاوہ یہ سونا اور رقم بھی داؤد کے لیے جا رہی ہے۔ ہمارے پاس اور بھی سونا ہے جو ان مرے ہوئے آدمیوں کو نظر نہیں آیا۔۔۔۔ میں آپ سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں آپ کو جو سونا اور رقم پیش کر رہا ہوں، یہ آپ لے لیں۔"

"اور میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرے سامنے سونے اور رقم کا بار بار نام نہ لو"۔۔۔ عالم نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کو ان چیزوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں"۔۔۔ عالم نے اُس کے سینے سے پوری بات نکلوانے کے لیے کہا۔ "اور جو بات تم ہمیں سنا رہے ہو، ہمیں اس کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ دلچسپی صرف یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو اپنی پناہ میں لیا ہے تو تمہیں حفاظت سے ملتان پہنچا دیں۔۔۔۔ تمہارے فوجی سپاہیوں نے راجہ کے مارے جانے کے بعد اور بھیرہ پر سلطان محمود کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی شکست تسلیم نہیں کی۔"

"پنڈتوں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا رکھا ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاؤں یہاں جم گئے تو ہندو مت ختم ہو جائے گا اور اس ملک میں ایک بار پھر اُسی طرح

اسلام پھیل جائیگا جس طرح محمد بن قاسم کے دور میں پھیلا تھا۔ پنڈت ہر ہندو کے ذہن میں یہی ڈالتے ہیں کہ مسلمان کا قتل صرف جائز نہیں بلکہ ہر ہندو کا فرض ہے اور اسلام کا خاتمہ مذہبی فریضہ ہے ..... آپ مسلمان ہیں۔ آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگی ہوں گی لیکن آپ نے مجھے سچی باتیں اگلنے کو کہا ہے۔ اب ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں قتل کر دیں، چاہیں تو جانے کی اجازت دے دیں۔"

یہ دونوں ہندو فوجی نہیں تھے۔ مذہبی جنون میں لڑکیوں اور زر و دولت کے ساتھ بھیرہ سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ راستے میں کیسے کیسے خطرے ہیں۔ اگر تربیت یافتہ فوجی ہوتے تو اتنا نہ ڈرتے کہ اپنا قیمتی راز دے دیتے۔ عالم نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ بے خوف ہو کر سو جائیں۔ عالم کے آدمی پہرہ دیتے رہیں گے۔

ایک آدمی کو پہرے پر کھڑا کر کے عالم اپنے دو ساتھیوں کو پرے لے گیا اور وہ اس مسئلے پر بحث مباحثہ کرنے لگے کہ ان ہندوؤں کو ملتان جانے دیا جائے یا انہیں واپس بھیرہ لے چلیں۔ اس پر بھی انہوں نے غور کیا کہ انہیں ملتان جانے دیں اور عالم اور اس کے ساتھی فوراً بھیرہ پہنچیں اور سلطان محمود کو خبردار کر دیں اور یہ بھی اسے بتائیں کہ مندروں اور گھروں کی تلاشی لے کر بھی راستے کے چھپے ہوئے فوجیوں کو پکڑ لیا جائے۔

گذشتہ رات دو قرامطی درویش کو باندھ کر ملتان لے گئے تھے۔ وہ اس قدر تیز گئے تھے کہ دن کے پچھلے پہر ملتان پہنچ گئے اور انہوں نے درویش کو داؤد کے سامنے لے جا کر بتایا کہ یہ ہے وہ قاتل جس نے سرنگ میں ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس نے یہ راز کس طرح منہ سے نکالا تھا اور اسے کس طرح یہاں تک لائے ہیں۔ داؤد بن نصر کو جب یہ بتایا گیا کہ اس کے ساتھ بوڑھا عالم اور تین جوان آدمی بھی تھے اور یہ سب بھیرہ جا رہے تھے تو داؤد بن نصر نے غصے سے گرج کر کہا۔ "تو انہیں بھی کیوں نہیں لائے؟"

"کماندار کا یہی حکم تھا"۔ ایک نے کہا۔ "اس کے ساتھی ہمارے آدمیوں کے ساتھ بھیرہ جا رہے ہیں۔"

داؤد بن نصر نے حکم دیا کہ دس بارہ سوار فوراً ان کے ساتھ دوڑا دو اور اس آدمی کے ساتھیوں کو پکڑ لاؤ..... حکم کی تعمیل بلا تاخیر ہوئی۔ بارہ تیز رفتار سوار ان دو آدمیوں کے ساتھ

موڑا دیئے گئے جو درویش کو لائے تھے۔ یہ فوج کے گھوڑے تھے۔ وہ حیران کن رفتار سے شہر سے نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رات آدھی گذر چکی تھی۔ عالم اور اُس کے دو ساتھی سو گئے تھے۔ تیسرا آدمی ہندوؤں پر پہرہ دے رہا تھا۔ اُسے گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے۔ آواز بتاتی تھی کہ گھوڑے بہت سے ہیں۔ اُس نے عالم اور اپنے ساتھیوں کو اور ہندوؤں کو بھی جگا دیا۔ عورت اور لڑکیاں بھی جاگ اٹھیں۔ عالم نے کہا کہ سب چٹان کی اوٹ میں ہو جائیں۔

گھوڑے بہت تیز آ رہے تھے اور سیدھے اِدھر ہی آ رہے تھے۔ اگلے سواروں کے پاس جلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ وہ اسی رفتار سے اس جگہ سے گزرنے لگے جہاں چار قرامطیوں کی لاشیں پڑی تھیں تو مشعلوں کی روشنی میں انہیں لاشیں نظر آ گئیں۔ گھوڑے اور اونٹ قریب ہی بندھے تھے۔ سوار رُک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انہوں نے لاشیں بھی دیکھیں اور للکارنے لگے۔ "سامنے آجاؤ، ورنہ کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

گھوڑوں اور اونٹوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اُن کے مالک یہیں ہیں۔ کوئی جواب نہ ملا تو سوار اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انہیں لڑکیاں نظر آ گئیں۔ وہ پکڑی گئیں تو دونو ہندو سامنے آ گئے۔ سواروں نے انہیں بتایا کہ وہ داؤد بن نصر کے فوجی ہیں اور انہیں ملتان لے جانے آئے ہیں۔ اُن دو آدمیوں نے جو درویش کو پکڑ کر لے گئے تھے، سواروں کو بتایا کہ یہ کوئی اور ہیں ہم جنہیں پکڑنے آئے ہیں اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔

"انہیں کس نے قتل کیا ہے؟" ایک سوار نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہمیں معلوم نہیں"۔ بوڑھے ہندو نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ سے آ رہے ہیں اور داؤد بن نصر کے لیے ایک ضروری پیغام لے کے جا رہے ہیں۔ ہم یہاں پڑاؤ کے لیے رُکے۔ لاشیں پہلے ہی یہاں پڑی ہوئی تھیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو"۔ سواروں کے کمانڈر نے کہا۔ "کیا پیغام لے کر جا رہے ہو؟"

"ہمیں ملتان لے چلو"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "پیغام ایسا ہے جو صرف تمہارے حاکم کو دیا جائے گا۔"

سواروں نے بستر دیکھے اور ایک سوار بولا ـــ "بستر زیادہ ہیں اور ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"ان لڑکیوں کو برہنہ کر دو" کمانڈر نے حکم دیا ـــ "اور اس عورت کے بھی کپڑے اتار دو۔ اِن آدمیوں کو گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھوڑے دوڑا دو۔ ملتان پہنچنے تک ان کی صرف ہڈیاں رہ جائیں گی۔ لڑکیوں کو ذرا پرے لے جاؤ، ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

لڑکیوں نے چودہ سواروں کو دیکھا تین چار سوار انہیں برہنہ کرنے کو بڑھے لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو نو ہندو مردوں نے عالم اور اُس کے ساتھیوں کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا۔ وہ احسان کا بدلہ چکا رہے تھے۔ جب سوار لڑکیوں کی طرف لپکے تو بھی وہ خاموش رہے۔

ایک طرف سے آواز آئی ـــ "لڑکیوں کو ہاتھ نہ لگانا ہمیں پکڑ لو۔ ان چاروں کے قاتل ہم ہیں۔"

یہ عالم کی آواز تھی۔ وہ سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ اُس کے تین ساتھی تھے۔ اُس نے کہا ـــ "ان لڑکیوں کو پریشان نہ کرنا۔ ہمیں اپنے حاکم کے پاس لے چلو۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے ملتان کے دربار میں کہیں گے۔"

ملتان کے دربار میں درویش موت کے منہ میں کھڑا تھا۔ داؤد بن نصر خود اُس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ سُرنگ میں کس طرح داخل ہوا تھا اور اُس نے اس آدمی کو کیوں قتل کیا تھا۔

"یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حاکم ملتان داؤد بن نصر کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں کہ وہ جنات اور مرے ہوؤں کی ارواح کو حاضر کر سکے" ـــ درویش نے پوری دلیری سے کہا ـــ "اور میں نے سُرنگ میں اُس آدمی کو قتل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس حویلی میں جنات بھی نہیں، ارواح بھی نہیں اور قرامطی فرقہ باطل کا علمبردار ہے۔"

داؤد بن نصر نے اُس کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ مارا اور کہا ـــ "تم ہماری کرامات کو جھٹلاتے ہو؟ ..... تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری زندگی ہمارے ہاتھ میں ہے؟ تمہیں ہم سے کون بچا سکتا ہے؟"

"خدائے ذوالجلال"۔ درویش نے کہا۔ "داؤد! فرعونوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کا انجام دیکھو۔ تیرا انجام اس سے بھی برا ہوگا۔ تیرا سورج غروب ہو رہا ہے۔"

داؤد بن نصر نے درویش کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا اور بولا۔ "ہمارے پاؤں کے نیچے تمہاری حیثیت ایک چیونٹی کی سی ہے۔ تم اتنے بڑے آدمی نہیں کہ ہم تم سے منہ لگائیں۔ ہمیں یہ بتا دو کہ تمہارے ساتھ اور کون ہے اور یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں جا رہے تھے۔"

"میں اکیلا ہوں"۔ درویش نے کہا۔ "خدا کے سوا میرا کوئی ساتھی نہیں۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بھیرہ جا رہا تھا لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ کیوں جا رہا تھا۔"

"تم سلطان محمود غزنوی سے یہ کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو محاصرے میں لے کر قرامطی گدی کو ختم کرے"۔ داؤد نے کہا۔ "تم نے ہماری کرامات نہیں دیکھی کہ تم نے جنگل میں ایک بات کہی اور ہم نے یہاں سن لی۔ اگر تم ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ تمہاری ہڈیوں سے گوشت آہستہ آہستہ الگ کیا جائے گا، پھر تم چیخ چیخ کر ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب دو گے مگر ہم نہیں سنیں گے۔ ہم تمہیں آج رات سوچنے کی مہلت دیتے ہیں۔ قید خانے میں بیٹھ کر اطمینان سے سوچو اور کل ہمیں بتا دینا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ تم سرنگ میں کس طرح داخل ہوئے تھے اور کیا سلطان محمود کے جاسوس ملتان میں موجود ہیں اور وہ کہاں ہیں۔"

"ان سوالوں کے جواب تو میں کل دوں گا" درویش نے کہا۔ "آج یہ سن لو اور رات کو میری اس بات پر غور کرتے رہنا کہ تخت و تاج نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ حکومت کی مسند کے لالچ نے قوموں کو ڈبو دیا ہے۔ انسان تخت پر بیٹھ کر جب سر پر تاج سجاتا ہے تو وہ اپنی ہی قوم کو فریب دینے لگتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ خدا کی ذات بھی موجود ہے۔ تم جیسے حکمران اپنے تخت کی مضبوطی کے لیے رعایا کو نئے جھانسے دیتے ہیں لیکن خدا کو کوئی جھانسہ نہیں دیا جا سکتا۔ خدا ظالم کی نہیں، مظلوم کی سنتا ہے اور خدا فریب کار کا نہیں فریب خوردہ کا ساتھ دیتا ہے۔ تم نے خدا کے سچے مذہب کو بگاڑ کر پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔

تم نے خدا کے بندوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے خدا کے مذہب کو حربہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہارا فریب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خدا تمہیں اتنا بڑا گناہ بخشنے کا نہیں "۔

داؤد بن نصر اچانک گرجا۔ "لے جاؤ اسے ..... قید خانے میں بند کر دو"۔

درویش کو گھسیٹ کر لے گئے۔ درویش جوں جوں دور ہٹتا جا رہا تھا، اُس کی آواز داؤد کے قریب آتی جا رہی تھی۔

"داؤد! تیری بےخبری پر بجلی گرنے والی ہے ..... داؤد! تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے"۔

"اگر عالی جاہ مجھے اجازت دیں تو میں اس بدبخت کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں"۔۔۔ ایک درباری نے داؤد بن نصر کو خاموش کھڑے دیکھ کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ آپ قرامطی مسند کی توہین کس طرح برداشت کر رہے ہیں"۔

"ملتان کی آستین میں سانپ پل رہے ہیں"۔۔۔ داؤد نے کہا۔ "اس سے معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں اور کون کون ہیں۔ اسے ہم یہیں اپنے ہاتھوں ختم کر سکتے تھے لیکن اس کی ہمیں ضرورت ہے"۔

"اس کے ساتھ جو لوگ تھے۔ وہ شاید پکڑے جائیں گے"۔۔۔ درباری نے کہا۔

"کہیں غائب نہ ہو گئے ہوں"۔۔۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "مجھے ان سے زیادہ محمود غزنوی کا خیال آ رہا ہے۔ بھیرہ سے جلدی اطلاع آ جانی چاہیے کہ محمود کا ارادہ کیا ہے۔ ہم نے اُسے اُس کے ایک سالار کے ذریعے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن اطلاع ملی ہے کہ یہ سالار اپنی تلوار سے مارا گیا ہے اور ہمارا دھوکہ ناکام ہو گیا ہے۔ راجہ بھی رائے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ محمود غزنوی کو خدا نے اگر فوج تھوڑی دی ہے تو دماغ بہت زیادہ دیا ہے۔ ہندوستان میں فوج کی کمی نہیں، دماغ کی کمی ہے"۔

سلطان محمود غزنوی اپنی فوج کی کمی کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا کام بھیرہ فتح کرنے پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ اصل مہم یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اُس میں ملک گیری کی ہوس نہیں تھی۔ اُس کا مقصد زر و جواہرات اکٹھے کر کے غزنوی لے جانا بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو اُس نے فتح کیا تھا اور اُس نے پہلے شہر میں ہی سارے

ہندوستان کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اُس نے مسجدوں پر مندروں کے گھناؤنے سائے پڑے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بھیرہ میں مسلمانوں کی آبادی کچھ کم تو نہیں تھی لیکن اسلام کا کہیں نشان نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے پاس سب سے پہلے پنڈتوں کا وفد آیا تھا۔ پنڈتوں نے اُس کے آگے پہلے گھٹنے ٹیکے پھر ماتھے زمین پر رگڑے تھے۔ پشاور کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے اسی طرح سجدے کئے تھے۔ اب بھیرہ کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے ماتھے رگڑے تو سلطان محمود غزنوی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کھڑے ہو جاؤ" — اُس نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں خدا نہیں۔ میں نے اس شہر پر قبضہ کیا ہے، شہر کے انسانوں پر نہیں۔ ہمارے مذہب میں سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔ تم لوگ مجھے گناہگار کر رہے ہو.... اپنا مطلب بیان کرو۔"

"ہم جان کی سلامتی اور مندروں کی حرمت مانگنے آئے ہیں" — پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کیا تم اپنے مندروں کی ویسی ہی حرمت چاہتے ہو جیسی تم مسجدوں کی کرتے رہے ہو؟" — سلطان محمود نے کہا — "کیا یہاں کے ہندوؤں کی ویسی ہی عزت چاہتے ہو جیسی تم مسلمانوں کی کرتے رہے ہو؟ تمہارے راجہ کے اس محل میں اتنی ہندو لڑکیاں نہیں تھیں جتنی مسلمان لڑکیاں تھیں۔ انہیں زبردستی راج محل میں رکھا گیا تھا۔ اگر تم پنڈت لوگ مذہب کے پابند ہوتے تو اس شہر کی بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کرتے۔"

"ہم مجبور تھے سلطان مہاراج!" — بڑے پنڈت نے کہا — "ہمارے دیس میں مہاراجہ کا حکم مذہب کے حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"تمہارے دیس میں مذہب مہاراجہ کا غلام ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اور تم جو اپنے مذہب کے پیشوا اور پاسبان ہو، اپنا مذہب مہاراجہ کے قدموں میں رکھ دیتے ہو" — سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے توجّہ ہٹا کر اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک فوجی مشیر سے کہا — "ہمارے مسلمان بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں میں بھی یہی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا اپنے بادشاہوں اور اُمرا کی بدکرداری پر مذہب کا پردہ ڈالے رکھتے ہیں اور بادشاہ اپنا حکم منوانے کے لیے اس پر خدا کے حکم کی مُہر ثبت کر دیتے ہیں۔"

"ملتان کا بادشاہ داؤد بھی اسی مرض کا مریض ہے۔" مشیر نے کہا۔

یہ باتیں فارسی زبان میں ہو رہی تھیں اس لیے پنڈت سمجھ نہ سکے۔ سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے کہا۔" ان پنڈتوں سے کہو کہ تمہارے بُت اگر سچے ہیں تو انہیں کہو کہ تمہاری جان و عزّت اور اپنے مذہب کی حفاظت کریں۔ اپنے بُتوں سے کہو کہ اپنی حفاظت کریں۔ میں ایک گناہگار آدمی سے کہتا ہوں کہ تمہارے خدا کو اُٹھا کر باہر پھینک دے۔ تم کھڑے دیکھتے رہنا کہ مٹی اور پتھر کا خدا، اپنے آپ کو ایک گناہگار انسان سے بچا سکتا ہے؟ اور اس انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دے سکتا ہے؟"

ترجمان نے جب سلطان محمود غزنوی کی یہ بات پنڈتوں کو اُن کی زبان میں کہی تو وہ خاموش کھڑے رہے۔ اُن کے چہروں پر کھسیانا سا تاثر تھا۔

"اور میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مندروں میں کیسے کیسے گناہ کرتے ہو"۔ سلطان محمود نے کہا۔" تمہارے ہاتھوں تمہارے اپنے مذہب کی کسی عورت کی عزّت محفوظ نہیں۔ تم نے اسی لیے پتھر کے خدا تراش رکھے ہیں کہ یہ تمہیں کسی گناہ سے روک نہیں سکتے۔ تم اگر میرے پاس جان و مال اور عزّت و آبرو کی التجا لے کر نہ آتے تو بھی میں کسی بے گناہ کو قتل اور کسی عورت کو بے آبرو نہ ہونے دیتا کیونکہ یہ میرے خدا کا حکم ہے اور خدا نے میرا ہاتھ روک رکھا ہے۔ میں خدا کے حکم سے آیا ہوں اور میرا ہر فعل خدا کے حکم کا پابند ہے۔"

سلطان محمود نے سر کو جھٹک کر اپنے ترجمان کی طرف دیکھا اور پنڈتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔" اِن سے پوچھو کہ انہوں نے مندروں میں لڑائی سے بچے اور بھاگے ہوئے فوجی عہدیداروں کو چھپا کے نہیں رکھا ہوا؟ ان سے کہو کہ یہ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ مندروں میں ہماری فتح کو شکست میں بدلنے کی سازشیں نہیں ہو رہیں؟"

"نہیں سلطان مہاراج!"۔ بڑے پنڈت نے ترجمان کی بات سن کر کہا۔" ہم آپ کے غلام ہیں۔ مندروں میں کوئی سازش نہیں ہو رہی۔"

"وہ کہاں ہیں؟"۔ سلطان محمود نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔" انہیں لے آؤ جنہیں

لاہور کے راستے سے پکڑا گیا ہے"۔
تھوڑی دیر بعد دو آدمی اندر لائے گئے جن کے ہاتھ رسیّوں سے بندھے ہوئے تھے۔

"انہیں پہچانتے ہو؟" — سلطان محمود نے پنڈتوں سے پوچھا اور دونوں قیدیوں سے کہا — "انہیں بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو اور کیوں پکڑے گئے ہو؟"

"ہمیں اِن پنڈتوں نے لاہور جانے کو کہا تھا" — ایک قیدی نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا — "انہوں نے مہاراجہ انند پال کے لیے پیغام دیا تھا کہ بھیرہ میں مسلمانوں کی فوج بہت تھوڑی ہے۔ فوراً حملہ کرو اور راجہ بجی رائے کی شکست کا انتقام لو۔"

"انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری فوج کے جو ہزاروں قیدی سلطان محمود کے پاس ہیں وہ حملے کی صورت میں باغی ہو کر لاہور کی فوج سے مل جائیں گے" — دوسرے قیدی نے کہا۔

"اور انہیں میری فوج نے راستے میں مشکوک حالت میں پکڑ لیا" — سلطان محمود نے کہا — "اِن دونوں قیدیوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے اسی قسم کا پیغام ملتان داؤد بن نصر کو بھیجا ہے۔ تم میرے پاس جان بخشی کے لیے آئے ہو ..... غور سے سنو بُتوں کو خدا ماننے والو! یہاں کے انسان میری فوج کے طوفان کو نہیں روک سکے۔ اپنے بُتوں سے کہو کہ میری فتح کو شکست میں بدل دیں، لیکن جس طرح تم عیّار اور جھوٹے ہو، اسی طرح تمہارے بنائے ہوئے خدا جھوٹے ہیں۔ میں تمہیں صرف یہ رعایت دیتا ہوں کہ اپنے بُت اُٹھاؤ اور اس شہر سے نکل جاؤ۔ اگر رُکے رہو گے تو میں یہ بُت ہندو قیدیوں کے ہاتھوں تڑواؤں گا۔ اگر تم وہ مذہب قبول کر لو جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں تو باقی زندگی سکون سے گذار سکو گے۔ تم جسمانی لذّت کے عادی رہے ہو، روحانی لذّت کا ذائقہ بھی چکھ لو۔ اپنے آپ کو سچے خدا کی نعمتوں سے مالا مال کر لو۔ سونے اور جواہرات میں وہ بات نہیں جو اللہ کی نعمتوں میں ہے ..... جاؤ اور سوچو اور مجھے جواب دو۔"

وہ چلے گئے تو سلطان محمود کے ایک عالم نے کہا "سلطان! یہ ہندو ہیں، یہ اسلام قبول کرنے نہیں، دھوکہ دینے آئے تھے۔ یہ جسمانی لذّتوں کے شیدائی ہیں۔ حکومت اور مذہب

کی پیشوائی کو یہ صرف اپنا حق اور ورثہ بنائے بیٹھے ہیں کیونکہ یہ برہمن ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کی نفرت بھری ہوئی ہے، اور یہ نفرت صرف اس لیے ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام اونچی نیچی ذاتوں کا قائل نہیں۔ امیر کو غریب پر اس لیے برتری حاصل نہیں کہ وہ امیر ہے۔ اسلام حکومت کا حق اُسے دیتا ہے جو قوم کی برتری اور اپنے اوپر اللہ کی حکمرانی کو تسلیم کرے۔"

یہ عالم سعید اللہ قاسمی تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ قاسمی کا اضافہ محمد بن قاسم کی عقیدت مندی کے اظہار کے لیے رکھا تھا۔ اُس وقت کی بعض بعض تحریروں میں ایک مولوی سعید کا ذکر آتا ہے۔ ایک تحریر میں سعید اللہ بھی لکھا ہے۔ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمود علمائے دین کا قدردان تھا۔ اُس نے بھیرہ فتح کیا تو سعید اللہ قاسمی اُس سے ملنے بھیرہ آئے تھے۔

"ہم نے اس خطے میں قاسمی مسلمانوں کا ایک گروہ بنا رکھا ہے" مولوی سعید قاسمی نے کہا۔ "ہم کسی ایسے سلطان یا ایسے مسلمان حملہ آور کی راہ دیکھ رہے تھے جو یہاں محمد بن قاسم کے دورِ حکومت کو بحال کر دے۔ ہندو پنڈتوں اور دیگر برہمنوں نے ہم پر نظر رکھی۔ ہم نے ان سے دوستی بھی کی۔ ان کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ ہم اُن کے مذہب کو قبول کر لیں۔ آپ ان کے بُت توڑ سکتے ہیں، انہیں اپنے مذہب سے نہیں ہٹا سکتے۔ ان کے دلوں میں اسلام کی جو نفرت ہے، وہ اُس وقت تک نہیں نکلے گی جب تک یہاں ایک بھی مسلمان موجود ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ان پنڈتوں نے آپ پر حملہ کرانے کا اہتمام بھی کیا ہے اور آپ کے سامنے آ کر انہوں نے سجدہ بھی کیا ہے۔ اِس ملک میں آپ نے کسی بھی خطے میں اسلامی ریاست بنا لی تو یہ ہندو اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہیں گے۔"

"اسلامی ریاست کی جڑیں تو ہمارے اپنے بھائی کھوکھلی کر رہے ہیں" — سلطان محمود نے کہا۔ "میں یہاں آ گیا ہوں لیکن میرا دھیان پیچھے غزنی اور بلخ بخارا پر لگا ہوا ہے۔ اسلامی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے آپ کو ساری دنیا کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ ہم خانہ جنگی لڑ چکے ہیں۔ جس فوج کو باطل کے بُت توڑنے تھے، وہ ایک دوسرے کا سر توڑنے میں لگی رہی اور کمزور ہو گئی ہے۔ اگر ان ریاستوں کی فوجیں متحد ہو جائیں

توہم سارے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنا سکتے ہیں۔ مگر ہر لمحہ میں اس اطلاع کا منتظر رہتا ہوں کہ میرے کسی مسلمان پڑوسی نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ لوگ اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں جنہیں ہمارے رسول صلعم نے سرفروش بننے کو کہا تھا، وہ ایمان فروش ہو گئے ہیں۔"

"آپ یہاں رہیں یا نہ رہیں، ہم یہ مہم جاری رکھیں گے کہ یہاں ہندو کسی مسلمان کا ایمان نہ خرید سکیں"۔۔۔ مولوی سعید اللہ نے کہا۔

"سب سے بڑا ایمان فروش تو ملتان کی گدّی پر بیٹھا ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "اُس نے اپنی قوم کے ایمان کی منڈی لگا رکھی ہے۔"

"ہم نے سنا ہے کہ وہاں ہندو اور قرامطی مل کر شعبدہ بازی کر رہے ہیں"۔۔۔ مولوی سعید اللہ نے کہا۔۔۔ "اور لوگ متاثر اور مسحور ہو کر قرامطی بنتے جا رہے ہیں۔"

"میں اُس عیسائی کے دماغ کی تعریف کرتا ہوں جس نے یہ فرقہ بنایا ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "انسانی فطرت گناہ کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی لذت کو انسان جلدی قبول کرتا ہے۔ اس فرقے نے ہر گناہ کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ ہندو پنڈتوں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا لیکن اس فرقے کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور اس کی شعبدہ بازیوں میں پوری طرح شریک ہیں تاکہ مسلمان اِس فرقے کے پیروکار بن کر اسلام کے خاتمے کا باعث بنیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندو اپنی لڑکیوں کو اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی گمراہی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ داؤد قرامطی کو نہ اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے نہ وہ اپنے فرقے کا وفادار ہے۔ وہ اپنی گدّی کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے۔"

یہ اسی دلچسپی کا مظاہرہ تھا کہ داؤد بن نصر پر درویش کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس کے دل میں خوفِ خدا پیدا نہ ہوا۔ اُس پر درویش کی اس للکار کا بھی اثر نہ ہوا۔۔۔ "داؤد! تمہاری پیغمبری پر بجلی گرے گی ..... تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے"۔۔۔ حکومت کے نشے نے اُسے بدمست کر رکھا تھا اور وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ اُس نے خدا کی آواز کو قید کر رکھا ہے۔

ملتان میں ایک قافلہ داخل ہوا جس میں فوج کے بارہ چودہ سوار تھے۔ ایک بوڑھا اور ایک جوان ہندو، ایک ادھیڑ عمر عورت اور دو بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں، اور اس قافلے میں چار

قیدی بھی تھے جن کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا جسے ملتان کے لوگ جانتے تھے کہ عالم فاضل ہے۔ تین قیدی جواں سال تھے۔ ملتان کے بعض لوگ انہیں بھی پہچانتے تھے۔ ان چاروں کو جاننے پہچاننے والے حیران و پریشان ہو گئے کہ انہیں کس جرم میں اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے۔ عالم کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عالم ہونے کی وجہ سے بعض قرامطی بھی اس کا احترام کرتے تھے۔

"انہوں نے کیا کیا ہے؟"۔۔۔ کسی تماشائی نے گھوڑ سواروں سے بلند آواز میں پوچھا۔

"قتل ..... یہ قاتل ہیں"

"انہوں نے کسے قتل کیا ہے؟"

"فوج کے سواروں کو"

"ہم نے اسلام کے غداروں اور ڈاکوؤں کو قتل کیا ہے"۔۔۔ عالم نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا۔

"ہم نے ان لڑکیوں کی عصمت پر حملہ کرنے والے چار قرامطیوں کو قتل کیا ہے"۔۔۔ ایک جواں سال قیدی نے کہا۔

"زبانیں بند رکھو"۔۔۔ ایک سوار نے گرج کر کہا۔

"تم خدا کی آواز کو خاموش نہیں کر سکتے"۔۔۔ ایک اور جواں سال قیدی نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا۔

گھوڑ سواروں نے انہیں گھسیٹنا شروع کر دیا۔

داؤد بن نصر کو دو اطلاعیں دی گئیں۔ ایک یہ کہ درویش کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں اور دوسری اطلاع یہ کہ اپنے جو چار سوار بھیرہ جا رہے تھے، وہ درویش کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ بھیرہ سے دو ہندو کوئی پیغام لے کر آئے ہیں۔ داؤد نے سب سے پہلے ہندوؤں کو بلایا۔

ہندوؤں نے دو نو لڑکیاں داؤد کو پیش کیں، پھر چمڑے کی ایک خوشنما تھیلی اُس کے قدموں میں خالی کی۔ داؤد کبھی لڑکیوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے قدموں میں رکھے ہوئے

سونے کے ڈھیر کو۔ لڑکیاں خوبصورت تو تھیں لیکن اُن کے چہروں پر جو تبسم تھا اور اُن کا جو انداز تھا، اُس نے داؤد پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ تربیت یافتہ لڑکیاں تھیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ انہیں کس کے پاس اور کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

بوڑھے ہندو نے داؤد کو بتایا کہ وہ فوج میں کمانڈر تھا۔ اُس نے بجی راۓ کی شکست کی تفصیل سنائی اور بتایا کہ کس طرح چند ایک فوجی عہدیدار مندروں میں چھپ گئے تھے۔ خزانے پر تو مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن بہت سی دولت مندروں اور لوگوں کے گھروں میں پہنچا دی گئی تھی۔

"سلطان محمود نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی مسلمان فوجی کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہو گا" — بوڑھے ہندو نے کہا۔ "اُس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہندو اپنے فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر جلا سکتے ہیں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچا سکتے ہیں۔ بھیرہ کے ہندوؤں کو پنڈتوں نے اور ہم نے در پردہ کہا کہ میدانِ جنگ میں اپنے زخمی اُٹھائیں اور مسلمان زخمیوں کو قتل کریں۔ انہوں نے بہت سے مسلمان زخمیوں کو قتل کیا لیکن مسلمانوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے ہندوؤں کو شہر سے باہر جانے سے روک دیا ....

"ہم نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گھر مسلمانوں سے واقعی محفوظ ہیں تو ہم نے جو رقم اور سونا ہاتھ لگا، چند ایک گھروں میں چھپا دیا۔ بڑے مندر میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو یہ اطلاع دی جائے کہ آپ فوراً بھیرہ پر چڑھائی کر دیں تو آپ نہ صرف بھیرہ کو مسلمانوں سے آزاد کرا لیں گے بلکہ آپ سلطان محمود کو قید اور اس کی فوج کو تباہ کر سکتے ہیں۔ وہ تین ہزار ہندو جنگی قیدی جو مسلمانوں کی بیگار میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی مدد کو آجائیں گے اور محاصرے کی صورت میں شہر میں تباہی بپا کر دیں گے ....

"لاہور اور بھٹنڈہ بھی پیغام بھیج دیئے گئے ہیں۔ وہاں کی فوجیں بھی آجائیں گی۔ آپ کا کام اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اگر آپ اپنی ریاست کی خیریت چاہتے ہیں تو آپ کو بھیرہ پر فوج کشی کرنی ہو گی۔ آپ کو بھیرہ سے مالی امداد بھی مل جائے گی۔"

داؤد بن نصر انہماک سے سُن رہا تھا۔ اُس نے ابھی کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ ہندو بوڑھا

جانتا تھا کہ داؤد کے خاندان کی تاریخ میں جنگ و جدل کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ سازش پسند خاندان ہے جسے عیسائیوں نے گدی پر بٹھایا اور ہندو راجے مہاراجے اسے آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ بوڑھا ہندو داؤد کی کمزور رگوں سے واقف تھا۔ بھیرہ سے اُسے سب کچھ بتا کر بھیجا گیا تھا۔

"حاکمِ ملتان!"۔۔۔ بوڑھے ہندو نے ذرا آگے جھک کر کہا "بھٹنڈہ اور لاہور کی فوجوں کو آپ کی فوج کے تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ آپ کو یہ تو احساس ہو گا ہی کہ آپ کی گدی ہمارے تعاون کی بدولت محفوظ ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپ ہندو راجوں اور مہاراجوں کے گھیرے میں ہیں۔ آپ پر کوئی حملہ نہ کرے اور صرف مالی اور فوجی امداد بند کر دی جائے تو آپ ملتان کو ہمارے قدموں میں پھینک کر بھاگ جائیں گے۔ اگر آپ نے بھیرہ پر فوج کشی نہ کی تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آپ ہمارے نہیں غزنی والوں کے دوست ہیں۔ ہم آپ کی دوستی سے دستبردار ہو جائیں گے اور پورے قرامطی فرقے کو بتا دیں گے کہ آپ کی پیغمبری محض شعبدہ بازی ہے۔"

"آپ خود فوجی عہدیدار ہیں"۔۔۔ داؤد نے گھبرائے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو اپنی فوج دکھاؤں گا۔ آپ خود کہیں گے کہ یہ فوج محاصرے میں لڑ سکتی ہے، ایک سو میل دُور جا کر کسی قلعہ بند شہر کو محاصرے میں لینے کے قابل نہیں کیونکہ تعداد کم ہے۔"

"آپ کو اپنی فوج شہر سے ایک سو میل دُور لے جانی پڑے گی۔ ہم آپ کی فوج کو اسی لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ تھوڑی ہے۔ آپ کی فوج سے ہم سلطان محمود کو دھوکہ دیں گے۔ وہ آپ کی فوج کو دیکھ کر اپنی فوج باہر لے آئے گا۔ آپ کو محاصرہ نہیں کرنے دے گا، کیونکہ اُسے یہ توقع ہو گی کہ وہ آپ کو آسانی سے شکست دے دے گا۔ وہ جونہی باہر آئے گا، لاہور سے آئی ہوئی مہاراج انند پال کی فوج جو دریا کے پار چھپی ہوئی ہو گی، شہر پر ہلہ بول دے گی۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ سلطان محمود آپ کی اور انند پال کی فوجوں کے درمیان پس جائے گا۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ محمود کو گرفتار کر کے ہم آپ کے حوالے کر دیں گے۔"

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس کی نظر قدموں میں رکھے ہوئے سونے

پر پڑی۔ اُس نے سر اُٹھا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ یہ تاثر صاف بتا رہا تھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ یہ بوڑھا ہندو اور اس کا جوان ساتھی ان لڑکیوں کو اُس کے پاس چھوڑ کر نکل جائیں۔

"میری فوج کو بھیرہ کے لیے کب کوچ کرنا ہوگا" — داؤد نے پوچھا۔

"آپ تیاری شروع کر دیں" — بوڑھے نے کہا۔"میں واپس بھیرہ جا رہا ہوں وہاں ہمیں لاہور اور بھٹنڈہ کی فوجوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملے گی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ اس اطلاع کے بعد آپ کو تیاری کی مہلت نہیں ملے گی۔ آپ کی فوج تیاری کی حالت میں رہے۔ رسد بیل گاڑیوں پر لدی رہے۔"

داؤد بن نصر نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے شراب و کباب لانے کا حکم دیا تو اُسے کسی درباری نے یاد دلایا کہ قیدی باہر کھڑے ہیں۔ داؤد نے کہا کہ قیدیوں کو پیش کرو۔ قیدی لائے گئے۔

"میں تمہیں زیادہ بولنے کی مہلت نہیں دونگا" — داؤد نے عالم اور اُس کے ساتھیوں سے کہا۔"تمہارا ایک ساتھی گرفتار ہو کر ہمارے پاس آچکا ہے۔ اُس نے ایک آدمی کو چار کنواریوں کی حویلی میں قتل کیا تھا۔ تم اس کے ساتھی ہو۔ تم نے ہمارے چار بڑے ہی تجربہ کار فوجیوں کو قتل کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اور تم نے انہیں کیوں قتل کیا ہے؟"

"اس کا جواب ہم سے سُنو" — بوڑھا ہندو بول پڑا — "اگر یہ اُن چار آدمیوں کو قتل نہ کرتے تو نہ یہ سونا آپ کے پاس پہنچتا نہ یہ لڑکیاں ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کی فوج کے آدمی ہیں۔"

بوڑھے نے داؤد کو پوری تفصیل سے سنایا کہ اُن چار آدمیوں نے کس طرح انہیں لوٹا اور ان لڑکیوں کو برہنہ کر کے ان کے ہاتھوں شراب پیتے رہے، پھر اُن میں سے ایک نے ایک لڑکی کو زمین پر گرا لیا۔ اچانک یہ بزرگ اور یہ آدمی اندھیرے میں سے نکلے اور اُن چاروں کو قتل کر دیا۔

"ہمیں ڈر تھا کہ ہم اُن چاروں سے بچ کر ان چار وحشیوں کے جنگل میں آگئے ہیں" ـــــ بوڑھے نے کہا۔ "لیکن انہوں نے لڑکیوں کو کپڑے پہننے کو کہا۔ ہم نے انعام پیش کیا جو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور ہماری حفاظت کے لیے ہم پر پہرہ کھڑا کر دیا۔ آدھی رات کو بہت سے سوار آئے اور انہیں باندھ کر لے آئے۔"

داؤد نے قیدیوں کی طرف دیکھا تو عالم نے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کے سوار ہیں۔ ہم انہیں ان کی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے قتل کیا ہے۔"

"اور وہ جو قیدی پہلے لایا گیا ہے، اُس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟" ـ داؤد بن نصر نے پوچھا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم بھیرہ سلطان محمود کے پاس جا رہے تھے۔"

"اُس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں" ـ عالم نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ ضرور جا رہے تھے لیکن کسی سلطان سے ملنے نہیں بلکہ اپنے کاروبار کے لیے جا رہے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان محمود کون ہے اور وہ کہاں رہتا ہے۔"

"انہوں نے ہماری جانیں اور ہماری عزت بچائی ہے" ـ بوڑھے ہندو نے کہا ـــ "انہوں نے آپ کی امانت کی حفاظت کی ہے۔ انہوں نے ہمارا انعام قبول نہیں کیا تھا۔ ہم آپ سے انہیں یہ انعام دلانا چاہتے ہیں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔"

داؤد بن نصر نے لڑکیوں کی طرف دیکھا دونوں نے باری باری کہا۔ "ہاں! انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اگر یہ اُن درندوں کو قتل نہ کرتے تو....."

"انہیں رہا کر دو" ـ داؤد نے مسکرا کر حکم دیا۔

عالم اور اُس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا گیا۔

دو تین روز بعد ـــ وہی حویلی تھی جس میں عالم اور درویش اور اُن کے زمین دوز گروہ کے آدمی رات کو اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ رات ابھی ابھی گہری ہوئی تھی۔ عالم اس حویلی میں آچکا تھا۔ اُس کے ساتھ جو تین آدمی گرفتار ہوئے تھے، وہ بھی باری باری آگئے تھے۔ پھر دو آدمی اور آگئے۔ ان کا موضوع اور مسئلہ یہ تھا کہ درویش کو کس طرح رہا کرایا جائے۔ کسی کو کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ قید خانے سے وہ واقف نہیں تھے۔ گزشتہ دو تین دنوں

میں انہوں نے کئی طریقے سوچ لیے تھے۔ قید خانے کی دیوار بھی دیکھی اور کمند پھینک کر اوپر چڑھنے اور قید خانے میں داخل ہونے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ اِس گروہ کے جوان اور نوجوان رکن جانوں کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے لیکن عالم جانیں ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کہا تھا کہ پہلے طریقہ سوچو۔

"کیا آپ لوگوں کو یہ احساس نہیں کہ ہمارا یہ بزرگ ساتھی (درویش) جلاّد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے؟"۔۔۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کی جان چلی بھی گئی تو آپ اسے ضائع ہونا نہ کہیں۔"

"اگر ہم لوگ ناکام ہو گئے تو درویش کو اُسی وقت جلاّد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ کے نام پر کر رہے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ سب اُٹھے اور صحن میں چلے گئے تاکہ خطرے کی صورت میں پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔ انہیں ہر لمحہ یہ خطرہ نظر آتا تھا کہ درویش اذیّتوں سے گھبرا کر سب کی نشان دہی کر دے گا اور اس حویلی پر چھاپہ پڑے گا۔ دو آدمی دروازہ کھولنے گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ایک نے دروازے کی زنجیر اُتاری اور کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ دوسرا دوسرے کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کواڑ بند کر دیئے۔ وہ اُن کا اپنا آدمی تھا۔

"یہاں کتنے آدمی ہیں؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"آٹھ ہیں۔"

وہ سب اُس کمرے میں چلے گئے۔ باقی سب صحن سے کمرے میں آ گئے۔

"فوراً باہر آؤ"۔۔۔ آنے والے نے کہا۔ "درویش کو چار فوجی لا رہے ہیں۔ وہ زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ گلیاں اور بازار خالی ہیں۔ ہم اُسے چھڑا سکتے ہیں۔"

قید خانے میں درویش سے ایک ہی سوال پوچھا جا رہا تھا کہ اُس کے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں۔ درویش نے اپنی ہڈی پسلی ایک کرالی تھی کسی کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ اُس رات یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُسے اس کے گھر لے جایا جائے اور گھر کی تلاشی لی جائے، پھر اس کے گھر کی عورتوں کو دہشت زدہ کر کے پوچھا جائے کہ اس کے تعلقات

کس کس کے ساتھ ہیں۔

اس مقصد کے لیے رات کا وقت بہتر سمجھا گیا تھا۔ درویش کا گھر اس حویلی سے بہت آگے تھا جہاں یہ گروہ بیٹھا کرتا تھا۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی ڈنڈے لے کر باہر نکل گئے۔ گلیاں اور بازار سنسان پڑے تھے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں چار پانچ آدمی نظر آئے۔ پانچ چھ آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ درویش اور فوجی اُن کے قریب سے گزر گئے۔ گروہ کے تمام آدمی اُٹھے اور بے پاؤں فوجیوں کے سروں پر پوری طاقت سے ڈنڈے مارے۔ بے ہوش کرنے کے لیے سر پر ایک ہی ضرب کافی ہوتی ہے۔ اُن کے سروں پر دو دو تین تین ضربیں لگائی گئیں۔ وہ سنبھلے بغیر بیہوش ہو کر گر پڑے۔

درویش آزاد تھا لیکن زنجیر میں ــ سب اُسے ساتھ لے کر اندھیرے میں اندھیری گلیوں میں غائب ہو گئے۔

جس روز عالم رہا ہوا تھا، اُس نے اُسی روز ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر بھیرہ روانہ کر دیا تھا کہ ملتان میں بھیرہ پر چڑھائی کی تیاری ہو رہی ہے اور بھیرہ سے ملتان پیغام اور تحفے آرہے ہیں۔ یہ آدمی بھیرہ چلا گیا اور سلطان محمود کو پیغام دیا سلطان کے لیے یہ پیغام کوئی نیا نہیں تھا۔ اُس کے جاسوسوں نے دو ہندوؤں کو لاہور کی طرف جاتے ہوئے پکڑا تھا۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ وہ راجہ انند پال کے لیے پیغام لے کے جا رہے ہیں کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایسے ہی پیغام ملتان اور بھٹنڈہ بھی بھیجے گئے ہیں۔

سلطان محمود نے یہ کارروائیاں کیں۔ ایک یہ کہ بھیرہ کے دونوں مندروں کی تلاشی لی۔ دونوں میں بجی رائے کی فوج کے چند ایک عہدیدار پکڑے گئے۔ سلطان نے پنڈتوں کو بھی پکڑ لیا۔ پھر شہر کے تمام ہندوؤں کو باہر میدان میں اکٹھا کر کے دونوں مندروں کے بُت اور مورتیاں اُن کے سامنے رکھ دیں۔

"میں نے تم لوگوں کو یہ دکھانے کے لیے بُلایا ہے کہ یہ بُت اور یہ تصویریں خدا نہیں"

——— سلطان محمود غزنوی نے گھوڑے پر سوار ہو کر ہجوم سے کہا "اگر ان میں خدائی قوت ہے تو انہیں کہو کہ اپنے آپ کو بچائیں۔ ان کا انجام دیکھو اور اُس خدا کی عبادت کرو جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اور جس کے ہاتھ میں ہماری زندگی اور ہماری موت ہے۔"

سلطان محمود کے حکم پر بُت توڑ دیئے گئے اور مورتیوں کو آگ لگادی گئی۔

سلطان محمود نے بھیرہ فتح کرتے ہی تیز رفتار قاصد پشاور کو اس حکم سے ساتھ دوڑا دیئے تھے کہ جس قدر کمک ہو سکے بھیج دو، رسد کی ضرورت نہیں۔ سلطان اب ہر روز کمک کا انتظار کرتا تھا۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں کا زمانہ تھا۔ فاصلے طے کرتے دن اور راتیں گذر جاتی تھیں۔ دریاؤں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ کمک کو جس علاقے سے گذر کر آنا تھا، وہ دشمن کا علاقہ تھا۔ راستے میں دشمن سے تصادم کا خطرہ تھا۔ سلطان محمود نے یہ پیغام بھی دیا تھا کہ دشمن سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ جو گائیڈ قاصد کے ساتھ بھیجے گئے تھے، انہیں کہا گیا تھا کہ وہ کمک کو عام راستوں سے دُور ہٹا کر لائیں۔

سلطان کی فوجی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ اُسے جانوروں کی ضرورت نہیں تھی۔ راجہ بجی رائے کی فوج کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور بیل (رسد کی گاڑیاں کھینچنے والے) خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ضرورت گھوڑسواروں کی تھی۔ بھیرہ سے تھوڑے سے مسلمان مل گئے تھے جو گھوڑسواری اور تیغ زنی کی سُوجھ بوجھ رکھتے تھے، مگر دشواری یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمان تھوڑے تھے اور یہ ہندوؤں کی رعایا تھے۔ ان پر نظر رکھی جاتی تھی کہ یہ تیغ زنی اور تیر اندازی کو اپنا شغل نہ بنائیں۔ مسلمانوں کو فوج میں بھی کم ہی لیا جاتا تھا۔ ہندو راجے مہاراجے اور پنڈت ان کی عسکری روح مار رہے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کیفیت سلطان محمود کے لیے دشواری پیدا کر رہی تھی۔ وہ یہاں سے فوج کی کمی پوری نہیں کر سکتا تھا۔

بھیرہ میں سلطان محمود کی حالت ایسی تھی جیسے ایک شیر زخموں سے چُور شکاریوں کے نرغے میں آیا ہُوا ہو اور شیر ان سب کو چیر پھاڑ دینے کو بے تاب ہو۔ سلطان اپنے

مستقر سے بہت دُور تھا اور دشمن کے نرغے میں بیٹھا تھا۔ صورت ایسی پیدا ہو گئی تھی جس میں نہ صرف اُس کی فوج کی تباہی یقینی تھی بلکہ اُس کی اپنی جان بھی بچتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے سالاروں پر ایسی سنجیدگی طاری تھی جو تذبذب کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی۔

"میں جوا نہیں کھیل رہا" سلطان محمود نے ایک روز اپنے سالاروں اور اُن کے نائبوں کو بلا کر کہا۔ "مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ ہمیں کیسی کیفیت اور کتنی خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہے، مگر ہم بھاگیں گے نہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ بہت سے زخمی لڑنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ کمک آجائے گی۔ ہمیں ملتان پر فوج کشی کرنی ہے۔ جاسوسوں کی اطلاعیں تمہارے سامنے ہیں۔ ملتان کی فوج کو لڑنے کا تجربہ نہیں۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو ملتان کی فوج ہمیں محاصرے میں لے لے گی اور انند پال اور دوسرے چھوٹے راجاؤں کی فوجیں بھی آجائیں گی۔ اگر ہم نے ملتان پر قبضہ کر لیا تو وہاں کی فوج ہمارے کام آسکتی ہے۔ وہ آخر مسلمان ہیں۔"

سلطان محمود نے ایک حکم یہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو اس طرح بیڑیاں ڈال دی جائیں کہ وہ کام کر سکیں لیکن پورا قدم نہ اٹھا سکیں تاکہ وہ جنگ کی صورت میں آہستہ آہستہ چلنے کے قابل رہیں، تیز نہ چل سکیں۔

جس وقت سلطان محمود کمک کا انتظار کر رہا تھا، اُس وقت بھیرہ کی مسجدیں جو ویران پڑی تھیں اور چھوٹی مسجدیں جو کھنڈر بن چکی تھیں، صاف کر دی گئی تھیں۔ سلطان محمود نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ مسجدوں میں اور عورتیں گھروں میں قرآن ختم کریں اور ہر کوئی نفل پڑھتا رہے۔

انہی دنوں لاہور میں مہاراجہ انند پال کے راج دربار اور راج محل میں زلزلے جیسے جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ پشاور کے راستے میں انند پال نے سلطان محمود کی فوج کو روکنے کی کوشش کی اور وہ منہ کی کھا کر بھاگ گیا تھا۔ مسلمان سواروں نے سوہدرہ (وزیر آباد) تک اُس کا تعاقب کیا تھا۔ اُسے ماہی گیروں نے دریا پار کرا دیا۔ مؤرخ

لکھتے ہیں کہ وہ لاہور جانے کی بجائے کشمیر چلا گیا۔ وجہ بیان نہیں کی گئی کہ وہ کشمیر کیوں چلا گیا تھا۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ مسلمان لاہور تک اُس کا تعاقب کریں گے اور اس کی فوج تتّر بتّر ہو گئی تھی۔

لاہور میں اُس کا نوجوان بیٹا سکھ پال تھا۔ وہاں جو فوج تھی اُس کی کمان سکھ پال کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فوج تازہ دم تھی لیکن اُس کا لڑنے کا جذبہ یوں گرتا جا رہا تھا کہ اٹک کے قریب سلطان محمودؒ سے شکست کھا کر انند پال تو غائب ہو گیا تھا اور اُس کی فوج کے سوار اور پیادے بڑی بری حالت میں اکیلے اکیلے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لاہور پہنچ رہے تھے۔ شکست میں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے وہ سلطان محمودؒ کی فوج کے متعلق دہشت انگیز خبریں سناتے تھے۔ اُن کی مبالغہ آمیز باتوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ غزنی کی فوج میں انسان نہیں، جن اور بھوت ہیں۔ اس مبالغہ آرائی سے لاہور کی تازہ دم فوج کا حوصلہ پست ہو رہا تھا۔

انند پال کا بیٹا سکھ پال اور اس نوجوان کی ماں پریم دیوی اس صورتِ حال سے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ ماں بیٹا انند پال کا انتظار کر رہے تھے لیکن اُس کی کوئی مصدّقہ اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ پریم دیوی کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں اُس نے سکھ پال کو جنم دیا تھا۔ تین اور عورتوں کے بطن سے انند پال کے بیٹے پیدا ہوتے تھے۔ پریم دیوی کی کوشش یہ تھی کہ باپ کی گدی پر اُس کا بیٹا بیٹھے۔ اُسے اپنے خاوند مہاراجہ انند پال کے مر جانے یا لاپتہ ہو جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔

ایک روز سکھ پال کو اطلاع ملی کہ بھیرہ سے دو آدمی کوئی بڑی ضروری اطلاع لے کر آئے ہیں۔ ان آدمیوں کو فوراً اندر بلا لیا گیا۔ یہ وہ آدمی تھے جنہیں بھیرہ کے پنڈتوں اور مندروں میں چھپے ہوئے فوجی عہدیداروں نے بھٹنڈہ اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ بھیرہ کو فوراً محاصرہ میں لے لیں۔ یہ دو نو بھٹنڈہ گئے۔ یہ شہر مہاراجہ انند پال کا دوسرا دارالحکومت تھا۔ وہاں سے ان آدمیوں کو تازہ دم گھوڑے دے کر لاہور بھیج دیا گیا کیونکہ حکم

دینے والے لاہور میں تھے۔

ان آدمیوں نے سکھ پال کو بھیرہ اور سلطان محمود غزنوی کے متعلق وہی خبر سنائی جو بوڑھے ہندو نے داؤد بن نصر کو سنائی تھی۔ پیغام میں وہی ہدایت تھی۔ جو داؤد بن نصر کو دی گئی تھی کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو۔ محمود غزنوی لڑنے کی حالت میں نہیں۔

"سکھ پال نے یہ خبر اپنی ماں کو سنائی تو ماں نے اُسی وقت اپنی فوج کے کمانڈر کو بلایا جسے سیناپتی کہا کرتے تھے۔ اس کا نام راج گوپال تھا۔ اُس نے بھیرہ پر فوج کشی سے انکار کر دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مسلمانوں کی جس فوج نے راستے میں مہاراج انند پال کو شکست دی اور اپنی کمی پوری کئے بغیر بھیرہ تک پہنچی اور راجہ بجی رائے کی فوج کو شکست دی ہے، اس فوج کو شکست دینے کے لیے ہمارے پاس اس سے تین گنا فوج ہونی چاہیئے۔ ہماری آدھی سے زیادہ فوج جو مہاراج کے ساتھ تھی بیکار ہو چکی ہے۔ یہاں جو دستے ہیں وہ بھی اچھی ذہنی حالت میں نہیں۔ بھیرہ تک ہمیں دو دریا عبور کرنے ہوں گے۔ راج گوپال نے یہ بھی کہا کہ مہاراج کو واپس آ لینے دیں۔ سکھ پال ابھی بچہ ہے۔

"میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں" — رانی پریم دیوی نے کہا — "بھیرہ میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارا حملہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اگر یہ فتح میرے بیٹے کے نام لکھ دی گئی ہے تو یہ باپ کی گدی کا حق دار ہو جائیگا"

"اور اگر شکست ہوئی تو یہ میرے کھاتے میں لکھی جائے گی، کیونکہ فوج کی کمان میرے ہاتھ میں ہوگی" — راج گوپال نے کہا "سکھ پال ساتھ تو ہوگا لیکن دور پیچھے یا وسط میں ہوگا جہاں اُس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا"

"راج گوپال!" پریم دیوی نے کہا — "اگر ہم سے پہلے ملتان کے داؤد نے بھیرہ لے لیا تو اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟ داؤد آخر مسلمان ہے۔ وہ سلطان محمود کے ساتھ ساز باز کر کے بھیرہ کو خالص مسلمان ریاست بنا سکتا ہے۔ اس طرح غزنی والوں کو یہاں دو مستقل اڈے مل جائیں گے"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ داؤد فوج کشی کی جرأت کرے گا" — راج گوپال نے کہا —

"عورت، شراب اور زر و جواہرات میں ڈوبا ہوا مسلمان جسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُس کا مذہب کیا ہے، جنگجو نہیں ہو سکتا۔ غزنی کی فوج ایمان کی طاقت سے لڑتی ہے جسے ہم دھرم کہتے ہیں۔ داؤد اپنا ایمان ہمارے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔"

پریم دیوی راج گوپال کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اُس کی عمر اُس وقت پینتیس سال کے قریب تھی لیکن چہرے کے حُسن اور جسم کی جاذبیت سے پچیس سال کی لگتی تھی۔ اُس نے راج گوپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "راج گوپال! بھول گئے ہو کہ سکھ پال تمہارا اپنا بیٹا ہے اور لوگ انند پال کو اس لیے سکھ پال کا باپ کہتے ہیں کہ وہ میرا خاوند ہے۔ میں نے مہاراج کی بیوی ہوتے ہوئے تمہیں اپنا خاوند بنائے رکھا۔ مہاراج تمہیں بھی اپنے ساتھ پشاور کی اُس لڑائی میں لے جانا چاہتے تھے جس میں وہ شکست کھا کر بھاگے ہیں۔ یہ میں تھی جس نے انہیں یہ کہہ کر تمہیں لاہور میں رکوا لیا کہ یہاں تجربہ کار سیناپتی کی ضرورت ہے ..... اپنے بیٹے کو راج کا وارث بنا دو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا اور تمہارا بیٹا محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لاہور لائے۔ تمہیں میری محبت کی قسم!"

سلطان محمود کو معلوم تھا کہ پشاور سے کمک اتنی جلدی نہیں پہنچے گی، پھر بھی وہ بے تاب ہو کر شہر کی دیوار پر چڑھ جاتا اور اُس کی نگاہیں شمال مغرب کے اُفق پر گھومنے لگتی تھیں۔ کہیں بگولا اُٹھتا تو اُس کی گرد کو دیکھ کر سلطان محمود کا چہرہ دمکنے لگتا کہ کمک کی گرد ہے۔

ملتان کا داؤد بن نصر بھیرہ سے تحفے میں آئی ہوئی دونوں لڑکیوں میں مگن تھا۔ یہ لڑکیاں اُسے شراب پلا پلا کر مدہوش رکھتیں اور اُسے بھیرہ پر حملہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی رہتی تھیں۔ اُسے جب اطلاع دی گئی تھی کہ قیدی (درویش) کو اُس کے گھر کی تلاشی کے لیے جایا جا رہا تھا تو بہت سے آدمیوں نے سپاہیوں پر حملہ کیا اور قیدی کو چھڑا لے گئے ہیں، تو داؤد نے بدمستی کی کیفیت میں کہا تھا — "اُن تمام سپاہیوں کو اور اُن کے کماندار کو تہہ خانے میں بند کر دو۔ انہوں نے قیدی کو خود بھگایا ہے۔ اس کے عوض انہوں نے قیدی سے دولت بٹوری ہوگی..... اور

قیدی کے گھر کا اتا پتا معلوم کر کے اُس کے گھر کے تمام افراد کو، بچوں اور عورتوں کو بھی قید خانے میں ڈال دو۔"

درویش کے گھر گئے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک صبح سلطان محمود نے شمال مغرب کی بجائے شمال مشرق کی طرف گرد اٹھتی دیکھی۔ اس گرد کو وہ پہچانتا تھا۔ یہ فوج کی گرد تھی، اور یہ کمک کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر ملتان کو کوچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو ملتان ہی جا رہا تھا لیکن راجہ بجی رائے نے اُسے راستے میں روک لیا اور اُس سے بڑی ہی خونریز جنگ لڑنی پڑی۔

اُس نے اپنے سالاروں کو بلایا اور انہیں بتانے لگا کہ کمک آ رہی ہے اور وہ کس طرح اور کب کوچ کرے گا۔ اسی دوران ایک سوار آیا۔ یہ دیکھ بھال والی ٹولیوں کا سوار تھا جنہیں شہر سے دور دور گشت پر رکھا جاتا تھا۔ سوار نے کہا کہ دشمن کی فوج آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھی بھی ہیں اور زیادہ نفری سواروں کی ہے۔ پیادے بھی ہیں اور یہ فوج بلاشبہ ہندوؤں کی ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کون سے راجے مہاراجے کی ہے۔

سلطان محمود یہ کہہ کر باہر نکلا—"میں خود دیکھوں گا"— اور کچھ دیر بعد وہ درختوں میں ڈھکی ہوئی ایک چٹان پر کھڑا اس فوج کا جائزہ لے رہا تھا جو بھیرہ کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے کئی جگہوں پر جا کر اور چھپ چھپ کر دیکھا اور اس فوج کی نفری کا اندازہ کیا۔

"ہم محاصرے میں نہیں لڑیں گے"۔ اُس نے اپنے سالار سے کہا جو اُس کے ساتھ تھا۔ دشمن کی فوج کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے دشمن کو محاصرے کی مہلت دے دی تو ملتان سے بھی فوج آ کر محاصرہ مضبوط اور طویل کر سکتی ہے.... کسانوں اور مسافروں کے بھیس میں دو تین آدمی بھیج دو جو اس فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہیں اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ کس کی فوج ہے اور کہاں سے آئی ہے۔"

سلطان محمود واپس شہر میں آیا اور اس کے پاس جو فوج تھی اُسے مقابلے کے لیے تقسیم کرنے لگا۔ اتنے میں اُسے اطلاع ملی کہ شمال مغرب کے اُفق پر کسی فوج کی گرد اُٹھ رہی ہے۔ وہ دوڑتا ہوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ گھوڑوں کی گرد تھی لیسے بھی وہ پہچانتا تھا۔ یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا کہ یہ پشاور سے کمک آئی ہے یا راجہ انند پال کی فوج ہے۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

وہ کبھی اِس گرد کو دیکھتا تھا کبھی شمال مشرق کی طرف سے اُٹھنے والی گرد کو۔ شمال مغرب کی طرف سے آنے والی فوج کے آگے دریا تھا۔ سلطان محمود کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

دریا کی طرف سے ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا شہر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو اُسے اشارے سے سلطان کی طرف بلا لیا گیا۔

سوار نے دیوار کے قریب گھوڑا روکا اور بولا "سلطانِ غزنی! کمک آگئی ہے"

سلطان محمود نے فوراً کہا "اُسے دریا کے پار روک لو۔ فوراً ایک سوار کو دوڑاؤ۔ اس سوار کو واپس نہ بھیجنا۔ گھوڑا بہت تھکا ہوا ہے۔"

رات کو سلطان محمود نہ خود سویا نہ اُس نے کسی کو سونے دیا۔ اُسے شمال مشرق کی طرف سے آنے والی فوج کے متعلق مصدقہ اطلاع ملی کہ لاہور سے آئی ہے لیکن راجہ انند پال ساتھ نہیں، اُس کا بیٹا سکھ پال ساتھ ہے۔ اس فوج کی تعداد بھی معلوم ہو گئی۔ اس اطلاع کے تین گھنٹے بعد یہ اطلاع آئی کہ سکھ پال کی فوج نے تقریباً تین میل دُور پڑاؤ کیا ہے لیکن خیمے نہیں لگائے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیاری کی حالت میں ہے اور صبح تک شہر کو محاصرے میں لے لے گی۔

اس اطلاع کے فوراً بعد سلطان محمود اپنے دو سالاروں کو ساتھ لے کر دریا کے پار چلا گیا جہاں اُس نے کمک کو روکنے کا حکم بھیجا تھا۔ کمک اور سکھ پال کی فوج کے درمیان کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ ان کے درمیان دریائے جہلم اور جنگل حائل تھا۔

سلطان محمود نے کمک کے سالار کو گلے لگا کر اور اُس کے گال چوم کر کہا۔

"تم میرے لیے آسمان سے اللہ کی غیبی مدد بن کر اُترے ہو۔ اگر تم کل آتے تو میں بتا نہیں سکتا کہ ہم اس زمین پر کس حال میں ہوتے.... میری بات غور سے سُن لو نعمان! تم سے پانچ میل دُور مشرق میں لاہور کے راجہ کی فوج پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ وہ صبح یا اس سے کچھ پہلے شہر کا محاصرہ کرے گی یا یلغار۔ تم صبح طلوع ہونے سے پہلے تمام دستوں کو دریا پار کرا دینا لیکن شور نہ ہو، خاموشی رہے۔ دستے تشبیبی جگہوں میں رہیں۔ اوپر صرف دیدبان کہیں چھپ کر رہیں۔ میں ہندوؤں کو محاصرہ کرنے کی مہلت نہیں دونگا۔ ایک پیادہ دستہ آگے بھیجوں گا جو دشمن سے ٹکر لے کر پیچھے ہٹے گا۔ دشمن آگے آئے گا۔ تم ذرا بلندی پر آ کر دیکھتے رہنا۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے دشمن کا پہلو تمہارے سامنے ہوگا اور تم اس کے عقب میں آسانی سے جا سکو گے۔ دشمن کے سامنے اور بائیں پہلو کو میں سنبھال لوں گا۔"

سکھ پال اور اُس کے سینا پتی راج گوپال نے صبح طلوع نہ ہونے دی۔ سلطان محمود نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے پیش قدمی شروع کر دی ہے اور دشمن کی ترتیب محاصرے کی ہے یعنی فوج پھیلی ہوئی آ رہی ہے۔ شہر کے قریب آ کر اس فوج کو اور زیادہ پھیلنا اور محاصرہ مکمل کرنا تھا۔ سلطان محمود کی چال بیکار گئی کہ وہ ایک دستہ آگے بھیج کر دشمن کو آگے لائے گا۔

اُس نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ کوئی ایک میل دُور اُسے سکھ پال کی فوج کا پھیلاؤ نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے اپنے سالار سے کہا کہ سوار دستے کے دو حصے کرو اور دونوں دستے بیک وقت دشمن کے دائیں بائیں پہلو پر حملہ کریں اور اُسے کو دبانے کی کوشش کریں..... شہر میں فوج تیار کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں شہر سے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ نکلا۔ نعرۂ تکبیر کی گرج سنائی دی۔ سواروں نے ایڑ لگائی اور دستہ ذرا آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اُن کے رُخ دشمن کے پھیلاؤ کے سروں کی طرف تھے۔

راج گوپال نے یہ چال چلی کہ بڑی تیزی سے پھیلاؤ کو سکیڑ لیا کہ سواروں کو لپیٹ میں لے کر واپس نہ جانے دیا جائے۔ سواروں نے پہلوؤں پر حملہ کیا۔ سلطان دیوار پر کھڑا تھا۔ اُس نے شہر سے ایک پیادہ دستہ نکالا اور اسے دشمن کے بائیں پہلو پر بھیجا۔

ہدایت کے مطابق سوار اور پیادے پیچھے ہٹنے لگے اور دشمن کی زیادہ تر توجہ اپنے بائیں پہلو پر ہو گئی جہاں پیادوں نے حملہ کیا تھا۔ اس طرح دشمن کی محاصرے کی ترتیب ٹوٹ گئی، اور دشمن کی پیٹھ اُدھر کو ہو گئی جدھر سلطان محمود نے کمک روک رکھی تھی۔ نعمان تجربہ کار سالار تھا۔ اُس نے عقب سے ہلّہ بول دیا۔ اُس کے دستوں نے صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے دریا پار کر لیا تھا۔ ہندوؤں کو بالکل توقع نہیں تھی کہ شہر سے باہر اُن کے عقب میں بھی فوج ہے۔ کمک میں زیادہ تر سوار تھے۔ ادھر سے سلطان محمود نے کم سے کم نفری کے دستے شہر سے نکال دیئے۔ نعمان کے عقبی ہلّے نے ہندوؤں کے اوسان خطا کر دیئے۔ شہر کے دستوں نے الگ قیامت بپا کر دی۔ دشمن کا نکل بھاگنا ناممکن ہو گیا۔ اُس کے زخمی ہاتھیوں کی بھگدڑ نے اُسے اور زیادہ نقصان دیا۔

سُورج نکل آیا تھا۔ ہندوؤں کے جے کارے، نقارے، نفر اور سنکھ مسلمانوں کے تکبیر کے نعروں کی گرج، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کے فلک شگاف شور میں دب گئے تھے۔ سلطان محمود دیوار پہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر سُکھ پال کے جھنڈے پر تھی جو ابھی گرا نہیں تھا۔ جھنڈا پیچھے یا دائیں بائیں جانے کی بجائے شہر کی طرف آرہا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا۔ نقصان دشمن کا ہو رہا ہے اور مسلمان غالب ہیں۔"

سُکھ پال کا جھنڈا جو ایک ہاتھی پر تھا، شہر کے دروازے پر آ گیا۔ سلطان محمود کو ہاتھی پر ایک جواں سال چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ بلاشک وشبہ راجہ انند پال کا بیٹا سُکھ پال تھا۔ وہ خود ہاتھی کو شہر میں نہیں لا رہا تھا بلکہ ہاتھی اُسے اِدھر لے آیا تھا۔ ہاتھی اپنے راج کمار کی طرح خوف زدہ تھا۔ جب ہاتھی شہر کے دروازے پر پہنچا تو مہاوت ہاتھی سے کُود کر بھاگ گیا۔ ہاتھی کے ساتھ سُکھ پال کا کوئی محافظ نہیں تھا۔ ہودے میں دو محافظ تھے، جو جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔

ہاتھی کی پیشانی میں بیک وقت تین تیر اُتر گئے۔ ہاتھی بڑی بھیانک آواز سے چنگھاڑا۔ اِس کے ساتھ ہی اُوپر سے سلطان محمود غزنوی کی گرجدار آواز اٹھی۔ "پکڑ لو اِس

ہاتھی کو" سکھ پال ہاتھی سے کود آیا اور شہر کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ سلطان محمود کے حکم پر اُسے پکڑ لیا گیا اور اُسے اُوپر دیوار پر لے گئے۔

"گھبراؤ نہیں لڑکے!" سلطان محمود نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری جرأت کی تعریف کرتے ہیں، لیکن کوچ سے پہلے اپنے باپ سے پوچھ لیا ہوتا کہ غزنی کی فوج سے ٹکر لینے کی کتنی قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہاں سے اپنی جنگی قوت کا انجام دیکھو۔"

سکھ پال نے دیکھا۔ دُور دُور تک اُس کی بکھری ہوئی فوج کا کشت و خون ہو رہا تھا۔ ہر طرف مسلمان دندناتے اور نعرے لگاتے پھر رہے تھے جن ہاتھیوں پر ہندو فوج کو ناز تھا، وہ منہ زور اور بے لگام اِدھر اُدھر چیختے چنگھاڑتے اور بھاگتے پھر رہے تھے ــــ اور سکھ پال کانپ رہا تھا۔ اُسے اپنا سینا پتی راج گوپال کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟" سکھ پال نے پوچھا۔

"اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرو" سلطان محمود نے کہا۔ "فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے آپ کو یہ یقین دلاؤ کہ بُت اور مورتیاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ حقیقی خدا کو مانو اور اسی کی عبادت کرو۔ مجھے اسی خدا نے صرف اس مہم میں یہ تیسری فتح دی ہے۔"

"میں اپنے مذہب سے بیزار ہوں" سکھ پال نے کہا۔

سلطان محمود نے مولوی سعید اللہ قاسمی کو بُلایا اور انہیں کہا کہ اس لڑکے کو لے جائیے۔ یہ قیدی نہیں لیکن یہ آزاد بھی نہیں۔ یہ اپنے مذہب سے بیزار ہے۔ مولوی سعید اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ اس نوجوان کی خوب خاطر تواضع کرو۔

تیسرے روز سلطان محمود نے ملتان کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کے سامنے دو سو میل طویل مسافت تھی اور اُسے دو دریا چناب اور راوی عبور کرنے تھے۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی۔ بیل گاڑیاں سُست چلتی تھیں۔ سلطان محمود نے جنگی قیدیوں

کی بیڑیاں کھلوا کر لوہے کے کڑے اُن کے گلوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ پہچانے جائیں۔ جہاں بیل گاڑیاں دلدل، ریت یا چڑھائی کی وجہ سے سست ہو جاتی تھیں، جنگی قیدی گاڑیوں کو دھکیلتے تھے۔ اس سے رفتار سُست نہ ہوئی۔

داؤد بن نصر بھیرہ سے اس اطلاع کا منتظر تھا کہ لاہور اور بھٹنڈہ کی فوج تیار ہے اور وہ بھیرہ کو محاصرے میں لینے کے لیے کوچ کرے۔ اُسے یہ اطلاع دینے والے بھیرہ میں قید ہو چکے تھے۔ داؤد کوچ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ہندوؤں کا نمک حلال کرنے کے لیے فوج کو تیار رکھے ہوئے تھا۔

اُسے بھیرہ سے تو کوئی اطلاع نہ ملی، ملتان کے گردنواح سے اُسے یہ بھیانک اطلاع دی گئی کہ ایک فوج بڑی تیز رفتاری سے بڑھی آرہی ہے۔ داؤد بن نصر دوڑتا ہوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا اور ایک بُرج میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ فوج قریب آگئی تھی۔ داؤد نے شہر کے دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا اور فوج کو محاصرے میں لڑنے کے لیے دیوار پر بلا لیا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے باہر فوج نے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔

سلطان محمود غزنوی کے حکم سے داؤد بن نصر کو للکارا گیا کہ وہ شہر کے دروازے کھول دے اور صلح کے لیے باہر آجائے، ورنہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

اس للکار کا جواب دیوار سے آیا۔ "قرامطی مرنے سے پہلے شہر نہیں دیں گے۔ ہمّت ہے تو آؤ اور دروازے کھول لو۔"

سلطان محمود کو قرامطیوں کے متعلق غلط اطلاعیں ملی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے قرامطی لڑنے سے گریز کریں گے اور وہ جنگجو نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے جب مقابلہ شروع کیا تو سلطان محمود کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ غزنی کے مجاہد دیوار تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے تو اوپر سے تیروں کی اتنی بوچھاڑیں آتی تھیں کہ ان میں بمشکل آدھے زندہ واپس آتے تھے۔

سات دن محاصرہ رہا۔ سلطان محمودؒ نے حکم دیا کہ محاصرہ طویل نہیں ہوگا۔ آٹھویں روز اُس نے تمام شہر کے گرد گھوم کر اپنی فوج سے کہا کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ محاصرہ کر کے بیٹھے رہیں۔ خدا نے تمہیں ہر میدان میں فتح دی ہے۔ تم اس دیوار کو بھی توڑ لو گے۔ اپنے اللہ کے نام پر قربان ہو جاؤ۔ یہ وہ دشمن ہے جس نے اسلام میں باطل کی آمیزش کر دی ہے۔

سلطان نے اپنی فوج کو جوش دلایا اور محاصرہ اُٹھا کر فوج کو شہر کے دروازوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اُس نے درخت کٹوائے اور ان کے سیدھے اور مضبوط تنے کاٹ کر دو دو ہاتھیوں کے درمیان سیدھے باندھ دیئے۔ ہاتھی دوڑتے ہوئے دروازے تک جاتے تھے تو شہتیر دروازے سے ٹکراتے تھے۔ بیلوں کو بھی استعمال کیا گیا۔ انسانوں نے بھی دروازے توڑنے کی کوشش کی اور جانیں قربان کرتے گئے۔ یہ سلسلہ تین روز چلتا رہا۔ ہر دروازے کے اُوپر تیروں کا مینہ برسایا گیا۔

تکبیر کے نعروں میں دروازوں کے ساتھ ہاتھی ٹکراتے اور زخمی ہو کر بھاگتے رہے۔ اندر کی فوج کی توجہ دروازوں کی طرف کر کے دیوار میں شگاف ڈالنے کی بھی کوشش ہوتی رہی۔ شہر کے اندر شہریوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ وہ نعروں اور دروازوں کے دھماکوں سے خوف زدہ ہوئے جا رہے تھے۔

دو مؤرخ عطبی اور عنصری لکھتے ہیں کہ اندر مسلمانوں (غیر قرامطیوں) کو جب پتہ چلا کہ حملہ آور غزنی کے مسلمان ہیں تو انہوں نے اندر سے دروازے کھولنے کیلئے ہلّہ بول دیا لیکن سب کو قتل کر دیا گیا۔

آخر چوتھے روز داؤد بن نصر نے گھبرا کر سلطان محمودؒ کو پیشکش کی وہ بیس ہزار درہم سالانہ ادا کرتا رہے گا اور اُس کی اطاعت قبول کرے گا۔ بعض مؤرخوں نے یہ رقم بیس لاکھ لکھی ہے۔ سلطان محمود نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ اُس نے دروازوں پر ایک ہلّہ بولا اور دو تین دروازے توڑ لیے۔ قرامطیوں نے اپنے عقیدے کے تحفظ کے لیے خون کی بے دریغ قربانی دی۔ انہوں نے ملتان کی گلیوں میں مسلمانوں کے ساتھ

زندگی کا آخری معرکہ لڑا۔ اُن کی عورتیں اور بچے بھی لڑے، لیکن مسلمانوں کے قہر کے آگے فنا ہوتے گئے۔

عطبی اور عنصری لکھتے ہیں۔ سلطان محمود کو جب پتہ چلا کہ مسلمانوں نے اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور قرامطیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، تو اُس نے تلوار نکال لی اور قرامطیوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ شہر کے مغربی طرف لوہاری دروازے سے قرامطیوں کا خون ندی کی طرح بہہ نکلا۔ سلطان محمود نے اتنے قرامطی قتل کیے کہ اس کے بعد اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا۔ اُنگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔ ہاتھ خون سے دستے کے ساتھ چپک بھی گیا تھا۔ اُس کا ہاتھ دستے سمیت گرم پانی میں رکھا گیا تو اُس کی انگلیاں کھلیں۔"

داؤد بن نصر لاپتہ ہو گیا۔ بہت تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ سے ہی لاپتہ ہو گیا اور قرامطی فرقہ ایک بھولی بسری کہانی بن کے رہ گیا۔ سلطان محمود نے قرامطیوں کی عبادت گاہ کو زمین سے ملا دیا تھا۔

عالم، درویش اور اُن کے گروہ کا کوئی آدمی زندہ نہ رہا۔

ملتان میں قرامطیوں کے نشان اور یادگاریں مٹا کر سلطان محمود نے ملتان کو اپنا مستقل اڈہ بنانے کا منصوبہ بنایا مگر غزنی سے ایک قاصد آیا جسے ہرات کے گورنر ارسلان جاذب نے بھیجا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ کاشغر کے بادشاہ ایلک خان نے غزنی کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے۔ سلطان محمود سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

اُس نے ابوعلی سنجوری کو ملتان کا امیر (گورنر) مقرر کیا اور بھیرہ پہنچا۔ وہاں اُسے پتہ چلا کہ سکھ پال نے اسلام قبول کر لیا ہے اور وہ اب سلطان محمود کا مرید اور غلام بنا رہے گا۔ سلطان محمود کا دماغ اب غزنی پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سکھ پال کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ سلطان کو کہا گیا کہ سانپ کے بچے پر بھروسہ نہ کرے لیکن وہ نہ مانا اور غزنی کے لیے روانہ ہو گیا۔

سکھ پال آستین کا سانپ ثابت ہوا۔

جب دشمن پر اعتبار کیا

سُلطان محمود غزنوی نے راجہ انند پال کو شکست دی اور اپنی راجدھانی میں جانے کی بجائے کشمیر کے کسی مقام پر چلا گیا۔ پھر محمود غزنوی نے بھیرہ کے راجہ بجی راے کو ایسی شرمناک شکست دی کہ اس ہندو راجے نے خود کشی کر لی۔ اس کے بعد سلطان نے قرامطی فرقے کو ختم کر کے اسلام کے چہرے سے یہ بدنما داغ دھو ڈالا اور ملتان کی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود غزنوی اپنی جس کامیابی پر بہت خوش تھا، وہ انند پال کے بیٹے سکھ پال کا قبولِ اسلام تھا۔ سکھ پال تو لاہور سے بڑے طمطراق سے بھیرہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اُس کی ماں نے اِس امید پر اُسے بھیرہ بھیجا تھا کہ وہ محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لائے گا اور اپنے باپ کا جانشین بنے گا، لیکن اُسے سلطان محمود غزنوی کے آگے نہ صرف ہتھیار ڈالنے پڑے بلکہ اُس نے اپنا مذہب بھی سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔

سکھ پال نے مولوی سعید اللہ قاسمی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اس عالم نے سکھ پال کا نام نواسا شاہ رکھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے مشیروں کے منع کرنے کے باوجود اس نومسلم کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ امیر کی حیثیت آج کے گورنر کی ہُوا کرتی تھی۔

راجہ انند پال اور اُس کے بیٹے سکھ پال کو ہندوستان میں یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہ خاندان پنجاب کا حکمران تھا اور پنجاب ہندوستان کا دروازہ تھا۔ پنجاب کی اہمیت سے سلطان محمود واقف تھا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ہندوستان کا دروازہ توڑ لیا تھا مگر اُسے اس دروازے میں داخل ہوتے ہی غزنی واپس جانا پڑا کیونکہ

اُسے اطلاع ملی تھی کہ کاشغر کے حکمران ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔
اُس نے ملتان سے روانہ ہوتے ہی تیز رفتار قاصد کو اس حکم کے ساتھ بھیرہ بھیجا کہ وہاں کا امیر نواسا شاہ (سابق سکھ پال) اور فوج کے سالار اور نائب سالار اُسے بھیرہ کے باہر دریائے چناب پر ملیں۔ ملتان کے امیر ابوعلی سنجوری اور ملتان میں رہنے والی فوج کے سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ ساتھ لے آیا تھا۔
سلطان محمود جب بھیرہ کے قریب سے گزر کر دریائے چناب کے کنارے پہنچا تو جن لوگوں کو اُس نے بلایا تھا، وہ وہاں موجود تھے۔ سب کو توقع تھی کہ سلطان وہاں کھانے کے لیے رُکے گا۔ انہوں نے دریا کے کنارے کھانے کا انتظام کر دیا تھا لیکن سلطان نے کھانے کی طرف دیکھا تک نہیں گھوڑے سے اُترا اور سب کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔
"میں ہندوستان سے اتنی جلدی واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا" ___ اُس نے کہا ___ "آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیوں آیا تھا، پھر بھی آپ کو یاد دلا دیتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد آپ میں سے کوئی ہندوستان کے طلسم میں گرفتار ہو جائے۔ ہم یہاں اسلام کے سُوکھے پیڑ کو ہرا بھرا کرنے آئے ہیں ہم یہاں اُس خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہم یہاں کے لوگوں کو بتانے آئے ہیں کہ خدا پتھر کے نہیں ہُوا کرتے۔ ہم اپنے رسولِ مقبول صلعم کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب یہ پیغام مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا رہا۔ اسلام پھیلتا پھولتا رہا مگر بادشاہی کا نشہ جب طاری ہُوا تو یہ مشعل ٹمٹمانے لگی اور اس کے نیچے اندھیرا ہو گیا....
"ہندوستان میں بھی یہ مشعل آئی تھی۔ محمد بن قاسم نے اِس سرزمین کو خدا کے نُور سے منوّر کر دیا تھا مگر یہاں کے آسمان نے وہ وقت بھی دیکھا کہ یہاں مسجدیں ویران اور اذانیں خاموش ہو گئیں۔ بُت پرستوں نے مسلمانوں کو تلوار کی نوک پر ہندو بنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ زمین تنگ ہو گئی۔ مسجدوں کی جگہ بُت خانے اُبھر آئے۔ تلوار کے ساتھ دولت اور عورت کو بھی اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی

دو چیزیں ہیں جو ایمان خرید لیا کرتی ہیں اور انہی دو چیزوں نے ہندوستان میں ایمان فروش پیدا کیے ہیں .....

" اور بادشاہی کی ہوس نے ہمارے بھائیوں کو اندھا کر دیا ہے۔ کاشغر کے ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔ مَیں جانتا ہوں اُس کے دوست کون ہیں۔ وہ سب ہمارے دشمن نہیں اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ میرے عزم اور میرے نظریات سے اچھی طرح آگاہ ہیں لیکن وہ اُن دھتکارے ہوئے لوگوں میں سے ہیں جن کے دماغوں، آنکھوں اور کانوں پر خدا نے مُہریں لگا دی ہیں اور اُن کے لیے بخشش کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنی رعایا کو بتاتے ہیں کہ یہی اسلام ہے جس کے وہ پیروکار ہیں اور مذہب کے پردے میں اپنے تخت و تاج کی سلامتی کے لیے لوگوں کو خانہ جنگی پر اُکساتے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بناتے ہیں ......

" وہ اگر سچّے اسلام کے شیدائی ہوتے تو میرا ساتھ دیتے اور ہندوستان کی طرف کوچ کرتے جہاں مسلمانوں پر عرصہ حیات صرف اس لیے تنگ کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ میری نظریں مستقبل میں بہت دُور تک دیکھ رہی ہیں۔ اگر ہم نے اس خطّے میں اسلام کو زندہ نہ کیا تو یہاں ہندوؤں کے ہاتھوں ہمیشہ اللہ کا نام لینے والوں کا قتلِ عام ہوتا رہے گا۔ انہیں مُورتیاں اور بُت پوجنے والوں سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انہیں ہم اپنے ملک میں لے چلیں لیکن یہ شکست اور پسپائی ہوگی اور اس اقدام سے اسلام کی سلطنت سکڑتی جائے گی۔ ہر ملک خُدا کی سرزمین ہے، اور جو سرزمین خدا کی ہے وہاں اُس کی ذاتِ باری کے پرستاروں کا وجود لازمی ہے۔ اسلامی سلطنت کی کوئی سرحد نہیں۔ ہم ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں شامل کریں گے یا اس کے کچھ حصّے میں اپنی حکومت قائم کر کے اسے اسلام کا مستقر اور قلعہ بنائیں گے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم روزِ محشر خدا کے حضور سرخرو نہیں ہوں گے ....

" آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے اپنے بھائی میرے راستے میں حائل

ہو گئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں غزنی سے زندہ واپس آسکوں گا یا نہیں۔ اگر میں نہ آسکا تو یہ آپ کا فرض ہو گا کہ میں نے جس مہم کا آغاز کیا ہے اُسے آپ سر کریں...... اگر آپ دنیاوی جاہ و حشمت میں پڑ گئے تو سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا...... بُتوں کے آگے اپنے خدا کو شرمسار نہ کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس خطّے میں صدیوں بعد اذانیں گونجنے لگی ہیں۔ اِن اذانوں کو خاموش نہ ہونے دینا۔"

سلطان محمود غزنوی کی آواز آخر میں آکر رِقّت میں دب گئی۔ اُس نے کھانا نہ کھایا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس نے فوج کو کوچ سے روکا نہیں تھا۔ فوج دریا پار کر رہی تھی۔ اُسے بہت جلدی غزنی پہنچنا تھا۔

محمود غزنوی جن فوجی حکام اور اُمرا کو پیچھے چھوڑ گیا تھا، اُن میں نومسلم نواسا شاہ بھی تھا۔ محمود غزنوی فارسی زبان میں بول رہا تھا، اس لیے ایک ترجمان نواسا شاہ کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اُسے اُس کی زبان میں بتاتا جائے کہ سلطان کیا کہہ رہا ہے۔ جب سلطان چلا گیا تو سب وہاں سے شہر کی طرف چل پڑے۔ نواسا شاہ پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ساتھ کسی نے بات کرنے کی کوشش کی بھی تو اُس نے مسکرانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

لاہور میں اُس کی ماں، رانی پریم دیوی اپنے محل کے ایک کمرے میں اُداس بیٹھی تھی۔ اُس کے خواب بھیرہ کے میدانِ جنگ میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اُس کا بیٹا بھیرہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ وہ تو راجکمار تھا۔ پریم دیوی کے آنسو بہنے لگے۔ اُس کا خاوند انندپال کشمیر بھاگ گیا تھا۔ وہ شاید اس لیے واپس نہیں آرہا تھا کہ محمود غزنوی لاہور پر حملہ کر کے قابض ہو چکا ہو گا۔ رانی پریم دیوی کو یہ غم کھا رہا تھا کہ اُس کی سوکن کا بیٹا ترلوچن پال باپ کی گدی کا جانشین ہو گا...... کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رانی نے دیکھا اُس کا سینا پتی راج گوپال آیا تھا۔

"بھیرہ سے میرے راجکمار کی کوئی خبر آئی ہے؟" رانی پریم دیوی نے پوچھا۔" اُس سے

یہ پلیچھ مسلمان نہ جانے کیسے کیسے نیچ کام کرا رہے ہوں گے۔ اُسے انہوں نے قید خانے میں ڈال رکھا ہو گا۔ اُسے جانوروں جیسی خوراک دیتے ہوں گے" — اُس کے آنسو بہنے لگے۔ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی — "وہ میرے بیٹے کو قتل کر چکے ہوں گے"۔

راج گوپال سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ شکست خوردہ سیناپتی (سپہ سالار) تھا۔ بھیرہ کی لڑائی سے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور لاہور پہنچا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں راج گوپال؟" — رانی نے اُسے غصے سے کہا — "تم میرے بیٹے کو قید سے چھڑا نہیں سکتے؟ کیا تم اپنی فوج کے ایک سو آدمی ایک راجکمار کے لیے قربان نہیں کر سکتے؟ کیا ہماری فوج میں راج دربار کی عزت پر قربان ہونے والے سپاہی نہیں ہیں؟ کیا وہ مسلمانوں کے بھیس میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے جہاں میرا راجکمار قید ہے؟" اُس نے ذرا دبی زبان میں کہا — "کیا تم بھول گئے ہو کہ وہ مہاراج انندپال کا نہیں تمہارا بیٹا ہے"؟

"میں کچھ بھی نہیں بھولا رانی!" — راج گوپال نے کہا — "میں سب کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں نے راجکمار کو بھیرہ سے اغوا کر لانے کے لیے آدمی تیار کر لیے تھے لیکن بہت بری خبر آئی ہے"۔

"کیا خبر آئی ہے؟" — رانی پریم دیوی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"سکھ پال اب سکھ پال نہیں رہا" — راج گوپال نے کہا — "وہ نواسا شاہ بن چکا ہے"۔

"کیا اُسے زبردستی ....؟"

"ہاں رانی!" — راج گوپال نے کہا — "اُسے مسلمان بنا لیا گیا ہے اور محمود نے اُسے یہ انعام دیا ہے کہ اُسے بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ لاہور کی گدی کا جانشین نہیں بن سکا، بھیرہ کا حاکم بن گیا ہے"۔

"وہ مر جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا" — رانی نے آہ بھر کر کہا — "اُسے مر جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنا مذہب نہ چھوڑتا .... کیا یہ پتہ نہیں چلا کہ اُس نے اپنی مرضی سے اپنا

مذہب چھوڑا ہے یا زبردستی اُسے مسلمان بنایا گیا ہے ؟"

" اگر اُس پر زبردستی کی جاتی تو اُسے بھیرہ کا امیر نہ بنایا جاتا"۔۔۔ راج گوپال نے کہا"۔۔ وہ نوجوان ہے ۔مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے"۔

" یہ تمہارا پاپ ہے"۔۔ رانی پریم دیوی نے کہا۔۔"تم اُسے قید میں چھوڑ کر خود بھاگ آئے تھے"۔

" کیا تم ساتھ نہیں تھیں"؟۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔"تم نے اپنی آنکھوں میدانِ جنگ دیکھا ہے ۔ہم پر دریا کی طرف سے جو حملہ ہُوا تھا، اس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی ۔ رانی ! میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمیں بھیرہ پر حملہ نہیں کرنا چاہیئے ۔تمہارا خیال تھا کہ مسلمانوں کی آدھی فوج کٹ چکی ہے اس لیے مقابلہ نہیں کر سکے گی ۔میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری فوج پر مسلمانوں کی دہشت طاری ہے اور یہ پشاور سے بھاگی ہُوئی فوج ہے ۔اِس فوج کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارا راجہ بھگوڑا ہے ۔ وہ ابھی تک اپنی راجدھانی میں واپس نہیں آیا"۔

" مجھے اس مہاراجہ کی رانی کہلاتے ہوئے شرم آتی ہے"۔۔۔ رانی نے کہا۔۔۔ " اگر وہ مرگیا تو مَیں چِتا نہیں چڑھوں گی ۔میں ایک بھگوڑے خاوند کی چِتا پر اپنے آپ کو نہیں جلاؤں گی"۔

" یہ مَیں پہلے ہی سوچ چکا ہوں"۔۔ راج گوپال نے کہا"۔ اگر مہاراج کے خاندان نے تمہیں زبردستی چِتا چڑھایا تو مَیں تمہیں بچا کر اتنی دُور لے جاؤں گا جہاں ہم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا"۔

" تم بھی اتنے بہادر نہیں رہے کہ مَیں تمہارے بھروسے کوئی بات کروں" ۔۔۔رانی پریم دیوی نے آہ لی۔"تم نے میری محبت کی بھی پرواہ نہ کی ۔مَیں اپنے مہاراجہ خاوند کو تمہاری خاطر دھوکہ دے رہی ہوں ۔کیا راج دربار کا کوئی آدمی خواہ وہ کتنے ہی اونچے رُتبے کا ہو، ایک رانی کے کمرے میں اس طرح آسکتا ہے جس طرح تم آتے ہو ؟ سینا پتی کو ہم اتنا بڑا آدمی نہیں سمجھا کرتے"۔

" کیا تم احسان جتا رہی ہو رانی ؟"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔"تم بھی بہت کچھ بھول

رہی ہو۔ مَیں نے تمہاری محبت کی خاطر یہ خطرہ مول لیا تھا کہ بھیرہ پر جا حملہ کیا اور ذلیل و خوار ہوا۔ تمہارے حکم سے فوج کو شہر سے باہر نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ مہاراج آ گئے تو مَیں انہیں کیا جواب دوں گا؟ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"مَیں زندہ رہی تو تم بھی زندہ رہو گے"۔ رانی نے کہا۔ "مہاراج کو مَیں جواب دوں گی۔ تم راجکمار سکھ پال کو بھیرہ سے نکال لنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے جس آدمی نے خبر دی ہے کہ سکھ پال مسلمان ہو گیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ اُس نے اپنی مرضی سے اور خوشی سے اسلام قبول کیا ہے"۔ راج گوپال نے کہا۔ "اسی لیے اُسے بھیرہ کا امیر بنایا گیا ہے۔"

"اُسے اغوا کراؤ"۔ رانی نے کہا۔ "اُسے یہاں تک لے آؤ۔ اُس نے میرا دودھ پیا ہے۔ میرے دودھ میں ملاوٹ نہیں تھی۔ اُسے ہندو ماں کا دودھ مسلمان نہیں رہنے دے گا۔ اُسے لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مہاراج مجھے اور تمہیں شکست معاف کر دیں گے، یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ راجکمار مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اُن کا مذہب قبول کر کے انہی کا ہو کے رہ جائے۔ اگر میری اور اپنی خیر چاہتے ہو تو سکھ پال کو بہلا پھسلا کر لاؤ یا اسے اغوا کر کے لاؤ۔ خود جاؤ۔ جان پر کھیل جانے والے فوجی تیار کرو۔ یہ کام کرنا ہے۔ وہ تمہارا خون ہے۔ وہ اُس عورت کا بیٹا ہے جس نے تمہاری خاطر اپنے خاوند کو دھوکہ دیا ہے.... مَیں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے میرے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ خاوند شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور بیٹا مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا ہے میں پاپی ہوں۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اپنے راجکمار کو مَیں خود لاؤں گی۔ نہ لا سکی تو وہیں مر جاؤں گی۔"

"یہ میرا کام ہے"۔ راج گوپال نے کہا۔ "اتنا مت تڑپو۔ مَیں انتظام کرتا ہوں۔ مَیں اُسے لے آؤں گا۔"

بھیرہ میں ایک سالار کے گھر میں محمود غزنوی کی فوج اور شہری انتظامیہ کے

چار پانچ حکام بیٹھے تھے۔

"ہم پر سلطان بڑی نازک ذمہ داری ڈال گئے ہیں"۔ سالار نے کہا۔"ہمیں نے لاہور کے جاسوسوں کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا ہے۔ راجہ انند پال ابھی تک لاہور میں نہیں آیا۔ وہ ہمارے ساتھ ٹکر لینے کی تیاریاں کر رہا ہو گا"۔

"سب سے زیادہ نازک ذمہ داری تو یہ ہے کہ سلطان ایک نومسلم کو یہاں کا امیر مقرر کر گئے ہیں"۔ نائب سالار نے کہا۔"کیا ہمیں اس امیر پر اعتماد کرنا چاہئے"؟

"اگر آپ سانپ کی کینچلی بدل دیں تو وہ سانپ ہی رہے گا، اُس کی فطرت نہیں بدلے گی"۔ شہری انتظامیہ کے ایک حاکم نے کہا۔"آپ لوگ غزنی سے آتے ہیں۔ مَیں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ ہندو کو مسلمان بنا سکتے ہیں لیکن اُسے مسلمانوں کا دوست نہیں بنا سکتے۔ بھیرہ میں کئی ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن وہ عام اور بے ضرر لوگ ہیں۔ وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ مَیں تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک راجکمار جس کے دادا کو آپ نے شکست دی اور اس نے خودکشی کر لی اور جس کے باپ کو آپ نے شکست دی اور وہ ابھی تک روپوش ہے، اس راجکمار کے دل سے آپ انتقام کی آگ کس طرح سرد کر سکتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ محمود جیسے دانشمند سلطان نے کیا سوچ کر ایک ایسے نومُسلم کو اتنا بڑا اعزاز دے دیا ہے"۔

"یہ نومُسلم اپنی عادتیں کس طرح بدل سکے گا"۔ ایک اور نے کہا۔"یہ شراب کا عادی ہو گا۔ ان کے ہاں ہر رات ناچ گانے ہوتے ہیں اور جوان لڑکیاں ان کی خدمت میں موجود رہتی ہیں کیا یہ اتنی جلدی مومن بن گیا ہو گا؟"

"ہم اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے"۔ سالار نے کہا۔"سلطان کا حکم ہے کہ امیر کی اطاعت کرو"۔

"لیکن اسلام کا حکم یہ ہے کہ امیر گناہ کرے یا غدّار ثابت ہو تو اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دو"۔ ایک اور حاکم نے کہا۔"اور اُس کی جگہ اُسے دو جو مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے اِس رُتبے اور ذمہ داری کے اہل ہو"۔

"تو ہمیں نظر رکھنی پڑے گی کہ امیر نواساشاہ ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہا"۔ سالار نے کہا۔" اُس کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کے تمام ہندو جنگی قیدیوں کو باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا گیا ہے ۔ انہوں نے میری موجودگی میں سلطان محمود کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے"۔

"ہندو سپاہی کیسے ہیں؟"۔ ایک شہری حاکم نے پوچھا۔

"اچھے ہیں"۔ سالار نے جواب دیا "ہمارے سپاہیوں کے ساتھ مل کر اور اچھے ہو جائیں گے ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ کچھ فوج سلطان اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر انند پال نے حملہ کر دیا تو ہماری فوج اتنی تھوڑی ہے کہ مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ سلطان اجازت دے گئے ہیں کہ ہندوؤں کو فوج میں شامل کر لیا جائے اور ان کی تنخواہیں زیادہ مقرر کی جائیں اور انہیں مراعات بھی زیادہ دی جائیں"۔

یہ محفل کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہو گئی۔

نواساشاہ نے اپنی عادتیں بدل لی تھیں ۔ اُس نے کبھی شراب کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ مولوی سعید اللہ قاسمی اُسے قرآن پڑھاتے اور معنی بھی سمجھاتے تھے۔ اُس نے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا۔ ایک روز اُس نے اُن پانچ ہزار ہندوؤں کو ایک میدان میں لانے کا حکم دیا جو اُس وقت تک سلطان محمود کی فوج کا اہم حصہ بن چکے تھے۔

"میں تم میں سے کسی کو کبھی نہیں کہوں گا کہ وہ اپنا مذہب بدل لے اور مسلمان ہو جائے"۔ اُس نے ہندوؤں کے دستوں سے خطاب کیا۔"مذہب تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام قبول کر کے جو سکون پایا ہے وہ مجھے ہندو مت میں نہیں ملا تھا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں نے مسلمانوں سے کس طرح شکست کھائی ہے۔ تم قلعہ بند ہو کر بھی نہ لڑ سکے اور تم کھلے میدان میں بھی نہ لڑ سکے حالانکہ مسلمان بہت دُور سے آئے تھے اور اِن کے پاس نفری بھی کم تھی اور سازوسامان بھی کم تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں یہاں سے کوئی

مدد نہیں ملے گی مگر انہوں نے فتح حاصل کرلی۔ یہ ایمان کی قوّت ہے جو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں تھی .....

"میں نے وہ قوّت حاصل کرلی ہے۔ مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنا مذہب بار لنے کے لیے کوئی نہیں کہے گا۔ یہ فیصلہ تم خود کرو۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس کا نمک کھایا ہے ہو اُس کے ساتھ غدّاری نہ کرنا۔ مَیں نے تمہیں بہت بڑی غلامی سے بچایا ہے۔ تم جنگی قیدی بنے پھر غلام بنا لیے گئے۔ سلطان تمہیں غلاموں کی حیثیت سے غزنی لے جانا چاہتے تھے۔ بھیرہ سے ملتان تک کا سفر یاد کرو جب تم گھوڑوں اور بیلوں کی طرح رسد کی گاڑیاں دھکیلتے اور گھسیٹتے گئے تھے۔ تمہاری گردنوں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ مَیں نے وہ کڑے کٹوا کر تمہیں مویشی سے انسان بنا دیا ہے۔ تم سپاہی ہو، جنگجو ہو۔ تمہاری عزّت اِسی میں ہے کہ تمہاری تلواریں تمہارے پاس ہوں۔ اپنی عزّت کو قائم رکھنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف ہو، کسی مسلمان کے خلاف کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔ اگر تم سچّے ہندو ہو تو سچّے بن کر دکھانا۔ میرا باپ مہاراجہ انندپال ہم پر حملہ کریگا۔ تم دیکھنا کہ مَیں اپنے باپ کے خلاف کس طرح لڑوں گا!"

اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ کئی آوازیں سنائی دیں ۔ "ہم غدّاری نہیں کرینگے۔ ہم مسلمانوں پر ثابت کریں گے کہ ہندو دھوکہ نہیں دیا کرتے۔"

نواسا شاہ کے حکم سے ہر ہندو فوجی کو چاندی کے دس دس درہم انعام دیا گیا۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سُکھ پال نے اسلام قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ بھیرہ کا مندر ہندوؤں کی عبادت کے لیے محفوظ رہنے دیا جائے یا سلطان محمود نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مندر کو نہیں چھیڑا تھا۔ اُسے شاید اپنی فوج کی کمی کا احساس تھا اس لیے اُس نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا تھا۔ بہرحال بھیرہ کا مندر محفوظ تھا۔

اُس رات مندر میں چھ اجنبی پنڈت کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پنڈت انہیں کہہ رہا تھا "قتل کرنا آسان ہے۔ وہ کبھی کبھی شہر سے باہر بھی جایا کرتا ہے۔ ایک تیر کافی ہے۔ اگر قاتل پکڑا گیا تو ہم اس ایک آدمی کی قربانی دے سکتے ہیں۔"

"ہم اُسے قتل کرنے نہیں آئے"۔ ایک اجنبی نے کہا۔ "اُسے اغوا کرکے لاہور لے جانا ہے۔ اس کی ماں اسے زندہ اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔"

"میں بھی اُسے زندہ ہی دیکھنا چاہتا ہوں"۔ پنڈت نے کہا "لیکن ہندو کے روپ میں۔ میں اسے نواسا شاہ سے پھر سُکھ پال بنانے کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ اُس نے اپنی فوج کی ہی توہین نہیں کی، اپنے مذہب کو ناپاک کر دیا ہے۔ ہم نے ہزاروں مسلمانوں کو ہندو بنایا ہے۔ اگر ہندو راجے مہاراجے مسلمان ہونے لگے تو یہ مندر کھنڈر بن جائیں گے اور دیوی دیوتاؤں کا ہم پر قہر نازل ہوگا۔"

"آپ ہماری راہنمائی کریں"۔ ایک اجنبی نے کہا۔ "ہمیں بتائیں کہ سُکھ پال کب شہر سے باہر نکلے گا، یا اُسے شہر سے باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ پیدا کریں.... کیا آپ اسے کسی جال میں لا سکتے ہیں؟"

پنڈت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "ہاں میں ایک جال تیار کر سکتا ہوں۔ تم مندر میں ہی ٹھہرے رہو۔ یہاں تم پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ ایک دو دن انتظار کرو.. میں حیران ہوں کہ وہ اتنی جلدی اتنا پکا مسلمان کس طرح بن گیا ہے۔"

"کچھ ذہن کا جوان آدمی ہے"۔ ایک آدمی نے کہا۔ "مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محمود اسے یہاں کے ہندوؤں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرے گا ورنہ غزنی کا سلطان ایسی حماقت نہیں کر سکتا کہ کل جس نے اُس سے لڑکر ہتھیار

ڈالے ہوں اور اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا ہو۔ اُسے محمود اتنے بڑے علاقے کا حکمران بنا دے۔ اپنے مذہب اور ملک کے لیے سُکھ پال کو یہاں سے غائب کرنا لازمی ہے خواہ ہماری جانیں چلی جائیں۔"

ان چھ آدمیوں کو راج گوپال اور راجہ انند پال کی رانی پریم دیوی نے سُکھ پال کے اغوا کے لیے بھیجا تھا۔ یہ لاہور کی فوج کے چنے ہُوئے بہادر اور ذہین آدمی تھے۔ رانی نے انہیں سونے کی صورت میں انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہ کامیابی کی صورت میں انہیں دو راتیں راج محل میں رکھا جائے گا جہاں وہ ویسی ہی عیش و عشرت کریں گے جیسی مہاراجے کرتے ہیں۔ انعام کے لالچ کے علاوہ ان چھ آدمیوں میں مذہب کا جنون پیدا کیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ہندو راجکمار کو مسلمانوں کے قبضے سے نہ چھڑا سکے تو دیوتاؤں کا قہر انہیں بھسم کر ڈالے گا۔

یہ چھ آدمی خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ درویشوں کے لباس میں بھیرہ میں داخل ہُوئے اور رات کے اندھیرے میں مندر میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے پنڈت کو بتایا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ نواسا شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اُسے اٹھا لے جانے کو تیار ہیں۔ پنڈت نے انہیں روک دیا تھا کیونکہ اس طریقے سے کامیابی کا کم اور مارے جانے کا خطرہ زیادہ تھا۔ پنڈت نواسا شاہ کو کسی پھندے میں لانے کی سوچ رہا تھا۔

دو تین روز بعد پنڈت کو پتہ چلا کہ امیرِ بھیرہ کہیں سے واپس آتے ہُوئے مندر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ پنڈت مندر سے نکلا اور راستے میں کھڑا ہو گیا۔ نواسا شاہ گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ دو گھوڑ سوار جو محافظ تھے، اُس کے آگے آگے تھے اور چار گھوڑ سوار اُس کے پیچھے تھے۔ پنڈت اور آگے ہو گیا۔ آگے والے محافظوں نے اُسے پیچھے ہٹ جانے کو کہا لیکن وہ نہ ہٹا۔ اس نے نواسا شاہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر تعظیم میں جھک کر دوہرا ہو گیا۔ نواسا شاہ نے گھوڑا روک لیا۔ پنڈت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نواسا شاہ کو سلطان محمود غزنوی نے خاص طور

پر کہا تھا کہ وہ چونکہ ہندوستانی ہے اور ہندو بھی رہا ہے اس لیے وہ یہاں کے لوگوں، خصوصاً ہندوؤں کی فطرت اور عادات سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ وہ بھیرہ اور گردو نواح کے لوگوں سے ملتا ملاتا رہے اور ان کی شکایتیں سُنے اور انہیں ہر لحاظ سے مطمئن اور خوش رکھے تاکہ یہاں کے لوگ اپنے آپ کو غلام رعایا نہ سمجھیں۔

اسی ہدایت کے تحت نواسا شاہ باہر نکلا تھا۔ وہ وہاں کے کسانوں سے مل کر آ رہا تھا پنڈت کو اُس نے راستے میں ہاتھ جوڑے کھڑا دیکھا تو وہ گھوڑے سے اتر آیا اور پنڈت سے پوچھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے؟

پنڈت نے اُسے دعائیں دے کر کہا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے جو بہتر سمجھا وہ کیا ہے۔ ہم سلطان محمود غزنوی کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی قدر کی اور آپ کو یہاں کی حکمرانی عطا کر دی۔"

"اس کے علاوہ آپ کو کچھ کہنا ہے؟"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "اپنی اور سلطان کی تعریفیں سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ اپنی کوئی شکایت، کوئی تکلیف، کوئی مسئلہ بیان کریں۔"

"کوئی شکایت نہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "ایک عرض ہے۔ حضور ہر جگہ جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں کی مسجدوں میں بھی گئے ہیں لیکن آپ مندر کو بھول گئے ہیں۔ کبھی وہاں بھی آئیں۔"

"مندر کی مرمّت کی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہیں حضور!"۔ پنڈت نے کہا۔ "کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اسے شکایت سمجھیں، جو کچھ بھی سمجھیں، بات یہ ہے کہ شہر کے سر کردہ ہندو کہتے ہیں کہ امیر ہر جگہ جا کر لوگوں کی شکایتیں سنتے ہیں، مندر میں نہیں آتے۔ شاید ہمیں پسند نہیں کرتے۔"

"میں کسی روز آؤں گا"۔ نواسا شاہ نے کہا۔

"دن اور وقت بتا دیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "ہم آپ کے رتبے کے مطابق کوئی انتظام کر لیں گے۔ دست بستہ حاضر رہیں گے۔"

نواساشاہ نے سوچ کر تین روز بعد کا دن اور وقت بتا دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ پنڈت مندر میں گیا۔ لاہور سے آئے ہوئے چھ آدمی اس کے انتظار میں تھے۔ پنڈت نے انہیں بتایا کہ سکھ پال فلاں دن مندر میں آ رہا ہے اور وہ اس کے لیے جال تیار کرے گا۔

"لیکن تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑے گا" پنڈت نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں نے جو سوچا ہے، وہ میری امید کے مطابق پورا نہ ہو۔ میری ایک کوشش ہے سکھ پال جوان آدمی ہے۔ میں ان مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں اور عادتوں سے واقف ہوں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں مہاراجوں والی عیش و عشرت حرام ہے۔"

وہ دن آ گیا جس دن نواساشاہ کو مندر میں جانا تھا۔ مندر کے دروازے پر پنڈت نے پھولوں کے لمبے لمبے ہار لٹکا رکھے تھے۔ مندر کے ایک بڑے کمرے کو عروسی کے کمرے کی طرح سجایا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو تھی جو نشے کی کیفیت طاری کرتی تھی۔ پھل اور میوے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ چار نوعمر لڑکیاں کمرے میں کھڑی تھیں۔ نواساشاہ اس کمرے میں داخل ہوا تو لڑکیوں نے خوشنما ٹوکریاں اٹھائیں اور نواساشاہ کے قدموں میں پھولوں کی پتیاں ٹوکریوں میں سے نکال کر پھینکنے لگیں۔ ان لڑکیوں کے بال کھلے ہوئے اور ان کے عریاں کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب ذرا سا جھک کر پھول نچھاور کرتی تھیں تو ان کے جسم پھولدار پودوں کی طرح لہلہاتے تھے۔ ان کے لباس عام ہندو لڑکیوں سے بہت مختلف تھے۔ وہ کسی اور ہی دیس کی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لبوں پر تبسم تھا۔

نواساشاہ کی نظریں ان لڑکیوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ پنڈت نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس نے اس راجکمار کی دکھتی رگ اپنے ہاتھ میں لینے کا اہتمام کر رکھا تھا اور یہ اہتمام اثر دکھا رہا تھا....

فرشی دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر مخمل کی چادریں بچھی تھیں۔ گول تکیے رکھے تھے۔ ان

کے غلاف بھی مخمل کے تھے۔ مختصر یہ کہ اس کمرے میں وہی سج دھج تھی جو مہاراجوں کے خاص کمروں کی ہوا کرتی تھی۔

نواسا شاہ ایک تکیے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی نے جھک کر اُس کے پاؤں پر عطر چھڑکا۔ اُس نے نواسا شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور لڑکی کے لبوں کا تبسّم حجاب سے زیادہ نکھر آیا۔ اس شرمیلے تبسّم نے نواسا شاہ کو ہلا کے رکھ دیا۔ اُس نے اپنے جذبات کی دنیا میں زلزلے کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ دوسری لڑکیوں نے اُس کے آگے پھلوں کی طشتریاں رکھیں۔

"حضور کو تو معلوم ہے کہ مندر میں ماس نہیں آسکتا۔" پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "آپ کے لیے گوشت کا انتظام کر بھی دیتے تو آپ اسے ہاتھ نہ لگاتے کیونکہ یہ مسلمانوں کی طرح ذبح کیا ہوا نہ ہوتا۔ آپ ہمارے ہاتھ کا پکا ہوا قبول بھی نہ کرتے۔ یہ پھل حاضر ہیں۔"

"آپ نے جو حاضر کیا ہے، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔" نواسا شاہ نے کہا اور اُس نے مسکرا کر اُس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے اُس کے پاؤں پر عطر چھڑکا تھا۔

میزبانوں میں ایک تو پنڈت تھا اور چھ وہ آدمی جو اُس کے اغوا کے لیے لاہور سے آئے تھے۔ وہ معزّز اور رئیس ہندوؤں کے لباس میں تھے۔ ان کے علاوہ دو اور ہندو تھے جو بھیرہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ یہ سب نواسا شاہ کے آگے بچھے جا رہے تھے۔

کمرے میں تاروں کا ترنّم نہایت آہستہ آہستہ اُبھرنے لگا۔ نواسا شاہ نے چونک کر دیکھا۔ ایک لڑکی بربط پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اُس نے اپنی زبان کا ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ اُس کی آواز میں سوز تھا۔ وہ گنگنا رہی تھی جیسے وہ ندی کنارے تنہا بیٹھی ہو اور اُسے یہ احساس ہو کہ ارد گرد کوئی تھی نہیں۔ نواسا شاہ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس پر سحر طاری ہوا جا رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خمار نظر آنے لگا تھا۔

لڑکی کی آواز جس طرح آہستہ آہستہ اُبھری تھی اسی طرح آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ نواسا شاہ کی نظریں لڑکی سے ہٹ نہ سکیں۔

"ہم نے آپ کو اِس لیے نہیں مدعو کیا تھا کہ کوئی شکایت یا کوئی اپنی ضرورت آپ کی خدمت میں پیش کریں گے"۔ پنڈت نے کہا۔"ہم اپنے انداز سے آپ سے اپنی عقیدت اور اعتماد کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اپنا وفادار سمجھیں"

"آپ کا انداز بہت حسین ہے"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ اس کا لہجہ اب مسلمانوں کے امیر کا نہیں، ایک راجکمار کا تھا۔ اُس نے کہا۔" کیا یہ لڑکی اسی قسم کا ایک اور گانا سنا سکتی ہے؟"

وہ لڑکی ایک پیشہ ور گانے والی کی بیٹی تھی لیکن نواسا شاہ کو بتایا گیا کہ ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھی، اور مندر کی داسی ہے۔ زیادہ تر بھجن گاتی ہے۔

لڑکی نے بربط کو چھیڑ کر ایک اور نغمہ شروع کیا۔ لڑکی کے گانے میں کوئی غیر معمولی کمال نہیں تھا۔ پنڈت نے ماحول ایسا طلسماتی بنا رکھا تھا کہ بھدّی آواز بھی سریلی لگتی تھی۔ نواسا شاہ ایسا مسحور ہُوا کہ اُسے پتہ نہ چلا کہ پنڈت کے سوا تمام میزبان کمرے سے نکل گئے ہیں۔

لڑکی کی آواز خاموش ہوگئی تو نواسا شاہ تصوروں کی مترنم گونج میں کھویا رہا۔ اچانک بیدار ہُوا اور بولا۔" باقی سب کہاں گئے؟"

"وہ آپ کی اس کیفیت میں مخل نہیں ہونا چاہتے تھے"۔ پنڈت نے کہا۔" میں نے انہیں اشارہ کر کے اُٹھا دیا ہے"۔

پنڈت نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا اور چاروں لڑکیاں جھک کر اُلٹے قدموں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ نواسا شاہ دیکھتا رہ گیا۔

"یہ چلی کیوں گئی ہیں؟"۔ اُس نے تشنہ سی آواز میں پوچھا۔

"مسلمانوں کے ہاں یہ راگ رنگ حرام ہے"۔ پنڈت نے کہا۔" میں نے انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو بلا لیتا ہوں"۔

"نہیں"۔ نواسا شاہ نے کہا۔" یہ راگ رنگ حرام ہے"۔

"حضور!"۔ پنڈت نے کہا۔" ایک بات کہوں۔ بری لگے تو معاف کر دینا.... آپ نے دل سے نہیں کہا کہ یہ سب حرام ہے۔ اپنے دل پر جبر نہ کریں۔ میں بوڑھا ہو

گیا ہوں۔ انسانوں کے دلوں کی بات اُن کی آنکھوں میں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ آپ نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اچھا کیا ہے۔ آپ کو اسلام کے اصولوں کی پابندی کرنی چاہیئے لیکن آپ جوان ہیں۔ اپنے دل پر پتھر نہ رکھیں، ورنہ آپ کا دل اِن پابندیوں سے باغی ہو جائے گا اور آپ کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اپنی عادتیں اور اپنی فطرت آہستہ آہستہ بدلیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یکلخت شراب بھی ترک کر دیں اور وہ عیش و عشرت بھی جس میں آپ جنے پلے اور جوان ہوئے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ماحول کو اور اِن لڑکیوں کو دیکھ کر آپ دورا ہے پر آ رُکے ہیں۔ آپ کے اندر مسلمان اور ہندو کا تصادم ہو رہا ہے۔ یہ ہوتا رہے گا اور آہستہ آہستہ ختم ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مسلمان کو ہندو پر غالب آنے دیں لیکن ہندو کو راضی رکھ کر اس سے نجات حاصل کریں۔"

نواسا شاہ پنڈت کی باتوں کے حسین جال میں آگیا تھا۔ اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا تھا۔ اُس نے بے ساختہ کہا۔ "آپ کی باتیں میرے دل میں اُتر رہی ہیں۔ صاف بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے آپ کے لیے یہ اہتمام صرف اس لیے کیا ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "آپ کی یہ ضرورت پوری ہونی چاہیئے لیکن چوری چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے کہ آپ نے مندر میں اپنے محل کی راتوں کو تازہ کیا ہے۔ آپ کو سلطان نے جو رتبہ دیا ہے اس پر مجھے فخر ہے۔ میں آپ کی پردہ پوشی کروں گا۔ آپ کی مدد بھی کرونگا کہ آپ کی جذباتی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور آپ کو مسلمانوں کی طرف سے جو نازک ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس سے بھی آپ کوتاہی اور چشم پوشی نہ کر سکیں، پھر آپ آہستہ آہستہ ذہن سے عیش و عشرت کو نکالتے چلے جائیں۔"

نواسا شاہ جوان تھا۔ چار پانچ ماہ پہلے تک وہ محلّات کی اُن عیاشیوں میں رہا تھا جنہیں جائز سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مسلمان ہو کر اپنا دل مار لیا تھا۔ مولوی سعید اللہ قاسمی اور امارت کے حکام نے اُسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نئی زندگی اور نئے مذہب کو بخوشی قبول کر چکا تھا اور اُس نے فرائض سر انجام دینے شروع کر دیے تھے مگر پنڈت نے اُس کے اِس اقدام کو سراہتے ہوئے نہایت اُستادی سے اُس

کے اندر ہندو راجکمار کو بیدار کر دیا۔ نواسا شاہ نے اتنی حسین لڑکیوں کو، اُن کے تبسّم اور اُن کے طلسماتی انداز کو دیکھا تو وہ ڈگمگانے لگا۔

"اگر میرے ماتحت حاکموں کو پتہ چل گیا تو میرا اعتماد ختم ہو جائے گا"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "وہ مجھ پر الزام عائد کریں گے کہ میں ہندوؤں کے ساتھ مل گیا ہوں"۔

"کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا"۔ پنڈت نے اُسے اپنی زنجیروں میں اور زیادہ مضبوطی سے جکڑنے کے لیے کہا۔ "میں آپ کو ذمہ داریوں سے بھی نہیں ہٹنے دوں گا اور میں آپ کو اسلام سے بھی منحرف نہیں ہونے دوں گا، لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مسلمان اُمراء بھی چوری چھپے عیاشی کرتے ہیں۔ اِن میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کی صرف ایک بیوی ہو۔ انہوں نے تین تین چار چار بیویاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ بیویاں بدلتے رہتے ہیں۔ جو پرانی ہو جاتی ہے اُس کی جگہ نئی لے آتے ہیں"۔

نواسا شاہ کے چہرے پر رونق آتی جا رہی تھی۔ پنڈت نے زہر میں بجھا ہُوا ایک اور تیر چلایا۔ اُس نے کہا۔ "آپ اپنے جن ماتحت حاکموں کی بات کر رہے ہیں، کبھی اُن کے گھروں میں جھانکیں۔ وہ اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لاتے۔ یہاں اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ بسر ہو رہی ہیں۔ وہ شراب بھی پیتے ہیں، اور صبح جب آپ کے سامنے آتے ہیں تو پکے مسلمان ہوتے ہیں"۔

"میں انہیں روک سکتا ہوں"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "مجھے سلطان نے کہا تھا کہ کسی کو عیش و عشرت میں نہ پڑنے دینا۔ کسی حاکم کا گناہ معاف نہ کرنا"۔

"اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ سازش کا شکار ہو جائیں گے"۔ پنڈت نے کہا۔ "یہ لوگ آپ پر ایسے الزام عائد کریں گے کہ سلطان محمود بھی چکرا جائے گا اور آپ کو اس جرم میں جلّاد کے حوالے کر دیا جائے گا کہ آپ نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور آپ اندر سے ہندو رہ کر سلطنت کو نقصان پہنچا رہے ہیں.... آپ نوعمر ہیں۔ انسانی فطرت کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ انسان اپنے نفس کا غلام ہے۔ اِس کی نفسیاتی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ اپنے روزمرّہ فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ آپ اپنے

اور پرہیز نہ کریں۔ کبھی کبھار یہاں آجایا کریں۔ مجھے آپ اپنا مخلص دوست پائیں گے۔"

"میں آیا ہوا تو ہوں"۔۔۔ نواساشاہ نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔" باہر آپ کے محافظ کھڑے ہیں۔ آپ کے عملے کو معلوم ہے کہ آپ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے ایک دو جاسوس بھی موجود ہوں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔ اب آپ چلے جائیں۔ رات کو اس طرح یہاں آئیں کہ کوئی آپ کو باہر نکلتے اور یہاں آتے نہ دیکھ سکے۔ آپ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہاں سے آپ کو خیریت سے واپس لے جانا میرا کام ہے۔"

"یہ لڑکیاں موجود ہوں گی؟"۔۔۔ نواساشاہ نے کہا۔" میں یہ گانا سننا چاہتا ہوں"۔

"آپ آئیں گے تو انہیں حاضر کرلیا جائے گا"۔ پنڈت نے کہا۔" اور شراب وہ پیش کروں گا جس کی بو نہیں ہوگی۔ یہ شراب راجہ بجی رائے کے لیے قنوج سے آیا کرتی تھی"۔

"میں کل رات آؤں گا"۔۔۔ نواساشاہ نے کہا۔" میں ضرور آؤں گا۔"

"وہ آئے گا"۔ پنڈت نے نواساشاہ کو اغوا کرنے والے چھ آدمیوں سے کہا ۔۔۔ "مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ کچھ پڑھا، کچھ دیکھا ہے۔ نیکی اور گناہ کے درمیان باریک سی ایک لکیر ہے۔ انسان اس پر چلتا رہتا ہے۔ اسے گناہ کی دعوت اور انگیخت نہ ملے تو اس لکیر سے اس کا پاؤں نہیں پھسلتا۔ اگر پھسلے گا تو نیکی کی طرف گرے گا، اور اگر حسین اشتعال یا انگیخت مل جائے تو اسے گناہوں کی طرف گرالینا بہت آسان ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ہم اسی حربے سے گرا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انہیں جیتی جاگتی عورت دے دی جاتے، عورت کے صرف حسین تصور سے انہیں گمراہ کیا جا سکتا ہے اور ہم ایسا کریں گے....

"میں ان والدین کی پوجا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی بیٹیاں آج مندر میں بھیج دی

تھیں۔ اپنے دھرم اور اپنے ملک کے لیے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ جو کام ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کر سکتی ہے، وہ پورا لشکر نہیں کر سکتا..... سکھ پال جوان ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس جادو سے بچ نہیں سکے گا جو میں نے اس کے لیے پیدا کیا تھا۔ آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میں نے کمرے میں جو خوشبو چھوڑی تھی اس میں ایسا اثر ہے جو انسان کے نفس کو بیدار کر دیتا ہے۔ لڑکیوں نے اپنا اثر پیدا کیا اور اس اثر کو میری باتوں نے مکمل کیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے تمام حاکم چوری چھپے عیش کر رہے ہیں اور اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ گذرتی ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ امارت میں میرے جاسوس موجود ہیں جو وہاں معمولی معمولی نوکریاں کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ سلطان محمود نے عیاشی کے مرتکب حاکم کے لیے ساری عمر کی سزائے قید مقرر کر رکھی ہے اور اُس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ جہاں کوئی گناہ ہو رہا ہو، اُسے اطلاع مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان حاکموں پر مذہبی جذبات کا غلبہ ہے۔ انہوں نے بہت بڑی فتح حاصل کی ہے۔ انہوں نے ملتان میں قرامطیوں کو ختم کر کے ہندوستان میں اسلام کو پاک کر دیا ہے۔ انہوں نے راجہ بجی رائے جیسے کٹر ہندو اور جابر جنگجو کو ایسی شکست دی ہے کہ اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ اسے مسلمان خدائی معجزہ کہتے ہیں، اور یہ ہے بھی صحیح کہ جسے ہم دھرم اور مسلمان ایمان کہتے ہیں، اگر مضبوط ہو تو معجزے رونما ہوتے ہیں مسلمانوں کا ایمان مضبوط ہے۔ اُن کے حاکم جو یہاں ہیں، وہ کوئی عیش و عشرت نہیں کرتے لیکن میں نے سکھ پال کو اُن کی جو تصویر دکھائی ہے، اس سے یہ جوان راجکمار پوری طرح میرے جال میں آگیا ہے۔"

"آپ مسلمان حاکموں کو بھی ایسے ہی جال میں لا سکتے ہیں۔" ایک ہندو نے کہا۔

"میں یہ جال پھیلاؤں گا" پنڈت نے کہا "ہماری بیٹیوں کو پرماتما نے حسن بھی دیا ہے اور یہ جذبہ بھی کہ مسلمان کو اس حسن سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ میری بوڑھی آنکھیں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہیں۔ مسلمان اس ملک پر غالب آجائیں گے۔ محمود

اگر سارے ہندوستان کو فتح نہ کر سکا تو یہاں کے کسی نہ کسی خطے میں اسلامی سلطنت قائم کرے گا مسلمانوں کو جنگ کے ذریعے شکست دینا اور انہیں ہندوستان سے نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ اگر ہمارے آئندہ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے عقل سے کام لیا تو وہ مسلمانوں کی سلطنت کو اس حربے سے کمزور کرلیں گے جو میں نے سکھ پال پر استعمال کیا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے ذہنوں اور اُن کے ایمان پر ایسا حملہ کرنا ہوگا جسے وہ حملہ نہ سمجھیں، پیار اور محبت کا پیغام سمجھیں۔"

"ہمیں سکھ پال کی بات کرنی ہے"۔ لاہور سے آتے ہوئے ایک ہندو نے کہا۔ "دور آنے والے وقت میں کیا ہوگا، وہ آنے والی نسلوں کا کام ہے۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ سکھ پال کو اغوا کر کے بھیرہ سے نکالنا ہے۔"

"وہ کل رات چوری چھپے آرہا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "میری یہی کوشش تھی جو کامیاب ہوگئی ہے۔ آپ لوگ یہاں موجود ہوں گے۔"

اور پنڈت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کس طرح اُسے دبوچ لیں۔ رات کے وقت اُسے شہر سے نکالنا مشکل تھا۔ یہ کام دن کو کرنا تھا۔ کچھ بحث و مباحثے کے بعد انہوں نے سکیم تیار کرلی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ بھیرہ شہر پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ قصرِ امارت پر بھی خاموشی طاری تھی۔ اس عمارت میں جب راجہ بجی رائے کی گدی تھی، تو یہاں کا دن سورج غروب ہونے کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا۔ سازو آواز اور تھرکتے ہوئے نسوانی جسموں سے جادو جاگ اُٹھتے تھے۔ شراب کا دور چلتا اور یہاں ساقی کی حکمرانی ہوتی تھی۔ اب یہ عمارت خاموش تھی۔ اس خاموشی میں ایک محافظ نواسا شاہ کی رہائش گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا اور دو محافظ اردگرد گشت کر رہے تھے۔ محافظ دستہ رات بھر مستعد رہتا تھا۔

نواسا شاہ اُٹھا۔ اُس نے دریچے میں سے جھانکا گشت کرنے والے دو محافظ ذرا آگے چلے گئے تھے۔ نواسا شاہ نے محسوس کیا کہ وہ ان سے نظر بچا کر نکل نہیں

سکے گا۔ دن بھر وہ امارت کے کاموں اور مسئلوں میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ رات چوری چھپے کس طرح نکل کر مندر میں جائے گا۔ رات کو نکلنے کا وقت آیا تو اسے خیال آیا کہ اس کی رہائش گاہ کے ارد گرد محافظوں کا کھڑا پہرہ بھی ہے اور گشتی بھی۔

وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے کمرے کی تنہائی میں وحشت محسوس ہونے لگی اُس کے دماغ پر چار لڑکیاں اور وہ شراب سمائی ہوئی تھی جس کی بو نہیں ہوتی۔ وہ خوش تھا کہ یہ شراب پی کر آئے گا تو کسی کو شراب کی بو نہیں آئے گی، مگر مندر تک پہنچنا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔

اُسے مایوسی کی تاریکی میں ایک چمک سی دکھائی دی۔ اُسے مولوی سعید اللہ قاسمی کے یہ الفاظ یاد آ گئے ”اسلام میں خلیفہ اور اُس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے علاقوں کے امرا کی ذمہ داریاں بڑی ہی نازک اور صبر آزما ہوتی ہیں۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر گلی کوچوں میں پھرتے اور دیواروں سے کان لگا کر سنتے ہیں کہ قوم میں کوئی گھرانہ یا کوئی فرد کسی مصیبت میں تو مبتلا نہیں، اور کیا پوری قوم خلافت اور امارت سے مطمئن ہے؟“

نواسا شاہ اُٹھا اور اُس نے بھیس بدل لیا۔ وہ باہر نکلا، اور دروازے پر کھڑے محافظ سے کہا کہ محافظ دستے کے کماندار کو بلاؤ۔ کماندار دوڑا آیا۔

”ہم شہر کی گشت کو جا رہے ہیں“۔ نواسا شاہ نے کماندار سے کہا۔

کماندار کے لیے امیر کا یہ اقدام حیران کن نہیں تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی روایت تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ کتنے امرا اس روایت پر عمل کرتے تھے۔ کماندار نے گشتی محافظوں کو بتا دیا کہ امیرِ محترم گشت کے لیے جا رہے ہیں۔

نواسا شاہ معمولی سا ایک چغہ پہن کر اور سر پر کپڑا لپیٹ کر چل پڑا اور قصرِ امارت کے صدر دروازے سے نکل گیا۔

وہ مندر کے دروازے پر جا رکا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ کس کمرے میں جانا ہے۔ ڈیوڑھی میں اس کے استقبال کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

اُس نے تالی بجائی۔ اچانک پیچھے سے ایک آدمی نے اُسے دبوچ لیا۔ ایک اور آدمی نے اُس کی ٹانگیں بازوؤں میں جکڑ لیں۔ نواساشاہ جوان اور تنومند آدمی تھا۔ اُس نے جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اپنے آپ کو پیچھے کو دھکا دیا اور پچھلے آدمی کے سہارے اگلے آدمی کو پاؤں سے دھکیلا۔ اس داؤ سے وہ آدمی جس نے اُسے پیچھے سے دبوچا تھا، پیچھے کو گرا اور جس نے اس کی ٹانگیں پکڑی تھیں وہ دوسری طرف گرا۔

دو اور آدمی اُس پر جھپٹے۔ نواساشاہ دروازے سے باہر آ گیا اور اُس نے پھرتی سے تلوار نما خنجر نکال لیا۔ ڈیوڑھی تاریک تھی۔ باہر ستارے نظر آتے تھے۔ ستاروں کی روشنی کافی تھی۔ نواساشاہ نے خنجر کا وار کیا اور ایک آدمی کی کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دی۔ پھر کسی کی آواز آئی "زندہ پکڑنا"۔

اور قریب سے ہی آواز آئی —"مشعل جلاؤ"۔

چقماق کا شرارہ چمکا اور تیل میں ڈوبی ہوئی مشعل کا شعلہ بھڑکا۔ پھر آواز سنائی دی۔ "کاٹ دو انہیں"۔

ایک آدمی زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ باقی تین پر چار آدمی تلواروں سے ٹوٹ پڑے۔ نواساشاہ حیران و پریشان ہو کر ایک طرف کھڑا تھا۔ مشعل کے رقص کرتے شعلے میں اُسے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔ اُس پر حملہ کرنے والوں پر کس نے حملہ کیا تھا؟

"امیرِ محترم!"— ایک آدمی نے کہا "آپ ٹھیک ہیں؟ زخمی تو نہیں؟"

تب اُس نے پہچانا کہ یہ تو اُس کے اپنے محافظ دستے کے جوان ہیں۔ اندر سے پنڈت دوڑا آیا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر پوچھنے لگا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ چار ہندو زمین پر خون میں ڈوبے پڑے تھے۔

"آپ انہیں پہچانتے ہیں؟"— ایک محافظ نے پنڈت سے پوچھا "انہوں نے امیرِ محترم پر حملہ کیا ہے"۔

"اوہ!"— پنڈت نے حیرت زدہ ہو کر نواساشاہ کو دیکھا اور بولا "امیرِ بھیرہ!

.... حضور ادھر اور اس وقت کیسے آنکلے؟"

"میں گشت پر آیا تھا"۔ نواساشاہ نے کہا "مندر کے اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوا ہی تھا کہ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"پاپی"۔ پنڈت نے حقارت سے کہا "ملیچھ۔ اچھا ہوا مارے گئے۔ امیر مندر میں آئیں تو ہم ان کے قدموں میں پھول نچھاور کریں۔ ان اچھوتوں نے امیر پر حملہ کیا ہے؟"۔ اُس نے مشعل کی روشنی میں چاروں کے چہرے دیکھ کر کہا "میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔ یہ بھیرہ کے معلوم نہیں ہوتے۔"

نواساشاہ نہیں چاہتا تھا کہ محافظ مندر کے اندر جائیں کیونکہ اُسے خیال تھا کہ اندر لڑکیاں اور شراب ہو گی، مگر محافظوں کے کمانڈر کو اپنے فرائض کا احساس تھا۔ وہ نواساشاہ کو بتائے بغیر اندر چلا گیا۔ نواساشاہ بھی گیا۔ کمروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں دو آدمی تھے جو باہر مارے جانے والوں کے ساتھی تھے۔ پنڈت نے بتایا کہ یہ پجاری ہیں۔

نواساشاہ کا خیال تھا کہ وہ اکیلا مندر میں آیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گشت پر نکلا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا محافظ دستہ اس سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ کمانڈر عقلمند تھا۔ اُسے احساس تھا کہ امیر نومسلم ہے اور ہندو اس پر قاتلانہ حملہ کریں گے چنانچہ نواساشاہ رہائش گاہ سے نکلا تو کمانڈر چار محافظوں کو عام کپڑوں میں ساتھ لے کر نواساشاہ کے پیچھے خاصا فاصلہ رکھ کر چلا گیا۔ یہ پانچوں دبے پاؤں چل رہے تھے تاکہ ان کے امیر کو بھی پتہ نہ چلے کہ اس کے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا کمانڈر کو خدشہ تھا۔ وہ بروقت مندر کے دروازے پر پہنچ گئے اور نواساشاہ کی جان بچ گئی۔

دوسرے دن اس واقعہ کی تحقیقات ہوئی۔ پنڈت نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لاہور کے راج محل میں رانی پریم دیوی سخت غصے کے عالم میں اپنے کمرے میں تیز تیز ادھر اُدھر چل رہی تھی۔ کمرے میں دو دو آدمی کھڑے تھے جو اپنے چار ساتھیوں

کو بھیرہ کے مندر میں مروا کر وہاں سے آ گئے تھے۔ انہوں نے رانی کو تفصیل سے سنایا تھا کہ پنڈت نے سکھ پال کو پھانسنے کا کیا انتظام کیا تھا لیکن عین آخری لمحے ناکامی ہوئی۔ سیناپتی راج گوپال بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

"اس سے ظاہر ہوا کہ میرا بیٹا بھیرہ کا امیر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کا قیدی ہے" ۔۔۔ رانی پریم دیوی نے کہا۔ "میں اسے رہا کراؤں گی۔ اگر وہ وہاں رہنا چاہے گا تو بھی اُسے لے آؤں گی"۔ وہ اچانک گرج اٹھی "نکل جاؤ یہاں سے .... دفع ہو جاؤ بزدلو!"

وہ دونوں آدمی باہر نکل گئے۔ راج گوپال وہیں کھڑا رہا۔ رانی نے اُسے دیکھا اور بولی "۔ تم میری محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کرنا کیا چاہتی ہو؟"۔ راج گوپال نے کہا۔ "اگر تم مجھے سزائے موت کی دھمکی دے کر کہو کہ میں بھیرہ پر حملہ کر دوں تو بھی میں صاف انکار کر دوں گا"۔

"سنو گوپال!" ۔۔۔ رانی نے کہا۔ "غور سے سنو میں کیا کرنا چاہتی ہوں"۔

اُس کے دماغ میں جو آئی تھی، وہ اُس نے راج گوپال کو سنا دی،

دس پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ نواسا شاہ دن کے وقت فوج کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔ اُس کا راستہ ایک سیاہ کالے رنگ کے بوڑھے نے روک لیا۔ اس کے ساتھ اسی رنگ اور اسی عمر کی ایک عورت تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر اور منہ پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ دونوں کی کمریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بہت لمبی مسافت طے کر کے آئے لگتے تھے۔ نواسا شاہ نے گھوڑا روکا اور اُتر کے ان کے قریب چلا گیا۔

"بہت دور سے فریاد لے کر آئے ہیں"۔ بوڑھے نے تھکی ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہماری کہانی لمبی ہے۔ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیں تنہائی میں عرض کریں گے"۔

نواسا شاہ نے اپنے محافظوں سے کہا کہ دونوں کو ساتھ لے چلو، ہم اِن کی فریاد سنیں گے۔

نواسا شاہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بڑھیا کو اس کے کمرے میں داخل کیا گیا۔ نواسا شاہ نے کہا "کہو کیا کہنا ہے"

بڑھیا اُس کے قریب چلی گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کو اپنے گمراہ بیٹے سے کیا کہنا ہوتا ہے؟" نواسا شاہ چونک اُٹھا۔ وہ رانی پریم دیوی تھی۔ اُس نے کہا "مت نگاہیں پھیر۔ مت حیران ہو میری آنکھوں میں دیکھ۔ ماتا کی ماری ہوئی ماں کی آنکھوں میں دیکھ"

نواسا شاہ کی نظریں ماں کی آنکھوں میں گرفتار ہو گئیں۔

"ماں نے تجھے کیوں جنا تھا؟" رانی نے کہا "اس لیے کہ اپنے دادا کے خون کا انتقام لے گا۔ اُن بتوں اور مورتیوں کی توہین کا انتقام لے گا جن کی بے حرمتی مسلمانوں نے کی تھی۔ تیرا باپ بھاگ کر کشمیر چلا گیا ہے، اور تُو نے شکست کھا کر ہتھیار ڈال دیئے ہیں تُو نے اپنے دادا کی طرح اور راجہ جی رائے کی طرح خودکشی نہ کی۔ تُو نے اپنے مذہب کے دشمن کا مذہب قبول کر لیا۔ تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ تیری ماں کا رکھوالا کون ہے۔ اگر مسلمان لاہور پر حملہ کر دیں تو وہ مجھے بھی قیدی بنا لیں گے۔ ایک رانی مسلمانوں کی اس لیے قیدی اور باندی ہو گی کہ اُس کا بیٹا بے غیرت اور بزدل ہے۔ لالچی ہے۔ اُس نے اپنا دھرم عہدے اور رتبے کے عوض بیچ ڈالا ہے۔"

نواسا شاہ کے منہ سے کئی بار نکل چکا تھا "ماں..... ماتا جی.... آپ ــــ لیکن ماں کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ وہ بولتی جا رہی تھی اور نواسا شاہ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ ماں نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ پنڈت اُسے پہلے ہی گمراہ کر چکا تھا۔ اُس رات کے بعد جس رات اُس پر حملہ ہوا تھا، وہ مندر میں دوبارہ جانے کی سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ یہ ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ پنڈت کی اس بات کو اُس نے صحیح مان لیا تھا کہ مسلمان حاکم اور سالار وغیرہ چوری چھپے عیش و عشرت کرتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں کہ اسلام میں یہ حرام ہے۔

اب ماں نے اس حلیے میں آ کر اُس کے جذبات کو ایسا ہلایا کہ اُسے چکر آنے

لگے۔ ماں نے اُسے نواسا شاہ سے سکھ پال بنا دیا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی ــــ "دیکھ، تیری رانی ماں کیا حال اور کیا صورت بنائے کھڑی ہے۔ پکڑی جائے تو یہاں تیرا کوئی نہیں ہے گا.... اور سوچ کہ تجھے محمود یہاں کا حاکم کیوں بنا گیا ہے.... وہ تجھ سے ڈرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ سکھ پال اتنا بہادر اور دانشمند ہے کہ غزنی کی فوج کو ملیا میٹ کر دے گا۔ تجھ سے بچنے کے لیے اُس نے تجھے سونے کے پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ تیری شکست تیرے جیسی گناہ کی سزا ہے۔ ہوش میں آ سکھ پال! اپنے دیوتاؤں کے قہر سے ڈر۔"

"تمہارے ساتھ کون ہے ماں؟"

"سیناپتی راج گوپال"ــــ رانی نے جواب دیا ــــ "اسے بھی اندر بلا لو۔"

نواسا شاہ نے دربان کو بلا کر کہا ــــ "اس بڑھیا کے ساتھ جو بوڑھا ہے، اُسے اندر بھیجو۔"

راج گوپال جھکا ہوا، کھانستا ہوا، اندر آیا اور نواسا شاہ کو فرشی سلام کیا۔ دربان باہر نکل گیا تو نواسا شاہ نے راج گوپال سے کہا ــــ "اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ.... ماں مجھے ہوش میں لے آئی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں رات کو یہاں سے نکل جاؤں گا۔ آپ دونوں واپس چلے جائیں۔"

"یہاں سے چوروں کی طرح نکل بھاگنا کوئی کمال نہیں" ــــ سیناپتی راج گوپال نے کہا ــــ "آپ راجپوت ہیں، راجکمار ہیں۔ اگر آپ ہمت کریں تو بھیرہ آپ کا ہو سکتا ہے.... مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کو سلطان کی فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

رانی پریم دیوی اور راج گوپال بہت دیر بعد نواسا شاہ کے کمرے سے نکلے۔ دربان اور محافظوں کو وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے اور تھکے ہوئے نظر آئے۔ کسی کو شک نہ ہوا کہ انہوں نے چہروں، گردن اور ہاتھوں پر ایسا محلول مل رکھا ہے جس سے اُن کے رنگ گہرے سانولے اور جلد بوڑھی نظر آتی ہے۔ وہ قصرِ امارت سے نکلے اور مندر میں چلے گئے۔ وہ رات انہوں نے پنڈت کے ساتھ گذاری اور اگلے روز لاہور کو روانہ ہو گئے۔

دو روز تک بھیرہ کی فضا میں پُراسرار سا ٹھہراؤ طاری رہا۔ تیسرے روز امیر بھیرہ نواسا شاہ نے فوج کے اعلیٰ حکام کو بلایا اور کہا کہ اپنی فوج میں جو چار ساڑھے چار ہزار ہندو ہیں، انہیں محاصرے میں لڑنے کا وہ تجربہ نہیں جو غزنی کی فوج کو ہے۔ کل تمام مسلمان فوج شہر سے باہر چلی جائے گی اور ہندو کماندار اور سپاہی شہر کے اندر رہیں گے۔ آپ لوگ باہر سے قلعہ توڑنے کی کوشش کریں گے اور ہم ہندوؤں کو سمجھائیں گے کہ قلعے کا دفاع کس طرح کیا جاتا ہے۔

اُسی رات نواسا شاہ نے سپہ سالار اور اُس کے نائب سالاروں کو اپنے ہاں بلایا۔ انہوں نے آ کر دیکھا کہ محافظ دستہ جو مسلمان ہُوا کرتا تھا اِس میں اب ہندو سپاہی ہیں۔ نواسا شاہ نے چند ایک محافظوں کو اندر بلا کر سالاروں اور اُس کے دونوں نائبوں کو گرفتار کرا لیا اور حکم دیا کہ انہیں قید خانے کی الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دو۔

اگلی صبح حکم کے مطابق فوج کی تمام تر مسلمان نفری باہر چلی گئی۔ نواسا شاہ کے حکم سے شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور ہندو نفری نے دیواروں پر جا کر مورچے سنبھال لیے۔ مسلمان اسے مشق اور تربیت سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے حکم کے مطابق قلعہ توڑنے کی جھوٹ موٹ کی نقل و حرکت کی۔ اوپر سے ہندو فوجیوں نے اُن پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی نواسا شاہ نے دیوار سے بلند آواز سے بار بار اعلان کیا ۔۔۔ "غزنی والو! زندہ رہنا چاہتے ہو تو غزنی واپس چلے جاؤ۔ میں نواسا شاہ نہیں سکھ پال ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہندو ہوں۔ تمہارے تینوں سالار قید میں پڑے ہیں۔"

مسلمان فوج کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ مشہور مؤرخین، البرونی، فرشتہ، گردیزی، عنصری اور عطبی کی تحریروں کے مطابق غزنی کے مسلمان فوجیوں نے بھاگ نکلنے کی بجائے لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں بتایا کہ سپہ سالار اور اُس کے نائبین کی غیر حاضری میں کمان کس نے سنبھالی۔ ہُوا یوں کہ مسلمانوں نے ایک قاصد ملتان کو دوڑا دیا۔ ان کے پاس رسد اور سامان کی کمی تھی، لیکن ان کے باوجود انہوں نے سکھ پال کا چیلنج قبول کر لیا، اور للکار کر سکھ پال کے اعلان کا جواب دیا ۔۔۔ "اے مکار

راجہ! تو اپنی فوج سمیت ہمارا قیدی ہے۔ اگر شہر میں کسی مسلمان باشندے پر ہاتھ اٹھایا گیا تو بھیرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا۔"

انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور دروازے توڑنے اور کہیں نقب لگانے کی کوشش شروع کر دیں۔

غزنی کی طرف جانے والا قاصد بہت تیز تھا۔ پشاور تک اُس نے دو گھوڑے مسافروں سے چھینے۔ تھکے ہوئے گھوڑوں کو وہ چھوڑتا گیا۔ اُس نے آرام، نیند اور کھانے پینے کی پرواہ نہ کی۔ ملتان والا قاصد جلد ہی منزل پر پہنچ گیا اور وہاں سے کمک چل پڑی۔

غزنی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ ایلک خان نے اس خوش فہمی میں غزنی پر فوج کشی کی تھی کہ سلطان محمود ہندوستان میں ہے اور غزنی میں فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ بڑے تحمّل سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ سلطان محمود کا پیغام رسانی کا نظام اور اُس کی فوج کے کوچ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ وہ جیسے اُڑ کر آ گیا ہو۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود جب غزنی پہنچا تو ایلک خان نے یقین نہ کیا۔ محمود نے فوج کو آرام نہ کرنے دیا۔ سیدھا حملہ کر دیا۔

فرشتہ لکھتا ہے۔ "ایلک خان نے ترک امرا اور حکمرانوں کو مدد کے لیے بلا لیا۔ یہ محمود غزنوی کے خلاف متحدہ محاذ تھا۔ محمود غزنوی نے اپنی فوج کے ایک حصّے کی کمان اپنے بھائی نصیر الدّین یوسف کو دی اور اپنے مشہور سپہ سالار ابو عبداللہ الطائی کو اس کے ساتھ رکھا۔ دائیں بازو کی کمان آل تمتاش حاجب کے پاس اور بائیں بازو کی ارسلان جاذب کے پاس تھی۔ اس بازو میں افغان اور خلجی تھے....

"محمود کے دشمن کا متحدہ محاذ کمزور نہیں تھا۔ ایلک خان نے اپنی قیادت میں سلطان محمود کی فوج کے قلب پر حملہ کیا۔ محمود گھوڑے سے کود کر اُترا اور سجدہ ریز ہو گیا۔ اُٹھ کر ہاتھ دُعا کے لیے پھیلائے اور گھوڑے پر سوار ہونے کی بجائے ایک ہاتھی پر جا چڑھا۔

اس نے اپنی فوج کو اللہ کے نام پر للکارا۔ اُس نے پیادوں کے آگے ہاتھیوں کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے حملہ روکنے کے لیے ہلّہ بولنے کا حکم دے دیا۔ ہاتھیوں کے ساتھ گھوڑ اسوار تھے۔ ایلک خان کی فوج اس ہلّے کے آگے ٹھہر نہ سکی"۔

فرشتہ نے لکھا ہے "محمود کے ایک ہاتھی نے ایلک خان کے اُس محافظ کو جس نے اُس کا پرچم اٹھا رکھا تھا، سونڈ میں پکڑا اور دُور اوپر کو اُچھال دیا۔ محمود کے ہاتھیوں نے دشمن کو اس طرح کچلا جیسے پاؤں تلے ٹڈی دَل کو مسل رہے ہوں"۔

دشمن کو گھبرا کر پسپا ہُوا۔ محمود غزنوی نے اس کا تعاقب کیا اور چیدہ چیدہ امرأ اور سالاروں کو پکڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

یہ اُس کے سجدے کا کرشمہ تھا کہ دشمن ختم ہو چکا تو بھیرہ کا قاصد اُس کے پاس یہ پیغام لے کر پہنچا کہ سکھ پال نے دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان محمود نے کوئی وقت ضائع نہ کیا اور بھیرہ کو کوچ کا حکم دے دیا۔

اُس کے پہنچنے تک مسلمان بھیرہ کا ایک دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ ملتان سے کمک آ گئی تھی۔ انہوں نے ہندو نفری پر جلدی قابو پا لیا اور سکھ پال کو بھی انہوں نے گرفتار کر لیا۔ سلطان محمود دل پر بڑا ہی ناگوار بوجھ لے کر آیا تھا لیکن بھیرہ کی کیفیت دیکھ کر عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے سکھ پال کو بلایا اور اُسے اتنا ہی کہا۔ "میں تمہیں تمام عمر کے لیے قید میں ڈالتا ہوں۔ تمام عمر اپنے کیے کی سزا بھگتتے رہو"۔

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

جہانگیر بُک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر: سرفراز احمد سکھیرا

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2005
سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور
سٹاکسٹ: مکتبہ داستان، ۲۶ پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدر آباد۔فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔فون: 061-4781781
سیلز ڈپو: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار، فیصل آباد۔فون: 0333-4469077
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔فون: 042-7314319

فہرست

پیش لفظ

عالمِ اسلام خصوصاً پاکستان بڑے ہی پُرخطر دور سے گزر رہا ہے۔ یہود اور ہنود نے ایسا حملہ کیا ہے جس کے آگے ہماری نوجوان نسل بلکہ اس نسل کے ماں باپ بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ یہ حملہ ہمارے تفریح کے ذرائع پر کیا گیا ہے۔

تفریح کے ذرائع کیا ہیں؟ — رسالے فلمیں اور ناول — تفریح انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے جس سے انسان کو محروم نہیں کیا جاسکتا، محروم کرنا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ مسلسل کام کاج اور سنجیدہ سوچوں سے اعصاب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ تھکے ماندے اعصاب، دل اور دماغ کو سکون دینے کے لیے تفریح لازمی ہے۔

ہمارے دو سب سے بڑے دشمنوں — یہودیوں اور ہندوؤں — نے انسانی فطرت کی اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے خفیہ طریقوں سے ہمارے لٹریچر میں فحاشی اور جنسی لذّت کے جراثیم چھوڑ دیئے ہیں۔ چونکہ ہر کس و ناکس کہانی پڑھنا اور فلم دیکھنا چاہتا ہے اس لیے ان اخلاق سوز کہانیوں کو مقبولیّت حاصل ہوگئی ہے اور اس کے نتائج اس صورت میں سامنے آتے ہیں کہ ہمارے بچّے اخلاقی لحاظ سے تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔

مکتبہ داستان لمیٹڈ اس محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرنے اور اپنے نوجوانوں کو جسمانی اور نفسیاتی تباہی سے بچانے کے لیے ایسا لٹریچر پیش کر رہا ہے جو آپ کے اور نوجوانوں کے اس فطری مطالبے کو پورا کرتا ہے کہ کہانی کا انداز ناصحانہ نہ ہو تفریحی ہو اور اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور جذبات میں ہلچل مچا دے۔

"...ایک اور بت شکن پیدا ہُوا" ہماری تاریخ کی روئیداد ہے جس کا ہیرو سلطان محمود غزنوی ہے لیکن ہر کہانی میں آپ کو کچھ دوسرے ہیرو بھی ملیں گے۔ یہ کہانیاں تفریح مہیّا کرنے کے ساتھ ساتھ ایمان افروز بھی ہیں اور یہ ہماری اُن روایات کا عکس پیش کرتی ہیں جو اسلام اور ہمارے قومی تشخّص کی ضامن ہیں۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاھور

نگرکوٹ کی نرتکی

نگرکوٹ ہندوستان کا ایک مشہور قلعہ ہُوا کرتا تھا۔ وہ دور قلعوں کا ہی تھا۔ ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ایک سے ایک وسیع اور مضبوط قلعہ تھا لیکن نگرکوٹ کے قلعے کو خصوصی شہرت اس لیے حاصل تھی کہ اس کے اندر بہت بڑا مندر تھا۔ مندر بجائے خود ایک قلعہ تھا۔ اس کے کمرے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ اس کا تہ خانہ بھی تھا۔ اس کے مندر میں گھوڑے اور ہاتھی گم ہو جاتے تھے۔ مندر کی حفاظت کے لیے اس کے اردگرد قلعہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔

یہ قلعہ اور اس کے اندر کا مندر بھارت کے مشہور شہر کانگڑہ کے قریب ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سے یہ ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ قلعے پر یلغار کرنے کے لیے پہاڑی پر چڑھنا پڑتا تھا لیکن قلعے والوں کے تیر اور بڑے بڑے پتھر جو اوپر سے پھینکے جاتے تھے حملہ آوروں کو قلعے تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اُس وقت جب سُلطان محمود غزنوی نے پشاور، بھیرہ اور ملتان پر قبضہ کر کے ایسی پوزیشن حاصل کر لی تھی جیسے خنجر بھارت ماتا کے دل میں اُتر گیا ہو، نگرکوٹ کا قلعہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے غیر معمولی اہمیّت کا مقام بن گیا۔

اس اہمیّت کی وجہ اس مندر کا بڑا پنڈت رادھا کشن تھا جو کٹر برہمن اور اونچے کردار کا آدمی تھا۔ مندروں کے اندر کی دنیا کی جو باتیں مشہور تھیں، ان سے یہ مندر پاک تھا۔ پنڈت رادھا کشن نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ وہاں عبادت کا مطلب صرف عبادت تھا۔ وہاں عورتیں بھی جایا کرتی تھیں لیکن پنڈت نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ کوئی عورت کسی پنڈت کے پاس نہیں بیٹھ سکتی اور مرد اور عورتیں اکٹھے عبادت

نہیں کر سکتے۔ عورتیں اس کی عقیدت مند تھیں اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق عورتیں اس کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے کو لگانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ کسی عورت کو، وہ بچی ہو خواہ بوڑھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

مندر میں چند اور پنڈت اور چیلے چانٹے بھی تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ ان پر بہت سختی کرتا اور ان پر نظر رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت میں ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریئے کے تحت وہ نوجوانی میں تارک الدنیا ہو گیا اور اور ہمالیہ کی یخ بستہ وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا نکلتا ہے۔ پندرہ برسوں میں اُس کا من مر گیا۔ اُس کے نفسانی جذبات سرد پڑ گئے اور وہ گنگا کے ساتھ ساتھ پا پیادہ اُتر آیا تھا۔ کانگڑہ کے قریب نگر کوٹ کی ایک پہاڑی پر اُس نے یہ مندر دیکھا تو وہ اس میں چلا آیا۔

اب اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن اُس کے چہرے پر اور ڈیل ڈول میں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک ابھی موجود تھی۔ داڑھی جوانوں کی طرح سفید اور چال میں جنگجو مہاراجے کا جلال تھا۔ وہ اپنی مثال دے کر کہا کرتا تھا کہ میرا جسم دنیا کے لہو و لعب سے اور عورت کے لمس سے پاک رہا ہے اس لیے یہ ایک سو سال تک بھی ایسا ہی صحت مند اور تنومند رہے گا اور وہ کہا کرتا تھا کہ جس نے اپنی روح کو پاک رکھا اُس کا جسم سدا جوان رہے گا۔

مذہب کے معاملے میں وہ کٹر تھا۔ رامائن اور مہابھارت اسے زبانی یاد تھیں۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ لوگ اسے اوتار (پیغمبر) بھی کہا کرتے تھے۔ اُسے ہندو مت کا ستون بھی اور قلعہ دار بھی کہا کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں پر وہ اپنا حکم چلایا کرتا تھا اور راجے مہاراجے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھول جایا کرتے تھے کہ وہ حکمران ہیں اور ان کی رعایا اُن کے آگے سجدے کیا کرتی ہے۔

نگر کوٹ کے مندر میں دولت اور زر و جواہرات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ تمام راجے مہاراجے مندر کو باقاعدگی سے دل کھول کر نقدی اور سونے چاندی کی صورت میں

تحفے بھیجا کرتے تھے۔ کانگڑہ کے تمام کسان اور زمیندار مندر کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس علاقے کی کھیتیاں مندر کی ملکیت تھیں اور کسان مندر کے مزارعے تھے۔ اس دولت کو پنڈت رادھاکشن نہ خود اپنے استعمال میں لاتا تھا نہ کسی دوسرے پنڈت کو ہاتھ لگانے دیتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ یہ ملک اور ہندومت کے دفاع کے لیے وقف ہے۔ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور یتیموں کی امداد اور تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔

۱۰۰۷ (۳۹۸ھ) کا واقعہ ہے جب سلطان محمود غزنوی نے پہلے آج کے اٹک کے گرد و نواح میں لاہور کے مہاراجہ انندپال کو شکست دے کر ایسا بھگایا کہ وہ کشمیر چلا گیا اور اپنی راجدھانی سے لمبا عرصہ غیر حاضر رہا۔ پھر سلطان نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو شکست دی اور فوراً بعد ملتان پر حملہ کر کے ہندوؤں اور عیسائیوں کے آلۂ کار قرامطیوں کی گدی اکھاڑی اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور پھر انندپال کے بیٹے سکھ پال نے سلطان محمود سے بھیرہ کے میدان میں شکست کھا کر ہتھیار ڈالے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس نے سلطان کی غیر حاضری میں غزنی کی فوج کو دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا اور سلطان محمود نے غزنی کی خانہ جنگی سے فارغ ہو کر بھیرہ میں آ کے سکھ پال کو عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا۔

۱۰۰۷ء میں اسلام کا کانٹا مہابھارت کے دل میں اتر گیا تو نگر کوٹ میں پنڈت رادھاکشن کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اُسے مسلمانوں کی فتوحات کی اطلاعیں بھیرہ، پشاور اور لاہور سے ملی تھیں اور اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ انندپال راجدھانی سے غیر حاضر ہے۔ پنڈت رادھاکشن نے ہندوستان کی ریاستوں اوجین، قنوج، گوالیار، کالنجر (موجودہ کوٹلی آزاد کشمیر) اور اجمیر کے راجوں مہاراجوں کو نگر کوٹ بلایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی۔

"کیا تم سب نے عیش و عشرت کا پھل پا لیا ہے یا کچھ اور مانگتے ہو؟" ۔پنڈت رادھاکشن نے مندر میں بٹھا کر ان مہاراجوں سے کہا "تمہاری شکست کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے اپنے محل سورگ کی طرح بنا رکھے ہیں تمہیں سلاتی ہیں تو عورتیں تمہیں جگاتی ہیں تو عورتیں تمہیں نہلاتی ہیں تو عورتیں اور عورتیں بھی وہ جو حسن میں بے مثال اور بے حیائی میں لاجواب ہیں۔ تم پیاس میٹھی شراب

سے بجھاتے ہو۔"

"شکست راجہ انند پال نے کھائی ہے"۔ ایک مہاراجے نے کہا "مسلمان جب میرے مقابلے میں آئیں گے تو ....."

"اس دیس کے ہر ہندو نے شکست کھائی ہے"۔ پنڈت رادھا کشن نے گرج کر کہا۔ "کیا تم ہندو نہیں ہو؟ غزنی کے ایک مسلمان سلطان نے ہندو دھرم کو شکست دی ہے۔ یہ تمہاری شکست ہے، یہ میری شکست ہے۔ کیا بھیرہ اور ملتان کے مندر تمہارے لیے مقدس نہیں؟ مسلمانوں نے دیوی دیوتاؤں کے جو بت اور اوتاروں کی جو مورتیاں توڑ پھوڑ کر باہر پھینکیں اور مسلمانوں نے جنہیں اپنے اور اپنے گھوڑوں کے قدموں میں روندا، ان کا تمہارے دھرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا؟ جہاں سنکھ اور گھڑیال بجتے تھے، جہاں کے پیڑ پودے اور جہاں کی ہوائیں بھجن اور اشلوک سنا کرتی تھیں وہاں اب اذانیں سنائی دیتی ہیں۔"

راجوں مہاراجوں پر سناٹا طاری ہوگیا۔ پنڈت کہہ رہا تھا "وہاں کی اذانیں مجھے یہاں سنائی دے رہی ہیں میں راتوں کو سوتا نہیں۔ مجھے ہری کشن اور ہری رام کی بجائے اذانیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں مندر کے اندر جانے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے بت غصے سے گھورتے ہیں۔ میں نے مورتیوں کے چہروں پر قہر دیکھا ہے۔ مجھے یہ سارا مندر، یہ قلعہ اور یہ پہاڑ جس پر یہ کھڑے ہیں، سب ہلتے اور لرزتے ہوئے لگتے ہیں۔ کیا تم برداشت کر لو گے کہ مسلمان یہیں بھی آکر توڑ دیں اور اس مندر میں بھی اذانیں گونجیں؟"

"ایسا نہیں ہوگا مہاراج!"۔ سب کی پُرعزم آوازیں اٹھیں۔ "ہم اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس دیس میں جو مسلمان آگئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"وہ واپس نہیں جائیں گے"۔ پنڈت رادھا کشن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ یہاں تک آئیں گے۔ میں اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اپنی عقل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ آئیں گے۔ وہ اس لیے آئیں گے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ تم عورت اور شراب کے نشے میں گم ہو گئے ہو۔ کیا مسلمان حسین اور جوان ناچنے گانے والیوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس طرح تم اس اونچے مندر میں آئے ہو اور اپنے ساتھ پاپ

کا سارا ساماں لائے ہو..... میں کیوں پریشان ہو رہا ہوں؟ مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟ میں راتوں کو گنگا ماتا کی آغوش میں ڈوب کر کیوں رویا کرتا ہوں؟ میری کوئی راجدھانی نہیں، میری کوئی ریاست نہیں جس کا مجھے غم ہو لیکن میری آنکھوں سے دیکھو۔ میری عقل سے سوچو۔ یہ سارا دیش میرا دیش ہے۔ یہ لڑائی کسی زمین کے لیے نہیں لڑی جارہی یہ ہندو دھرم اور اسلام کی لڑائی ہے۔ محمد بن قاسم کے بعد ہمارے دادا پردادا نے بڑی مشکل سے اسلام کو اس دیش سے نکالا تھا مگر آج اسلام ایک بار پھر طوفان کی طرح آیا ہے اور تم عیش و عشرت میں بدمست ہو.....

"تم مذہب کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کی سوچو۔ تم شکست کھا گئے تو کہاں جاؤ گے؟..... تمہاری لاشوں کو کریا کرم نصیب نہ ہوگا۔ زندہ رہو گے تو مسلمانوں کے قید خانے میں پڑے گلتے سڑتے رہو گے اور تمہاری بیٹیوں کے ساتھ مسلمان وہی سلوک کریں گے جو تم ان ناچنے گانے والیوں کے ساتھ کر رہے ہو جنہیں تم یہاں بھی اپنے ساتھ لائے ہو۔"

پنڈت کی آواز میں اور اُس کے الفاظ میں ایسا تاثر پیدا ہوتا چلا گیا کہ راجوں مہاراجوں کا خون کھولنے لگا۔ وہ بھڑک بھڑک کر سلطان محمود پر جوابی حملے کی باتیں کرنے لگے۔ وہ غزنی کی فوج کو اپنی متحدہ فوج سے بھیرہ اور ملتان میں محصور کر کے ختم کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

"عقل سے کام لو" پنڈت نے کہا۔ "اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے پشاور کی طرف کوچ کر دو اور مسلمانوں کے سُلطان کو وہاں کہیں پہاڑی علاقے میں گھسیٹ کر لڑاؤ۔ اُسے وادیوں میں گھما گھما کر مارو اور غزنی پر چڑھائی کر دو۔ بھیرہ اور مُلتان خود ہی تمہاری جھولی میں آگریں گے۔ اگر تم پشاور کے قریب لڑو گے تو تمہارے مقابلے میں غزنی کی فوج کا تیسرا حصہ ہوگا۔ بھیرہ اور ملتان سے جانے والی کمک کو تم راستے میں روک سکو گے۔"

کچھ دیر جنگ کی تکنیک پر بحث ہوتی رہی۔ سب مہاراجہ انندپال کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ پنڈت نے کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کشمیر میں ہے۔ اُسے واپس بلایا جائے"..... اور اپنی اپنی ریاست میں منادی کرادو کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے

فوجوں کو ہتھیاروں، جانوروں، اناج، کپڑوں، خیموں اور سامان کی ضرورت ہے" — پنڈت نے کہا۔ "اس کے لیے رقم چاہیئے اور ہر وہ آدمی جو لڑسکتا ہے، فوج میں شامل ہو جائے۔"

"ہم لاہور میں دوبار ایک ایک جوان لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے چکے ہیں" — ایک راجہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے بھگوان ہم پر اتنے ناراض ہیں کہ وہ تو قربانیاں قبول نہیں ہوئیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں پاک نہیں تھیں" — پنڈت رادھاکشن نے کہا۔ "میں پنڈتوں کو جانتا ہوں۔ وہ لڑکیوں کو بہت دن اپنے پاس رکھتے ہیں اور دیوتاؤں کی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ ایسے بدکار پنڈتوں کے ہاتھوں دلائی ہوئی قربانی قبول نہیں ہو سکتی .... میں یہ سوچ چکا ہوں۔ دیوی ایک انسان کی قربانی مانگتی ہے۔ یہ قربانی تم میں سے کسی ایک کی رقاصہ کی دی جائے گی۔ رقاصہ ایسی ہونی چاہیئے جو بہت ہی خوبصورت ہو، جوان ہو اور جو اپنے راجہ کو بہت عزیز ہو اور اُس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔"

"مگر رقاصہ پاک نہیں ہو سکتی مہاراج!" — ایک راجے نے کہا۔ "اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان بھی ہو۔"

"اُسے کوئی پنڈت بُری نیّت سے اپنے پاس نہ رکھے" — پنڈت نے کہا۔ "میں اسے پاک کرتا ہوں .... اُسے میں اس مندر میں رکھوں گا۔ تم دیکھنا اس کی جان قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ رقاصہ کا انتخاب میں خود کروں گا۔"

ان تمام ریاستوں میں جو آدھے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں، مندروں میں گلیوں میں، بازاروں میں گھروں میں ہندوؤں کی زبان پر یہی الفاظ چڑھ گئے "مسلمان فتح پہ فتح حاصل کرتے آرہے ہیں۔ انہوں نے پشاور سے لے کر ملتان تک تمام جوان ہندو لڑکیاں اپنی فوج میں تقسیم کر دی ہیں۔ مندروں میں گھوڑے اور بیل بندھے ہوتے ہیں۔ ہتھیار ڈالنے والے فوجی زندہ ہیں مگر کوڑھی ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کا قہر ہے۔ یہ سب پر گرے گا۔"

ہر کسی پر خوف طاری ہوا جا رہا تھا۔ مندروں میں پنڈت مذہب کی باتیں کم کرتے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت زیادہ پھیلاتے تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عورتوں کو ڈرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دگر دیزی اور عطبی کے الفاظ میں، "ہندو عورتوں نے اپنے زیورات بیچ کر قیمیں اپنے راجاؤں کے حوالے کر دیں جن عورتوں کے پاس زیورات نہیں تھے، انہوں نے سُوت کات کر بیچا اور پیسے خزانے میں جمع کرا دیئے۔ غریب عورتوں نے مزدوری کر کر کے بھی خزانے کو پیسے دیئے۔ جسے دیکھو، وہ پیسہ کمانے اور خزانے کو دینے کی فکر میں تھا جوان آدمی فوج میں شامل ہونے لگے۔ وہ اپنے گھوڑے بھی ساتھ لے گئے۔"

ایک جنون تھا جو ہندو قوم پر طاری ہو گیا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کے اندر لاوا اُبل رہا تھا اور اندر سے پہاڑ پھیلتا جا رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پہاڑ کا دہانہ پھٹے گا تو لاوا ساری دنیا کو نیست و نابود کر دے گا۔

سلطان محمود غزنوی اس پہاڑ کے دامن میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اُن بھائیوں کے خلاف لڑ کر آیا تھا جو اُس کے ارادوں اور اُس کے ایمان سے بے پرواہ، اُس کی سلطنت غزنی پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جتن کر رہے تھے۔ ان ایمان فروشوں کے عزائم کو کچلنے کے لیے غزنی کی سرحدوں پر کافی فوج رکھنے کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو وہ فوج ہندوستان میں کام آ سکتی تھی۔ بھیرہ اور ملتان کی لڑائیوں میں اُس کی فوج کی بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس نے اس کمی کو نئی بھرتی سے کسی حد تک پورا کر لیا تھا لیکن یہ کافی نہیں تھی۔

سلطان اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ ہندو راجے اُسے بخش دیں گے اُن کا جوابی حملہ لازمی تھا۔ سلطان وقت حاصل کرنے کی خواہش لیے ہوئے تھا۔ اسے راجہ انند پال کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا، اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ تمام راجے مہاراجے متحد ہو کر بھی آ سکتے ہیں۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ ٹریننگ میں زیادہ وقت صرف کرتا اور فوج میں ڈسپلن پر زیادہ زور دیتا تھا۔ یہ کام

فوج کے امام کرتے تھے جو فوج کو اِس جنگ کی غرض وغائت بتاتے رہتے تھے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے کبھی محروم نہیں رکھا تھا، لیکن انہیں مفتوحہ علاقے میں لُوٹ مار کی کبھی اجازت نہیں دی تھی۔

اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی راجدھانیوں میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ ان جگہوں کے مقامی مسلمان ان جاسوسوں کی بہت مدد کرتے تھے۔ ان میں ایمان فروش بھی تھے جو سلطان کے جاسوسوں کو پکڑوا بھی دیا کرتے تھے۔ بہرحال سلطان کو اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے۔

راجہ انند پال کشمیر سے لاہور واپس آگیا تھا۔ اُس نے وہاں سے کچھ فوج اکھٹی کرلی تھی۔ وہ شکست کھا کر گیا تھا۔ اُس نے سلطان محمود سے صلح اور امن کا معاہدہ کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ مؤرخوں میں اس کا ذکر صرف البرونی نے کیا ہے جس کی تحریریں مستند مانی جاتی ہیں۔ البرونی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ تھا۔ وہ بہت سے اہم واقعات کا عینی شاہد ہے۔ سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ اور ملتان کی فتح کے بعد غزنی اس اطلاع پر گیا تھا کہ کاشغر کی فوج نے اُس کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے تو اُسے وہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑا تھا۔ بعض اوقات اُس کی کامیابی مخدوش نظر آنے لگتی تھی۔ سلطان کی اِس کیفیت کی اطلاع کسی طرح راجہ انند پال تک پہنچ گئی۔ البرونی لکھتا ہے کہ انند پال نے اپنے ایک قاصد کے ہاتھ سلطان محمود کو یہ تحریری پیغام بھیجا:

"مجھے پتہ چلا ہے کہ تُرکوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ خراسان تک پھیل گئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو مَیں پانچ ہزار سواروں، دس ہزار پیادوں اور ایک سَو ہاتھیوں کے ساتھ آپ کی مدد کو آسکتا ہوں، اور اگر آپ پسند کریں تو مَیں اپنی جگہ اپنے بیٹے کو بھیج دوں گا اور اُس کے ساتھ فوج اس سے دُگنی بھیجوں گا۔ اِس اقدام اور پیش کش سے آپ جو بھی تاثر لیں گے، مَیں اِسے نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر فتح پائی ہے، مَیں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ پر فتح پائے۔"

اس پیغام اور اس پیش کش سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ انند پال سلطان محمود سے کس قدر خائف تھا اور اُس میں اب لڑنے کی جرأت نہیں رہی تھی لیکن محمود جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل سیاست دان تھا۔ اُسے معاہدوں کے سلسلے میں ہندوؤں کی ذہنیت کا پتہ چل چکا تھا۔ اُسے مدد کی ضرورت تھی لیکن وہ ہندو راجے کی مدد کا خواہشمند نہیں تھا۔ اُس نے یہ خطرہ بھی دیکھا کہ راجہ انند پال اُسے فوجی مدد کا جھانسہ دے کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے کہ سلطان غزنی میں ہی لڑتا مرتا رہے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ راجہ فوج لے آتے اور سلطان کو کسی خطرناک صورتِ حال میں چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔

"کیا انند پال تاریخ کو اور ہمارے آنے والی نسلوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں ہندوؤں کی مدد سے جیتا تھا؟" سلطان محمود نے انند پال کا پیغام اپنے سالاروں اور مشیروں کو کر کہا۔ "اس میں کوئی اور خطرہ نہ بھی ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو ایسے مذہبوں کے حکمران جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، دوست بن جائیں۔ میں ایسی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ اپنے مذہب کے دشمن کو دوست نہیں بنایا جا سکتا۔"

اُس نے انند پال کے قاصد کو زبانی جواب دیا کہ اپنے راجہ سے کہنا کہ ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے درمیان امن ناممکن ہے۔

اس جواب کے بعد راجہ انند پال لاہور آ گیا۔ صلح کی پیش کش مسترد ہو جانے کے بعد اُس کے لیے اب یہی راستہ رہ گیا تھا کہ سلطان محمود سے فیصلہ کُن معرکہ لڑے۔ اُس کے پاس فوج کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنے وزیر، اپنے جرنیلوں اور اپنے مشیروں کی کانفرنس بلائی اور ان سب کو بتایا کہ وہ بہت تھوڑے سے وقت میں تیاری کر کے بھیرہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر بحث کے دوران یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ سلطان محمود نسبتاً کم فوج سے اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست دے دیتا ہے۔

"اُسے آج تک ہم اور سُرگباشی مہاراجہ جے پال بے خبری میں نہیں دبوچ سکے۔" ایک جرنیل نے کہا۔ "اُسے اتنی قبل از وقت ہماری پیشقدمی کی اطلاع مل جاتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو نہایت اچھی ترتیب میں تقسیم کر لیتا ہے۔ ہم ہر بار اُس کی گھات میں آ گئے ہیں۔ اس

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے جاسوس بہت ہوشیار ہیں۔ یہ جاسوس ہمارے درمیان گھومتے پھرتے رہتے ہیں"۔

"یہاں مسلمانوں کی جو تھوڑی سی آبادی ہے، ان میں اُس کے جاسوس ہیں" ــــ راجہ انند پال نے کہا۔"کیوں نہ اس پوری آبادی کو صاف کر دیا جائے"

"یہ اقدام ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے گا"۔ وزیر نے کہا۔"یہ لوگ یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ جاسوس فوراً نکل جائیں گے۔ ایسی کاروائی کریں کہ ہمیں جاسوس مل جائیں۔ یہاں کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نہ بنائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کتنے ہی مسلمان ہمارے لیے مخبری اور جاسوسی کرتے ہیں۔ مسلمان کی مخبری مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایسا انتظام کریں گے کہ مسلمان گھرانوں پر نظر رکھیں اور خفیہ طریقے سے پتہ چلائیں کہ کون جاسوس ہے۔ اگر ایک پکڑا گیا تو ہم طریقہ جانتے ہیں کہ اُس سے معلوم کیا جائے کہ یہاں کون کون جاسوس ہے"

"یہ کام آج ہی شروع کر دو"۔ راجہ نے کہا۔"اور فوج کو تیار کر دو"

"لوگ بہت مدد کر رہے ہیں"۔ وزیر نے کہا۔"مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کو جنگی تیاری اور فوج کی ضروریات کے متعلق بتا دیا ہے"۔ وزیر نے بتایا کہ لوگوں کو کیا کچھ بتایا جا رہا ہے اور لوگ کس طرح مدد دے رہے ہیں۔

راجہ انند پال کے راج محل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کا انچارج شعیب ارمغانی نام کا ایک مسلمان تھا جو گھوڑوں کو سدھانے کا ماہر اور شہسوار تھا۔ وہ پشاور کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ راجہ جے پال کے آخری دور میں یہاں آیا تھا۔ اُس وقت وہ نوجوان تھا اور اب پختہ کار جوان بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے خود سر اور عادی بے لگام گھوڑوں کو بھی رام کر لیا تھا۔ راجہ جے پال کے بعد اُس کا بیٹا راجہ انند پال بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

گھوڑوں کی مہارت کے علاوہ اُس میں کچھ اور خوبیاں بھی تھیں جن کی بدولت وہ محل کی رانیوں اور راجکماریوں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ ایک تو وہ خوبرو تھا۔ اُس کا رنگ گورا اور آنکھیں سبز تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُس کی زبان میں چاشنی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر

تبسّم رہتا تھا۔ وہ دراز قد اور گٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ گھوڑے بھی جیسے اُس سے محبت کرتے تھے۔ اُس کی وفاداری میں کسی کو شک نہیں تھا۔ اُس کی وفاداری تھی ایسی کہ اُس کے متعلق راج محل میں کہتے تھے کہ یہ نام کا مسلمان ہے۔

محل کے عملے میں چند ایک مسلمان ملازم بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ راجہ انندپال کے نئے حکم کے مطابق خفیہ طریقے سے اِن سب کی نگرانی ہونے لگی۔ ہندو فوجی مسلمانوں کے بہروپ میں انہیں جانچنے اور پرکھنے لگے۔ ہندوؤں کی ذہین اور چالاک لڑکیاں مسلمان لڑکیوں کے بھیس میں مسلمانوں کے گھروں میں جاتیں، محمود غزنوی کے حق میں اور ہندوؤں کے خلاف باتیں کرتیں اور مسلمان عورتوں سے اُن کے مردوں کے خیالات اور خفیہ سرگرمیوں کے متعلق پتہ چلانے کی کوشش کرتیں۔ ہندو مرد آج کی پولیس کی طرح مسلمان مردوں سے ملتے۔ راز و نیاز کی باتیں کرتے۔ اپنے آپ کو سلطان محمود کے جاسوس کہتے۔ اِس خفیہ مہم میں کئی ایک مسلمان پکڑے گئے۔ جس کسی پر ذرا سا شک ہوتا تھا، اُسے بھی پکڑ لیتے اور یہ سب تشدّد کی چکی میں پسنے لگے۔

شعیب ارمغانی پر شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اُس کی سرگرمیاں گھوڑوں تک محدود تھیں۔ اُس پر صرف اِس بنا پر شک کیا جاسکتا تھا کہ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اُس وقت تک اُسے دو تین بچوں کا باپ بن جانا چاہیے تھا لیکن وہ اکیلا تھا۔ اگر اس کی بیوی پشاور میں تھی تو اُسے کبھی بھی لاہور نہیں لایا تھا۔ اگر اُس نے شادی نہیں کی تھی تو اب تک کرلینی چاہیے تھی۔ یہی ایک پہلو تھا جو اُس کے خلاف کچھ شک پیدا کرسکتا تھا لیکن ہندو اُسے اپنی خفیہ مہم سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس نے کئی بار سلطان محمود کے خلاف باتیں کی تھیں۔ اُسے کبھی مسجد میں جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ نماز روزے سے بھی فارغ تھا۔ اُس کے متعلق معلوم کرلیا گیا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے نہیں ملتا۔

ایک شام وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک سیاہ ریش اجنبی کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس اجنبی نے اپنا تعارف یوں کرایا کہ وہ پشاور

کا تاجر ہے اور سامان لے کر آیا ہے، اور اُس کے ساتھ اس کی جواں سال بیٹی ہے جسے وہ اس لیے ساتھ لایا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور گھر میں اور کوئی نہیں جس کے پاس وہ بیٹی کو چھوڑ کر آتا۔ بیٹی کی خواہش سیر کی بھی تھی، اس لیے وہ اسے ساتھ لے آیا ہے۔ وہ پشاور کی زبان بول رہا تھا۔

" سرائے میں رہائش کا انتظام اچھا ہے"۔ اجنبی نے کہا۔" لیکن اتنی جوان اور ایسی خوبصورت بیٹی کو سرائے میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ سنا ہے ہندو فوج چھاپے مارتی رہتی ہے اور مسلمانوں کو شک میں پکڑ لیتے ہیں۔ کسی نے آپ کے متعلق بتایا ہے کہ آپ اکیلے رہتے ہیں اور لوگ آپ کی شرافت اور نیّت کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے گھر کا راستہ دکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ہمارے ہی وطن کے رہنے والے ہیں"۔

" ایک مسلمان کسی مسافر پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا"۔ ارمغانی نے کہا۔ " اور جہاں ایک مسلمان خاتون کی عزّت کا معاملہ ہو وہاں میں ساری رات پہرہ بھی دے سکتا ہوں۔ مسلمان ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوا کرتے۔ آؤ، اپنی بیٹی کو لے آؤ۔ میرے گھر میں بہت کمرے ہیں"۔

وہ دونوں اُس کے ساتھ اُسی کے کمرے میں آ گئے۔ خاتون نے دیئے کی روشنی میں چہرے سے نقاب ہٹایا تو ارمغانی کو دھچکہ سا لگا۔ وہ عورت نہیں، جوان لڑکی تھی اور اُس کے حسن میں کوئی ایسی کشش تھی کہ ارمغانی سُن ہو کے رہ گیا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔" آپ نے اچھا کیا ہے کہ سرائے میں نہیں ٹھہرے۔ چھپا کر رکھنے والی چیزوں کو ایک نہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھنا چاہیئے"۔

انہیں بٹھا کر وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور بازار سے مہمانوں کے لیے کھانا لے آیا۔ لڑکی نے برقعہ نما چادر بھی اتار دی تھی۔ اُس کا قد اور سراپا اس قدر دلنشیں تھا کہ ارمغانی اُس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ راج محل کی نوکری میں کئی لڑکیوں نے ارمغانی پر ڈورے ڈالے تھے لیکن اُس نے اپنے دامن کو ہر کسی سے پاک رکھا تھا۔ راجہ انند پال کی دو راجکماریاں

اُس سے گھوڑسواری سیکھنے آتی تھیں۔ دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ خود گھوڑے پر نہ بیٹھیں، ارمغانی اُنہیں اٹھاکر گھوڑے پر بٹھائے۔ وہ گھوڑسواری سیکھ چکیں تو بھی کہتی تھیں کہ نہیں، وہ ابھی طاق نہیں ہوئیں۔

یہ دونوں خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ارمغانی اِن کے اتنے واضح اشاروں کو بھی یوں نظرانداز کر دیتا تھا جیسے وہ بدّھو اور جاہل ہو، یا اس کے سینے میں مرد کا دل ہی نہ ہو۔ ایک بار ایک راجکماری گھوڑا سرپٹ دوڑانے کے بہانے اُسے دریا کے کنارے جنگل میں لے گئی تھی اور وہاں جاکر ارمغانی سے کہا کہ میرے گھوڑے پر میرے پیچھے سوار ہو جاؤ، مجھے ڈر آتا ہے۔ ارمغانی نے انکار کر دیا تھا۔ راجکماری نے پہلے التجا کی کہ آ جاؤ میرے پیچھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں پکڑلو۔ وہ نہ مانا تو راجکماری نے اُسے حکم دیا کہ میرے پیچھے بیٹھو۔ ارمغانی نے مسکرا کر انکار کر دیا تھا۔ راجکماری غصّے سے گھوڑا واپس لے آئی تھی۔

اس معاملے میں وہ پتھر تھا لیکن اپنے مہمان کی بیٹی کو دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کی جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ وہ اِس لڑکی کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس کی نیّت بد نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اُس کے دل میں یہ خواہش تڑپی کہ اُس کا مہمان ذرا باہر چلا جائے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرے۔ لڑکی اُسے دیکھتی تھی تو اُس کے ہونٹوں پر شرمیلا سا تبسّم آجاتا تھا۔ یہ تبسّم ارمغانی کے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ارمغانی نے مہمانوں کو اُن کا کمرہ دکھایا۔ لڑکی اُسی کمرے میں رہ گئی اور لیٹ گئی اور اُس کا باپ ارمغانی کے کمرے میں آن بیٹھا۔ گپ شپ چلی تو مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی باتیں ہونے لگی۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ مہمان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ سلطان محمود کا شیدائی ہے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں، علم و فضل پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ اُس نے محمد بن قاسم کی بھی باتیں کیں اور کہنے لگا کہ اُس کا بس چلے تو سارے ہندوستان کو مسلمان کر دے۔ اُس نے اِس پریشانی کا بھی اظہار

کیا کہ سلطان محمود کے پاس فوج کی کمی ہے اور اگر تمام راجوں نے اُس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی فوج مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ ارمغانی نے کہا کہ مسلمان کو اپنے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

"لیکن مسلمان کو بھی کچھ کرنا چاہیے"۔ مہمان نے کہا۔ "ہم دو مسلمان یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم اُس سلطان کی کیا مدد کر رہے ہیں جو کافروں کے دیس میں اللہ اور رسول ؐ کا پیغام لے کر آیا ہے اور کفر کی ساری طاقتیں اس کے خلاف ہیں.... میں تجارت کر رہا ہوں اور تم ہندوؤں کی نوکری کر رہے ہو"۔

"ضرورت پڑی تو میں نوکری چھوڑ دوں گا"۔ ارمغانی نے کہا۔

"نہیں"۔ مہمان تاجر نے کہا۔ "میں نے تمہارے ساتھ یہ باتیں اس لیے کی تھیں کہ دیکھوں کہ تم کیسے مسلمان ہو اور اسلام کے ساتھ تمہارا رشتہ کیسا ہے.... میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم اپنے رسول ؐ کے نام پر مر مٹنے والے مسلمان ہو۔ میں تمہارے ساتھ دل کی بات کر سکتا ہوں۔ تم نے نوکری چھوڑ دینے کی بات کی ہے۔ یہ غلط ارادہ ہے۔ تم اس نوکری کو سلطان محمود کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ تم راج محل میں کام کرتے ہو۔ تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والوں نے مجھے بتایا ہے کہ گھوڑوں کا استاد ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کی فوج کے بڑے بڑے حاکم اور محل کی شہزادیاں بھی تمہیں چاہتی ہیں.... تمہیں کرنا کچھ بھی نہیں۔ یہ معلوم کرتے رہو کہ راجہ کے ارادے کیا ہیں۔ یہاں کی فوج کی تیاریاں دیکھتے رہو اور یہ اطلاعیں سلطان تک پہنچاتے رہو"۔

"کیا تم یہ کام کرتے ہو؟"۔۔۔ ارمغانی نے پوچھا۔

مہمان عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا۔ "بے شک میں تاجر ہوں لیکن تجارت کے سلسلے میں مجھے لاہور آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی.... میں اونٹوں پر سامان لاد کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ دیکھوں کہ راجہ انند پال کیا کر رہا ہے اور وہ کب تک مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ دراصل سلطان کو بھی وقت چاہیے۔ اُس کی فوج کا جانی نقصان بہت ہُوا ہے۔ اس کمی کو پُورا کرنا ہے"۔

"تمہیں کسی نے بھیجا ہے؟"۔ ارمغانی نے پوچھا۔ "یا یہ کام اپنے جذبے کے تحت کر رہے ہو؟"

"میرا تعلق براہِ راست سلطان محمود غزنوی سے اور اُس کے سپہ سالار ابو عبداللہ الطائی سے ہے"۔ مہمان نے جواب دیا۔ "یہاں مجھے کسی ایسے آدمی کی مدد کی ضرورت ہے جو راج محل اور راج دربار کے اندر کے حالات جانتا ہو۔ وہ آدمی تم ہو۔ مجھے تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والے آدمی میرے اپنے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس کچھ سوچ سمجھ کر بھیجا ہے"۔

"وہ کون ہیں؟"

"مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیئے"۔ مہمان نے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ میں صرف احتیاط کر رہا ہوں۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا ساتھ دو گے؟ اگر دھوکہ دو گے تو پچھتاؤ گے"۔

ارمغانی کا سر جھک گیا۔

"میرے جذبے کا اندازہ اس سے کرو کہ میں اپنی بیٹی کو سلطان محمود کی فتح کے لیے استعمال کرنے کو تیار ہوں"۔ مہمان نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایسی خوبصورت لڑکی پتھروں کے بھی دل چیر کر راز لے آئے گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں یہیں کوئی تباہ کاری کرنی پڑے"۔

"میری دو باتیں دھیان سے سنو میرے تاجر دوست!"۔۔۔ ارمغانی نے کہا۔ "ایک یہ کہ بیٹی کو اس کام میں استعمال نہ کرنا۔ مسلمان کی بیٹی میدانِ جنگ میں لڑ سکتی ہے اور ہماری بہنیں لڑی بھی ہیں، لیکن انہیں جاسوس بنا کر کفار کے حوالے کرنا کفر ہے۔ یہ گناہ کفار کیا کرتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے راجہ کا نمک کھایا ہے۔ میں نے راجہ کی خدمت کی ہے اور راجہ نے مجھے اتنی اُجرت دی ہے جس کا میں حقدار نہ تھا"۔

"ایک طرف تم اسلام اور اسلامی غیرت کی باتیں کرتے ہو، دوسری طرف تم اسلام کے دشمن کا نمک حلال کر رہے ہو"۔ مہمان نے کہا۔ "میں نے سُنا تھا تم بہت جرأت والے اور ایمان والے ہو"۔

"مجھ میں دونوں چیزیں ہیں"۔۔۔ ارمغانی نے کہا۔ "جرأت بھی، ایمان بھی، لیکن میں یہ نہیں کہلاؤں گا کہ مسلمان نمک حرام ہوتے ہیں"۔

"پھر تو مجھے لاہور سے جلدی نکل جانا چاہیئے"۔ مہمان تاجر نے کہا۔"ورنہ تم مجھے اور میری بیٹی کو پکڑوا دو گے۔ میرے یہاں کے آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شک اور شبہے میں پکڑ رہے ہیں"۔

ارمغانی اٹھا اور طاقچے سے قرآن اُٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لیا اور مہمان کے آگے کر کے کہا۔"اِس پر ہاتھ رکھو"۔ مہمان نے ہاتھ رکھا تو ارمغانی نے کہا۔"میں خدا اور رسول ؐ کے اس پاک کلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو دھوکہ نہیں دونگا.... اب تم قسم کھاؤ کہ تم بیٹی کو اس کام میں استعمال نہیں کرو گے اور تم سلطان محمود غزنوی کو دھوکہ نہیں دو گے"۔

مہمان نے قسم کھالی۔ کچھ دیر سوچ میں پڑا رہا پھر کہنے لگا۔"تم نے بیٹی کے متعلق قسم لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا خطرناک کام کر رہا ہوں میں پکڑا گیا تو میری بیٹی کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ کیا تم میری بیٹی کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہو؟ فی الحال اسے کچھ دن اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شاید باہر چلا جاؤں"۔

"کسی کی جوان بیٹی کو اپنے پاس رکھنا بڑی ہی نازک ذمّہ داری ہے"۔ ارمغانی نے کہا۔"میں انکار بھی نہیں کر سکتا اور میں اقرار سے بھی گھبراتا ہوں"۔

مہمان تاجر اُٹھ کھڑا ہُوا اور سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد رُک کر بولا۔۔۔ "اگر میں اپنی بیٹی تمہیں پیش کروں تو اسے بیوی بنالو گے؟ میں اپنے ہاتھوں شادی کرادونگا"۔

"آپ نے مجھ میں ایسی کونسی خوبی دیکھی ہے کہ اپنی اتنی خوبصورت بیٹی کی شادی مجھ جیسے عام آدمی کے ساتھ کر رہے ہیں؟"۔ ارمغانی نے کہا۔"میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا"۔

"تم میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو"۔ مہمان نے کہا۔"میں اسی لیے تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم جاسوسی کر سکتے ہو یا نہیں۔ تم وفادار ملازم ہو، اس لیے میری بیٹی کا مستقبل محفوظ رہے گا۔ جاسوس کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔ میری بیٹی کے لیے دولت مندوں کے رشتے مل رہے ہیں۔ پشاور میں غزنی کی فوج کے ایک نائب سالار نے مجھ سے رشتہ مانگا تھا۔ میں نے انکار

کر دیا۔ میں کسی امیر کبیر کو رشتہ نہیں دوں گا کیونکہ وہ ایک بیوی سے مطمئن نہیں ہُوا کرتے ۔“
شعیب ارمغانی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا وہ تو اس لڑکی کو دیکھتے ہی اُس کے حُسن سے مسحور ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلی صبح ارمغانی کا مہمان یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو واپس آئے گا۔ ارمغانی لڑکی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اُس نے لڑکی کے لیے ناشتے کا انتظام کیا اور اُس کے آگے ناشتہ رکھ کر اُس سے نام پوچھا۔ اُس نے بتایا ”زرفہ“
”کیا باپ نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ تمہاری شادی میرے ساتھ کر رہا ہے؟“ — شعیب ارمغانی نے پوچھا۔
لڑکی نے نگاہیں نیچی کر کے سر اتنا جھکا لیا جیسے زمین میں دھنس جانا چاہتی ہو۔
”مجھے جواب دو زرفہ!“ — اُس نے لڑکی کا سر اوپر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر مجھے اپنے قابل نہ سمجھو تو بتا دو۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر ساری عمر کے لیے اپنی زنجیروں میں نہیں باندھوں گا۔ میں انکار کر دوں گا۔“
زرفہ نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ ارمغانی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں میں تھام کر پہلے اپنے ہونٹوں سے پھر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر دبایا۔ تب اُس نے ارمغانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ارمغانی کے ہاتھ گھوڑوں کے جسموں کے لمس کے عادی تھے۔ وہ گھوڑوں کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے جوانی گذار رہا تھا۔ وہ اتنے نازک ہاتھوں اور اتنے نرم اور ملائم بالوں کے لمس سے ناآشنا تھا جو اس لڑکی کے تھے۔ اُس نے ایسی، نشیلی آنکھیں اتنی قریب سے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اُس پر خمار طاری ہو گیا۔

شام کو زرفہ کا باپ آیا تو اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ انہوں نے زرفہ کی شادی شعیب ارمغانی کے ساتھ کر دی۔ باپ نے زرفہ کو نقد رقم دی، کپڑے دیئے اور سونے کے زیورات دیئے اور وہ اُسی شام چلا گیا۔ اُس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے ارمغانی کو اپنی بیٹی دینے ہی آیا ہو۔

اُس رات ارمغانی کو کئی بار شک ہُوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں زرد اُس کے ساتھ یوں کُھل گئی جیسے وہ ایک مدّت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ یہ لڑکی ارمغانی پر طلسم کی طرح طاری ہو گئی۔ ارمغانی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے چشمے پر آ کر اُسے پتہ چلا ہو کہ وہ پیاس سے مر رہا ہے۔

"تمہارا باپ سلطان محمود کے متعلق بہت جذباتی ہے"۔ ارمغانی نے زرفہ سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ اُس کے ارادے کیا ہیں؟"

"اگر میں آپ سے کہوں کہ وہی ارادے میرے ہیں جو میرے باپ کے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟"۔ زرفہ نے کہا "میرے باپ نے آپ کے ساتھ جو باتیں کیں تھیں، وہ سب مجھے بتا گئے ہیں"

"اور یہ بھی کہہ گئے ہوں گے کہ تم مجھے جاسوسی کے سلسلے میں اُس کی مدد پر آمادہ کرو"۔ ارمغانی نے کہا۔

"ہاں"! ۔ زرفہ نے کہا "میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ وہ مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں آپ کو اسلام کی خاطر کام کرنے کے لیے تیار کروں کیونکہ آپ کو راجہ نے ایسی جگہ دے رکھی ہے۔ جہاں سے آپ بڑے قیمتی راز حاصل کر سکتے ہیں"۔

کیا تم نے اسی مقصد کے لیے میرے ساتھ شادی کی ہے؟"۔ ارمغانی نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم مجھے انعام کے طور پر دی گئی ہو"۔

"نہیں" ۔۔۔ زرفہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا "خدا نے آپ کو مجھے انعام کے طور پر دیا ہے۔ آپ میری زندگی کے ساتھی ہی نہیں، میرے دل اور میری روح کے مالک ہیں۔ میں نے آپ کو کل ہی دیکھا ہے نا! مگر ایسے لگتا ہے جیسے ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہے ہیں۔ میرے دل میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے .... میرا ہر راز آپ کا ہے۔ آپ کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم باپ بیٹی اسلام کی شمع کے پروانے ہیں۔ میرے والد پر یہ جنون طاری ہے کہ سارے ہند میں اسلام پھیلانا ہے۔ وہ جس مسلمان سے ملتے ہیں، اُس سے پہلی بات یہ پوچھتے ہیں "سلطان محمود غزنوی کی فتح کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟" ۔۔۔ مسجد میں جاتے ہیں تو سلطان محمود کی فتح اور ہندوؤں کی شکست کے لیے دعائیں کرتے اور کراتے ہیں۔ وہ

مجھے تیغ زنی، گھوڑ سواری اور تیر اندازی کی بہت مشق کرا چکے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا تھا کہ بیٹی! ہو سکتا ہے میں تمہاری شادی نہ کر سکوں۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ تم اسلام اور سلطان محمود کے نام پر قربان ہو گی۔"

ارمغانی نے محسوس کیا کہ لڑکی کے خیالات اپنے باپ جیسے ہیں اور اس میں باپ والا جوش و خروش ہے۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ میں غزنی والوں کا جاسوس ہوں؟" ارمغانی نے پوچھا۔

زرفہ نے اپنا ایک بازو اُس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اُس کے اتنا قریب ہو گئی کہ دونو کے گال چھونے لگے۔

"مجھے معلوم نہیں کہ والد کو آپ کے متعلق کس نے بتایا تھا" زرفہ نے جواب دیا۔ "مجھے انہوں نے کہا تھا کہ ہم جس آدمی کے پاس جا رہے ہیں، وہ ہمارے کام کا آدمی ہے"۔ زرفہ نے منہ اُس کے اور قریب کر کے رازداری سے کہا۔ "اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ سلطان محمود کے خفیہ آدمی نہیں تو مجھے مایوسی ہوئی ہے۔"

"پھر تمہارے دل سے میری محبت نکل جائے گی؟"

"محبت تو روح میں اُتر گئی ہے"۔ زرفہ نے جواب دیا "میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غزنی کی فوج کی اتنی مدد کرنی چاہیے کہ وہ اگر سارے ہند پر نہیں تو آدھے ملک پر قابض ہو جائے اور یہاں کا بچہ بچہ مسلمان ہو۔"

"تمہیں کس نے یہ بتایا ہے کہ صرف جاسوسی سے ہی غزنی والوں کی مدد کی جا سکتی ہے؟" ارمغانی نے پوچھا۔ "اور بھی کئی طریقے ہیں"۔

"میرے والد صرف جاسوسی کی باتیں کرتے ہیں" زرفہ نے کہا۔ "ایک عورت یہی کام کر سکتی ہے لیکن میرے والد مجھے بتا گئے ہیں کہ تم نے ان سے قرآن پر قسم لی ہے کہ وہ مجھے اس کام کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔۔۔ میں ایسا کام نہیں کروں گی جس میں میری عصمت کو خطرہ ہو لیکن میں صرف بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ وہ کام کریں جو آپ کو میرے والد بتا گئے ہیں۔ یہ میری روح کی آرزو ہے۔"

شعیب ارمغانی نے اُسے کوئی تسلّی بخش جواب نہ دیا۔

اُس رات کے بعد ارمغانی کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ کام سے وقت نکال کر گھر چلا جاتا اور زرفہ کے ساتھ چند منٹ گذار کر واپس چلا جاتا۔ زرفہ اُس کی بیوی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اُسے اس طرح دیکھنے لگتا جیسے اُسے اُس سے کوئی چھین کر لے جائے گا۔ زرفہ اس کی محبّت کا جواب دیوانہ وار محبّت سے دیتی لیکن وہ ہر رات اُسے اکساتی کہ وہ ہند میں اسلام کی فتح کے لیے کچھ کرے۔ اس معاملے میں بھی وہ اتنی ہی جذباتی تھی جتنی ارمغانی کی محبّت میں دیوانی۔

دس بارہ روز گذرے ہوں گے۔ آدھی رات تک وہ دونوں رازو نیاز اور پیار و محبت میں محو رہے۔ ارمغانی پر نیند کا غلبہ ہُوا جا رہا تھا۔ زرفہ کے حسُن و جوانی نے اُس پر اپنا خمار طاری کر دیا تھا۔ اس کیفیت میں زرفہ نے آہ بھر کر کہا۔ "آپ کے جسم کی تپش اور آپ کی محبّت کا سرور مجھے جنّت میں پہنچا دیتا ہے۔ جنّت اس سے زیادہ دلنشیں نہیں ہو سکتی، مگر اس نشے میں جب غزنی کے وہ جوان یاد آتے ہیں جو اتنی دُور آکر شہید ہوئے ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہیدوں کی روحیں مجھے لعنت ملامت کرتی ہیں کہ تم عیش و عشرت میں پڑی ہوئی ہو، اور تمہیں اپنی روح کی مسرّت کا کوئی خیال نہیں۔"

اُس نے بے تاب ہو کر ارمغانی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی "میری روح کا گلا گھونٹ دو تاکہ میں صرف خوبصورت جسم رہ جاؤں اور تم اس کے ساتھ کھیلتے رہو۔ اگر ہم ان شہیدوں کے عزم کو جنہیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، پورا نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنا مذہب تبدیل کر لینا چاہیئے۔"

ارمغانی پر خمار طاری تھا۔ یہ خمار اُس کی عقل پر غالب آگیا۔ اُس نے کہا "زرفہ! میں اپنی قسم توڑنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے مسجد میں قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ جان دے دوں گا، اپنا اور اپنے کسی ساتھی کا راز کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔ آج میں اپنی قسم اس لیے توڑ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری بیوی ہی نہیں، میرے اُن ساتھیوں کی طرح میری ساتھی بھی ہو جو میری طرح حلف اُٹھا کر پشاور سے آئے تھے ....

میرا راز سن لو۔ میں غزنی کی فوج کا جاسوس ہوں۔ میں نے نوجوانی میں غزنی جا کر جاسوسی کی تربیت حاصل کی اور یہاں آیا تھا۔ مجھ میں ہنر یہ تھا کہ گھوڑا کتنا ہی اکھڑ اور منہ زور ہو، اُسے اپنا غلام بنا لیتا ہوں۔ خدا نے مجھے چند اور خوبیاں بھی دی ہیں۔ یہاں آیا تو مجھے ہندوؤں نے یہ ملازمت دے دی ....

"میری قربانی کا اندازہ کرو زرفہ! میں نے اپنی جوانی کی اُمنگیں قربان کر دیں۔ شادی نہ کی۔ میں نے راتیں تنہا گذاری ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکیوں نے مجھے محبت کے پیغام دیئے۔ راجکماریوں نے میرے جسم پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے لالچ دیئے۔ میرے انکار پر مجھے مروا دینے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن میں عورت کے لیے پتھر بنا رہا۔ لاہور اور بھٹنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس ہیں، وہ میری کمان میں ہیں۔ وہ میرا گروہ تھا جس نے ہندوؤں کی ہر پیشقدمی کی اطلاع سلطان محمود تک اتنی قبل از وقت پہنچائی ہے کہ سلطان نے حملہ روکنے کی پیش بندی بھی کر لی اور گھات بھی لگائی ....

"میں وہ آنکھ ہوں جس سے سلطان محمود غزنی سے دیکھ سکتا ہے کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا گروہ وہ کان ہیں جن سے سلطان محمود اُن گھوڑوں کے ٹاپ بھی سن سکتا ہے جو اُس کی طرف لاہور سے چلتے ہیں۔ میرے گروہ نے یہاں فوج کی رسد اور سامان کا ذخیرہ بھی جلایا ہے۔ اب راجہ انندپال سلطان پر جوابی حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہم اس کی رسد ایک بار پھر جلانے کی کوشش کریں گے تاکہ سلطان کو تیاری کا وقت مل جائے ....

"زرفہ! میں نہیں بتا سکتا کہ میں کتنے دن اور تمہیں نظر آتا رہوں گا۔ تم نے اُس آدمی کے ساتھ شادی کی ہے جو جلّاد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے۔ میں تمہارے والد کو یہ راز نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔"

زرفہ نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔ "آپ نے میری روح کو مسرّتوں سے سرشار کر دیا ہے۔ مجھے آپ نے روحانی سکون دیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھے آپ جہاں بھی استعمال کریں گے، میں ہر مشکل میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آگ لگانے اور آگ میں کود جانے سے بھی نہیں ڈروں گی۔"

"میں مرجانا پسند کروں گا، تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا۔" ارمغانی نے کہا۔ "اگر

پکڑا گیا یا مارا گیا تو تمہیں بہت دن پہلے بتا دوں گا کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

"مجھے اپنے ایک دو ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دیں۔ زرفہ نے کہا۔ "تاکہ آپ زیادہ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو جائیں تو میں اُن سے معلوم کر لیا کروں۔"

"ہم نے یہ راز اپنی ماؤں کو بھی کبھی نہیں دیتے۔" ارمغانی نے کہا۔ "تمہیں اگر میری غیر حاضری میں یہاں سے غائب کرنے کی ضرورت پڑی تو میرے ساتھی خود آ کر تمہیں لے جائیں گے۔ اُن کے پاس میری کوئی ایسی نشانی ہوگی جسے دیکھ کر تمہیں اعتبار آ جائے گا کہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو رہا۔"

زرفہ نے جب ایک بار پھر کہا کہ اُسے اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دے تو ارمغانی نے غصّے سے کہا "زرفہ! اپنی زبان سے یہ سوال دھو ڈالو۔ میں اس راز پر تمہاری محبّت کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

تین چار دن اور گذر گئے۔ زرفہ ارمغانی کی بیوی بن کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ لیکن ارمغانی نے اُس پر اپنا آپ ظاہر کر دیا تو وہ مسرّت سے سرشار رہنے لگی... ایک رات وہ بہت دیر عشق و محبّت کے راز و نیاز میں محو رہے۔ ارمغانی دن بھر نئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تھکن سے چور تھا۔ زرفہ کے ساتھ وہ زیادہ دیر جاگتا رہا اور سو گیا۔ زرفہ کی آنکھ نہ لگی۔

وہ تھوڑی دیر ارمغانی کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نیند جب بے ہوشی کی صورت اختیار کر گئی تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں صحن میں نکل گئی۔ ذرا سی دیر کھڑی رہی پھر ڈیوڑھی میں چلی گئی۔ صدر دروازے کے ساتھ کان لگائے اور صحن میں چلی گئی۔ ذرا ٹہل کر کمرے میں گئی اور ارمغانی کو دیکھا، وہ خراٹے لے رہا تھا۔ زرفہ پھر صحن میں چلی گئی۔ وہ بے چین تھی۔ دبے پاؤں چلتی تھی۔

اُسے بلّی کی دھیمی سی "میاؤں" سنائی دی۔ بلّی باہر بولی تھی یا چھت پر۔ زرفہ دبے پاؤں ڈیوڑھی میں گئی اور صدر دروازے کی زنجیر کھول دی۔ کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے سرگوشی میں پوچھا "سو رہا ہے؟"

زرفہ نے فوراً جواب نہ دیا۔ ذرا سوچ کر بولی۔ ”ابھی جاگ رہا تھا۔ شاید اب تک سو گیا ہو۔ میں ڈیوڑھی میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم باہر ہی ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں سو گیا ہو تو آکر دروازہ کھول دوں گی۔“

وہ زنجیر چڑھا کر تیزی سے اُس کمرے میں گئی جہاں ارمغانی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ زرفہ نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ ارمغانی نے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے۔

”زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ارمغانی!“۔۔۔ زرفہ نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر نہ رُکنا۔ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ میرا باپ مجھے دھوکے کا ذریعہ بنا کر لایا تھا۔ میرا باپ تاجر نہیں۔ راجہ انند پال کا جاسوس ہے۔ ہم پشاور سے نہیں بھٹنڈہ سے آئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ تمہارے متعلق کسی نے شک ظاہر کیا تھا کہ تم غزنی والوں کے جاسوس ہو مگر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ تم سے ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ تم جاسوس ہو یا نہیں، اور اگر ہو تو تمہارے ساتھی کون کون ہیں....

”میرا باپ بھٹنڈہ سے یہاں آیا تو اسے یہ کام دیا گیا کہ تم سے راز لے۔ وہ پشاور کا تاجر بن کر آیا اور مجھے ساتھ لے آیا۔ اُس نے تمہارا پردہ اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن تم نے راز نہ دیا۔ میرے باپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مجھے تمہاری بیوی بنا دیا۔ یہ میرے حُسن اور میری جوانی کا اثر تو ضرور تھا لیکن میں نے جس طرح تم پر اپنا نشہ طاری کیا، یہ میرا کمال تھا۔ تم مرد ہو اور عورت مرد کی خطرناک کمزوری ہوتی ہے۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ میں نے تمہارے سینے سے راز نکال لیا۔“

شعیب ارمغانی مسحور کئے ہوئے آدمی کی طرح سُن رہا تھا۔ باہر ایک بار پھر بلی کی ”میاؤں“ سنائی دی۔ زرفہ اور تیزی سے بولنے لگی۔

”تم جب اپنے کام پر چلے جاتے تھے تو ایک عورت میرے پاس آتی تھی۔ میں اُسے بتلایا کرتی تھی کہ راز لیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک دن میں نے اُسے بتایا کہ یہ آدمی بڑا خطرناک جاسوس ہے۔ مجھے کہا گیا کہ تمہارے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کروں۔ تم نے

مجھے یہ راز نہ دیا۔ میں نے اپنے باپ کو اطلاع بھیجی کہ یہ راز لینا ناممکن ہے۔ مجھے اطلاع ملی کہ آج میں جاگتی رہوں۔ باہر بلی کی میاؤں سنائی دے گی تو میں دروازہ کھول دوں۔ تین آدمی آئیں گے ان میں میرا باپ بھی ہوگا۔ وہ تمہیں پکڑلیں گے اور تمہیں تمہارے سینے سے راز نکالنے کے لیے مجھے استعمال کریں گے یا تمہیں اذیتیں دیں گے.... مجھ سے تفصیل سے نہ پوچھنا وہ آگئے ہیں۔"

"پھر دروازہ کیوں نہیں کھولا؟"۔ ارسغانی نے پوچھا اور اچھل کر اٹھا۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی برچھی اٹھالی اور بولا "جا بدکار! اپنی عصمت سے کھیلنے والی! جا، اور تینوں کو اندر بلالے.... میں خود جاکر دروازہ کھولتا ہوں۔ دیکھ تیرا شکار کس طرح تین آدمیوں میں سے نکل کر غائب ہوتا ہے۔"

زرفہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ "ارسغانی میری بات سن لو۔ خدا کے لیے باہر نہ جانا۔ میری بات سن لو۔"

تینوں آدمی باہر کھڑے بے تاب ہوئے جارہے تھے۔ ایک نے کہا "اب تک دروازہ کھل جانا چاہیے تھا۔"

"لڑکی دھوکہ نہ دے جائے"۔ ایک اور نے کہا "اس نے اندر سے زنجیر کیوں چڑھادی ہے؟"

"تمہاری بیٹی اس کی غلام ہوگئی ہے"۔ ایک نے زرفہ کے باپ سے کہا "تم ہو تو بڑے عقلمند لیکن عقل والے بیوقوفوں سے دھوکہ کھایا کرتے ہیں۔"

"ذرا سا اور انتظار کرلو"۔ زرفہ کے باپ نے کہا۔

اندر زرفہ شعیب ارسغانی سے کہہ رہی تھی "میرا فرض یہی تھا کہ تمہیں پکڑوا دیتی۔ میں نے اپنے باپ کا حکم مانا اور اسے تمہاری ڈھکی چھپی اصلیت بتادی ہے مگر میں جو سراپا دھوکہ بن کر آئی تھی، تمہارے مردانہ حسن اور تمہارے اسلامی جذبے کی زنجیر میں جکڑی گئی۔ مجھے تمہاری بیوی جو بنایا گیا تھا، یہ فریب تھا لیکن میرے دل نے مجھے مجبور کردیا کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوجاؤں۔ میں کوئی شریف لڑکی نہیں لیکن مجھے جو ملا جسم

کا شیدائی ملا۔ تم نے مجھے روحانی محبت سے سرشار کیا۔ تم نے محبت کا یہ ثبوت دیا کہ اپنا حلف توڑا اور مجھے اپنا سمجھ کر راز دے دیا۔ میرے اندر اسلام کا جذبہ بیدار ہو گیا ....

"میں نے اپنے باپ کا حکم اس لیے مانا کہ بچپن میں میری ماں مر گئی تھی۔ باپ نے مجھے ماں کی طرح پالا۔ اس نے مجھے شہزادی بنایا۔ میں جوان ہوئی تو اس کا ہر ناجائز حکم بھی مانا۔ اُس نے میرے ذریعے ہندو حاکموں اور ان کے ذریعے راجہ کی خوشنودی حاصل کی۔ اُس نے اپنا ایمان بیچ ڈالا اور خوب دولت کمائی۔ اُس نے مسلمان ہو کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کرایا۔ میں اسی کو زندگی سمجھتی رہی، مگر تم نے مجھ پر جس دنیا کے دروازے کھولے ہیں، اس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خاوند کی محبت عورت کی جنت ہے ....

"میں نے باپ کا حکم پورا کر دیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے تک دل میں یہی ارادہ رکھا ہوا تھا کہ تمہیں پکڑا دوں گی لیکن دروازہ کھولا اور ان تین آدمیوں کو دیکھا تو مجھ پر ایسا خوف طاری ہو گیا جیسے یہ تینوں میرا سینہ چیر کر میرا دل نکال لے جانے کے لیے آئے ہوں۔ مجھے اپنے باپ سے کہیں زیادہ تم عزیز لگے۔ اُن کے لیے میں جسم ہوں۔ میری روح کو تم نے جگایا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا اور انہیں کہا کہ تم جاگ رہے ہو، ذرا انتظار کرو۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ اوپر چلے جاؤ ارمغانی! پیچھے سے کود جاؤ۔"

"اور تم؟"

"شاید کبھی ملیں" — زرینہ نے کہا — "زندہ رہے تو ملیں گے۔"

باہر تین آدمی پریشان ہونے لگے تھے۔ ایک نے کہا کہ میں پچھواڑے چلا جاتا ہوں، مجھے گڑبڑ نظر آرہی ہے — وہ ادھر کو چل پڑا۔

یہ آدمی جب پچھواڑے گیا تو ارمغانی منڈیر سے اُتر چکا تھا اور دیوار کے ساتھ پاؤں جما رہا تھا۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ اُس آدمی نے ارمغانی کو للکارا۔ ارمغانی اُوپر سے کودا اور دوسری طرف دوڑ پڑا۔ اسے دیکھنے والے نے شور مچایا لیکن ارمغانی گلی کا موڑ مڑ گیا۔ وہ گلیوں میں دوڑا جا رہا تھا اور اس کے تعاقب میں تین آدمی تھے۔ اُسے رات کا اندھیرا فائدہ دے رہا تھا۔

وہ کھلے علاقے میں چلا گیا جہاں مکان ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ ایک حویلی کے اردگرد فصیل تھی اور فصیل کے ساتھ جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ وہ فصیل کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے وہاں رُک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ارمغانی بیٹھے بیٹھے سرکتا گیا اور فصیل کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ وہ پھاٹک کے اندر جا کر فصیل کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اُٹھا نہیں۔ یہ حویلی کا باغیچہ تھا۔

اُسے تلاش کرنے والے پھاٹک تک آئے۔ کسی نے کہا کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ وہ نکل گیا ہے۔ وہ چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ارمغانی اُٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ حویلی کے ایک کمرے میں روشنی ہے۔ اُسے وہاں رُکنا نہیں چاہیے تھا لیکن خطرہ تھا کہ اُسے تلاش کرنے والے ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھ گیا۔

اس حویلی سے وہ واقف تھا لیکن یہاں کبھی آیا نہیں تھا یہ راجہ انند پال کی ایک رقاصہ اور مغنّیہ کی حویلی تھی۔ مسلمان تھی لیکن سمرتی کہلاتی تھی۔ اپنے فن اور جسمانی حسن میں یکتا تھی۔ اپنی قدر و قیمت جانتی تھی۔ اُس نے راجہ انند پال سے اپنی یہ شرط منوالی تھی کہ وہ محل میں نہیں رہے گی۔ چنانچہ وہ اس حویلی میں رہتی تھی جس کے آگے چھوٹا سا خوشنما باغیچہ تھا۔ سمرتی ہر رات اور ہر کسی کے لیے ناچنے والی رقاصہ نہیں تھی۔ اُسے اُس وقت راجہ بلایا کرتا تھا جب کوئی مخصوص مہمان آیا ہوتا تھا۔ وہ اُڑنے والی تتلی تھی۔ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

اُس رات جب ارمغانی اُس کے باغیچے میں چھپا بیٹھا تھا، وہ ذرا دیر پہلے راج محل سے آئی تھی۔ کسی دوسری ریاست کا راجہ آیا ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی کپڑے بدل رہی تھی۔ اُس کی جوانی کے چند دن ہی باقی تھے۔ اُس نے اپنی بوڑھی خادمہ سے کہا۔ ”آج تو تھک گئی ہوں۔“

”رقاصہ جب تھکن محسوس کرے، اُسے شادی کر لینی چاہیئے۔“ خادمہ نے اُسے کہا۔ ”لیکن ناچنے گانے والیاں سمجھتی ہیں کہ وہ سدا حسین اور جوان رہیں گی اور اُن پر بھنورے منڈلاتے رہیں گے۔“

"میں تو ابھی جوان ہوں" سمرتی نے مسکرا کر کہا۔
"میں بھی یہی کہا کرتی تھی" ـ خادمہ نے کہا "تم میرے متعلق جانتی ہو گی کہ میں بھی رقاصہ تھی۔ تم نے جو شہرہ پایا ہے، وہ میں نے بھی پایا تھا۔ تم جس طرح کسی انسان کو پلے نہیں باندھتی اس طرح میں بھی بڑے بڑے طرحداروں کو دھتکار دیا کرتی تھی۔ مجھے میرے پیشے کی بوڑھی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ کسی کے ساتھ اب شادی کر لو اور یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں بھی تمہاری طرح کہا کرتی تھی کہ میں تو ابھی جوان ہوں ... دیکھ لو۔ آج تمہاری خادمہ ہوں۔ بہت خوار ہوئی ہوں۔ میں نے شادی کی اُس وقت سوچی تھی جب میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میری دہلیز پر ماتھے رگڑنے والوں نے مجھے دھتکار دیا۔ کسی بوڑھے نے بھی مجھے قبول نہ کیا۔"

سمرتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ جوانی ڈھلنے والی ہے۔ اُس کی خادمہ نے اُسے ایسا ہولناک خاکہ دکھایا کہ اُس پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔

باہر کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی، پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کتّے نے کسی کو پکڑ لیا ہو اور اُسے بھنبھوڑ رہا ہو۔ یہ سمرتی نے حویلی کی رکھوالی کے لیے کتّا رکھا ہوا تھا۔ رات کو اسے کھول دیا کرتی تھی۔ اُس کی ایسی خوفناک آواز پر سمرتی اور خادمہ باہر کو دوڑی گئیں۔ اُس کا خونخوار کتّا کسی آدمی پر جھپٹ رہا تھا۔ سمرتی نے دوڑ کر کتّے کو پکڑا۔ کتّے نے غصّے میں اس کے ہاتھ پر بھی پنجہ مار دیا۔

"کون ہو تم؟" ـــ اُس نے اس آدمی سے پوچھا جسے کتّے نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔ "کوئی چور ڈاکو ہو؟"

"اگر چور ڈاکو ہوتا تو یہاں نہ کھڑا رہتا" ـ اُس آدمی نے کہا "میرا نام شعیب ارمغانی ہے۔"

"گھوڑوں کا استاد؟"

"ہاں سمرتی جی!" ـــ ارمغانی نے کہا۔

"یہاں کیا لینے آئے تھے؟" ـ سمرتی نے کہا "اندر چلو۔ اگر تم بھاگے تو جانتے ہو

کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

ارمغانی جب اندر روشنی میں گیا تو اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے دونوں بازوؤں اور ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ کتّے نے اُس کی کھال ادھیڑ دی اور ٹانگ پر کاٹا بھی تھا۔

"میں نہیں مان سکتی کہ تم یہاں چوری کرنے آتے تھے" سمرتی نے کہا "تم ان لوگوں میں سے ہو جو میرے جسم کے شیدائی ہیں۔ تمہیں میری خوبصورتی اور جوانی یہاں لائی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا کتّا شیر اور چیتے کو بھی اس باغیچے میں نہیں ٹھہرنے دیتا" سمرتی نے خادمہ سے کہا "اس کے زخم دھونے کے لیے پانی گرم کرو۔ صاف کپڑا اور شراب لے آؤ۔ اس کے زخموں پر باندھوں۔ شراب اور جلا ہوا سوت زخم کو بہت جلدی ٹھیک کر دیتا ہے۔"

خادمہ چلی گئی تو ارمغانی نے سمرتی سے کہا "تمہارے کتّے نے مجھے تمہارے باغیچے میں پکڑا ہے نا، اس لیے تم مجھے چور کہہ سکتی ہو۔ مجھے بدکار بھی کہہ سکتی ہو جو تمہیں اکیلا جان کر آدھی رات کو آیا ہے .... غور سے سنو سمرتی! تمہیں اپنے حسن اور جوانی پر اتنا زیادہ ناز ہے۔ اسے اگر میری آنکھوں سے دیکھو تو اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو۔"

"کیا تم مجھ سے نفرت کرنے چوروں کی طرح یہاں آتے ہو؟"

"جسے میں چاہتا ہوں اور جو مجھے چاہتی ہے، اگر اُسے دیکھ لو تو تم آئینے میں اپنی صورت دیکھنی چھوڑ دو" ارمغانی نے کہا "دل سے یہ وہم کہ میں تمہاری خاطر آیا ہوں، اور غرور کہ تم بہت حسین ہو نکال دو۔ تم راجہ اسندپال کی راجکماریوں سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ میں انہیں دھتکار چکا ہوں۔"

"پھر یہاں کیوں آتے تھے؟"

سمرتی کے ایک ہاتھ کی اُلٹی طرف کتّے نے پنجہ مار دیا تھا۔ وہاں سے خون کے دو تین قطرے فرش پر گرے۔ ارمغانی اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے خون کے قطرے پہلے ہی گر رہے تھے۔ ارمغانی نے نیچے دیکھا سمرتی کا خون اُس کے خون کے ساتھ مل گیا تھا۔

"اپنے خون کو دیکھو" — ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔ "میرے خون کے ساتھ مل کر اس کا رنگ چمک آیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ .... دونوں خون ایک ہیں۔ تم نے اپنے خون کو تکبر، غرور اور گناہ سے بدرنگ کر رکھا ہے۔ یہ اپنے خون سے ملا تو اپنے اصلی رنگ میں آگیا ہے۔ ... حیران ہو کے مجھے نہ دیکھو، رقاصہ! اب میں تمہیں سمرتی نہیں کہوں گا۔ تمہارا اصل نام مجھے معلوم نہیں ... میں ہندوانہ نام سے ایک مسلمان لڑکی کی توہین نہیں کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہے اور یہ اُن بالپوں کا خون ہے جو ایک تھے اور ہو سکتا ہے کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہی باپ کا ہو۔"

"تم کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔"

"تم جانتی ہو میں کون ہوں" — ارمغانی نے کہا۔ "میں تمہیں تمہارے خون کی اصلیت دکھا رہا ہوں۔ رقص اور موسیقی تمہارا مذہب نہیں۔ حسن اور جوانی اور تمہاری آواز کا جادو تمہاری ملکیت نہیں۔ کل پرسوں تم ان سب سے محروم ہو جاؤ گی۔ آج تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آیا ہوں، پھر تم دعا کیا کرو گی کہ مجھ جیسا کوئی جوان چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آئے، مگر کوئی نہیں آئے گا۔ تم راتوں کو اس کتے کو باندھ کے رکھا کرو گی کہ کوئی تمہارے گھر آئے۔ تم دیکھنا کہ اس کتے کے سوا اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا .... ایک نیکی کرو۔ مجھے پناہ دو۔"

"کیوں؟" — سمرتی نے پوچھا۔ "کیا کر کے بھاگے ہو؟"

"تمہیں ایک لڑکی کے ایثار کی کہانی سناؤں گا" — ارمغانی نے کہا۔ "وہ تم سے زیادہ جوان ہے، تم سے زیادہ حسین ہے، اُس کے حسن میں وہ جادو پورے جوبن پر ہے جو تم گنوا چکی ہو۔ وہ تم سے زیادہ گناہگار ہے لیکن اُس نے اپنا گھر جنت میں بنا لیا ہے .... مجھے پناہ دو۔ اپنی نوکرانی کو یہاں نہ آنے دینا۔ اپنے زخم میں خود صاف کر لوں گا۔ اسے کہو کہ کسی کو نہ بتائے کہ میں یہاں ہوں۔"

سمرتی کو خادمہ پہلے ہی کچھ ایسی باتیں کہہ چکی تھی جن سے اُس کے دل پر بوجھ تھا۔ اب ایک جوان اور دلکش مرد جو اُس کا قیدی اور زخمی تھا، اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے

حسن و جوانی کا جادو ختم ہو چکا ہے۔ اُس کے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اُس نے خادمہ کو یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ سمرتی نے شعیب ارمغانی کے زخم اپنے ہاتھوں شراب سے دھوئے۔ ان پر سفوف اور کورے سوُت کی راکھ باندھی۔ ٹانگ کے زخم گہرے تھے۔

ارمغانی نے سمرتی کے ہاتھ کا زخم صاف کیا۔ اور اس پر سفوف رکھ کر پٹی باندھی۔ اس دوران ارمغانی اسے زرفہ کی بات پوری تفصیل سے سُناتا رہا۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ جھوٹ نہ بولا۔ یہ بھی بتادیا کہ وہ سلطان محمود کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی کی باتیں کیں۔ اُس نے کہا کہ زرفہ کو باپ نے عیش اور گناہ میں ڈال کر اُسے شہزادی بنایا تھا۔ اُس کی فریب کاری کامیاب تھی لیکن روحانی محبت نے اس لڑکی کے سینے میں مسلمان لڑکی کو جگا دیا تو اُس نے ایسا کام کیا کہ خدا کا دل جیت لیا۔

"ٹھہرو" سمرتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "آج رات کالنجر کا راجہ آیا ہوا ہے۔ مجھے اسی کے لیے بلایا گیا تھا۔ راجہ انند پال نے اُسے میرے متعلق بتایا تھا کہ یہ مسلمان ہے اور میری بڑی ہی عزیز اور قیمتی رقاصہ۔ کالنجر کے راجہ نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں، اُسے اغوا کرا کے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا یا ان میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے، اور اگر آپ بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ملک میں جو مسلمان رہ جائیں گے، اُن کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی ہوگا۔"

سمرتی نے ارمغانی کو راجہ کالنجر کی یہ بات سنائی تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ ارمغانی نے اُس کے اندر احساس بیدار کر دیا تھا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ارمغانی نے اُس کی یہ بات سُنی تو اُس نے ایسی باتیں کیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں"۔ ارمغانی نے کہا۔ "غزنی سے اتنی دُور آکر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ تم کھلونہ ہو اور یہ کھلونہ پرانا ہو رہا ہے۔ زرفہ بن جاؤ۔ اپنی رُوح کو پہچانو۔"

یہ رقاصہ ایسی صورتِ حال سے کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اُسے ایسی کرڈی

کیلی باتیں کسی نے کبھی نہیں کہی تھیں۔ اُسے اُس کے حسن و جوانی اور رقص کی تعریفیں کرنے والے ملا کرتے تھے۔ اب اُس کے اندر ایک انکشاف اُبھرنے لگا "تم بھی فریب ہو اور تمہارے چاہنے والے بھی فریب ہیں"۔

"زرفہ کو شاید میں نے دیکھا ہے" سمرتی نے کہا۔ "اگر وہی ہے تو بہت خوبصورت لڑکی ہے .... تم اُسے چاہتے ہو؟"

"میری رُوح اُسے چاہتی ہے" ارمغانی نے کہا۔ "تم نے اس محبت کا ذائقہ نہیں چکھا۔"

"اگر میں تمہیں پناہ دوں تو .... تو مجھے اس محبّت کے ذائقے سے سرشار کر سکتے ہو؟" سمرتی نے کہا۔ "میرے اندر معلوم نہیں کیا ہونے لگا ہے جیسے زمین زلزلے سے ہل رہی ہو۔"

"مجھے بھائی بنا سکتی ہو؟" ارمغانی نے کہا۔ "رُوح کو سرشار کرنا ہے تو دل میں بہن کا رشتہ بیدار کرو۔"

"تم میری پناہ میں رہو گے ارمغانی! لیکن" .... وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ اچانک اُس نے ارمغانی کے گال اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ .... قدرے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "میرے سامنے زرفہ کا نام نہ لینا .... ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو کہ وہ تمہاری بہن نہیں لیکن تم اُس کی خاطر مجھے دھوکہ دو گے"۔ اُس نے ارمغانی کے گال چھوڑ دیئے اور ان ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تم تو راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہو، مجھ سے یہ ڈر کیوں؟"

"میں نہیں بتا سکتی" سمرتی نے کہا۔ "میں نہیں جانتی کیا جواب دوں .... تم میری پناہ میں ہو۔ میری ملکیت ہو .... ہم .... ہم اب .... میں نہیں سمجھ سکتی کہ کیا کہوں .... ہم ایک ہیں" اُس نے فرش پر دیکھ کر کہا۔ "ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیتی ہے .... سو جاؤ .... ارمغانی! سو جاؤ۔ زخم ٹھیک ہونے تک تمہیں پکڑنے کوئی نہیں آئے گا۔"

شعیب ارمغانی کو تلاش کرنے والے مایوس ہو کر اُس کے گھر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو زرفہ نے دروازہ کھولا۔ اُس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ نکل کس طرح گیا ہے۔

"وہ جاگ رہا تھا" زرفہ نے کہا "تم لوگ بار بار بلّی کی آواز نکالتے تھے۔ میں تمہیں خاموش کرنے کو آئی تو اُس نے دیکھ لیا۔ وہ بہت چالاک اور عقلمند آدمی ہے۔ اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوڑ کر چھت پر چلا گیا۔ پھر مجھے تم میں سے کسی کا شور سنائی دیا۔ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ مجھے اتنے دن اُس کی بیوی بنائے رکھا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔"

پھر شہر میں اور گردونواح میں اُس کی تلاش شروع ہو گئی۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ ہر مسلمان گھر کی تلاشی اس طرح لی گئی کہ جانوروں کی کھرلیوں میں سے چارہ بھی اُٹھا کر دیکھا گیا۔ ارمغانی کی انہیں مشک بھی نہ ملی۔

نگر کوٹ کے پنڈت رادھا کشن کو اطلاع ملی کہ راجہ انند پال لاہور واپس آ گیا ہے تو اُس نے راجہ کو نگر کوٹ بلا بھیجا۔ قاصد کے آتے ہی انند پال نے تیاری اور فوری روانگی کا حکم دے دیا۔ دوسرے راجوں کی طرح وہ بھی نگر کوٹ کے مندر کا احترام کرتا اور وہاں کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن اب اُس کی ضرورت مختلف تھی۔ وہ پنڈت کے حکم سے دوسرے راجوں سے بہت سی فوجی مدد لینا چاہتا تھا تاکہ سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

وہ مہاراجوں والی شان و شوکت سے نگر کوٹ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک قافلہ تھا جس میں اُس کا محافظ دستہ تھا۔ دس بارہ پالکیاں تھیں جن میں سے ایک میں اُس کی عزیز ترین رقاصہ سمرتی تھی اور باقی پالکیوں میں اُس کی اپنی اور سمرتی کی خادمائیں تھیں۔ سمرتی اپنی بوڑھی خادمہ کو اپنے گھر چھوڑ آئی تھی اور سختی سے کہہ آئی تھی کہ ارمغانی کو ایک راز کی طرح چھپائے رکھے۔ اُس کے ساتھ جو خادمائیں تھیں، وہ جوان لڑکیاں تھیں۔ قافلے میں دیگر ضروری سامان کے خچروں کے علاوہ سازندے بھی تھے۔ راجہ نے نگر کوٹ میں مندر والی پہاڑی کے دامن میں ایک سرسبز اور خوشنما جگہ کیمپ لگایا۔ وہ چار پانچ دنوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اس لیے تھکن نے اُسے اُسی وقت اوپر مندر میں نہ جانے دیا۔

پنڈت رادھاکشن کو اطلاع ملی تو اُس نے نیچے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ کے استقبال کے لیے شام کے بعد نیچے آئے گا۔

وہ شام کے بعد نیچے آیا تو راجہ انند پال نے آگے بڑھ کر اُس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے۔ پنڈت کو شک ہونے لگا جیسے یہ جنگل نہیں، کسی مہاراجہ کا محل ہے۔ اوپر شامیانے اور اِرد گرد خوشنما کپڑے کی قناتیں تھیں۔ فانوس اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ قالین بچھے ہوئے اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پنڈت بیٹھا ہی تھا کہ پہلے چار لڑکیوں نے رقص شروع کیا۔

رقص کے دوران پنڈت نے راجہ سے کہا۔"آپ شاید وہ راجہ انند پال نہیں ہیں، جن کے باپ نے اور آپ نے بھی مسلمانوں سے پے بہ پے شکستیں کھائی ہیں۔ آپ کے باپ نے خودکُشی کرلی تھی اور آپ شاید بھاگ گئے تھے؟ ..... اگر آپ وہی ہیں تو آپ کی شکست کی وجہ یہ ہے جو آپ مجھے خوش کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے مہاراجے میدانِ جنگ میں بھی اسی شان و شوکت سے جایا کرتے ہیں۔"

"مہاراج!"۔ راجہ انند پال نے کہا۔"مرنے سے پہلے ہم دل بہلاوے کا بندوبست ساتھ رکھتے ہیں۔"

"مگر آپ مرے نہیں"۔ پنڈت نے کہا۔"اتنی بار شکست کھا کر بھی آپ زندہ ہیں، اور آپ صرف اس لیے زندہ ہیں کہ اپنی بہشت خود بنا کر اسی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کی شکست کی وجہ کیا ہے۔ جسم کی لذّت اور سرور حاصل کرنے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔"

اتنے میں لڑکیاں رقص کرتی ہوئی یوں ایک طرف کو غائب ہوگئیں جیسے ہوا میں تیرتی ہوا میں تحلیل ہوگئی ہوں۔ سازوں کی دھُن بدل گئی۔ نئی دھن کا تاثر ایسا تھا کہ پنڈت بھی چونک اُٹھا۔ ایک طرف سے سمرتی یوں آئی جیسے جل پری پانی میں تیرتی آرہی ہو۔ وہ پنڈت کے قریب آگئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مخمور سا تبسّم تھا۔ اُس نے جسم کو ناگن کی طرح بل دے کر پنڈت کو جھُک کر سلام کیا۔ فانوسوں کی روشنی میں سمرتی کا حُسن سحر انگیز ہوگیا تھا۔ راجہ انند پال نے پنڈت رادھاکشن کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے پنڈت مسحور ہُوا جا

رہا ہو۔

سمرتی کا جسم ہوا میں جھولتی، پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح سازوں کی تھرکتی ہوئی پُرسوز لَے پر جھولنے لگا تو پنڈت نے راجہ انند پال سے پوچھا "ہندو یا مسلمان"؟

"مسلمان!" راجہ انند پال نے جواب دیا۔ "اس پیشے میں ہم صرف مسلمان لڑکیوں کو ڈالتے ہیں"۔

"اگر اس رقاصہ کو ہم اپنے مندر کی نرتکی بنا لیں تو آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں گے"؟

"اس کی بجائے مہاراج مجھ سے ایک سو لڑکیاں لے لیں"۔ راجہ انند پال نے کہا۔ "یہ رقاصہ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے"۔

"میں یہی سننا چاہتا تھا"۔ پنڈت نے کہا۔ "میں اسے اپنے لیے نہیں لے جا رہا۔ میں مندر میں کسی داسی کو بھی نہیں رکھتا۔ نرتکی (رقاصہ) کو کیوں رکھوں گا!.... اسے کشن بھگوان کے چرنوں (قدموں) میں قربان کرنا ہے"۔

"قربان کرنا ہے!"۔ راجہ نے بدک کر پوچھا۔

"ہاں راجہ انند پال!" پنڈت نے کہا۔ "یہ خواہش میری نہیں، یہ دیوتاؤں کا انتخاب ہے۔ یہ رقاصہ انہوں نے مانگی ہے"۔

"ہم لاہور میں دو لڑکیوں کی جان کی قربانی دے چکے ہیں"۔

"اور آپ نے دونوں بار شکست کھائی"۔ پنڈت نے کہا۔ "کیونکہ آپ کے پنڈتوں نے ان لڑکیوں کو ناپاک کر کے ذبح کیا تھا.... مجھے خواب میں کشن مراری کا اشارہ ملا تھا کہ قربانی اُس لڑکی کی دو جو رقص میں بے مثال ہو، حسن میں بے مثال ہو، بوڑھی نہ ہو، نوجوان بھی نہ ہو اور وہ جس کے پاس ہو اُسے اتنی عزیز ہو کہ کسی قیمت پر کسی کو دینے پر رضامند نہ ہو سکے.... میں بہت عرصے سے ایسی رقاصہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے مل گئی ہے۔ میں ہندو دھرم کی فتح چاہتا ہوں۔ میں تمہیں دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کی فکر میں ہوں"۔

راجہ انند پال نگر کوٹ کے پنڈت کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ پنڈت نے اُس کے ساتھ سلطان محمود پر حملے کی اور ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالنے کی وہی باتیں کیں جو وہ بہت دن پہلے دوسرے مہاراجوں سے کر چکا تھا۔ اسے بھی پنڈت نے وہی مشورہ دیا کہ مسلمانوں

کو پشاور سے آگے جہاں راجہ جے پال نے شکست کھائی تھی للکار دا اور اُسے شکست دے کر لمغان کے سلسلۂ کوہ میں گھس جاؤ۔ آگے غزنی ہے۔ غزنی کی سلطنت کو ہماری فوجوں سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

"بھیرہ اور ملتان کا کیا بنے گا؟" راجہ انند پال نے پوچھا۔

"وہ دونوں شہروں کی مسلمان فوج ہماری قیدی ہوگی"۔ پنڈت نے کہا۔ "آپ چلے جائیں۔ راگ رنگ کو بھول کر جنگی تیاری کریں۔ تمام ریاستوں کی فوج آپ کے پاس پہنچ رہی ہے"۔

اگلے روز راجہ انند پال اوپر گیا اور مندر میں پوجا پاٹ کر کے واپس آگیا سمرتی کو پنڈت رات کو ہی لے گیا تھا۔ راجہ انند پال اُسے دیکھ بھی نہ سکا۔

پنڈت رادھا کشن سمرتی کو پہاڑی پر مندر میں لے گیا۔ وہ خاموشی سے اُس کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اسے ذبح کر کے اس کے خون سے کشن مراری کے بُت کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔ اُسے جب پنڈت تہ خانے کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر قالین اور قالین پر بستر بچھا ہوا تھا تو سمرتی نے پنڈت سے پوچھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

"کیا تمہیں ہمارے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟" پنڈت نے پوچھا اور کہا۔ "بیٹھو تو سہی"۔ پنڈت مسکرانے لگا۔

سمرتی نے بیٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے کھینچا۔ پنڈت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ سمرتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آگیا۔ پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی سمرتی نے کہا۔ "مہاراج نے میرے رقص کی قدر نہیں کی ..... ابھی آپ نے میرا رقص دیکھا ہے، آواز نہیں سنی، مگر آپ کو میرا جسم اچھا لگا ہے"۔

"اوہ!" پنڈت نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ "تم تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی ہو۔ مجھے تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی

ہے اور خالی ہی رہے گی۔"

"کیوں ؟"

"ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔

"پھر آج یہ گناہ کیسے کر بیٹھے ؟"

"ابھی جواب نہیں دے سکتا"۔ پنڈت نے کہا۔ "دل سے وہ وہم نکال دو جو تم نے میرے ساتھ اس کمرے میں آ کر پیدا کر لیا ہے۔ ہمیں تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ ہم سے ابھی کچھ نہ پوچھو۔ ہم تمہیں دیوی کا درجہ دیں گے۔ تمہیں گنگا جل میں نہلائیں گے۔ تمہارے سارے پاپ جھڑ جائیں گے۔"

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ وہ کچھ دیر ہنستی ہی رہی اور پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بچوں کی طرح ہنستے ہنستے اس طرح لڑھک گئی کہ اُس کا سر پنڈت کی گود میں جا گرا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور بہت ملائم تھے۔ بالوں میں ایسا عطر لگایا گیا تھا جو مہاراجوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور مہاراجے یہ اپنی خاص قسم کی عورتوں کو لگایا کرتے تھے۔ اس کی بُو میں مدہوشی کا اثر تھا۔ اس اثر کے ساتھ سمرتی کے ریشمی بالوں اور عریاں کندھوں کے لمس کا اثر شامل ہوا تو پنڈت کا جسم بڑی زور سے کانپا۔ اُس نے عورت کو اتنی قریب سے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر قدرت کا ایک شاہکار اس کی گود میں آن گرا تھا۔

"اٹھو لڑکی!"۔ پنڈت نے اسے ہاتھ لگائے بغیر کہا۔ "اٹھو اور بتاؤ کہ تم کیوں ہنس رہی ہو"۔

سمرتی کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ جسموں سے کھیلنا جانتی تھی۔ وہ اٹھنے کی بجائے پیٹھ کے بل ہو گئی اور سر پنڈت کی گود میں رہنے دیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور نظروں کی شوخی سے بولی۔ "آپ مجھے گنگا جل میں نہلا کر میرے پاپ دھو ڈالیں گے ؟... نہیں .... آپ نے غلط کہا ہے۔ کہنا یوں چاہیئے کہ میں گنگا میں اتروں گی تو گنگا کے پاپ بہ جائیں گے۔"

پنڈت نے اُسے اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ سمرتی ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھی اور پنڈت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں .... مجھے پاک کرنے"۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ "میرے

پاپ اُس روز دھلیں گے جس روز ان تمام پاپیوں کو آپ گنگا میں ڈبو دیں گے جنہوں نے میرے جسم کو کھلونا بنایا ہے۔ کیا آپ کا بھگوان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟..... اور پنڈت جی مہاراج! میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرا کوئی مذہب رہنے نہیں دیا گیا۔ مجھے تھوڑے دن ہوئے پتہ چلا ہے کہ میرے اندر جو روح ہے وہ پاک ہے اور یہ روح اُس انسان کے انتظار میں میرے جسم کے پنجرے میں تڑپ رہی ہے جو اسے سچا پیار دے گا۔"

"تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ وہ کون ہے؟"

"وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ کوئی آپ سے زیادہ بوڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی مجھ سے زیادہ جوان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی رشی منی اور کوئی مولوی بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کُٹیا میں رہتا ہو۔ وہ کسی محل کا باسی بھی ہو سکتا ہے..... کیا آپ کے پاس گنگا جل میں دُھلا ہوا پیار نہیں ہے؟"

پنڈت یوں چونکا جیسے اُسے کسی نے بڑے پیارے خواب سے بیدار کر دیا ہو۔ وہ جو دعویٰ کرتا تھا کہ اُس کی زندگی عورت سے خالی رہی ہے اور خالی رہے گی، سمرتی کے ریشمی بالوں میں اُلجھ گیا تھا، یا اُس کے تبسّم، یا اس کے سحر آگیں پیکر میں، یا اس کی باتوں میں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا اور قدرے ہکلا کر بولا۔۔۔ "کیوں نہیں..... ایک پجاری سے تمہیں پاپ نہیں پیار ملے گا۔"

"اگر آپ مجھے وہ پیار دے دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بُتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر بھی تھرکنے لگیں گے اور آپ کے جس بُت کے ہونٹوں کے ساتھ بنسری لگی ہوئی ہے، اس بنسری سے وہ نغمہ پھوٹ اُٹھے گا جو آپ کو مدہوش کر دے گا۔ دُور دُور سے لوگ نگر کوٹ کی نرتکی کا نرتک (رقص) دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کشن بھگوان کی بجائے نگر کوٹ کی نرتکی کی پرار تھنا کیا کریں گے۔"

پنڈت اُٹھا اور یوں کمرے میں ٹہلنے لگا کہ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سمرتی اسے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت رکتا تھا۔ اسے دیکھتا تھا اور ٹہلنے لگتا تھا۔

"مہاراج کے پاس صبح جاؤں گی؟"۔۔۔ سمرتی نے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں مہاراج انند پال سے تحفے کے لیے مانگ لوں تو کیا کہو گی؟"

"یہی کہ پہلے میں ایک راجہ کی ملکیت تھی، اب نگر کوٹ کے پجاری کے پنجرے میں آگئی ہوں"۔ سمرتی نے جواب دیا "لیکن میری روح کی قیمت آپ کو ادا کرنی ہوگی جو زرو جواہرات کی صورت میں نہیں ہوگی"۔ اُس نے اپنے گلے میں پڑا ہُوا بیش قیمت ہار گلے سے زور سے نوچا اور اسے ایک بیکار چیز کی طرح پنڈت کے پاؤں میں پھینک دیا۔ انگلیوں سے ہیروں والی انگوٹھیاں اتار پھینکیں اور بولی ۔ "انہیں اپنی گنگا میں بہا دیں"۔

پنڈت نے جھُک کر یہ چیزیں اٹھائیں اور آہستہ سے اس کے آگے رکھ کر کہا۔ "آرام سے سو جاؤ۔ ہم صبح آئیں گے اور گنگا کنارے چلیں گے"۔

راجہ انند پال لاہور چلا گیا۔ اُس کے دل پر بوجھ سا تھا۔ سمرتی کے ساتھ اسے پیار تھا اور یہ پیار اُس کے فن کی بدولت تھا بلکہ یہ فن کا پیار تھا۔ وہ سمرتی کی بجائے ایک سو حسین کنواریاں قربان کرنے کو تیار تھا مگر پنڈت نے سمرتی کو ہی قربانی کے قابل سمجھا .... راجہ زیادہ دن پریشان نہ رہ سکا کیونکہ دوسری ریاستوں کی فوجیں لاہور میں آنے لگی تھیں۔ ان میں قنوج، گوالیار اور اجمیر کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج کو لاہور بھیجنے کی بجائے پشاور کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے کمانڈروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دریائے سندھ پار کریں۔ اپنی طرف کے کنارے سے دو خیمہ زن ہو جائیں۔

یہ ۱۰۰۸ء کے ساون بھادوں کے دن تھے۔ دریا چڑھے ہوئے تھے۔ فوجوں کی نقل و حرکت میں خاصی دشواری پیش آتی تھی۔ دریا پار کرنے بہت مشکل تھے۔ کشتیوں کے پل بنتے تھے۔ سیلاب آجاتا اور پل بیکار ہو جاتے تھے لیکن اتنی بڑی فوج کو مجوزہ میدان جنگ کے قریب جمع گاہ تک پہنچانے کے لیے مہینوں جتنا وقت درکار تھا۔ رسد اور فالتو سامان پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہند کے راجے سلطان محمود کو اتنی مہلت نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی فوج کی کمی کو پورا کر لے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ لاہور فوجی کیمپ بن گیا تھا۔ فوج کی کیفیت یہ تھی کہ اُس کی نفری بڑھتی جارہی تھی۔ ایک تو ریاستوں کے دستے آرہے تھے اور دوسرے یہ کہ غیر فوجی ہندو جوان جو تیغ زنی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ جوق در

جوق فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ انہیں باقاعدہ تربیت یافتہ فوج میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ہندو مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیج کر فخر محسوس کرتی تھیں۔ مندروں کے پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہریلا اور حقارت آمیز پروپیگنڈہ کیا تھا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو جنگ میں جانے سے نہیں روکتی تھی۔ لوگوں نے فوج کے لیے رسد کے انبار لگا دیتے تھے۔ رسد میدانِ جنگ تک لے جانے کے لیے لوگوں نے اپنے بیل، بھینسے اور اونٹ دے دیتے تھے۔

مندروں میں یہی ایک دعا سنائی دیتی تھی کہ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست۔ ہندوؤں کے دلوں میں جیسے اور کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔ وہ جب لاہور کے اردگرد فوجوں کا اجتماع دیکھتے تھے تو خوشی سے اُن کے چہرے لال ہو جاتے تھے۔ مؤرخوں خصوصاً فرشتہ اور البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوستان نے اتنی فوج پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو ایک متحدہ کیمپ میں جمع ہوئی ہو۔

اس کے مقابلے میں سلطان غزنوی کو اللہ کا سہارا اور اپنی جنگی فہم و فراست پر بھروسہ تھا۔ وہ پشاور میں تھا اور اُسے لاہور سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ اُس کے خلاف انسانوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کا ایک سیلاب تیار ہو رہا ہے۔ اُسے ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس سیلاب کا رُخ کس طرف ہو گا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان میں اتنی رسد رکھوا دی تھی کہ محاصرے کی صورت میں محصورین کے لیے ایک سال تک خوراک کافی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ ان شہروں کا محاصرہ ہُوا تو وہ باہر سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کرے گا۔

ایک روز اُسے دیدبانوں نے اطلاع دی کہ حضرو کے قریب کالنجر کی فوج خیمے گاڑ رہی ہے۔ اس سے اُسے اور زیادہ فکر پیدا ہُوا۔ وہ کہتا کہ ہندو تین محاذ کھولیں گے۔ بھیرہ اور ملتان کے محاصرے اور اُسے پشاور روکے رکھنے کے لیے اِدھر بھی حملہ کریں گے۔ یہ سلطان کے بس کی بات نہیں تھی کہ تینوں محاذوں پر لڑتا اور فتح بھی حاصل کرتا۔

پھر ایک روز یوں ہُوا کہ ہند کی متحدہ فوج سیلاب کی طرح چل پڑی۔ اس کا رُخ پشاور کی طرف تھا۔ لاہور اور گردونواح کے ہندوؤں نے فوجوں کو دریائے راوی

اس طرح پار کرایا جیسے ہر ایک سپاہی کو کندھوں پر اُٹھا کر پار کر دیا ہو۔ دریا میں طغیانی تھی۔ کشتیوں کے دو پُل بنائے گئے تھے۔ طغیانی کشتیوں کو اُچھالتی تھی لیکن لوگوں نے رسّے اپنے ہاتھوں اتنے موٹے اور اتنے مضبوط بنائے تھے کہ کشتیاں ایک دوسری سے الگ نہیں ہوتی تھیں۔ مسلسل تین دن اور تین راتیں فوج دریا پار کرتی رہی۔ رسد سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کو لوگ دھکیلتے تھے تاکہ بیل تھک نہ جائیں اور تیز چلیں۔

جب یہ اطلاع سلطان محمود غزنوی کو ملی کہ تمام فوج لاہور سے پشاور کی سمت نکل آئی ہے تو اُسے اس اطلاع پر یقین نہ آیا۔ اُس نے بھیرہ کو اپنے جاسوس مسافروں کے بھیس میں بھیجے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہندو بھیرہ اور ملتان کو نظر انداز کئے رکھتے۔ بہت دنوں بعد اُس کے جاسوسوں نے تصدیق کر دی کہ بھیرہ اور ملتان کی طرف ہندوؤں کی کوئی توجہ نہیں اور تمام افواج پشاور کی سمت آرہی ہیں۔

"دشمن کے لیے غزنی بھیرہ اور ملتان سے زیادہ اہم ہے"۔ سلطان محمود نے اپنے سالاروں وغیرہ سے کہا۔ "میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہند کی متحدہ فوج پشاور کے اس میدان میں آکر لڑے گی جس میں جے پال نے ہم سے شکست کھائی تھی۔ وہ اپنی تمام فوج اس لیے ادھر ہی لا رہے ہیں کہ ہمیں کچلتے ہوئے غزنی کی طرف نکل جائیں۔ اگر دشمن نے یہی سوچا ہے تو میں یہ منصوبہ بنانے والوں کی تعریف کرتا ہوں۔ اتنی بڑی فوج کے زور پر وہ اتنا اچھا منصوبہ بنا سکتے ہیں....

"اللہ کے علاوہ ہماری مدد کرنے والا دریائے سندھ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے کہ اگر دشمن رات کو کشتیوں کا پُل بنائے تو جانباز جا کر رسّے کاٹ دیں۔ دُور مار تیر اندازوں کی بھی ضرورت ہے۔ اگر پُل سے گذرتے ہوئے کسی ایک ہاتھی کو دو تین تیر کاری لگ گئے تو وہ پُل سے کسی کو گذرنے نہیں دے گا....

"لیکن اتنی بڑی فوج کو ان طریقوں سے نہیں روکا جا سکے گا۔ دشمن کی فوج اُس وقت یہاں پہنچے گی جب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہو گا اور دریا میں پانی کم ہو گا۔ ہم دشمن کو دریا کے پار روکیں گے۔ ہمیں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑے گا۔"

سلطان نے اُسی وقت بھیرہ، ملتان اور غزنی کو قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیئے کہ تھوڑے تھوڑے دستے ہر جگہ سے پشاور آجائیں اور پیشقدمی بہت تیز ہو۔ سلطان محمود کی کیفیت یہ ہوگئی کہ نقشہ سامنے رکھ کر اس میں غرق ہو جاتا اور اُسے کھانے پینے اور سونے کی بھی ہوش نہیں رہتی تھی۔ اُس کی انگلی نقشے پر چلتی رہتی اور وہ نقشے بنانے میں مگن رہتا۔

شعیب ارمغانی ابھی سمرتی کے گھر میں تھا جب راجہ انند پال نگر کوٹ سے لاہور واپس آیا تھا۔ سمرتی کی خادمہ نے اُسے بتایا کہ راجہ تو آ گیا ہے، سمرتی نہیں آئی۔ دو تین روز بعد خادمہ نے بتایا کہ جو لڑکیاں راجہ کے ساتھ گئی تھیں، وہ بتاتی ہیں کہ پہلی رات ہی نگر کوٹ کا پنڈت سمرتی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ مندر سے واپس نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن راجہ وہاں سے چل پڑا تھا۔

ارمغانی سوچنے لگا کہ سمرتی کیوں نہیں آئی۔ شاید نگر کوٹ کے پنڈت کو وہ اتنی اچھی لگی ہو کہ اُس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ اس پنڈت کی فرمائش کو کوئی راجہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ بوڑھی خادمہ کو سمرتی سے اتنا پیار تھا کہ دل وجان سے اُس کی وفادار تھی۔ اس نے سمرتی کی خواہش کے مطابق ارمغانی کو قیمتی راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اور ہر روز اُس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ زخم ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ شعیب ارمغانی گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ اُسے پناہ بھی مل گئی تھی۔ یہی اُس کا مسئلہ تھا۔ اُسے وہاں سے نکل جانا چاہیئے تھا مگر اُس کے لیے زرفہ ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ تو عورت کو وہ اپنے خفیہ فرائض کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ زرفہ اسکی زندگی میں آئی تو وہ اپنے جذبات کا غلام ہو گیا۔ وہ زرفہ کو حاصل کرنے کی سوچ رہا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب بھی دیا کہ زرفہ نے اُس کے ساتھ جو شادی کی تھی، وہ دھوکہ تھا، مگر اُس کا دل اِس جواز کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے یہ خیال آجاتا کہ زرفہ نے اُسے دل وجان سے خاوند تسلیم کر لیا تھا اور یہ اُس کی محبت کا ثبوت ہے کہ اُس نے اُسے گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا، مگر زرفہ اُسے کہاں مل سکتی تھی؟

سمرتی کی خادمہ اُس کے اِس راز سے واقف نہیں تھی، اس لیے وہ اِس بڑھیا سے

یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زردفہ نام کی ایک لڑکی کو تلاش کرے۔

ایک روز ایک بگھی سمرتی کے گھر کے سامنے رکی۔ خادمہ دوڑی گئی کہ سمرتی آتی ہے لیکن اس میں سے دو لڑکیاں اتریں۔ ارمغانی اندر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان دونوں میں ایک زردفہ تھی۔ وہ سمرتی سے ملنے آئی تھیں۔ خادمہ انہیں اندر لے آئی۔ ارمغانی دوسری لڑکی کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ خادمہ کو آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس نے ایک پھولدان فرش پر پھینک دیا۔ خادمہ نے آواز سنی تو دوڑی گئی کہ برتن کون توڑ رہا ہے۔

"میں نے تمہیں بلانے کے لیے پھولدان پھینکا تھا" اس نے خادمہ سے کہا — "ان میں زردفہ نام کی ایک لڑکی ہے اسے اس طرح میرے پاس بھیجو کہ دوسری کو پتہ نہ چلے"

"یہ سمرتی سے ملنے آئی ہیں" — خادمہ نے کہا۔ "انہیں معلوم نہیں تھا کہ سمرتی یہاں نہیں ہے۔ وہ جا رہی ہیں"

ارمغانی کے اصرار پر خادمہ مان گئی۔ وہ تجربہ کار عورت تھی۔ وہ دوسری لڑکی کو کسی بہانے باہر لے گئی۔ ارمغانی زردفہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ زردفہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ دوڑ کر ارمغانی سے لپٹ گئی۔ بولی — "تم ابھی یہیں ہو؟ زخمی کیسے ہوئے ہو؟"

"اگر دھوکہ دینا ہے تو بتا دو" — ارمغانی نے کہا — "میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمہارے لیے رکا ہوا ہوں۔ کہاں مل سکتی ہو؟"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ دھوکہ نہیں دوں گی" — زردفہ نے کہا۔ "جہاں کہو ملوں گی۔ یہاں آجاؤں؟"

"اندر نہیں باہر" — ارمغانی نے کہا۔ "میں اس باغیچے میں چھپا ہوا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے تمہیں اندر لے آؤں .... اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ سمرتی نگرکوٹ میں کیوں رہ گئی ہے۔ اس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے پناہ دی ہے .... اب چلی جاؤ۔ وہ آرہی ہے"

زرفہ سمرتی رقاصہ کے گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی شعیب ارمغانی اُسے بہت دنوں بعد نظر آیا تھا۔ یہ تو اُسے یقین تھا کہ ارمغانی پکڑا نہیں گیا اور وہ شہر سے نکل گیا ہے لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ارمغانی اب اُسے کبھی نہیں ملے گا۔

وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس تھا۔ لاہور میں اُسے پہچان لیا گیا تھا۔ اب اُسے کبھی بھی اُدھر نہیں آنا تھا۔ زرفہ ارمغانی کی زندگی میں بڑا حسین دھوکہ بن کر آئی تھی اور یہ دھوکہ کامیاب تھا۔ اس دھوکے نے وہ قسم توڑ دی تھی جو ارمغانی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کھائی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے کسی جاسوس ساتھی کا راز فاش نہیں کرے گا۔

اُس نے زرفہ کے حُسن کے طلسم میں آکر اپنا راز فاش کر دیا لیکن یہ قرآن کا ہی کرشمہ تھا کہ زرفہ ارمغانی کو پھانسنے کے لیے پھندہ بن کر آئی تھی جس میں وہ خود بھی پھنس گئی اور پھنسی بھی ایسی کہ ارمغانی کو اُس نے اس سے نکال دیا اور خود پھندے سے آزاد نہ ہو سکی۔ یہ اُس محبت کی سحر کاری تھی جو اُسے کہیں سے نہیں ملی تھی جب اُسے ملی تو پتہ چلا کہ اُس کی رُوح کیسی ظالم پیاس سے جلتی رہی ہے

ارمغانی اُسے سمرتی کے گھر میں چھُپا ہُوا مل گیا۔ سمرتی کی خادمہ زرفہ کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ارمغانی اور زرفہ ملے تو زرفہ کو خواب کا دھوکہ ہُوا لیکن وہ زیادہ دیر تک اکٹھے نہ رہ سکے کیونکہ سمرتی کی خادمہ زرفہ کی سہیلی کو زیادہ دیر تک دوسرے کمرے میں روک نہیں سکتی تھی۔

ارمغانی نے اُسے کہا کہ وہ اُسے کل رات اس گھر سے باہر ملے۔۔۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

زرفہ اور اُس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی چلی گئی۔ خادمہ نے ارمغانی سے پوچھا کہ وہ زرفہ سے چوری چھپے کیوں ملا ہے۔ یہ ایک قدرتی سوال تھا جو خادمہ کے ذہن میں پیدا ہُوا۔ وہ ارمغانی کی ہمراز تھی لیکن ارمغانی کے اصل راز سے وہ واقف نہیں تھی۔ اُسے سمرتی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ارمغانی کو چھُپا کر رکھنا ہے اور اس کے زخموں کا علاج کرنا

ہے۔ خادمہ خود رقاصہ رہ چکی تھی۔ اُس کے جسم کی لچک ختم ہوگئی اور جب جوانی اُس کے سر میں دو تین سفید بال اور چہرے پر ہونٹوں کے دائیں بائیں دو باریک سی لکیریں چھوڑ کر رخصت ہوگئی تو راج محل میں اُس کی ضرورت ختم ہوگئی۔ اُس کی اداؤں سے مسحور ہونے والوں اور اُس کے جسم کے ساتھ کھیلنے والوں کی نظریں پھر گئیں تو ایک احساس زہر کی طرح اُس کی رگ رگ میں بھر گیا ــ یہ احساس تنہائی کا تھا، کسمپرسی کا تھا ــ اُس کے دل میں سچّی محبت جاگی تھی مگر جس نے محبت کو جگایا تھا، اُسے ساری عمر کے لیے مہاراجہ کے قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ مسلمان تھا مگر اُس نے اپنی قوم سے بھی غدّاری کی تھی اور مہاراجہ کو بھی دھوکہ دیا تھا یہ تو کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ رقاصہ بھی اسی کو چاہتی ہے۔ پتہ چل جاتا تو وہ بھی قید خانے میں گل سڑ رہی ہوتی۔

وہ کوئی ایسی بوڑھی تو نہیں ہوئی تھی۔ وہ چونکہ رقاصہ رہی تھی اس لیے اُس کے چھریرے جسم میں پھرتی اور حرکات میں مستعدی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی پھرتیلی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اُس کا رقص اب بوڑھا ہوگیا ہے اور اُس کی جگہ سمرتی نے لے لی ہے تو وہ سمرتی کے گھر آکر بیٹھ گئی۔ سمرتی کے معاملے میں اُس کے دل میں وہ رقابت نہیں تھی جو ناچنے گانے والیوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ سمرتی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ سمرتی رقاصہ بھی تھی مغنّیہ بھی۔ اُس کے جسم میں بھی جادو تھا، آواز میں بھی۔ خادمہ جوں جوں پُرانی ہوتی گئی، اُس کے دل میں سمرتی کی محبت نکھرتی آئی، پھر وہ وقت آیا کہ سمرتی اِس رقاصہ کو جو اُس کی خادمہ بنی، ماں سمجھنے لگی۔ وہ جب رقص کو خیرباد کہہ کر سمرتی کے گھر آئی تو سمرتی نے اُسے گلے لگا لیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس پُرانی رقاصہ نے اپنے آپ کو سمرتی کی خادمہ کا درجہ دے لیا۔

جب شعیب ارمغانی مفرور جاسوس کی حیثیت سے سمرتی کے باغیچے میں آچھپا تو سمرتی کے کُتّے نے ارمغانی کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ سمرتی ارمغانی کو اندر لے گئی۔ اُس کے زخم دھوئے اور جب اُس نے خادمہ سے کہا کہ اس شخص کو ایک مقدّس راز کی طرح چھپا کر رکھنا ہے تو خادمہ نے اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ راز کیا ہے اور اس راز کا تقدّس کیا ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زخمی سمرتی کے دل میں اُتر گیا ہے۔ اُسے اپنی محبت یاد آگئی تھی۔ اُس نے جسے

چاہا تھا وہ قید خانے میں پڑا تھا اور اس رقاصہ نے محبت اور آہوں کو اپنے سینے میں قید کر لیا تھا۔

یہ اُس کے مجروح جذبات کا درد تھا کہ اُس نے سمرتی کے کہنے پر ارمغانی کو ایک راز کی طرح اپنے سینے میں ڈال لیا، پھر سمرتی مہاراجہ انند پال کے ساتھ نگر کوٹ چلی گئی۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ اُس نے ارمغانی کو چھپا کر رکھا ہُوا تھا۔ وہ دراصل اُس محبّت کو اپنے پیار سے سینچ رہی تھی جو سمرتی کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ارمغانی کی محبت تھی۔ اُس نے سمرتی کی غیر حاضری میں ارمغانی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اُسے کہاں جانا ہے۔

اب زرفہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی اور ارمغانی نے اُس کے ساتھ علیحدگی میں بات کی تو قدرتی طور پر خادمہ کے ذہن میں یہ سوال بیدار ہُوا کہ وہ زرفہ کو کس طرح جانتا ہے اور ان کے درمیان کیا راز ونیاز ہے۔ ارمغانی کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا کہ خادمہ کو بتا دے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس اور مفرور ہے؟

سوچ سوچ کر اُس نے جواب دیا — "زرفہ میری بیوی ہے۔"

"پھر یہ پردہ داری کیسی؟" — خادمہ نے پُوچھا۔

"تم نے زرفہ کا حُسن دیکھا ہے؟" — ارمغانی کو ایک جُھوٹ سُوجھ گیا — "اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ زرفہ کس باپ کی بیٹی ہے؟"

"زرفہ سانپ کی بیٹی ہے" — خادمہ نے کہا — "میں اس کے باپ کو جانتی ہوں۔ وہ بے اصول، بے ایمان، بے غیرت اور زہریلا مسلمان ہے۔ وہ بیٹی کی جوانی اور اس کے حُسن کے بل بوتے پر راج دربار کا خاص آدمی بنا ہُوا ہے۔"

"اور اس باپ کی بیٹی نے چوری چھپے میرے ساتھ شادی کر لی تھی" — ارمغانی نے کہا — "وہ میرے گھر آ گئی۔ اُس کے باپ کو پتہ چل گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جاسوسی کے شک میں یہاں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کیسی بے دردی سے ہوئی تھی۔ لوگوں نے ذاتی دشمنیوں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو پکڑوا دیا تھا۔ زرفہ کے باپ نے ایک اونچے رُتبے کے

آدمی کو یہ جھانسہ دے کر ساتھ لیا کہ وہ زرفہ کی شادی اُس کے ساتھ کر دے گا اور انہوں نے ایک رات فوج کے تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر انہیں یہ بتایا کہ میں جاسوس ہوں اور میرے گھر چھاپہ مارا۔ یہ زرفہ تھی جس نے مجھے بچایا اور فرار میں مدد دی۔ اُسے بروقت پتہ چل گیا تھا۔ میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُس نے مجھے جگایا اور بتایا کہ میں کس خطرے میں آ گیا ہوں۔ اُس نے اپنے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو دھوکہ دیا اور میرے لیے موقع پیدا کر دیا کہ میں نکل جاؤں۔ میں اوپر جا کر پچھواڑے سے کُودا اور بھاگ نکلا۔ وہ میرے تعاقب میں تھے۔ یہاں باغیچے میں آ چھپا۔ وہ لوگ تو آگے نکل گئے، تمہارے کُتّے نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہاری مالکن کو میں نے یہ کہانی سنائی تو اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا..... کیا میں تمہیں جاسوس نظر آتا ہوں"؟

"نہیں"۔ خادمہ نے کہا۔ "یہ زرفہ کے باپ کی انتقامی کارروائی ہے..... تم اب کیا کرنا چاہتے ہو"؟

"میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا"۔ ارمغانی نے جواب دیا۔ "اگر زرفہ کے باپ کے سامنے آگیا تو وہ مجھے گرفتار یا قتل کرا دے گا۔ میں زرفہ کو ساتھ لے کر پشاور چلا جاؤں گا"۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے"؟

"بالکل تیار ہے"۔ شعیب ارمغانی نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس راز میں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ زرفہ کل شام کے بعد چوری چھپے یہاں آ رہی ہے۔ میں نے باغیچے میں ایک جگہ ملنے کو کہا تھا لیکن اب میں نے تمہیں اس راز میں شریک کر لیا ہے تو کیا تم پسند کرو گی کہ زرفہ کو میں اندر لے آؤں؟ اس میں خطرہ یہ ہوگا کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ گیا تو میں پکڑا جاؤں گا"۔

"تم اسے اندر لے آنا"۔ خادمہ نے کہا۔ "میں کتّا کُھلا چھوڑ دوں گی۔ کوئی آ گیا تو کُتّا اُسے آگے نہیں آنے دے گا۔ اتنے میں تم اِدھر اُدھر ہو سکتے ہو۔ زرفہ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ سمرتی سے ملنے آئی تھی"۔

"کیا تم معلوم کر سکتی ہو کہ مہاراجہ واپس آ گیا ہے تو سمرتی کیوں نہیں آئی"؟ — ارمغانی نے پوچھا۔

"کوشش کروں گی" ـ خادمہ نے کہا ـ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مہاراجہ کسی کو سمرتی تحفے کے طور پر دے آیا ہو ـ اس رقاصہ سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔"

"میں نے زرفہ سے کہا تھا کہ معلوم کرے۔"

زرفہ نے معلوم کر لیا تھا ـ وہ رات کو آگئی ـ ارمغانی باغیچے کی فصیل کے باہر اُس جگہ انتظار کر رہا تھا جہاں وہ فرار کی رات آکر چھپا تھا ـ بہت انتظار کے بعد زرفہ آئی ـ وہ اکیلی تھی ـ ارمغانی نے اُسے بتایا کہ اُس کے متعلق وہ خادمہ کو کیا بتا چکا ہے ـ وہ زرفہ کو اندر لے گیا ـ خادمہ نے کتا کھول کر باغیچے میں چھوڑ دیا ـ

زرفہ نے ارمغانی کو پہلی یہ خبر سنائی کہ نگر کوٹ کے بڑے پنڈت نے سمرتی کو انسانی قربانی کے لیے وہیں رکھ لیا ہے ـ دوسری خبر یہ کہ مہاراجہ انندپال کی فوج اور تین چار اور ریاستوں کی فوجیں جو لاہور میں جمع ہوئی تھیں، پشاور کی طرف کوچ کر گئی ہیں ـ ان کی فتح کے لیے پنڈت نے سمرتی کو دیوتاؤں کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے منتخب کیا ہے ـ

"اس وقت تک اس کا خون بہایا جا چکا ہوگا" ـ زرفہ نے کہا ـ

"شاید ابھی زندہ ہو" ـ خادمہ نے کہا ـ "جس لڑکی کو قربانی کے لیے منتخب کرتے ہیں اُسے فوراً ذبح نہیں کر دیتے ـ ایک مہینہ پنڈت اسے غسل اور عبادت سے پاک کرتے رہتے ہیں ـ اُسے نشہ آور دوائیاں کھلاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود کہنے لگتی ہے کہ مجھے دیوی کے قدموں میں قربان کر دو۔"

تینوں پر سناٹا طاری ہو گیا ـ

"سمرتی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، یہ ایسا معمولی نہیں کہ میں اسے فراموش کر دوں" ـ ارمغانی نے کہا ـ "میں نگر کوٹ جاؤں گا اور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ زندہ ہے یا ذبح کر دی گئی ہے ـ اگر زندہ ہوئی تو میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا۔"

"نگر کوٹ کا مندر اس مکان کی طرح نہیں کہ ایک کمرے سے آخری کمرے تک گھوم جاؤ گے" ـ خادمہ نے کہا ـ "میں اس مندر میں گئی ہوں ـ کمرہ اور

راہداریوں کی بھول بھلیاں ہیں۔ اس کا تہہ خانہ بھی ہے۔ وہاں تو ہاتھی غائب ہو جاتے ہیں۔ مندر کے ارد گرد قلعہ ہے۔ لوگ وہاں عبادت کے لیے جاتے ہیں لیکن یہ معلوم کرنا کہ سمرتی کہاں ہے، آسان نہیں ہوگا۔"

شعیب ارمغانی کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سمرتی مسلمان ہے۔ اس کے لیے یہ قابلِ برداشت نہیں تھا کہ ایک مسلمان عورت کو ہندوؤں کی فتح کے لیے قربان کر دیا جائے۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب سمرتی نے اُسے اپنے خونخوار کُتّے سے چھڑایا اور اُسے اندر لے گئی تھی۔ اُس کے زخموں سے خون فرش پر گر رہا تھا۔ کُتّے نے سمرتی کا بھی ایک ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔ اُس کے خون کے قطرے بھی فرش پر گر کر ارمغانی کے خون میں مل گئے تھے۔ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ اپنا خون پہچانو میرا اور تمہارا خون ایک ہے۔ سمرتی نے فرش پر دیکھ کر کہا تھا "ہاں، ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیا کرتی ہے۔"

ارمغانی کو اُس رات کا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا۔ وہ کچھ دیر خلاؤں میں دیکھتا رہا۔ اچانک پھٹ کر بولا "میں ایک مسلمان عورت کا خون پتھر کے بُتوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا" ـــ اُس نے خادمہ کی طرف دیکھا اور پوچھا "تم کہا کرتی ہو کہ تمہارے دل میں سمرتی کی وہی محبت ہے جو ماں کے دل میں اپنے بچے کی ہوتی ہے.... اس محبت کا کوئی ثبوت دے سکو گی؟ میرا ساتھ دو گی؟ مَیں نگر کوٹ کا راستہ نہیں جانتا۔ مجھے وہاں تک لے چلو۔ مجھے مندر کے اندر کی دنیا کے راستے اور تہہ خانے سمجھا دینا۔ شاید وہ ابھی زندہ ہو۔"

"کیا ہم راستے میں پکڑے نہیں جائیں گے؟" خادمہ نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ ارمغانی نے کہا "ہم بہروپ میں جائیں گے"۔ اُس نے زرفہ سے کہا ـــ "تم یہیں رہو۔ شاید ہم جیتے جی مل سکیں گے۔"

"مَیں تمہارے ساتھ چلوں گی" ـــ زرفہ نے کہا "میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ جہاں تم ہو گے وہاں میں ہوں گی۔"

خادمہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ارمغانی پر سمرتی کی قربانی کی خبر نے ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جیسے اُسے

یاد ہی نہ رہا ہو کہ اُس کے پاس زرفہ بیٹھی ہے۔ اور زرفہ خطرہ مول لے کر اُس کے پاس آئی ہے۔ اُسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے زرفہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ ارسغانی نے بے خیالی میں اُس کی طرف دیکھا۔

"تم شاید ابھی تک مجھے ایک فریب سمجھ رہے ہو"۔ زرفہ نے کہا۔ "ایک رقاصہ کو تم مجھ سے زیادہ قیمتی اور بہتر سمجھتے ہو"۔

"اوہ زرفہ"!۔ اُس نے زرفہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یوں نہ کہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سمرتی نہ ہوتی تو میں آج قیدخانے میں زندہ لاش بن چکا ہوتا۔ وہ مسلمان ہے۔ تم بھی مسلمان ہو۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں سمجھ رہا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں تو بھی ٹھیک نہیں۔ یہاں چھوڑ جاؤں تو تم سے ملنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ میں یہاں آیا تو پکڑے جانے کا خطرہ ہو گا"۔

"تم جس بہروپ میں خادمہ کو ساتھ لے جاؤ گے، اسی بہروپ میں مجھے بھی ساتھ لے چلو"۔ زرفہ نے کہا۔ "مجھے اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنا ہے"۔

"یہ خیال رکھنا زرفہ!"۔ ارسغانی نے کہا۔ "میں نے سمرتی کی خادمہ کو تمہارے متعلق یہ تو بتا دیا ہے کہ تم میری بیوی ہو لیکن اپنے متعلق یہ نہیں بتایا کہ میں جاسوس ہوں"۔ اُس نے خادمہ کو اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہ زرفہ کو بتا دیا، پھر اُسے کہا۔ "مجھے اپنے دو دوستوں کو بھی ساتھ لینا ہے۔ میں آج رات انہیں ملوں گا اور انہیں نگر کوٹ چلنے پر آمادہ کروں گا۔ تم چلی جاؤ۔ کل صبح اگر ادھر آسکو تو آجانا۔ تمہیں بتا دوں گا کہ ہم نے کیا طے کیا ہے"۔

زرفہ نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی تلاش ترک کر دی گئی ہے۔ اب لاہور میں سکون تھا۔ فوجیں چلی گئی تھیں۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ رُک گیا تھا۔ ارسغانی کی داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ وہ اپنا روپ بدلنا جانتا تھا۔ وہ کئی سوانگ بھر سکتا تھا۔ اُس نے زرفہ کو یوں رخصت کیا کہ کچھ دُور تک اُس کے ساتھ گیا اور اُسے رخصت کر کے اپنے ایک ساتھی کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اُس کے ذہن پر سمرتی چھائی ہوئی تھی۔

نگر کوٹ میں پنڈت رادھا کشن کے ذہن پر بھی سمرتی چھانے لگی تھی۔ عورت کے

معاملے میں وہ پنڈت نہیں پتھر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریئے کے تحت پنڈت رادھا کشن نوجوانی میں تارک الدنیا ہوگیا اور ہمالیہ کی اُن برف پوش وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے گنگا نکلتا ہے۔ اُس نے وہاں پندرہ برس گزارے تھے اور اُس کا من مرگیا اور اُس کے جذبات ہمالیہ کی برف کی طرح سرد ہو گئے۔ تو وہ نگرکوٹ کے مندر میں آگیا تھا۔ اب اُس کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔

پہلی رات وہ سمرتی کو قربانی کے لیے منتخب کر کے اپنے ساتھ نگرکوٹ کے مندر میں لے گیا تو سمرتی نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کیں جنہوں نے پنڈت کے وجود کا کوئی ایسا تار چھیڑ دیا جو پنڈت سمجھتا تھا کہ کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔ وہ سمرتی کو کمرے میں چھوڑ کر اور یہ کہہ کر نکل گیا تھا کہ آرام سے سو جاؤ، ہم صبح آئیں گے اور گنگا کے کنارے چلیں گے۔

پنڈت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا زیادہ اختیار تھا کہ سونے کے لیے لیٹتا تھا تو لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی۔ اُس کا ذہن کبھی بھٹکا نہیں تھا مگر اُس رات اُسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ سمرتی کی ہنسی کا جل ترنگ اُس کے ذہن کے ہر گوشے میں بج رہا تھا۔ سمرتی نے بچوں کی طرح ہنستے ہنستے سر اُس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ سمرتی کے ریشمی بالوں کے لمس کو وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا وجود عورت کے لمس سے ہمیشہ ناآشنا رہا تھا۔ وہ اس لمس سے اور عورت کے وجود کی بُو باس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُسے آزادی ممکن نظر نہیں آرہی تھی۔

اُسے سمرتی کے الفاظ یاد آرہے تھے جو اس رقاصہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہے تھے ——"اگر آپ مجھے وہ پیار دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر تھرکنے لگیں گے۔ لوگ دور دور سے نگرکوٹ کی نرتکی کا نرت تک دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کشن بھگوان کی بجائے نگرکوٹ کی نرتکی کی پرارتھنا کیا کریں گے"۔

پنڈت یوں بیدار ہوگیا جیسے وہ بڑا ہی سندر سپنا دیکھ رہا تھا کہ کسی نے سوئی چبھو کر اسے جگا دیا ہو۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی مانند ہو گئیں۔ وہ لیٹے لیٹے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا —"ایک نرتکی؟ .... مسلمان؟

رقاصہ، ملیچھ، پاپن، جس کی آتما نہ جانے کتنے پاپی مردوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کشن بھگوان کا اپمان کر رہی ہے، وہ کشن بھگوان کے کرودھ سے واقف نہیں ان بتوں کو پتھر کہتی ہے؟"

اُس نے ایک ہاتھ کا گھونسہ اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں مارا اور دانت پیس لیے ـــ "اس ملیچھ نے ہمارا شریر ناپاک کر دیا ہے۔۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔۔ ہم جھوٹ نہیں کہتے کہ عورت کا جادو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔" پنڈت بڑبڑانے لگا۔ وہ جو سوچ رہا تھا، وہ اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ ذرا اونچی آواز سے بولنے لگا ـــ "اِسے پاک کرنا ہے۔ بہت دن لگیں گے۔ پاک کر کے اس کے خون سے کشن مراری کے پاؤں دھوتے جائیں گے۔"

پنڈت کے ذہن اور دل پر سمرتی کا جو طلسم طاری ہو گیا تھا وہ اتر گیا۔ وہ لیٹا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پنڈت رادھا کشن معمول کے مطابق اُس وقت جاگ اُٹھا جب سحر ابھی تاریک تھی۔ وہ مندر کی بلندی سے اترا اور بھجن گنگناتا ہُوا پہاڑی کے قریب نیم دائرے میں بہتی ہُوئی بن گنگا تک جا پہنچا۔ بن گنگا کو گنگا ندی بھی کہا کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جا کھڑا ہُوا۔ ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اُڑاتے اور بھجن گنگناتے ہوتے پانی میں بیٹھ گیا ہندوؤں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ گنگا پانی سارے پاپ دھو ڈالتا ہے۔ پنڈت پانی میں بیٹھ گیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اُس کا جسم سرد ہُوا تو اُس نے محسوس کیا کہ رات اُس کا جسم جلتا رہا ہے۔ یہ آگ سمرتی نے لگائی تھی۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ گذشتہ رات اُس کے وہ جذبات بیدار ہو گئے تھے جو وہ سمجھتا تھا کہ مر چکے ہیں۔

بھجن اور پانی اُسے ٹھکانے پر لے آئے اور وہ وہی پنڈت رادھا کشن بن گیا جس نے کسی معتقد عورت کو بھی اپنے پاؤں کبھی چھونے نہیں دیئے تھے۔ رات اُسے سمرتی پر جو غصّہ آیا تھا وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اِسے خیال آیا کہ سمرتی کو پاپی بنایا گیا ہے۔ وہ سچے پیار کی پیاسی ہے۔ اُس نے کہا تھا ـــ "مجھے گنگا جل سے دُھلا ہوا پیار دے سکتے ہو؟"

"ہاں، دے سکتا ہوں۔" پنڈت نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں اس لڑکی کو گنگا

جل سے دھلا ہُوا پیار دوں گا۔ پھر میں کرشن مراری کے چرنوں میں اس کا خون بہا کر یہ کہہ سکوں گا کہ میں نے ایسی عورت قربان کی ہے جسے میں نے پیار دیا تھا۔ یہ قربانی قبول ہو گی جلدی قبول ہو گی۔ غزنی، بلخ، بخارا اور سمرقند بھی مہابھارت میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر دوار کی گھنٹیاں محمود غزنوی کی مسجدوں میں بھی بجیں گی۔ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست ہو گی"۔

وہ واپس آیا تو مندر کے عبادت گاہ والے حصے میں چلا گیا جہاں ہندو مرد اور عورتیں عبادت میں مصروف تھیں۔ اُس نے گڑوی میں سے بن گنگا کا پانی ہاتھ پر ڈال کر بت کے قدموں پر پھیرا اور ہاتھ جوڑ کر بت کے آگے سجدہ کیا۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی دیر عبادت میں مصروف رہا۔ کچھ زیادہ ہی مگن ہو گیا۔ وہ جب اس خود فراموشی سے بیدار ہُوا تو دیکھا کہ وہ وہاں اکیلا تھا۔ لوگ پوجا پاٹ کر کے جا چکے تھے۔ سُورج طلوع ہو چکا تھا۔ اُسے یاد آگیا کہ اسے سمرتی کو بھی دریا پر لے جانا اور نہلانا تھا۔ وہ اٹھا اور اُس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ سمرتی کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت اندر چلا گیا اور سمرتی سے دو تین قدم دُور رُک گیا جیسے اُسے کسی نے اس کی مرضی کے بغیر روک دیا ہو۔

سمرتی بےفکری کی نیند سوئی ہُوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر معصوم بچوں کا سا تبسّم تھا جیسے وہ کوئی بڑا اچھا خواب دیکھ رہی ہو۔ اُس کے چند ایک بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور وہ ابھی تک سوئی ہُوئی تھی۔ پنڈت کو خیال آیا کہ گناہ انسان کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ یہ عورت تو عبادت کی منکر ہے۔ کیا اس کی روح مطمئن ہے؟ کیا یہ روحانی سکون ہے کہ یہ ایسی بےفکری کی نیند سوئی ہوئی ہے؟

سمرتی کو دیکھتے دیکھتے پنڈت رادھا کرشن کو بےچینی سی محسوس ہونے لگی جو تشنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ اُس کے سامنے سوئی ہوئی رقاصہ معصوم سی بچی بن گئی۔ آنکھیں کھلیں تو سمرتی اُسے اُس کے اپنے رُوپ میں نظر آئی جیسے اس عورت نے اُسی کی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو اور ان کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون رواں دواں ہو۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا اور اُس کا ذہن دُور پیچھے چلا گیا جب وہ اسی طرح بچوں کی طرح سویا کرتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آنے لگا مگر یہ چہرہ دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے یادوں کی دھند کو ہٹانے

کی بہت کوشش کی مگر دُھند نہ چھٹی، البتہ چہرہ نکھر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا ـــــ یہ چہرہ سمرتی کا تھا۔

بیٹی، بہن، ماں ـ پنڈت کے وجود میں سوئیاں چبھنے لگیں ۔ اسے اپنا وجود کھنڈر کی طرح کھوکھلا اور ویران محسوس ہونے لگا۔ اُس نے عمر کے لمبے لمبے بے شمار سال اس خلا کو بتوں اور مورتیوں سے پُر کرنے میں گزار دیئے تھے مگر سمرتی نے تمام بُت اور مُورتیاں اٹھا کر بن گنگا میں بہا دیں۔ پنڈت پھر کھوکھلا ہو گیا۔ اُسے رقاصہ کے روپ میں عورت کے سارے ہی روپ نظر آ گئے۔ تشنگی بڑھنے لگی۔ وہ سمرتی کو ہاتھ لگانے کو بے تاب ہونے لگا۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو سمرتی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پنڈت کو کھڑے دیکھا اور انگڑائی لی پنڈت نے کسی عورت کو کبھی انگڑائی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے جسم نے جھرجھری سی لی۔ اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس سے وہ ناآشنا تھا۔ اسے سرور سا محسوس ہونے لگا اور اُس پر خود فراموشی طاری ہو گئی۔

"دن بہت چڑھ آیا ہے" ـ سمرتی نے کہا "آپ رات مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"تمہیں اکیلے ڈر آتا تھا؟"

"ڈر؟" ـــ سمرتی نے ہنس کر کہا ـــ "ڈر کس کا؟ ڈر ایک احساس ہوتا ہے میرے تمام احساس مر چکے ہیں عورت پرائے مرد سے ڈرا کرتی ہے۔ مگر پرائے مردوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والی عورت کے دل سے تمام ڈر نکل جایا کرتے ہیں۔ جو لُٹ جاتے ہیں وہ باقی سفر نڈر ہو کر طے کیا کرتے ہیں۔ مجھے اب کسی رہزن کا ڈر نہیں"۔

"لیکن اطمینان اور سکون کی ایسی نیند جیسی تمہاری ہے، وہی سو سکتا ہے جس کی روح مطمئن ہو" ـــ پنڈت نے کہا ـــ "ایک نرتکی کی آتما اتنی شانت نہیں ہونی چاہیئے"۔

"میرے پاس صرف روح رہ گئی ہے ـ جسے آپ آتما کہتے ہیں" ـــــ سمرتی نے کہا ـــــ "میرا جسم پرایا ہو گیا ہے روح میری ہے، یہ شانت ہے، مطمئن ہے" ـ

"لیکن کیسے؟"

"مذہب کے مارے ہوئے لوگ نہیں سمجھ سکتے"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ ایک ہی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ پرارتھنا کرو، آتما شانت ہو جائے گی۔ دنیا کا لوبھ نہ ہو تو آتما شانت ہو جاتی ہے۔ منش کے ہردے میں مراری کی اچھا ہو تو آتمہ شانت ہو جاتی ہے...... یہ سب باتیں ہیں پنڈت جی مہاراج! میں نے دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اُٹھالیا ہے تو میری آتما شانت ہو گئی ہے"۔

یہ سمرتی کے لب ولہجہ کی بے باکی تھی یا اِس کے انداز میں خوداعتمادی تھی یا اِس کے سراپا میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ پنڈت کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ سمرتی اُس پر غالب آنے لگی۔ اُس کے ذہن میں نیکی اور بدی کا پُن اور پاپ کا، جزا اور سزا کا فلسفہ گڈمڈ ہونے لگا۔ سمرتی اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے کندھے عریاں تھے۔ لمبوتری گردن عریاں تھی۔ اُس کے بکھرے بکھرے بال اُس کے کندھے اور گردن کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ پنڈت نے تیاگ کی اتنی لمبی عمر میں پہلی بار محسوس کیا کہ یہ کہنا آسان ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے لیکن اس فتنے سے بچنا آسان کام نہیں۔ پنڈت کے اندر ایک کش مکش شروع ہو گئی جو اُسے پریشان کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے جھگڑنے لگا۔

"آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟" سمرتی نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ نے مجھے مہاراج اننھ پال سے لے لیا ہے مگر یہاں لا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ رات آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اسی لیے آپ مجھے یہاں لائے ہیں؟ مجھے پاک کر کے آپ کیا کریں گے؟"

پنڈت چونک کر بیدار ہو گیا اور اس کے مُنہ سے نکل گیا۔ "ہم تمہیں دیوی کے چرنوں میں قربان کریں گے"۔

پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جیسے یہ ایسی سعادت ہو جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ سمرتی کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی نہ وہ چونکی نہ بدکی۔ اُس کی مسکراہٹ بھی نہ غائب ہوئی۔ پنڈت خود چونک اُٹھا۔ اُسے یہ راز فاش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جسے قربان کیا۔

جاتا تھا، اُسے بتایا نہیں جاتا تھا۔ اُسے نشہ آور دوائیاں پلا پلا کر اُس کے ذہن کو ماؤف کر دیا جاتا تھا اور اُس کے ذہن میں اپنی باتیں ڈال دی جاتی تھیں۔ پنڈت رادھا کشن پر سمرتی کا سحر طاری ہو گیا تھا جس کے اثر سے اُسے اپنے اوپر قابو اور اختیار نہیں رہا تھا۔

"آپ میرے جسم کی قربانی دینا چاہتے ہیں؟" ــــ سمرتی نے کہا ــــ "لیکن یہ جسم میرا تو نہیں۔ اگر یہ میرا ہی ہے تو یہ کبھی کا قربان ہو چکا ہے۔ روح میری ہے۔ اِس کی قربانی دوں مگر یہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہیں...... کیا آپ نے کسی کی روح پر کبھی قبضہ کیا ہے؟ آپ کی روح پر کسی کا کبھی قبضہ ہوا ہے؟"

پنڈت اُسے احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا ہو۔ "آپ سچے پیار سے آشنا نہیں" ــ سمرتی نے کہا ــ "میں جانتی ہوں۔ میں ہندروں کے اندر کی دنیا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں اس چیز کو اچھا سمجھتے ہیں جو نظر آسکے اور جسے چھوا جا سکے اسی لیے آپ لوگ اُس خدا کو نہیں مانتے جو نظر نہیں آتا۔ آپ نے نظر آنے والے 'خدا' اپنے ہاتھوں سے بنا لیے ہیں۔ آپ جسموں کی قربانی دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اِن بُتوں کو خوش کر لیا ہے اور اب یہ بُت آپ کی ہر مراد پوری کریں گے۔"

"تم مسلمان ہو اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔"

"میں کچھ بھی نہیں" ــ سمرتی نے کہا ــ "میرا کوئی مذہب نہیں۔ میں ایک پیاسی روح ہوں۔ روح آپ کی بھی پیاسی ہے۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔ میں مردوں کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیا کرتی ہوں کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔" ــ اُس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر کہا ــ "میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں۔۔۔ جھجکیں نہیں میرے قریب آجائیں۔"

پنڈت بُت بنا رہا۔ سمرتی سرک کر اُس کے قریب ہو گئی۔ سمرتی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پنڈت کا جسم کانپا۔ اُس نے اپنا چہرہ سمرتی کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جب بولنے لگا تو اُس کی

زبان ہکلا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کپڑے بھیجوں گا" — پنڈت نے کہا — "تم نہا لو۔ کھانا بھی آجائے گا"

اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ اُسے شعیب ارمغانی یاد آگیا۔ اُس نے شعیب ارمغانی کو بتایا تھا کہ کالنجر کے راجہ نے اُس کی موجودگی میں راجہ انندپال سے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں اُسے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا اور ان میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہند میں جو مسلمان رہ جائیں گے، ان کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی رہ جائے گا"

سمرتی کو یاد آیا کہ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں۔ غزنی سے اتنی دُور آ کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ ارمغانی نے اسے کہا تھا — "زرو بن جاؤ اپنی روح کو پہچانو"

سمرتی نے اپنی روح کو پہچان لیا۔ اُسے ارمغانی یاد آیا تو اُس کے جذبات کی دنیا میں ہلچل سی بپا ہو گئی۔ اُسے ارمغانی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُسے جب یہ خیال آیا کہ ارمغانی زرفہ سے مل چکا ہو گا تو اُس نے دل میں کسک سی محسوس کی۔ ارمغانی پہلا مرد تھا جس نے اس کی پناہ اور اس کی قید میں ہوتے ہوئے بھی اسے دُھتکار دیا تھا۔

اس کے اندر ایک عزم بیدار ہو گیا — "میں ہندوؤں کے بتوں کے قدموں میں قربان نہیں ہوں گی" — وہ فرار کے راستے سوچنے لگی۔ ایسی صُورتِ حال سے وہ کبھی دوچار نہیں ہُوئی تھی۔ وہ سپاہی نہیں تھی، مجاہدہ نہیں تھی۔ وہ شہزادی تھی۔ راجہ کے دل پر اس نے راج کیا تھا۔ بڑے بڑے جابر مرد اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ فرار اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن فرار کا ارادہ پختہ تھا۔

وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک نے کھانا اٹھا رکھا تھا اور دوسری کے ہاتھ میں کپڑے تھے۔ وہ نوجوان لڑکیاں تھیں۔ خوبصورت نہیں تھیں۔ کھانے کے دوران اُس نے لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ مندر کے صدر دروازے سے کتنی دُور

ہے۔ لڑکیوں نے اُسے بتایا کہ انہیں حکم مِلا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کریں۔ اُلٹا انہوں نے سمرتی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

"میں نگرکوٹ کی نرتکی ہوں" — سمرتی نے کہا۔ "مجھے بڑے پنڈت جی مہاراج اس مندر کے لیے لاتے ہیں میں یہاں ناچا اور گایا کروں گی۔"

"مہاراج نے کہا تھا کہ تمہارا بہت خیال رکھیں" — ایک لڑکی نے کہا۔

"مہاراج نے کسی عورت کا اتنا خیال کبھی نہیں رکھا" — دوسری لڑکی نے کہا — "وہ عورتوں کے ساتھ بات نہیں کیا کرتے لیکن تمہارے متعلّق وہ ایسی باتیں کرتے تھے جیسے تم ان کی اپنی بیٹی یا بہن ہو۔"

"یہ مہاراج کی نوازش ہے" — سمرتی نے کہا — "وہ مجھے خود سارے مندر کی سیر کرائیں گے۔ میں نے ایسے ہی پوچھا تھا کہ صدر دروازہ کہاں ہے۔"

وہ اسی دروازے سے مندر میں آئی تھی۔ لڑکیوں نے اسے صدر دروازے تک کا راستہ بتایا تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی سوائے اس کے کہ وہ کسی رہبر کے بغیر صدر دروازے تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اگر وہ صدر دروازے سے نکل بھی جائے تو مندر کے اردگرد قلعہ تھا۔ اس نے لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھا۔ انہوں نے کچھ اُسے بتایا کچھ نہ بتایا۔ پنڈت کے متعلّق اسے بتایا گیا کہ عورت کے نام سے بھی بدکتا ہے۔

لڑکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس رقاصہ کو قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے نہلایا اور وہ کپڑے پہنائے جو وہ لائی تھیں۔ یہ ساڑھی کی طرح کی ایک سفید چادر تھی جو سر کی اوڑھنی کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ سمرتی کے ماتھے پر تلک لگایا گیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

پنڈت رادھا کشن کے کمرے میں دو پنڈت اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سمرتی کو قربانی کے لئے لایا گیا ہے۔ اسے قربانی کے لیے تیار کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ اپنا عمل شروع کرنا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس علاقے میں قحط آ گیا تھا انوکھی بات تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں بارش بہت ہوتی تھی مگر اُس سال بارش نہ ہوئی۔ مویشی اور انسان بھوک سے مرنے لگے۔ پنڈت رادھا کشن کے کہنے

پر ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی پندرہ سولہ روز مندر کے اسی کمرے میں جہاں سمرتی کو رکھا گیا تھا، اس لڑکی کو بھی رکھ کر اُسے قربانی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

"وہ کنواری کنیا نہیں" — پنڈت رادھاکشن نے سمرتی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پنڈتوں سے کہا — "یہ کنواری نہیں راج دربار کی رقاصہ ہے۔ کنواری پوتر تھی سمرتی کو پہلے پوتر کرنا پڑے گا۔ قربانی اسی کی دی جائے گی لیکن بہت دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مسلمان ہے۔ اسے ذہنی طور پر پوجا پاٹ پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔"

"آپ جانتے ہیں مہاراج، فوجیں کوچ کر گئی ہیں" — ایک پنڈت نے کہا — "قربانی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہو جانی چاہیئے۔"

پنڈت رادھاکشن نے کہا۔ "فوجوں کو میدانِ جنگ تک پہنچنے بہت دن لگیں گے۔ جتنی فوج گئی ہے اس کے مقابلے میں محمود غزنوی کی فوج ہاتھی کے مقابلے میں بلی جیسی ہے۔ اسے کچل کر ہماری فوجیں غزنی کی طرف نکل جائیں گی۔ اس میں تین مہینوں سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا۔ وہ وقت ہو گا جب ہم قربانی دیں گے۔ اُس وقت تک یہ لڑکی اس قابل ہو جائے گی کہ خود دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر کہے گی کہ میری گردن کاٹ دو۔"

دونوں پنڈت قائل نہیں ہو رہے تھے لیکن پنڈت رادھاکشن قربانی کو ملتوی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اُس نے آخر حکم کے لہجے میں فیصلہ دیا کہ اس عورت کی قربانی کے متعلق وہ کسی کی بات نہیں سنے گا چونکہ یہ انتخاب اس کا ہے، اور چونکہ اس نے یہ انتخاب دیوتاؤں کے اشارے پر کیا ہے اس لیے وہی بہتر جانتا ہے کہ قربانی کب دی جائے گی۔

پنڈت جب اُٹھ کر چلے گئے تو پنڈت رادھاکشن گہری سوچ میں کھو گیا۔

سمرتی حیران تھی کہ تین دن اور تین راتیں گذر گئی ہیں، اُس کے کمرے میں پنڈت رادھاکشن نہیں آیا۔ دو لڑکیاں اُس کے لیے کھانا لاتی رہیں اور اُس کی ہر ضرورت پوری کرتی رہیں۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ پنڈت جی مہاراج کو بھیجیں۔ پنڈت پھر بھی نہ آیا۔ سمرتی

کو جیسے کوئی غم ہی نہیں تھا کہ اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اُسے افسوس صرف یہ ہو رہا تھا کہ اُسے ہندوؤں نے بے مذہب کیا اور رقاصہ بنایا اور وہ ہندوؤں کی ہی فتح کے لیے قربان کی جارہی تھی۔ اُسے پورا پورا الیقین تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت خدا نہیں ہیں اور فتح اور شکست اِن کے ہاتھ میں ہو ہی نہیں سکتی ــــ اور جو سچّا اور واحد خدا ہے، اُس کے حکم کے مطابق انسانی جان کی قربانی بے گناہ کا قتل ہے اور یہ جھوٹے مذہب کی رسم ہے۔

اُسے یاد تھا کہ چند سال پہلے لاہور میں راجہ جے پال کی فتح کے لئے ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ راجہ ایسی شرمناک شکست کھا کر واپس آیا تھا کہ اُس نے چتا پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں چتا کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو جلا ڈالا تھا۔

سمرتی مرنے سے نہیں ڈرتی تھی لیکن وہ ہندوؤں کے بت کے قدموں میں نہیں مرنا چاہتی تھی۔ شعیب ارمغانی نے اُس کی روح کو بیدار کر دیا تھا، مگر وہاں سے فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہر لحہ یہ خطرہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی آئے گا اور اُسے گھسیٹ کر بت کے سامنے لے جائے گا اور اُس کی گردن پر چھُری پھیر دی جائے گی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ پنڈت لوگ عورت کے معاملے میں پاکباز نہیں ہوتے، لیکن لڑکیوں نے اُسے بتایا تھا کہ پنڈت رادھا کشن پاکباز ہے اور رشی ہے۔ ہر کسی کی زبان پر تھا کہ پنڈت رادھا کشن برہم چاری ہے۔

اُسے یاد آیا کہ پہلی رات جب اُسے یہاں لایا گیا تھا تو اُسے شک ہوا تھا کہ پنڈت اُسے اپنے لیے لایا ہے۔ اُس نے اس شک کا اظہار کیا تو پنڈت نے کہا تھا ــــ "ہمیں تمہارا جسم ضرور اچّھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی ہے اور خالی ہی رہے گی۔ ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔"

سمرتی کو یہ بھی خیال آیا تھا کہ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں بے چینی سی دیکھی ہے۔ وہ مردوں کی نظروں کو خوب پہچانتی تھی۔ اُسے اپنے حسن کے طلسم کا بھی احساس تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا اور فرار کا ایک راستہ اُسے نظر آ گیا۔ اُس نے اپنے حسن اور

نسوانیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ پتھر کو موم کرسکتی تھی۔

چوتھی رات کا پہلا پہر تھا جب پنڈت رادھا کشن اُس کے کمرے میں آیا۔ کمرے میں دو دیئے جل رہے تھے۔ سمرتی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے دیکھا تو ٹھٹھک کے رُک گیا۔ اُس نے سمرتی کو رقص کے لباس میں دیکھا تھا جو زرق برق تھا۔ اُس میں سے اُس کے کندھے، گردن، سینے اور پیٹھ کے بالائی حصّے عریاں تھے۔ اس کے چہرے پر مصنوعی رنگ اور آنکھوں میں کاجل تھی۔ اس کے بالوں کا سنگھار بھی کچھ اور تھا۔ اور اس حلیے میں بے حیائی تھی۔ مگر اب پنڈت اُسے سفید ساڑھی میں قدرتی رنگ میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور کہنیوں تک بازو ننگے تھے۔ اُس کے چہرے سے مصنوعی رنگ اور کاجل ڈھل گئی تھی۔ اُس کے بال ڈھل کر نکھر آئے تھے اور اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نیم عریانی میں اتنا حسین نہیں لگتی تھی جتنی مستور ہو کر لگی۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

"آپ مجھے بھول گئے تھے مہاراج!" ___ سمرتی نے پنڈت کے قریب آکر کہا ___

کہتے ہیں جانور کو ذبح کرنے سے پہلے پانی پلایا کرتے ہیں۔ آپ مجھے پانی نہ پلائیں، ذبح کرنے سے پہلے میری روح کی پیاس بجھا دیں، ورنہ میری روح اِس مندر میں بھٹکتی رہے گی۔ نہ چین لے گی نہ آپ کو چین لینے دے گی۔"

اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار تھا یا وہ تاثر تھا جو وہ کسی کو اپنے اثر میں لانے کے لیے اپنی آنکھوں میں اور اپنے چہرے پر پیدا کر لیا کرتی تھی۔ پنڈت نے محسوس کیا جیسے اُس کا جسم اندر سے لرزا ہو، اُسے اُس سمرتی سے نفرت ہوسکتی تھی جو رقاصہ کے لباس اور حلیے میں تھی۔ اُس حلیے میں اُس کے جسم سے گناہوں کی بو آتی تھی۔ اب اُس سادگی نے جبکہ اُس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا، وہ پاک لگ رہی تھی، اور پنڈت مسحور ہو گیا تھا۔

سمرتی نے اُسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سمرتی خاموش تھی۔ پنڈت رُکا۔ اُس نے سمرتی کو دیکھا اور یوں سر جھکا لیا جیسے اُس کا سامنا کرنے

سے گھبرا گیا ہو۔ وہ چند قدم چل کر رُکا اور سمرتی کو اپنے قریب بلایا۔

"میں جانتا ہوں تم پیار کی پیاسی ہو" ___ پنڈت نے کہا ___ "تمہیں کس کا پیار چاہیئے؟...... باپ کا؟ بھائی کا؟ بیٹے کا؟...... یا تم......؟"

"کیا آپ نہیں جانتے کہ روح کس کا پیار چاہتی ہے؟" ___ سمرتی نے پوچھا ___ "آپ کے پاس کون سا پیار ہے؟"

پنڈت کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بے چین ہو گئیں۔ سمرتی نے ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیئے اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کا سینہ پنڈت کے سینے کو چھُونے لگا۔ سمرتی کے بازو اُس کی گردن کے گرد لپٹ گئے۔ اُس نے مخمور سی سرگوشی کی ___ "وہ پیار جس کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، جس میں گناہ کی بُو نہ ہو...... ہے آپ کے پاس ایسا پیار؟" ___ اُس کی سانسیں پنڈت کی سانسوں سے ٹکرانے لگیں۔ پنڈت اُس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔

"گھبرائیں نہیں رشی!" ___ سمرتی نے کہا ___ "آپ جس عورت سے بھاگتے ہیں وہ صرف جسم ہوتا ہے، وہ چلتا پھرتا بت ہوتا ہے۔ میں جسم نہیں ہوں۔ یہ جسم میرا نہیں۔ میں اسے تیاگ چکی ہوں۔ آپ کو اپنی روح دے رہی ہوں، اپنی آتما دے رہی ہوں۔ اس سے نہ ڈریں، اس سے نہ بھاگیں۔"

پنڈت پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو جیسے سمرتی کی جادو بھری آنکھوں نے نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ سمرتی کے بازو اُس کے گرد لپٹے گئے تھے۔

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تشنگی سی محسوس نہیں کر رہے ہیں؟"

"میں جل رہا ہوں لڑکی!"۔۔۔ پنڈت نے پریشان ہو کر کہا۔ "مجھے اور نہ جلاؤ"۔

سمرتی نے اُس کی باتوں میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ پہلے اپنے آپ کو ہم کہتا تھا، اب 'میں' کہہ رہا تھا۔

"مجھے ذبح کرنے سے پہلے اس پیار کا ذائقہ چکھ لیں"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔۔۔ "میرا جسم ذبح ہو جائے گا، آپ کی رُوح قتل ہو جائے گی"۔

پنڈت اُکھڑ گیا تھا۔ سوچ میں کھو گیا تھا۔ کبھی سمرتی کو دیکھتا کبھی سر جُھکا کر ٹہلنے لگتا۔

"مجھے کس روز قربان کیا جائے گا؟"۔۔۔ سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت چونک کر رُک گیا اور اس طرح بولا جیسے اُس کی زبان سے الفاظ پھسل آتے ہوں۔۔۔ "ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔"

"آج نہیں تو کل"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔

پنڈت نے آہ لی اور سرگوشی میں بولا۔۔۔ "کل بہت دنوں بعد آئے گی۔ کون جانے کل کیا ہوگا۔"

وہ تیزی سے گھوما اور کمرے سے نکل گیا۔ سمرتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دروازے کو دیکھتی رہی جس میں سے پنڈت نکل گیا تھا لیکن اُس کی نظریں اُس کمرے تک نہ پہنچ سکیں جس میں پنڈت رہتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور بہت سے ہاتھوں والی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔ دیوی مسکرا رہی تھی۔ وہ جب سے بنی تھی مُسکرا رہی تھی پنڈت نے پہلی بار اُس کی مسکراہٹ کو غور سے دیکھا۔ اُس کے سینے میں ایسی بے قراری تھی جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اُس کا آخری سہارا یہ مُورتی اور بُت تھے۔ وہ بھجنوں کی زبان میں اپنے دُکھ سکھ انہی کے آگے بیان کیا کرتا تھا مگر آج اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے جسم میں یہ بے قراری کیسے آ گئی ہے۔

اُس نے مُورتی کی مسکراہٹ دیکھی اور وہ بھجن گنگناتے گنگناتے اس مسکراہٹ

میں کھوگیا۔ وہ تو اس دیوی کے آگے یہ پرارتھنا لے کے آن گرا تھا کہ اُس کی بے چینی کو قرار آجائے مگر اس کی عبادت اور دُعا میں وہ یکسوئی نہیں تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ اُسے مُورتی کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سمرتی کا چہرہ بن گیا اور مُورتی کی مسکراہٹ سمرتی کا تبسّم بن گیا۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زبان سے بھجن عادت کے مطابق پھسلتے رہے جیسے ندی آہستہ آہستہ بہتی جارہی ہو۔

ستمبر ۱۰۰۸ء (۳۹۹ ہجری) کے دن تھے ہندوؤں کی فوج سیلاب کی طرح پشاور کی طرف بڑھی جارہی تھی۔ رفتار تیز نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ مختلف ریاستوں کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج حضرو کے مقام پر خیمہ زن ہو چکی تھی۔ لاہور سے جو فوجیں چلی تھیں ان میں انند پال کی فوج کے علاوہ اوجین، گوالیار اور قنوج کی فوجیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے دستے ابھی آرہے تھے۔ جب کسی دستے کی آمد کی اطلاع ملتی تھی پوری فوج رُک جاتی تھی۔ اِن تمام افواج کی کمان راجہ انند پال کے بیٹے برہمن پال کو دی گئی تھی۔ وہ پوری فوج کو یکجا کر کے آگے بڑھنا بہتر سمجھتا تھا۔

رفتار سُست ہونے کی دوسری وجہ دریا تھے جو چڑھے ہوئے تھے۔ فوجیں تو دریا پار کرلیتی تھیں، رسد کی بیل گاڑیاں اور اُن کے مویشیوں کو دریا پار کرانا خاصا دشوار تھا۔ اِس متحدہ فوج کی تعداد کسی بھی مورخ نے نہیں لکھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس کے مقابلے میں پشاور میں سلطان محمود غزنوی کے پاس جو فوج تھی، وہ ہزاروں میں تھی۔ ایک لاکھ بھی نہیں بنتی تھی۔ ہندوؤں کی اتنی زیادہ فوج کو سیلابی دریا پار کرتے کئی کئی دن لگ رہے تھے۔ چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

رفتار سست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے ملک میں مندروں کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی فوج سارے ہند کو فتح کرنے کیلئے آرہی ہے اور یہ فوج مندروں کو مسمار کر کے مسجدیں تعمیر کرے گی، جوان لڑکیوں کو اُٹھا لے جائے گی اور تمام ہندوؤں کو مسلمان کر لے گی۔ مسلمانوں کے خلاف ایسا خوفناک پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ متحدہ فوج کے راستے میں لوگ آجاتے اور فوج کو روک لیتے تھے۔ وہ نقدی اور زیورات

پیش کرتے اور اناج اور جانوروں کے لئے دانا چارہ بھی دیتے اور جو جوان آدمی تیغ زنی اور گھوڑسواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ فوج میں شامل ہو جاتے تھے ____ ہندوؤں پر مذہب کے حوالے سے اسلام دشمنی کا جنون طاری کر دیا گیا تھا۔

اِس طرح یہ فوج تعداد اور رسد کے لحاظ سے بڑھتی اور پھولتی جارہی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان نے ایک ہی محاذ پر اتنی زیادہ فوج نہ کبھی دیکھی تھی نہ تاریخ نے اُس کے بعد کسی بھی دور میں دکھائی۔ تعداد، اتحاد اور ساز وسامان کے لحاظ سے یہ فوج تمام تر عالمِ اسلام کو تہہ تیغ کرنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ ہندوستان نے تو اس کے بعد اسلام کے خلاف اتنی بڑی فوج نہ دیکھی، البتہ صلیبی سلام کے خلاف اس سے بھی زیادہ فوج سلطان سلاخ الدین ایوبی کے مقابلے میں لائے تھے۔ اس کے بعد سلطان ایوبی کے پوتے الکمال کو شکست دینے کے لئے صلیبی یورپ کے نو ملکوں کی افواج لائے تھے۔

ہندوؤں کی متحدہ افواج بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ فوجیوں پر اور شہریوں پر یہی ایک دیوانگی طاری تھی۔ "مسلمانوں کو کچل دو۔ اسلام کو ختم کر دو" ___ اور لوگ اپنا سب کچھ اپنی فوج پر نچھاور کر رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو پشاور میں اطلاعیں مل رہی تھیں کہ یہ لشکر کہاں تک پہنچا ہے اور وہاں تک اس کی تعداد میں کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ دشمن کو دریا پار نہیں کرنے دیا جائے گا اور لڑائی دریا کے پار لڑی جائے گی۔ سالاروں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ دشمن کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہے، اس لیے دریا کو اپنی پیٹھ پیچھے رکھ کر نہ لڑا جائے۔ ضرورت کے مطابق پسپائی بڑی تباہ کن ثابت ہوگی۔

سلطان محمود غزنوی نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں گھوم پھر کر لڑنا پڑے گا۔ اس کے لیے کھلے میدان کی ضرورت ہے جو دریا کے پار ہے۔ دریا کے پشاور والے کنارے سے آگے علاقہ پہاڑی ہے جہاں چھاپہ مار جنگ نہیں لڑی جا سکے گی۔ دشمن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ کئی ایک دستے مروا کر بھی پشاور تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا تو ہم محفوظہ سے اُس کے لئے دریا پار کرنا محال کر دیں گے۔

سلطان محمود غزنوی کو اپنی فوج کے جذبے، اپنے ایمان اور اپنے خُدا پر بھروسہ تھا اُس نے اپنی فوج کے کچھ آدمی ماہی گیروں اور مزدوروں کے بھیس میں دریائے سندھ کے کناروں پر بھیج دیئے اور کچھ چھاپہ مار حضروبھیجے۔ اُن کے ذمّے یہ کام تھا کہ اس فوج کی نقل وحرکت پر نظر رکھیں اور اگر یہ فوج کوُچ کر کے دریا کے قریب آئے اور کشتیوں کا پُل بنائے تو پُل کے رسّے کاٹ دیئے جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو کوُچ کا حکم دے دیا اور دریائے سندھ کے کنارے پر آگیا۔ اُس نے فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ دو حصّوں کو دریا کے پار موجودہ اٹک کے شمال میں پہنچا دیا۔ دو حصّوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر رکھا کشتیوں کا مضبوط پل بنا دیا گیا۔ دریا کے پشاور والے کنارے پر کوچ کے جو دو حصے تھے، اِن میں سے ایک سوار دستوں پر مشتمل تھا۔ اُسے دریا کے کنارے پر چوکس ہو کر گھومتے پھرتے رہنا تھا تاکہ دشمن کسی طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اِسے روکیں۔ یہ گھوڑسوار تیر انداز سے۔ دوسرا حصہ محفوظہ کا تھا۔

اور پھر سلطان کو اطلاع ملی کہ دشمن دریا سے پندرہ میل دور رہ گیا ہے۔ یہ اس فوج کا آخری پڑاؤ تھا سلطان تھوڑا سا وقت اور حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے کسی طرف سے کمک کی توقع تھی۔ اُس نے ملتان اور بھیرہ سے جو دستے منگوائے تھے وہ اُس کے پاس آگئے تھے۔ اُسے مزید وقت کی ضرورت اِس لئے تھی کہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سلطان محمود کی خواہش یہ تھی کہ جنگ سردی کے عروج کے وقت شروع ہو اُس کی فوج کے سپاہی یخ ٹھنڈ میں لڑ سکتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ قنوج اور گوالیار وغیرہ کی فوج سردی میں نہیں لڑ سکے گی۔

مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سمرتی کا کمرہ شہزادی کا کمرہ بن چکا تھا۔ پنڈت رادھا کشن اُس کے پاس آتا اور باتیں کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اُسے اِس کمرے میں دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ یہ اُن کا پنڈت رادھا کشن ہے۔ وہ سمرتی کی عمر کا آدمی معلوم ہوتا

تھا۔ اُس نے سمرتی کے کمرے میں گدّے رکھوا دیئے اور اِن پر ریشمی پلنگ پوش بچھا دیئے تھے۔ مٹی کے دیئے کی جگہ فانوس لگوا دیئے تھے اور لڑکیاں ہر صبح کمرے میں تازہ پھول رکھ جاتی تھیں۔

دوسرے پنڈتوں کا خیال تھا کہ اُن کا بڑا پنڈت سمرتی کو قربانی کے لیے تیار کر رہا ہے۔ پنڈت رادھا کشن انہیں بتایا بھی یہی کرتا تھا کہ نرتکی قربانی کے لیے تیار ہے لیکن سمرتی کے پاس جا کر وہ بھول جایا کرتا تھا کہ اُسے قربانی کے لیے پاک اور تیار کرنا ہے۔ صرف سمرتی تھی جسے یقین تھا کہ اُسے قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ پنڈت نے اُس کے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ البتہ اُس کے ہونٹ جو ہمیشہ سے مسکراہٹ سے محروم تھے، اب مسکرانے لگے تھے۔ سمرتی کی بعض باتوں سے وہ ہنس بھی پڑتا تھا۔ سمرتی نے اُسے کئی بار کہا کہ وہ اُسے جلدی ذبح کر دے کیونکہ موت کا انتظار اذیّت ناک ہے۔ یہ سُن کر ہر بار پنڈت کا چہرہ اداس ہو جایا کرتا تھا۔

وہ پنڈت جو سمجھتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو عورت سے محروم کر کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر لی ہے، اب اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ جیسے دیوتاؤں کو ناراض کر کے سمرتی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں جو خلا پیدا کر لیا تھا، وہ سمرتی سے پُر ہونے لگا تھا۔ پیاسے کو پانی ملا تو اُسے محسوس ہُوا کہ وہ پیاس سے جل رہا تھا۔ اُس نے سمرتی کو کبھی بیٹی کے روپ میں دیکھا، کبھی بہن کے روپ میں اور کبھی اُسے اپنی ماں سمجھا۔ اس مندر میں سمرتی سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں آیا کرتی تھیں۔ پنڈت نے ان کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ نگاہیں پھیر لیا کرتا تھا۔ سمرتی پہلی لڑکی تھی جس کی اُس نے باتیں سنیں اور جو اُس کی مرضی کے بغیر اُس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اس قُرب نے اور اِس لمس نے پنڈت کے اندر وہ تشنگی بیدار کر دی جسے وہ اپنی عظمت کی علامت سمجھا کرتا تھا۔

"کیا تمہاری آتما اب بھی اُس پیار کی پیاسی ہے جو تم نے مجھ سے مانگا تھا؟" —— ایک روز اُس نے سمرتی سے پوچھا۔

"آپ پہلے مرد ہیں جس نے مجھے اتنی راتیں اپنے پاس رکھا لیکن اس طرح رکھا جیسے

میں آپ کے پاس نہیں ہوں"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔" آپ نے میرے جسم کے ساتھ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ میری آتما اسی میں شانت ہوگئی ہے.... کیا میں اب دیوتاؤں کے چرنوں میں قربان ہونے کے لیے تیار ہوگئی ہوں ؟"

" ابھی نہیں"۔۔۔ پنڈت رادھا کشن نے اداس سے لہجے میں کہا۔

" کیا میں ابھی تک ناپاک ہوں ؟"

پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمرتی آگے بڑھی اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ساڑھی کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے کھلے ہوئے نرم و ملائم بال پنڈت کے چہرے پر جا پڑے پنڈت نے ایک ہاتھ اُٹھایا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سمرتی کا ایک گال پنڈت کے سر پر تھا۔ پنڈت کا کانپتا ہوا ہاتھ سمرتی کے بکھرے بالوں تک گیا اور اُس نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سمرتی گھبرا گئی۔ پنڈت نے اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ سمرتی کو جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا، جیسے وہ اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ کس نے اُٹھا کر تمھارے بالوں پر رکھ دیا تھا ؟

قلعے کے دروازے کا گھڑیال بجنے لگا۔ پنڈت رادھا کشن پوری طرح اپنے آپ میں آ گیا۔ یہ گھڑیال اُس وقت بجا کرتا تھا جب کوئی راجہ مہاراجہ آیا کرتا تھا۔ پنڈت قلعے کے دروازے پر جا کر اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اُس نے سمرتی سے کہا کہ کوئی مہمان آیا ہے، اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

راجہ انند پال کی بیوی آئی تھی۔ یہ انند پال کے دوسرے بیٹے برہمن پال کی ماں تھی۔ متحدہ افواج کی کمان اسی برہمن پال کو دی گئی تھی، حالانکہ انند پال خود ساتھ تھا۔ اُس نے برہمن پال کی ماں کو بتایا تھا کہ راج محل کی سب سے اعلیٰ رقاصہ کو نگر کوٹ کے پنڈت نے انسانی قربانی کے منتخب کر لیا ہے اور اُس نے یقین دلایا ہے کہ

فتح برہمن پال کی ہوگی۔

اس سے پہلے راجہ انند پال کی دوسری بیوی نے اپنے بیٹے سکھ پال کو جو مسلمان ہوگیا تھا، سلطان کے خلاف اس اُمید پر باغی کیا تھا کہ وہ بھیرہ کو فتح کر کے سلطان محمود غزنوی کو قیدی بنالائے گا اور باپ کی گدی کا جانشین بنے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سکھ پال بھیرہ میں سلطان کا قیدی بن گیا اور سلطان نے اُسے عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا تھا۔ اب انند پال کی دوسری بیوی کو ایسی ہی توقع تھی کہ اُس کا بیٹا پشاور کو فتح کر کے غزنی کو بھی تہہ تیغ کرلے گا اور اپنے باپ کی جگہ راج کرے گا۔ وہ بیٹے کی فتح کے لیے بے تاب تھی۔ وہ نگرکوٹ یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ سمرتی کی قربانی دی جاچکی ہے یا نہیں۔

پنڈت رادھا کشن نے اُسے بتایا کہ چونکہ سمرتی رقاصہ رہی ہے اور وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی تھی، اس لیے اُسے پاک کرتے بہت دن لگ گئے ہیں۔ برہمن پال کی ماں نے اُسے کہا کہ اس سے پہلے بھی جوان لڑکیوں کی قربانی دی جاچکی ہے۔ کسی پر اتنا زیادہ عرصہ صرف نہیں کیا گیا۔ اُس نے اصرار شروع کر دیا کہ سمرتی کی قربانی جلدی دی جائے کیونکہ فوجیں میدانِ جنگ کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ لڑکی کو ابھی بن گنگا تک بھی نہیں لے جایا گیا۔

پنڈت رادھا کشن کی حیثیت راجوں مہاراجوں سے بہت اونچی تھی اور اُسے بھگوان کا ایلچی سمجھا جاتا تھا لیکن انند پال کی بیوی نے ایسے شک کا اظہار کر دیا جس سے پنڈت کی حیثیت ذرا جھلتی رہ گئی۔ اُس نے کہا "سمرتی کے حُسن اور اُس کے جسم میں ایسی کشش ہے کہ جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کا یہی جادو نگرکوٹ کے مندر پر بھی چل گیا ہے میں اس کی قربانی تک یہیں رہوں گی"۔

پنڈت رادھا کشن نے کچھ بھی نہ کہا۔ شک غلط نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کل صبح سمرتی کو بن گنگا لے جارہا ہے۔ یہی ایک کام رہ گیا تھا جو کل ہوجائے گا اور اس سے اگلے

روز سمرتی کو قربان کر دیا جائے گا۔

راجہ انندپال کی بیوی شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔ پنڈت رادھا کشن سمرتی کے کمرے میں چلا گیا۔ سمرتی نے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ پنڈت کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ سمرتی کو دیکھتا رہا۔ جب سمرتی نے اُس سے پریشانی اور خاموشی کی وجہ پوچھی تو پنڈت نے کہا "میں صبح اتنی جلدی آؤنگا جب ابھی اندھیرا ہوگا۔ ہم دونوں بن گنگا چلیں گے"۔ اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

قافلے میں دو اونٹ تھے اور تین گھوڑے، ایک اونٹ پر ایک جوان لڑکی اور دوسرے پر ایک ادھیڑ عمر عورت سوار تھی۔ گھوڑوں پر مرد سوار تھے۔ وہ ہندو معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا حلیہ اور اُن کا لباس ہندوؤں جیسا تھا۔ ایک کتا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں قافلوں کے ساتھ رکھوالی والے کتے لازمی سمجھے جاتے تھے۔ یہ قافلہ لاہور سے چلا تھا اور اُس کی منزل نگرکوٹ تھی۔ راستے میں اِن سے جس کسی نے پوچھا انہوں نے یہی بتایا کہ وہ پوجا پاٹ کے لیئے نگرکوٹ کے مندر میں جا رہے ہیں۔ اب یہ قافلہ نگرکوٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس علاقے میں آکر وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہ نگرکوٹ کے مہارشی رادھا کشن کے درشن کرنے اور پاؤں چھونے جا رہے ہیں۔ نگرکوٹ کے اردگرد کے تمام لوگ پنڈت رادھا کشن کو اوتار مانتے تھے۔

اِس قافلے نے نگرکوٹ سے تھوڑی ہی دُور آخری پڑاؤ کیا۔ رات وہ آگ جلا کر اِس کے اِردگرد بیٹھے تو ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ مندر میں داخل ہو گئے اور اگر کسی کو ہم پر شک نہ ہوا تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سمرتی کہاں ہے۔ اگر وہ قربان ہو چکی ہے تو میں اس مندر کے تمام پنڈتوں کو قتل کر کے یہاں سے نکلوں گا۔

یہ شعیب ارمغانی تھا جو ہندوؤں کے مذہب سے، ان کے رسم و رواج اور مندروں کی زبان اور اصطلاحوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے لاہور سے اپنے دو ساتھی ساتھ لے لیے تھے۔ زرد سمرتی کے گھر میں آگئی تھی سمرتی کی خادمہ ساتھ

چلنے کو پہلے ہی تیار تھی۔ شعیب ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے سر منڈوا کر ہندوؤں کی طرح سر کی چوٹیوں پر بودیاں رکھ لی تھیں۔ داڑھیاں صاف کرا کے مونچھیں اس طرح بڑھالی تھیں کہ ہونٹوں پر چھجوں کی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ خادمہ اور زرفہ کو بھی انہوں نے ہندوؤں کے حلیے میں چھپا لیا تھا۔ اُن دونوں کے چہرے چھپانے کا نہایت آسان اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ دونوں نے گھونگھٹ لٹکا لیے تھے۔ یہ ہندوؤں کا رواج تھا۔

اونٹوں اور گھوڑوں کا انتظام شعیب کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ یہ خواہش خادمہ کی تھی کہ وہ کُتّے کو ساتھ لے چلیں کیونکہ پیچھے اُس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ سمرتی کا کتا تھا جو اُس سے بہت پیار کرتا تھا۔ رات کو گھر کی رکھوالی کرتا اور سمرتی گھر میں ہوتی تو اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ راستے میں بھی کُتّے کی ضرورت تھی۔

انہوں نے آخری پڑاؤ میں سمرتی کو مندر سے نکالنے کے اُن طریقوں پر غور کیا جو وہ سوچ کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُن کا زندہ واپس آنا مخدوش ہے۔ خادمہ اور زرفہ نے اپنے ذمے یہ کام لیا تھا کہ سمرتی اگر زندہ ہوئی تو اُس کا سراغ لگالیں گی۔ مندر کے بیسیوں کمرے تھے، تہہ خانے میں بھی کمرے تھے اور راہداریاں اور سیڑھیاں تاریک تھیں اس لیے سمرتی کو اِن بھول بھلیوں سے نکالنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے کی ضرورت تھی۔ خادمہ نے مردوں کو بتایا تھا کہ یہ بھول بھلیاں کیسی ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مندر کے قلعے میں فوج بھی رہتی تھی۔

ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے خنجر اور خنجر نما تلواریں پہنے ہوئے کپڑوں کے اندر چھپالیں اور یہ قافلہ رات کے آخری پہر نگر کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ خادمہ رہبری کر رہی تھی۔ انہیں سحر کی تاریکی میں مندر کے دروازے میں پہنچ جانا تھا۔

یہ وہ سحر تھی جب پنڈت رادھا کشن نے سمرتی سے کہا تھا کہ اُسے بن گنگا میں اشنان کے لیے لے جانا ہے۔ پنڈت سمرتی کے کمرے میں گیا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت نے اُسے جگایا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ سمرتی خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مندر سے نکلے۔ اُن کے لیے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ باہر آکر وہ پہاڑی سے اترنے لگے۔ پنڈت تو کئی برسوں سے اس پہاڑی سے اُترا اور چڑھ رہا تھا

اس لیے اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ دشواری سمرتی کے لیے تھی جو دو گھوڑوں والی بگھی کی سواری کی عادی تھی۔ اُسے جو چپل پہنائے گئے تھے، اُن سے وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ پہاڑی سے اُترتے اس کے پاؤں بار بار پھسلتے تھے۔ پنڈت اُسے سہارا دیتا تھا اور وہ سنبھل جاتی تھی۔ پھر سمرتی نے ایک بازو پنڈت کی کمر کے گرد لپیٹ دیا اور اترنے لگی۔ پھر بھی اس سے اچھی طرح اترا نہیں جاتا تھا۔ پنڈت نے بھی بے قابو ہو کر اپنا بازو اُس کے گرد لپیٹ دیا اور اُسے تقریباً اپنے اوپر گرا کر پہاڑی اُترنے لگا۔ موسم سرد تھا۔ سمرتی اُس کے ساتھ چپک گئی۔

وہ پہاڑی سے اُتر آئے اور دریا کی طرف چل پڑے۔ مندر دُور اُوپر رہ گیا تھا۔ نیچے جنگل اور ویرانہ تھا۔ پنڈت نے سمرتی کو اپنے بازو سے آزاد نہ کیا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے چلتے گئے۔ صبح کا اجالا نکھرنے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ پنڈت سمرتی کو اس لیے اتنی جلدی لے آیا تھا کہ صبح کے وقت دریا پر لوگ آجاتے تھے۔ سمرتی کو چھپا کر رکھنا تھا۔

"کیا آپ مجھے آخری غسل کے لیے جا رہے ہیں؟" — سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت نے اس کے سوا کوئی جواب نہ دیا کہ اپنے بازو کا گھیرا رقاصہ کے گرد اور زیادہ تنگ کر کے اُسے اس طرح اپنے ساتھ لگا لیا جیسے اُسے اپنے جسم میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" — سمرتی نے کہا — "مجھ سے آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ مجھے آج مرنا ہی ہے تو مجھے بتا دیں۔"

"بتا دوں گا سمرتی!" — پنڈت نے اُسے اپنے آگے اس طرح کر لیا کہ دونوں کے سینے مل گئے — "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دونو قربان ہو رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آج کا سورج نہیں دیکھ سکوں گا" — اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ رندھیائی ہوئی آواز میں بولا — "زندگی کی آخری رات ہے۔ مجھے پیاسا نہ مرنے دو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں اپنا من مار چکا ہوں۔ من نہیں مرا۔ میں نے تم پر ہر روپ چڑھایا ہے۔ بیٹی کا بھی، بہن کا بھی، ماں کا بھی۔ صرف ایک روپ کو چھپانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بہت دھوکے دیئے ہیں۔ میں نے دیویوں کی مُورتیوں میں تمہاری مسکراہٹیں دیکھی ہیں۔ پاپی من مانا نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا

کیوں ایسی عورت کے وجود سے بہت بھاگا ہوں مگر.....؟"

"آپ پتھر کے بھگوان کو مانتے ہیں" — سمرتی نے کہا — "میرے خُدا کی عبادت کریں۔ من کے سب پاپ جھڑ جائیں گے۔"

"مجھے باتوں میں نہ لگاؤ سمرتی!" — پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں نے تمہاری رُوح کو پیار دیا ہے۔ اس کے عوض مجھے جسم کا خمار دے دو۔ شاید یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہو، پھر اس جسم کو جلا دیا جائے گا۔ میں جیتے جی جل رہا ہوں۔"

سمرتی نے قہقہہ لگایا اور اُچک کر اُس سے الگ ہو گئی۔ بولی — "تیرا کشن مراری سچا ہوتا تو تیری پچاس برسوں کی پرارتھنا کو یوں پاپ میں ڈوبنے نہ دیتا۔ میں آزاد ہوں۔ میں جانتی تھی تو مجھے ایک دن انہی نگاہوں سے دیکھے گا جن سے مجھے پاپیوں نے دیکھا تھا۔ میں نے تیرے اندر اس آگ کو اسی لیے بھڑکایا تھا کہ تو جلتا ہوا میرے قدموں میں آ گرے اور میں تجھے بھوکے کتے کی طرح اپنے پیچھے پیچھے جنگل میں لے جاؤں اور آزاد ہو جاؤں ... میں آزاد ہوں.... میں آزاد ہوں۔"

وہ ایک طرف دوڑ پڑی لیکن اونچی نیچی زمین پر وہ تیز دوڑ نہ سکی۔ پنڈت نے اُسے چند قدموں پر پکڑ لیا اور کہا "پاگل نہ بنو سمرتی! مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ کہاں پناہ ڈھونڈو گی؟ میں تمہیں پکڑوا دوں گا اور ذبح کر دوں گا۔ میں تم سے کوئی قیمتی چیز نہیں مانگ رہا۔"

سمرتی نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا اور بولی "میں دریا میں ڈوب جاؤں گی۔ تیرے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

"تجھے کوئی نہیں بچا سکتا سمرتی!" — پنڈت نے کہا — "بتوں کی توہین نہ کر۔"

"مجھے میرا خدا بچائے گا" — سمرتی نے کہا — "میرا خُدا سچا ہوا تو تیرا ایک بھی بُت سلامت نہیں رہے گا۔"

پنڈت بھوکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ اُس کے وجود میں وہ مرد بیدار ہو گیا تھا جسے وہ سمجھا تھا کہ ہمالیہ کے دامن میں مار آیا ہے۔

تب اُسے ایک کُتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قریب آرہی تھی۔

جس وقت مندر کی پہاڑی سے دُور جاکر پنڈت کشن نے رُک کر سمرتی کو اپنے سینے سے لگایا تھا، اُس وقت شعیب ارمغانی کا چھوٹا سا قافلہ پہاڑی کے دامن میں اُس جگہ پہنچا تھا جہاں سے مندر کا راستہ اوپر جاتا تھا۔ سمرتی کی خادمہ اس جگہ سے واقف تھی۔ انہیں گھوڑے اور اونٹ وہیں چھوڑ دینے تھے۔ سمرتی کا کُتّا کھلا ہُوا تھا۔ وہ زمین کو سونگھ کر بے تابی سے غرّایا، پھر دھیمی سی آواز میں بھونکا اور اُس طرف زمین کو سونگھتا چل پڑا جدھر پنڈت اور سمرتی گئے تھے۔ قافلے والوں نے اس کی طرف توجّہ نہ دی۔ کتّے تو ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔

کتّا دوڑنے لگا اور اُس کی بھونکنے کی آواز بلند اور دُور ہونے لگی۔ خادمہ نے کہا کہ کُتّے کو کسی گیدڑ یا بھیڑیئے کی بُو آگئی ہے۔ اِن میں سے کوئی تصوّر میں نہیں لا سکتا تھا کہ کتّا مالکن کی بُو پر جا رہا ہے۔ اُسے سمرتی سے جُدا ہوئے اڑھائی تین مہینے ہی گذرے تھے۔ وہ سمرتی کے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اُس کے بستر میں گھُس جایا کرتا تھا۔ سمرتی اُس کے ساتھ بچّوں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔

پنڈت نے جب کتّے کے بھونکنے کی آواز سنی تو اُس نے پروا نہ کی۔ وہ بھوکے بھیڑیئے کی طرح سمرتی پر ٹوٹ پڑا تھا اور سمرتی اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے گرا لیا اور اُس کی ساڑھی نوچنے لگا۔ اب سمرتی بے بس ہوگئی تھی۔ ایک کتّا اُس کے گرد گھوم کر اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا تو وہ سمجھی کہ یہ بھیڑیا ہے یا مندر کا کتّا ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ یہ اُس کا اپنا کتّا ہے۔ کتّا اُس کا منہ چاٹنے لگا تو اُسے کچھ شک ہُوا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا — ”شیری! پکڑلو“۔

کُتّے نے اگلی ٹانگیں اٹھا کر پنجے پنڈت کے جسم میں اتار دیئے اور اُس کا ایک کندھا منہ میں لے لیا۔ اُس نے پنڈت کو جھنجھوڑا تو پنڈت چیخ کر اُٹھا۔ سمرتی اُس کے نیچے سے نکل آئی۔ کُتّے نے کندھے سے منہ اکھاڑ کر پنڈت کی ران دانتوں کے شکنجے میں لے لی۔ پنڈت نے ایسا واویلا بپا کیا کہ دُور دُور تک سنائی دیا۔ پنڈت بھاگا تو کتّے نے اُس کی

ٹانگ پھر پکڑ لی۔ سمرتی نے چلّا کر پنڈت سے کہا۔ "میں نے تجھے کہا تھا کہ مجھے میرا خدا بچائے گا۔ یہ میرا کتا ہے جو لاہور سے میری بُو پر آیا ہے۔"

سمرتی نے کُتّے کو پکڑ لیا۔ پنڈت بھاگ گیا۔ سمرتی کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُس کا کتا کہاں سے آ گیا ہے؟ کتا اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ سمرتی کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی کہ مندر کے فوجی پنڈت کی مدد کو آرہے ہیں۔ اُس نے چھپنے کی کوشش کی لیکن اُسے ایک عورت کی آوازیں سنائی دیں "شیری۔۔۔ شیری" وہ کتے کو بلا رہی تھی۔ آواز سمرتی کی خادمہ کی تھی۔ پنڈت کا واویلا اتنا بلند تھا کہ انہیں بھی سنائی دیا تھا۔ ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ساتھ کُتّے کے بھونکنے اور بھنبھوڑنے کی آوازیں بھی سُنی تھیں۔ ارمغانی کو یاد آ گیا تھا کہ اس کتے نے اُسے بھی بھنبھوڑا اور بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔

وہ سب دوڑتے وہاں پہنچے تو سمرتی نیم تاریکی میں ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے پہچاننے میں ذرا وقت محسوس ہوئی۔ سمرتی نے جب ارمغانی اور اپنی خادمہ کو پہچان لیا تو اُسے خواب کا دھوکہ ہُوا۔ اُس نے بڑی تیزی سے انہیں بتایا کہ وہ اس جگہ تک کس طرح پہنچی ہے۔ ارمغانی نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح نگر کوٹ آتے ہیں۔ زیادہ رُکنا خطرناک تھا۔ سب وہیں واپس چلے گئے جہاں اونٹ اور گھوڑے کھڑے تھے۔ زرینہ اور سمرتی کو ایک اونٹ پر بٹھا دیا گیا۔ خادمہ دوسرے اونٹ پر بیٹھی۔ مرد گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا لیکن اُن کی منزل لاہور نہیں بھیرہ تھی۔ اب ان میں کوئی بھی لاہور نہیں جا سکتا تھا، سوائے ارمغانی کے دو ساتھیوں کے۔ لاہور میں ان پر کسی کو شک نہیں تھا کہ وہ ارمغانی کے ساتھی ہیں۔

یہ قافلہ اب عام راستے سے ہٹ کر جنگلوں اور ویرانوں میں جا رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تعاقب کا تھا۔ انہوں نے حساب لگایا کہ پنڈت اوپر جائے گا۔ اطلاع دے گا کہ سمرتی بھاگ گئی ہے۔ تعاقب میں آنے والے پہاڑی سے اُتریں گے اور جتنا وقت گذر جائے گا، اتنے وقت میں اونٹ اور گھوڑے انہیں بہت دُور لے جائیں گے۔ اب اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔

اُن کا خطرہ بے بنیاد تھا۔ اُن کے تعاقب میں کوئی نہیں آرہا تھا۔ کُتّے نے پنڈت کے کندھے اور ٹانگوں سے گوشت اکھاڑ دیا تھا۔ خون چشمے کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ مدد کے لئے چیختا چلّاتا تو کوئی نہ کوئی اُس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔ ان زخموں سے وہ مر نہیں سکتا تھا مگر اُس نے کسی کو مدد کے لیے نہ بلایا۔ اُس نے یہ بھی نہ کیا کہ اُس نے جو چادر اپنے اوپر لے رکھی تھی، اُسے پھاڑ کر زخموں پر باندھ لیتا تاکہ خون رُک جاتا اور وہ پہاڑی پر اپنے مندر میں جانے کی بجائے نگر کوٹ گاؤں میں چلا جاتا جو قریب ہی تھا۔

وہ کہیں بھی نہ گیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کیا۔ اُس نے زیرِلب کہا — "اچھا ہُوا .... ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا .... اچھا ہُوا" — وہ اُٹھا اور بن گنگا کی طرف چل پڑا — "گنگا ماتا میرا یہ پاپ نہیں دھو سکے گی ....اس ناپاک جسم کو آگ بھی پاک نہیں کر سکے گی .... من پاپی ہو جائے تو تن کو پاپ کرتے دیر نہیں لگتی .... میں پیاسا ہوں" — وہ چلتا گیا اور اُسے چکر آ گیا۔ لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ چند قدم اور چلا اور گر پڑا۔ اُٹھا، چلا اور پھر گر پڑا — "ذرا دیر اور .... مجھے گنگا جل تک پہنچنے دے۔"

وہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی مگر پنڈت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے بن گنگا کی لہروں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ اور تیزی سے رینگنے لگا۔ اُسے سمرتی کی آواز سنائی دی — "مجھے میرا خدا بچائے گا۔ تیرے بُت تباہ ہوں گے" — اُسے اپنی آواز سنائی دی — "عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہو سکتی ہے۔ اُسے کوئی اور روپ دے کر اس کے قریب جاؤ گے تو جل جاؤ گے۔ انجام بہت بُرا ہوگا" — وہ مندر میں یہی رَٹ لگائے رکھتا تھا مگر اس نے خود وہی پاپ کیا کہ سمرتی کو وہ روپ دیا جو نہ ماں کا تھا، نہ بہن کا، بیٹی کا نہ بیوی کا۔

اُس کا خون بہہ رہا تھا۔ جسم خالی ہو رہا تھا اور گناہ اُسے ڈس رہا تھا۔ وہ بن گنگا کے کنارے اُس مقام تک رینگتا ہُوا پہنچ گیا جہاں پاٹ تنگ تھا اور پانی باہر بھی آ جایا کرتا تھا۔ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ اُس نے بیہوش ہوتے ہوئے کہا — "میں پیاسا ہوں ... میں پاپ کا پیاسا تھا" — بن گنگا کی ایک لہر کنارہ پھلانگ کر آئی اور بیہوش پنڈت کو اپنے ساتھ لے گئی۔

نگر کوٹ کے بُت اُس تریکی کی راہ دیکھتے رہے جس کے خون سے اُن کے پاؤں دُھلنے تھے۔ مندر اپنے مہارشی پنڈت رادھا کشن کی راہ دیکھتا رہا۔ برہمن پال کی ماں اُن کے انتظار میں باؤلی ہوتی رہی۔ وہاں کے پچھلے پہر پنڈت اور سمرتی کی تلاش کو گئے ہوئے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے اُس راستے پر خون ہی خون دیکھا جو راستہ بن گنگا کو جاتا تھا۔ اُس خون سے کئی کہانیاں بنیں۔ قیاس کے بہت گھوڑے دوڑائے گئے مگر کوئی گھوڑا پنڈت اور نگر کوٹ کی تریکی تک نہ پہنچ سکا —— ہندوؤں کی متحدہ افواج کے سیناپتی برہمن پال کی ماں دیوی دیوتاؤں کے قہر سے ڈرنے لگی۔

قہر تو سلطان محمود غزنوی پر نازل ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی اتنی زیادہ فوج کو وہ تصوّر میں بھی نہیں لاسکتا تھا۔ یہ افواج جس انداز سے آئی تھیں اس سے اُن کے کئی راز معلوم ہو گئے تھے۔ یہ راز سلطان محمود تک پہنچا دیئے گئے تھے۔ سلطان انہی سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مورخوں نے جن میں سے ایک انگریز سمتھ بھی۔ اسے سمتھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، ہندوستان کے اس لشکر کی اِن خامیوں کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کی متحدہ ہائی کمانڈ ایک آدمی کے تحت تھی اور یہ آدمی ہر ایک فوج کی فنّی اور نفسیاتی کیفیت سے ناواقف تھا۔ دوسرے یہ کہ ہائی کمانڈ پر افواج کے کمانڈروں کو اعتراض تھا، اس لیے باہمی تعاون ناقص تھا۔ تیسرے یہ کہ فوج میں ہزارہا شہری صرف اس لیے شامل کر لیے گئے تھے کہ اُن میں لڑنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ اسلام کے خلاف جذباتی تھے مگر انہوں نے میدانِ جنگ کبھی دیکھا نہیں تھا اور چوتھے یہ کہ ہندوؤں کو اپنی تعداد اور سازو سامان پر بھروسہ تھا۔

ہندو لشکر کے مورال کو تقویت وہ بُت اور مورتیاں دیتی تھیں جنہیں پنڈت فوجوں کے ساتھ رکھتے اور عبادت اور دُعا میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ شکست کی صورت میں سب سے پہلے یہ پنڈت بُتوں اور مورتیوں کو پھینک کر بھاگا کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سلطان کو [illegible] پر بھروسہ تھا جو وہ ہر لڑائی سے

پہلے میدانِ جنگ میں بڑھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی عسکری فہم و فراست پر بھروسہ تھا، اور اُسے اپنے اس عقیدے پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے اور یہ جنگ اُس کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں۔ اب بھی اُس نے اپنے سامنے ہندو لشکر کے پہاڑ دیکھے تو اُس نے اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو آخری ہدایات دے کر کہا ــــ "بدر میں رسولِ اکرم صلعم نے تین گنا قوی دشمن کو شکست دی تھی۔ ہمیں اس روایت کو زندہ کرنا ہے۔ میں اپنی فوج سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار اپنی فوج سے خطاب کر رہا تھا ــــ "میں تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں کروں گا کہ فتح تمہاری ہے۔ صرف یہ کہوں گا کہ خدا تمہارا ہے بشرطیکہ تم خدا کے ساتھ رہو اور دل میں یہ ایمان تازہ رکھو کہ اسلام کی پاسبانی کریں گے اور اپنے سچے مذہب کے کسی دشمن کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ تمہارے سامنے کفر کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر تم نے اپنے عقیدے کی بجائے اپنی جان کو عزیز سمجھا تو تمہارے لیے تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمیں اِن پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ اپنی اور اپنے دشمن کی تعداد کو بھول جاؤ۔ جنگ جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا اُسے فتح دیتا ہے جو اُس کا نام روشن کرنے کے لیے فتح کا عزم لے کر لڑتا ہے۔"

(۸)

سلطان محمود غزنوی فوج کے دو حصّوں کو اپنی کمان میں دریائے سندھ کے پنجاب والے کنارے پر لے گیا اور حضرو کے قریب خیمہ زن ہُوا۔ اُس نے دیدبانوں کی آنکھوں سے بھی ہندو لشکر کو دیکھا اور اپنی آنکھوں سے بھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ اب ہندو لڑنے کا جذبہ اور فتح کا عزم لے کر آتے ہیں ہمیں بہت محتاط ہو کر لڑنا پڑے گا۔ اُس نے اپنے پلان میں ردّ و بدل کیا اور چند ایک چھاپہ مار جیش دریا کے کنارے پر دُور دُور پھیلا دیتے۔ وہ پشاور اور غزنی کے دفاع کے لیے دریا کا پورا پورا استعمال کرنے کی سوچ چکا تھا۔

اُس نے دُوسرا اقدام یہ کیا کہ اپنی خیمہ گاہ کے ارد گرد خندق کھدوا دی۔ اُس نے مورچہ بند ہو کر لڑنا زیادہ موزوں سمجھا۔ وہ کچھ اور انتظام بھی سوچ رہا تھا لیکن مزید

تاخیر اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی کیونکہ دشمن کے لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ابھی تک ہندوستان سے دستے آ رہے تھے۔

سلطان سمجھ گیا کہ دشمن کی افواج ابھی منظم نہیں ہوئیں۔ انہیں ابھی حملے کی ترتیب میں آنا تھا سلطان نے اللہ کے بھروسے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے ایک روز علی الصبح، نماز کے فوراً بعد ایک ہزار گھوڑ سوار تیر انداز جو گھوم پھر کر تیر اندازی کرنے کا تجربہ رکھتے تھے، دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیئے۔ اس صورتِ حال میں اُس نے پہل کاری بہتر سمجھی اور جنگ کی ابتدا کر دی۔

تاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۳۹۹ ہجری بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۰۰۸ عیسوی تھی۔ مشہور مؤرخ گردیزی نے اس معرکے کا آنکھوں دیکھا حال یوں لکھا ہے کہ ایک ہزار تیر اندازوں سے حملہ کرا کے محمود غزنوی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اُس کے پلان کو دشمن نے یوں پرے پھینک دیا جیسے کوئی بے کار چیز کوڑے کرکٹ میں پھینک دی جاتی ہے۔ دشمن کی طرف سے تیس ہزار گکھڑوں نے ایک ہزار تیر اندازوں پر ہلّہ بول دیا۔ گکھڑ ایک لادین قبیلہ تھا جو ہندوؤں کا حامی تھا بلکہ یہ قبیلہ اپنے آپ کو ہندوؤں کی نسل سے سمجھتا تھا۔ یہ لوگ جنگجو تھے۔ موسم کیسا ہی ہو میدانِ جنگ پتھریلا ہو، تپتا ہوا ریگزار ہو، ہموار ہو یا اونچا نیچا، گکھڑ ننگے پاؤں اور ننگے سر لڑا کرتے تھے۔

انہوں نے تیر انداز سواروں پر ایسا شدید ہلّہ بولا کہ ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار سواروں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں غائب ہو گئے ہیں گکھڑ ان کا قتلِ عام کر رہے تھے۔ گکھڑوں نے اپنا ہلّہ روکا نہیں، وہ نعرے لگاتے اور چیختے چنگھاڑتے سلطان محمود کے کیمپ میں داخل ہو گئے۔ کیمپ کے ارد گرد خندق تھی۔ دو طرف آنے جانے کا راستہ تھا گکھڑ ان راستوں سے سیلاب کی طرح اندر چلے گئے۔ سلطان محمود اس صورتحال کے لیے تیار نہیں تھا۔ گکھڑوں کی یہ دلیرانہ یلغار غیر متوقع تھی لیکن احمقانہ بھی۔ بے شک اُن کی تعداد تیس ہزار تھی لیکن وہ ایسے کیمپ کے اندر آ گئے تھے جو خندق سے گھرا ہوا تھا۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ چند منٹوں میں گکھڑوں کے ہاتھوں پانچ ہزار مسلمان شہید ہو گئے۔

زخمی لاتعداد تھے کیمپ میں خونریز معرکہ لڑا جا رہا تھا خندق نے گکھڑوں کے لیے پسپائی ناممکن بنادی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ دشمن مزید تعداد سے حملہ کر دے گا اور ایک گھنٹے کے اندر جنگ کا فیصلہ دشمن کے حق میں ہو جائے گا۔ سلطان کیمپ میں پھنس گیا تھا اور وہ سپاہیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ٹروپس کو جس طرح ڈیپلائے کر رکھا تھا، اُسے اس کا ثمر ملنے لگا۔ وہ اس طرح کہ مشہور سالار عبداللہ الطائی چھ ہزار عربی نسل کے گھوڑوں کو تیار رکھے ہوتے تھا جو اُس نے گکھڑوں کے خلاف استعمال نہ کیے۔

کچھ دیر بعد گکھڑوں کا صفایا شروع ہو گیا۔ وہ کم بھی رہ گئے اور تھک بھی گئے تھے۔ وہ خندق میں گرتے تو مسلمان تیراندازوں اور برچھی بازوں کا شکار ہو جاتے۔ راجہ انندپال نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اُس نے نہایت اعلیٰ فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقعہ نہ دینے کے لیے اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے کیمپ کی کیفیت کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہاں اب گکھڑ کٹ رہے تھے اور مسلمان کاٹ رہے تھے۔ راجہ انندپال نے فتح یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھی کو آگے رکھا۔ اپنا جھنڈا اور اونچا کیا اور ہلّہ بولنے کے انداز سے حملہ کر دیا۔

سلطان کے سالار عبداللہ الطائی نے چھ ہزار گھوڑسواروں سے اُس پر پہلو سے حملہ کر دیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے چھ ہزار گھوڑسوار کچھ بھی نہیں تھے لیکن مورخ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک معجزہ رونما ہُوا۔ وہ یوں کہ راجہ انندپال کے ہاتھی کی پیشانی میں دو تین تیر اُتر گئے اور ایک تیر آنکھ میں لگا۔ یہ شاہی ہاتھی بڑا ہی طاقتور اور بدمست تھا۔ اس نے اُدھم بپا کر دیا اور اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس کی چنگھاڑ سے دوسرے ہاتھی بھی بدک گئے۔ راجہ انندپال کا پرچم گر پڑا اور اُس کے ہاتھی نے پیچھے مڑ کر حملے کی صفوں میں قیامت بپا کر دی۔ دوسرے ہاتھی بھی اس کی چنگھاڑ سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ راجہ انندپال کی فوج یہ سمجھ کر کہ آگے سے مسلمانوں نے حملہ کر دیا ہے، پیچھے کو دوڑ پڑی اور اسے پیچھے کو بھاگتے دیکھ کر دوسری ریاستوں کی فوجیں حکم اور ڈسپلن کی زنجیر توڑ کر پسپا ہونے لگیں۔

متحدہ ہائی کمان بیکار ہو گئی۔ ہندو لشکر کی بے دلی کی ایک وجہ موسم بھی تھا۔ یہ ۳۱ دسمبر

کا دن تھا جب قریبی پہاڑیوں پر برفباری شروع ہو چکی تھی۔ سلطان محمود اسی موسم میں لڑنے کے لیے وقت حاصل کرتا رہا تھا۔ سلطان نے دشمن میں یہ بھگدڑ دیکھی تو اُس نے کھلے حملے اور تعاقب کا حکم دے دیا۔ عبداللہ الطائی نے اپنے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اور دوسرے سالار ارسلان جاذب نے دس ہزار سواروں اور پیادوں سے جن میں ترک، افغان اور خلجی تھے، مل کر حملہ کر دیا۔ دشمن اب لڑ نہیں رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔

فرشتہ کے مطابق پسپائی میں دشمن کے بیس ہزار فوجی ہلاک ہو گئے۔ جنہوں نے ہتھیار ڈال کر قید قبول کر لی، ان کی تعداد بے حساب تھی۔ اس سے پہلے سلطان محمود نے کبھی تعاقب نہیں کیا تھا۔ اُس نے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے سے بھی فوج بُلالی اور دشمن کا تعاقب نہ چھوڑا۔

راستے میں اسے بتایا گیا کہ نگر کوٹ کا مندر ہندو راجوں مہاراجوں کا جنگی مرکز بنا ہُوا ہے جو ایک قلعے میں ہے۔ سلطان نے اُدھر کا رُخ کر لیا۔ نگر کوٹ کو راجہ انند پال کی یا کالنجر کی فوج بچا سکتی تھی مگر دونوں فوجیں بُری طرح تتّر بتّر ہو گئی تھیں۔ سلطان نے نگر کوٹ کا محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں سے تیر برسنے لگے۔ قلعہ پہاڑی پر تھا اس لیے حملہ آوروں کی کامیابی محال تھی۔ تاہم تین دنوں کے محاصرے اور دروازے پر تابڑ توڑ حملوں سے محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان محمود مندر میں گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بُتوں اور مورتیوں کو پہاڑی کے اوپر سے نیچے گرایا۔ مندر سے بے بہا زروجواہرات برآمد ہوئے۔ سات کروڑ سونے کے سکّے تھے۔ سونا منوں کے حساب سے تھا۔ چاندی کئی سو من تھی۔ ہیرے جواہرات بھی منوں کے حساب سے تھے۔ یہ وہ خزانہ تھا جو ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کو شکست دے کر غزنی کو مہابھارت میں شامل کرنے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔

سلطان نے حضرو سے نگر کوٹ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ راجہ انند پال اس کے چند دن بعد مر گیا۔

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں رہ کر اسلامی سلطنت کو منظّم اور مستحکم کرنا چاہتا

تھا مگر اُسے غزنی سے اطلاع ملی کہ غور کے علاقے میں محمد نام کے ایک افغان نے دس ہزار فوج کے ساتھ اپنا کیمپ بنالیا ہے اور غوری اُس کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک اور خانہ جنگی کی ابتدا تھی۔ سلطان محمود کو ۱۰۰۹ء (۴۰۰ھ) میں غزنی جانا پڑا اور اُسے ایک اور خانہ جنگی لڑنی پڑی۔

معرکہ انسان اور ابلیس کا

نگرکوٹ کے بُت توڑنے کے بعد سلطان محمود غزنوی غزنی کو جا رہا تھا کیونکہ اُس کی غیر حاضری میں غوریوں نے غزنی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سلطان محمود کی بہت بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے کوئی نہ کوئی مسلمان حکمران غزنی پر چڑھ دوڑتا تھا۔ اُسے غزنی کو بچانے کے لیے واپس جانا پڑتا تھا، اس لیے وہ ہندوستان میں کسی بھی وقت آرام سے بیٹھ کر یہاں کے امور کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ متعصّب تاریخ والوں نے اُس کی اس مجبوری پر پردہ ڈال کر اُس پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ لوُٹ مار کے لیے آتا تھا اور وہ بُت اس لیے توڑتا تھا کہ بتوں کے اندر زروجواہرات بھرے ہوتے تھے اور وہ لوُٹ مار کر کے غزنی چلا جاتا تھا۔

اب کے وہ اس عزم کے ساتھ آیا تھا کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے فوجی اتحاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا اور کسی بڑے مندر میں کوئی بُت سلامت نہیں رہنے دے گا۔ چنانچہ اُس نے حضرو کے مقام پر ہندوستان کی متحدہ فوجی طاقت کو بکھیرا اور نگرکوٹ تک جا پہنچا جہاں کا مندر سارے ملک میں مشہور تھا۔ اُس نے نگرکوٹ کو فتح کیا ہی تھا کہ اُسے غزنی سے بلاوا آگیا کہ دس ہزار غوریوں نے غزنی کے قریب خیمے گاڑ کر اردگرد خندق کھود لی ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے ساتھ دو ہزار ہندو قیدی لے جا رہا تھا لیکن یہ جنگی قیدی نہیں تھے۔ یہ اُس وقت کے رواج کے مطابق غلام تھے جو مہاراجہ انند پال نے سلطان محمود کو تحفے کے طور پر دیئے تھے۔ کچھ ہاتھی تو سلطان نے ہندو فوج سے

چھینے تھے۔ پچاس ہاتھی ہندو مہاراجوں نے پیش کیے تھے۔

وہ جتنی فوج اپنے ساتھ لایا تھا اتنی واپس نہیں لے جا رہا تھا۔ کچھ نفری یہاں ضرورت کے تحت چھوڑ چلا تھا اور بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس کی فوج کا کوئی ایک بھی سپاہی جنگی قیدی نہیں تھا کیونکہ وہ فاتح تھا، مگر اُس کے دو کمانڈار اُس کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ دونوں زندہ تھے اور اُس فوج کے ساتھ بھی نہیں تھے جسے سلطان محمود نگر کوٹ کے دفاع اور انتظام کے لیے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

ان میں ایک لُغراخان تھا اور دوسرا التنگین۔ دونوں خوبرو اور تنومند جوان تھے۔ لُغراخان پشاور اور لمغان کے درمیان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ پشاور آتا جاتا رہتا تھا اس لیے ہندوستان کی زبان سمجھ سکتا تھا اور کچھ کچھ بول بھی سکتا تھا۔ جب سلطان محمود کی فوج نے نگر کوٹ کا قلعہ سَر کر لیا اور لڑائی تقریباً ختم ہو گئی تھی، اُس وقت لُغراخان قلعے سے باہر ایسی جگہ تھا جو پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ قلعہ ٹوٹتے ہی اُس کے جیش کے سپاہی قلعے کے اندر جانے کو دوڑ پڑے۔ لُغراخان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا یکلخت دوڑ پڑا۔ لُغراخان سنبھل نہ سکا۔ وہ پیچھے کو گرنے لگا اور گھوڑا اُس کے نیچے سے یوں نکل گیا جیسے بدک گیا ہو۔

لُغراخان ایسا گرا کہ لڑھکتا ہُوا پہاڑی سے نیچے چلا گیا۔ وہ سنبھل تو گیا لیکن چوٹیں اتنی آئی تھیں کہ کوشش کے باوجود اوپر نہ جا سکا۔ وہ نیچے چلا گیا۔ اُس کا سَر چکرا رہا تھا اور دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ ہندو فوج کے سپاہی اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ لُغراخان اُن سے چھپتا پھر رہا تھا۔ ہندو اُسے دیکھ لیتے تو جان سے مار جاتے۔

وہ نیم غشی کی حالت میں کسی اور ہی سمت نکل گیا۔ اُسے سمت اور وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ وہ کبھی بیہوش ہُوا، کبھی ہوش میں آیا اور جب بھی ہوش میں آیا، وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ علاقہ جنگلاتی اور چٹانی تھا۔ اُسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں یا کوئی دن گزرا بھی ہے یا نہیں۔ اُسے کسی نے جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ عادت کے مطابق اپنی تلوار کے دستے پر پڑا اور اُس نے

تلوار نیام سے نکال لی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا مگر گر پڑا۔ چوٹوں کے علاوہ وہ بھوکا اور پیاسا بھی تھا اور ایک زخم ایسا تھا جس سے خُون نکل رہا تھا۔

"ہوش میں آؤ خان" ___ اُسے اپنی زبان کی آواز سنائی دی ___ "میں التنگین ہوں۔ یہاں کیسے آگئے؟"

بُغرا خان نے بولنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کا حلق خشک تھا اور زبان پیاس سے اکڑ گئی تھی۔ اُس نے منہ کھولا تو التنگین سمجھ گیا کہ وہ پیاسا ہے۔ التنگین نے اپنی پیٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی پانی کی چھاگل کھولی اور اُس کے منہ سے لگا دی ___ بُغرا خان اُس کا گہرا دوست تھا۔

التنگین بھی بُغرا خان کی طرح ایک جَیش کا کمانڈر تھا۔ وہ قلعے کے محاصرے میں شامل نہیں تھا۔ اُس کے جَیش کو قلعے کی پہاڑی سے دُور اُس راستے پر بھیج دیا گیا تھا جس سے ہندو فوج کی کمک یا رسد کے آنے کی توقع تھی۔ التنگین کے ذمے یہ کام تھا کہ کمک کو راستے میں ہی الجھا لے۔ اُس کا جَیش تیر انداز تھا اور گھوم پھر کر تیر اندازی کا تربیّت یافتہ تھا۔

اس جَیش کو ایک ہدف مل گیا۔ یہ ہندوستانی فوج کا ایک سوار دستہ تھا جو نگر کوٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا بلکہ اُدھر سے آ رہا تھا۔ التنگین کے تیر اندازوں نے اس سوار دستے پر تیر برسانے شروع کر دیئے مگر کچھ اور ہندوستانی پیادہ سپاہی کسی اور طرف سے گزر رہے تھے۔ انہیں مسلمان تیر انداز نظر آگئے۔ یہ ہندوستانی سوار اور پیادے دراصل نگر کوٹ سے بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں التنگین کے جال میں آگئے۔ سوار اور پیادے اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑنے لگے۔ وہ اس علاقے سے واقف تھے۔ انہوں نے مسلمان تیر اندازوں کو گھیر لیا اور تیر اندازوں کے لیے مشکل پیدا ہوگئی۔

التنگین کے پاس نفری بہت کم تھی۔ یہ نفری لڑی تو بے جگری سے لیکن کچھ ماری گئی کچھ بکھر گئی۔ ہندوستانی سوار اور پیادے جو بچ گئے تھے، وہ نکل گئے

اور التگین اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنے جیش کو ڈھونڈنے لگا۔ اس تلاش میں جنگل اور چٹانوں میں بھٹک گیا۔

وہ بھٹکتا رہا۔ دن گزرا۔ رات گزری۔ اگلا دن اور رات بھی گزر گئی اور وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں بُغرا خان پڑا تھا۔ بُغرا خان کو اُس نے پانی پلایا تو وہ پوری طرح ہوش میں آگیا۔ التگین نے اُس کے منہ میں کھانے کے لیے کچھ ڈالا۔

سورج غروب ہوگیا۔ بُغرا خان کے جسم میں کھانے اور پانی سے جان آگئی تھی مگر وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

صبح طلوع ہوئی تو التگین کہیں سے مدد لانے کے لیے یا نگر کوٹ کا راستہ اور سمت معلوم کرنے کے لیے کسی مقامی آدمی یا کسی گاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اُسے بُغرا خان نے بتا دیا تھا کہ قلعہ سر ہو چکا ہے۔ التگین کو اس خبر نے حوصلہ دیا۔ اُس کے دل سے یہ ڈر نکل گیا کہ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھ چڑھ جائے گا۔ چنانچہ وہ نڈر ہو کر چلا جا رہا تھا۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد اُسے چھوٹا سا ایک گاؤں نظر آگیا۔ وہ اُدھر کو چل پڑا۔

جب گاؤں کے قریب پہنچا تو عورتیں اور بچے اُسے دیکھ کر گھروں کو بھاگ گئے۔ اب یہ گاؤں مسلمانوں کا محکوم تھا۔ گاؤں والوں کو پتہ چل چکا تھا کہ نگر کوٹ کے قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور مسلمان بُت توڑ چکے ہیں۔ التگین کو دیکھ کر کچھ آدمی باہر آگئے۔ وہ غریب سے دیہاتی تھے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ مسلمان فوجی ہے، وہ غلاموں کی طرح دوڑے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ التگین نے چار آدمی ساتھ لیے اور بُغرا خان تک پہنچا۔ اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں اِن آدمیوں سے پوچھا کہ نگر کوٹ کا قلعہ کتنی دُور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بہت دُور ہے اور پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے فاصلہ زیادہ لمبا اور تکلیف دہ ہے۔

گاؤں کے اِن آدمیوں میں سے ایک نے اُنہیں خوش کرنے کے لیے کہا کہ بُغرا خان کو گاؤں میں لے چلیں اور ذرا بہتر ہو جائے تو اسے قلعے میں پہنچا دیں گے۔ بُغرا خان نے التگین کو اپنی زبان میں بتایا کہ ان لوگوں نے کیا مشورہ دیا ہے۔

ان لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گاؤں میں زخموں اور چوٹوں کا علاج اور دودھ اور شہد بھی ہے۔ التگین ایسا خطرہ مُول لینے کے حق میں نہیں تھا لیکن بُغرا خان ناقابلِ برداشت تکلیف میں تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ گاؤں کے لوگ اُن کے محکوم تو ہو گئے ہیں لیکن وہ آخر دشمن ہیں اور ہلاک کر سکتے ہیں، اس نے التگین سے کہا کہ وہ پہلے گاؤں میں چلے۔ قلعے تک پہنچتے شاید وہ زندہ نہ رہے۔

التگین اپنے دشمن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ذہین آدمی تھا لیکن بُغرا خان کے ساتھ اُس کی دوستی ایسی گہری اور جذباتی تھی کہ وہ خطروں کو بھُول کر جذبات میں آ گیا۔ اُس نے گاؤں والوں سے کہا کہ بُغرا خان کو اُٹھا کر گاؤں میں لے چلیں۔

التگین جب ان آدمیوں کو گاؤں سے لے گیا تھا تو تین آدمیوں نے ایک درخت تلے کھڑے ہو کر کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔ اِن میں سے ایک پنڈت تھا اور دوسرے دو فوجی تھے لیکن سپاہی نہیں تھے۔ بڑے عہدے کے افسر معلوم ہوتے تھے۔ یہ تینوں نگر کوٹ سے بھاگے تھے۔ پنڈت اسی مندر میں ہُوا کرتا تھا۔ فوجی عہدیداروں کو وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی فوج کچھ ماری گئی اور کچھ کٹ گئی تھی اور ران کے راجہ نے بہت سے سپاہی سلطان محمود کو غلاموں کے طور دے دیئے تھے۔ یہ دونوں عہدیدار اکٹھے اس گاؤں میں آئے تھے۔ پنڈت پہلے ہی آ چکا تھا۔ ان تینوں کو گاؤں والوں نے چھُپا لیا تھا۔ تینوں بھڑکے ہوئے تھے اور شکست نے انہیں جذباتی بنا دیا تھا۔ انہیں اس گاؤں سے بھی بھاگ جانا چاہیئے تھا۔

"اگر مَیں تمہاری طرح سپاہی ہوتا تو یوں میدان سے بھاگ کر یہاں نہ آ چھُپتا"۔۔۔ پنڈت نے اپنے فوجی عہدیداروں سے کہا۔۔۔ "تمہاری رگوں میں راجپوت باپ کا خون معلوم نہیں ہوتا..... اگر تم دیکھ لیتے کہ ان ملیچھوں کے گھوڑے مندر میں کس طرح داخل ہوئے تھے، اگر تم دیکھ لیتے کہ کشن مراری کو انہوں نے کس طرح گھسیٹا اور پہاڑی کے اوپر

سے نیچے پھینکا تھا، انہوں نے مورتیاں اور بھگوت گیتا باہر پھینکی اور میں نے مسلمانوں کو ان کے اُوپر چلتے پھرتے دیکھا۔ تم نے اذان نہیں سُنی جو ایک مسلمان سپاہی نے مندر کے اوپر کھڑے ہو کر دی تھی .... تم نے سُنی ہو گی۔ تم نے اپنے مذہب کو، اپنی مذہبی کتابوں کو مسلمانوں کے پاؤں تلے دیکھا ہو گا۔ تم راجپوت ہوتے تو وہیں مر جاتے، یہاں نہ آتے۔ تمہیں اپنی جانیں زیادہ پیاری ہیں"۔

"نہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے ہاتھ پنڈت کے گھٹنے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔۔۔ "ہم بزدل نہیں"۔

"ہاتھ پیچھے رکھو"۔ پنڈت نے نفرت سے کہا۔۔۔ "تم بھی ملیچھ ہو۔ جو سپاہی اپنے دھرم پر مرنا نہیں جانتا اُسے بستی میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہارا حق صرف یہ ہے کہ جنگلوں میں دھکیل دیئے جاؤ اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو۔ تم نہیں جانتے کہ میں ان تین کنواری کنیاؤں کو وہاں سے کس طرح نکال کر لایا ہوں۔ اُن کے چہروں اور ہاتھوں پر سیاہی ملی۔ انہیں مردوں کے کپڑے پہنائے اور نکال لایا .... اور وہ جو مندر میں رہ گئی ہیں، اُن کے انجام سے تم واقف ہو گے"۔

"ہم انتقام لیں گے مہاراج!"۔۔۔ دوسرے عہدیدار نے کہا۔

"اگر تم میں اتنی عزت ہوتی تو تمہاری لاشیں مندر سے اٹھائی جاتیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "اور تمہاری آتمائیں آکاش پر ہوتیں مگر تم اپنے ملیچھ شریر چھپاتے پھر رہے ہو .... اب غزنی کا یہ سلطان دیش کے دوسرے مندروں کا بھی یہی حال کرے گا۔ آج نگرکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجی، کل تھانیسر کی باری ہے۔ تم جانتے ہو تھانیسر ہمارے لیے اتنا ہی مقدس ہے جتنا مسلمانوں کے لیے مکہ اور مدینہ۔ کاش، آج میرے اس بوڑھے جسم میں جوانی آجاتے اور میں غزنی کے سلطان کو قتل کر دوں"۔

"اسی کام کے لیے ہم یہاں رُکے ہوتے ہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے کہا۔۔۔ "ہم چھپے ہوئے نہیں، رُکے ہوئے ہیں۔ ہم سپاہی نہیں عہدیدار ہیں جو ہم سمجھتے ہیں وہ سپاہی نہیں سمجھ سکتے اور جو عزت ہم میں ہے وہ کسی بھی راجے، کسی بھی مہاراجے اور کسی بھی رانی میں نہیں"۔

"جانتے ہو کیوں؟" ــــ پنڈت نے کہا ــ "انہیں راج پیارا ہے۔ انہیں مندر سے نہیں محل سے پیار ہے۔ جس کے دل میں راج محل کا پیار ہو جاتا ہے، اُس کے دل سے مندر کی محبّت نکل جاتی ہے.... سلطان محمود ایک آدمی ہے۔ ایک انسان ہے۔ اوتار نہیں، لیکن اس ایک انسان نے ہندوراشٹر کو اپنے پاؤں تلے دبا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ایک انسان کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ساری فوج ہمارے قدموں میں بیٹھ جائے گی۔"

"مگر اس ایک آدمی کو ختم کرنا آسان نہیں" ــ ایک عہدیدار نے کہا ــــ "آپ کو معلوم نہیں۔ میں درویشوں کے بھیس میں اُوپر گیا تھا۔ قلعے کے اندر بھی گیا تھا۔ مجھے کئی جگہ روکا گیا۔ مجھے اچھی طرح دیکھا گیا۔ میں نے ہر جگہ کہا کہ میں تارک الدّنیا درویش ہوں۔ صوفی ہوں اور سُلطان کو مبارک دینے آیا ہوں مگر مجھے بہت ہی منّت سماجت کے بعد سلطان کے محافظوں کے کماندار تک جانے دیا گیا۔ کماندار نے میری تلاشی لی اور میرے چغے کے اندر کمر کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال کر کہا کہ درویش کو ہتھیار سے کیا کام؟ میں نے کہا کہ جس مذہب کا سلطان اتنی دور سے بُت توڑنے کے لیے آیا ہے، اُس مذہب کے کسی پیروکار کو خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہیئے۔ میں مسلمان ہوں اور ہتھیار مسلمان کا زیور ہے.... اُس نے مجھ سے خنجر لے لیا اور مجھے دربان کے حوالے کر دیا۔ میں نے بڑی غور سے دیکھا کہ غزنی کے سلطان تک پہنچنا ہی آسان نہیں، اسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ ہر کسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آگیا۔"

"ہم ابھی یہیں رہیں گے" ــــ دوسرے عہدیدار نے کہا ــ "ہم انتظار کر رہے ہیں کہ سُلطان باہر نکلنا شروع کرے گا تو کیا اسے تیر سے یا قریب جا کر خنجر سے قتل کیا جا سکتا ہے؟ ہم اپنی جانیں نہیں بچائیں گے مہاراج! اگر ہم دو آدمی اپنی جانیں قربان کر دیں تو ...."

"تو تم اگلے جنم میں اس دیش کے مہاراجے ہو گے" ــ پنڈت نے کہا ــــ "برہمن اور راجپوت بھی تمہارے قدموں میں ماتھے رگڑیں گے" ــ پنڈت نے

رازداری سے کہا ۔۔"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس ایک آدمی کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے ۔ میرے ساتھ یہ جو تین لڑکیاں ہیں، ان کا حسن دیکھو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ تحفے کے طور پر سلطان کو کس طرح پیش کی جاسکتی ہیں ۔ یہ اُسے زہر دے سکتی ہیں ۔"

"ناممکن ہے"۔۔ ایک عہدیدار نے کہا۔"ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطان پتھر دل ہے ۔ عورت اور شراب کی بُو سے بھی نفرت کرتا ہے ۔ اسی لیے اس کی فوج جس علاقے کو فتح کرتی ہے، وہاں کسی عورت کی بے عزتی نہیں ہوتی ۔ عورت کے جال میں سلطان محمودؔ کو لانا ممکن نہیں ۔ کوئی اور طریقہ سوچیں "۔

"ہمارے مہاراجوں کو عورت اور شراب نے مارا ہے"۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔ "مسلمانوں کی فتح کا سبب یہی ہے کہ ان دونوں سے دل نہیں لگاتے .... پھر بھی کچھ سوچنا پڑے گا، کچھ کرنا پڑے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا ۔ میں نے جس کشن بھگوان کی دن رات پوجا پاٹ کی ہے، اس کی توہین میری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے ۔ اس دیش پر قہر نہ پڑا تو مجھ پر پڑے گا، تم پر پڑے گا "

نگر کوٹ کو فتح ہوئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے ۔ یہ تینوں مندر کی پہاڑی سے دور نیچے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے ۔ دونوں عہدیدار بھیس بدل کر دو دو بار اوپر گئے تھے مگر سلطان محمود کے قتل کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی ۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے ۔ پنڈت کی باتیں انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں ۔ وہ اب اس امید پر بیٹھے تھے کہ سلطان محمود اس علاقے کی سیر کے لیے باہر نکلے گا ۔ انہوں نے دو کمانیں اپنے پاس رکھ لی تھیں ۔ یہ گھنا جنگل تھا اور درختوں میں ڈھکی ہوئی اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں ۔ کہیں سے بھی چھپ کر تیر چلایا اور غائب ہوا جاسکتا تھا ۔

اتنے میں التگین گاؤں میں چلا گیا اور وہاں سے چار آدمی لے آیا ۔ دونوں عہدیداروں نے اسے دیکھا تھا ۔ اُن کا خیال تھا کہ غزنی کا یہ فوجی ان آدمیوں کو کسی بیگار کے لیے لے گیا ہے ۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کے آدمی واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ التگین تھا اور گاؤں کے ایک آدمی نے کسی کو پیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ عہدیداروں نے التگین کو پہچان لیا اور وہ چھپ گئے۔ التگین جب ان آدمیوں کے ساتھ گاؤں میں پہنچا تو گاؤں کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بغرا خان کو چارپائی پر ڈال دیا گیا اور دو بوڑھے اس کے زخم اور چوٹیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے فوراً اس کا علاج شروع کر دیا۔

التگین کے کہنے پر بغرا خان نے ان بوڑھوں سے کہا۔ "اگر گاؤں میں ہمارے ساتھ کسی نے کوئی گڑبڑ کی تو سارے گاؤں کو آگ لگا دی جائے گی اور بوڑھے سے بچے تک کو زندہ جلا دیا جائے گا"۔

"آپ ہمارے بادشاہ ہیں"۔۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ "سارا گاؤں آپ کی حاضری میں کھڑا رہے گا۔ گڑبڑ کی جرأت کون کر سکتا ہے .... ہم نے اس سے زیادہ گہرے زخموں اور زیادہ خطرناک چوٹوں کا علاج چند دنوں میں کیا ہے۔ آپ پانچ چھ دنوں تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے"۔

التگین اور بغرا خان کے لیے ایک جھونپڑا خالی کر کے اسے صاف کیا گیا۔ ان لوگوں کے پاس جو صاف ستھرے بستر تھے، وہ انہوں نے بچھا دیئے۔ رات غزنی کے دونوں کمانڈار اس جھونپڑے میں سوئے ہوئے تھے۔ التگین نے بغرا خان سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کی راہنمائی میں قلعے میں جا کر اپنی اور اس کی اطلاع کرا آتا ہے لیکن بغرا خان نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ اکیلا رہ گیا تو یہ لوگ اسے غائب کر سکتے ہیں یا زخموں میں زہریلی دوائی ڈال کر خراب بھی کر سکتے ہیں۔

وہ دونوں تو سو گئے تھے۔ تھکن سے ان کے جسم ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑی ہی دور ایک اور جھونپڑے میں پنڈت، دونوں ہندو عہدیدار اور دونوں بوڑھے جنہوں نے بغرا خان کی مرہم پٹی کی تھی، اکٹھے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پنڈت کہہ رہا تھا ۔۔۔ "انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ایک بزدل انسان کو درندہ اور درندے کو بزدل بنایا جا سکتا ہے"۔

"سلطان کو اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں سے قتل کرایا جائے تو زیادہ

بہتر ہے" ۔۔۔ ایک عہدیدار نے کہا "ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اُس تک نہیں پہنچ سکتا"

"تم دونوں سن لو" ۔ پنڈت نے دونوں بوڑھوں سے کہا ۔ "اس مسلمان کے زخم اور چوٹیں اتنی جلدی ٹھیک نہ ہونے دینا ۔ مجھے ابھی گھوڑا دو ۔ میں تھانیسر جارہا ہوں ۔ گھوڑا ایسا دو جو مجھے بہت تیز لے جائے اور بہت تیز لائے" ۔۔۔ دونوں بوڑھے چلے گئے تو اُس نے عہدیداروں سے کہا ۔۔ "میں تینوں لڑکیوں کو تمہارے سپرد کر چلا ہوں ۔ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا"

انہوں نے تینوں لڑکیوں کو وہیں بلالیا اور پنڈت انہیں بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے ۔ اتنے میں گھوڑا تیار ہو گیا ۔ پنڈت گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا ۔

صبح سویرے التگین کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بُغرا خان درد سے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا ۔ التگین بوڑھے کو بلانے کے لیے باہر نکلا تو دو جوان لڑکیاں دروازے پر کھڑی تھیں ۔ التگین کو دیکھ کر مسکرائیں ۔ التگین اُن کے حُسن اور ان کی مسکراہٹوں سے جیسے مسحور ہو گیا ہو ۔ ایک لڑکی نے اسے کچھ کہا تو وہ خاموش کھڑا رہا ۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکا ۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا ۔ لڑکیاں اندر چلی گئیں جہاں بُغرا خان پڑا کراہ رہا تھا ۔

"بہت تکلیف ہے؟" ۔۔۔ ایک لڑکی نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ۔

دوسری نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ بغرا خان کی تو جیسے زبان بند ہو گئی ہو ۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا ۔

"یہ دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے" ۔۔۔ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا ۔

"میں سمجھتا ہوں" ۔۔۔ بغرا خان نے کہا ۔ "میں تمہیں دیکھ کر اس لیے چپ ہو گیا تھا کہ اس جنگل میں تم جیسی لڑکیاں کہاں سے آگئی ہیں! ..... تم اس گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتیں"

"ہم اسی جنگل میں پیدا ہوئی ہیں" ۔۔۔ ایک لڑکی نے کہا ۔ "یہاں کوئی روگی، کوئی دکھی انسان آجائے تو ہم اُس کا درد چوس لیا کرتی ہیں ..... میں نے پوچھا تھا کہ بہت تکلیف میں ہو؟"

"درد زیادہ ہے"۔۔۔ بغراخان نے جواب دیا اور اُس نے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔ "میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں"۔

دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں۔

وہ واپس آئیں تو تین تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں منہ ہاتھ دھلانے کے لیے پانی تھا اور باقی دو نے کھانے پینے کا سامان اُٹھا رکھا تھا۔ اس میں دودھ تھا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ لڑکی نے دونوں کے مُنہ ہاتھ دُھلائے۔ انہوں نے دودھ پی لیا اور میوے وغیرہ کھائے۔ لڑکیاں خالی برتن لے گئیں تو ذرا دیر بعد بغراخان نے قہقہہ لگایا۔ التگین نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں کو یوں بیساختگی سے ہنسے بہت مدت گزر گئی تھی۔ وہ پہلے حضرو کے قریب بڑا ہی خونریز معرکہ لڑے تھے جس میں انہیں کامیابی کی توقع نہیں تھی لیکن راجہ انند پال کے ہاتھی کی آنکھ میں تیر لگا تو اس نے قیامت بپا کر دی۔ مہاراجہ کا جھنڈا اسی ہاتھی پر تھا۔ ہاتھی پیچھے کو بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ جھنڈا پیچھے کو آتا دیکھ کر ہندوستانی دستے گھبرا گئے اور اصل صورتِ حال معلوم کیے بغیر پسپا ہونے لگے۔

التگین اور بغراخان کے دستوں کو حکم ملا تھا کہ دشمن کا تعاقب کرو۔ چنانچہ وہ تعاقب میں گئے۔ ان کے کئی عزیز دوست حضرو کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ وہ ہنسی اور مسکراہٹوں سے محروم رہے، پھر انہیں نگر کوٹ تک پیش قدمی کرنی پڑی اور یہاں بھی لڑنا پڑا۔ جب موت ہنسا کرتی ہے تو انسان رویا کرتے ہیں۔ یہ دونوں کماندار رونے والے نہیں تھے۔ وہ غزنی سے ندیوں، دریاؤں اور چٹانوں اور دشمن کی صفوں کو چیرتے آئے تھے۔ اب جب اس جھونپڑے میں بغراخان نے قہقہہ لگایا اور التگین کی ہنسی نکل گئی تو دونوں نے محسوس کیا کہ جنگ کے جہنم نے ان کے جذبات اور ہنسی کو چوس لیا ہے اور وہ ہنسنا کھیلنا چاہتے ہیں۔

بُغراخان نے کہا کہ اسے درد میں خاصا افاقہ ہُوا ہے۔ التگین جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بغراخان کو معلوم تھا کہ وہ کس کی راہ دیکھ رہا ہے مگر لڑکیوں کی بجائے دونوں بوڑھے اندر آئے۔ وہ تھے تو دیہاتی اور وہ جاہل سے لگتے تھے لیکن اُن کے انداز میں ایسی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اپنے فن کے ماہر ہوں۔ دونوں نے بغراخان کی پٹیاں کھولیں۔ زخم دیکھے۔ چوٹیں دیکھیں اور دونوں نے متفقہ رائے دی کہ آٹھ دن اور لگیں گے۔

ایک اور جھونپڑے میں دونوں ہندو عہدیدار بیٹھے تھے۔ انہوں نے تینوں لڑکیوں کو اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔

"احتیاط سے" ـــ ایک عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا "دو دن تک اس سے زیادہ مقدار نہ ملانا، ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔ دودھ خود چکھ لیا کرو۔ ذائقے میں ذراسی بھی تبدیلی دیکھو تو اور دودھ ڈال دو اور اس میں شہد زیادہ ڈالو۔"

"نشہ تو تمہارا اپنا ہے" ـــ دوسرے عہدیدار نے ہنس کر لڑکیوں سے کہا ـــ "تم انہیں دودھ میں یہ چیز ملائے بغیر بھی ان پر نشہ طاری کر سکتی ہو۔"

"یہ خیال بھی رکھنا کہ تم پر ہی نشہ طاری نہ ہو جائے" ـــ عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا ـــ "دونوں خوبصورت جوان ہیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" ـــ ایک لڑکی نے کہا ـــ "یہ تو آپ نے ہمیں فرض ہی ایسا سونپ دیا ہے کہ ہم ان کے پاس چلی گئی تھیں ورنہ ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان مسلمانوں کے قریب نہ جائے۔"

"شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ آزمائش میں ڈالا جائے" ـــ دوسرے عہدیدار نے کہا ـــ "اپنے دیس اور اپنے دھرم کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ انہیں پنڈت مہاراج کے آنے تک یہیں جال میں الجھائے رکھو۔ پنڈت جی ایک آدمی کو ساتھ لائیں گے جو ان دونوں کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ کر لے گا، پھر ہم ان کے ہاتھوں سلطان محمود کو قتل کرائیں گے۔"

سلطان محمود غزنوی کے دو کمانڈر ہندوؤں کے بڑے ہی حسین جال میں آگئے۔

دوسرے تیسرے دن وہ اپنی فاتحانہ حیثیت، اپنے عہدوں اور اپنے فرائض کو بھول چکے تھے۔ انہیں پتہ نہ چل سکا کہ انہیں دودھ میں شہد اور شراب پلائی جا رہی ہے۔ انہوں نے چونکہ کبھی شراب نہیں پی تھی اس لیے دودھ میں ملی ہوئی تھوڑی سی شراب بھی انہیں اتنا سا مخمور کر دیتی تھی کہ وہ ہنسنے کھیلنے لگتے تھے۔ اتنی حسین لڑکیوں نے ان پر اپنا نشہ بھی طاری کر رکھا تھا۔

دو تین دن اور گزرے تو ایک لڑکی نے لبغراخان کو اور دوسری نے التگین کو کہنا شروع کر دیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ دونوں کمانداروں نے یہ بھی پوچھنے یا دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اتنی خوبصورت لڑکیاں کون سے باپوں کی بیٹیاں ہیں۔ اُس علاقے کے لوگوں کے رنگ تو بڑے صاف اور بعض کے گورے تھے لیکن یہ لڑکیاں اس علاقے کی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

دونوں بوڑھے لبغراخان کا علاج کر رہے تھے اور لبغراخان چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن وہ اس گاؤں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ التگین کا دل بھی اس جھونپڑے کی جنّت کا قیدی ہو گیا تھا۔ دونوں دوست لڑکیوں سے کہنے لگے کہ وہ کبھی رات ان کے جھونپڑے میں گزاریں۔ لڑکیوں نے انہیں بتایا کہ ان کے ماں باپ انہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ کہتی تھیں کہ والدین نے انہیں ان کی صرف تیمارداری کی اجازت دے رکھی ہے۔ یوں لڑکیاں ان کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ میدانِ جنگ کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے سراب بنی ہوئی تھیں۔ وہ جس والہانہ انداز سے اظہارِ محبت کرتی تھیں، وہ ان کمانداروں کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔ عریاں کندھوں پر بکھرے لہراتے ریشمی بالوں کو جب وہ چھوتے تھے تو ان کے جسموں پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔

تھوڑی ہی دور اوپر سلطان محمود نے ہندوؤں کا ایک بہت بڑا بت خانہ اُجاڑ ڈالا تھا اور وہاں اب اذانیں گونجتی تھیں، مگر اُس کے دو کماندار ہندوؤں کے جیتے جاگتے بتوں کی پوجا کر رہے تھے۔

"تم نے مجھے بدبودار لاشوں اور خون کی بدبو سے اٹھا کر ایسی دنیا میں پہنچا دیا ہے جہاں مجھے یہ جھونپڑا بھی محل لگتا ہے" ۔۔۔ ایک روز بغرا خان نے اپنی لڑکی سے کہا۔

"کہو تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ حسین دنیا میں پہنچا سکتی ہوں" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "لیکن میں جو کچھ بھی کروں، تم کوئی اعتراض نہ کرنا" ۔۔۔ اور وہ چلی گئی۔

واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ اس نے پیالہ بغرا کو دے کر کہا ۔۔۔ "پیو۔ یہ اس جنگل کے ایک درخت کے پھل کا رس ہے۔ یہ صرف اس خطے میں ہوتا ہے۔"

بغرا خان نے پیالہ منہ سے لگایا۔ تین چار گھونٹ پیئے ہوں گے کہ لڑکی نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بولی ۔۔۔ "ایک ہی بار نہ پیو۔"

بغرا خان نے اس ذائقے کی کوئی چیز پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے سرور آنے لگا۔ اُس نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور مستانہ سی آواز میں بولا ۔۔۔ "میں اب چل پھر سکتا ہوں لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر سلطان مجھے تم سے جُدا کرے گا تو اُس کا بھی حکم نہیں مانوں گا۔"

"تم نے کبھی شراب پی ہے؟" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "سُنا ہے مسلمان شراب نہیں پیا کرتے۔"

"میں شراب پر لعنت بھیجتا ہوں" ۔۔۔ بغرا خان نے کہا ۔۔۔ "تم ہو تو مجھے شراب کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں تمہیں شراب پلا چکی ہوں" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "سچ بتاؤ، کیا تم اس چیز کو حرام سمجھتے ہو؟"

وہ سنجیدہ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ لڑکی کا چہرہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے لڑکی کا چہرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر بغرا خان بھول گیا کہ حرام کیا اور حلال کیا ہے۔

"التگین!" ۔۔۔ اُس نے اپنے دوست کو آواز دی۔ التگین اسی جھونپڑے کے دوسرے کمرے میں تھا۔ دوڑا آیا۔ بغرا خان نے اُسے کہا ۔۔۔ "دیکھو یہ لڑکی کتنی اچھی چیز کو شراب کہتی ہے۔ لو، تم بھی پیو" ۔۔۔ اُس نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ التگین نے

پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگالیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی اُنہی آسمانوں میں اڑنے لگا جن میں بُغراخان اُڑ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے آپ پر شراب حلال کرلی لیکن اسے وہ شراب نہیں کہتے تھے۔

ایک روز دونوں لڑکیاں جھونپڑے میں آئیں تو اُنہوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے پاس بٹھالیا۔ ایک لڑکی نے بغراخان سے بات شروع کی۔

"تم نے ہم سے کبھی بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کس کی بیٹیاں ہیں اور ہم کون ہیں"—— لڑکی نے کہا۔ "ہم اس گاؤں کی رہنے والی نہیں۔ ہم دونوں کے باپ تاجر ہیں تمہاری فوج جب نگر کوٹ کی طرف آرہی تھی تو ہم اپنے باپوں کے ساتھ نگر کوٹ کے مندر میں پُوجا پاٹ کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تمہاری فوج کی خبر سن کر ہمارے باپ ہمیں واپس اپنے گھروں کو لے جانے کی بجائے اس گاؤں میں لے آئے۔ تیسری لڑکی میری قریبی رشتہ دار ہے۔ ہمارے باپوں نے اس گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ مسلمانوں کی فوج آ رہی ہے اور اتنی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرنا ان کے لیے بہت خطرناک ہے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ہم تینوں لڑکیوں کو یہاں چھپالیں۔ جب خطرہ ٹل جائے گا تو وہ ہمیں لے جائیں گے۔ وہ اب آگئے ہیں اور ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔ اپنے دوست کو اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ تم دونوں ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارے باپ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو جائیں گے۔"

بغراخان نے التگین سے بات کی تو اُس نے کہا کہ ہم فوج کے آدمی ہیں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو ہمیں غدّار اور بھگوڑا کہا جائے گا اور ہمارے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اگر یہ لڑکیاں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو ہم انہیں ساتھ رکھنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے۔ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے۔

لڑکیاں مایوس ہو کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ اُنہوں نے لڑکیوں کو اس گاؤں میں لانے کی وہی وجہ بتائی جو لڑکیاں بتا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنا مسئلہ یوں پیش کیا کہ وہ لڑکیوں کو لے جانے آئے ہیں لیکن راستے میں مسلمان فوجیوں کا خطرہ ہے۔ لڑکیاں اتنی خوبصورت

ہیں کہ جس کی نظر پڑ گئی وہ اُٹھا لے جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بغراخان اور التگین ان کے ساتھ چلیں اور منزل پر پہنچا کر واپس آجائیں۔ ان کا انہیں اتنا انعام ملے گا جو وہ اپنے تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے۔

"ہم تمہیں منزل پر پہنچا دیں گے" ــــ بغراخان نے کہا۔ "لیکن ہمارا انعام یہ لڑکیاں ہوں گی۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو تم چلے جاؤ۔"

"انہی کی خاطر تو میں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا" ــــ ایک لڑکی کے باپ نے کہا ــــ "میں اپنی لڑکی کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"اور تم لڑکیوں کو یہاں سے نہیں لے جا سکتے" ــــ بُغراخان نے کہا۔

اُسی رات کا ذکر ہے۔ دونوں لڑکیاں بُغراخان اور التگین کے پاس تھیں اور اُنہیں شراب پلا رہی تھیں۔ دونوں کے ذہن اپنے قابو سے نکل گئے تھے۔ جھونپڑے کا دروازہ کھُلا اور ایک درویش صُورت آدمی اندر آیا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی تھی اور سر کے بال لمبے تھے۔ اُس نے چغہ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں لمبا عصا تھا جس کے سر پر لکڑی کا سانپ بنا ہُوا تھا۔ لڑکیوں نے اسے دیکھا تو وہ تیزی سے اٹھیں اور درویش کے پاؤں چھُوئے۔ انہوں نے بغراخان اور التگین کو بتایا کہ یہ ایک جوگی ہے جو کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کہاں رہتا ہے اور اس کا مذہب کیا ہے۔ آنے والے وقت کی باتیں بتاتا ہے۔ جنگل کے سانپ اس کے مرید ہیں۔ راجے اور مہاراجے بھی اس کے آگے سجدے کرتے ہیں، لیکن یہ خود جنگلوں میں کہیں رہتا ہے۔

"تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے" ــــ جوگی نے بغراخان سے کہا۔ "اتنی دور اُوپر سے تم گرے اور بچ گئے۔ موت ابھی ٹلی نہیں۔ میرے قریب آؤ۔"

جوگی نے بغراخان کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور چراغ دان قریب کر لیا۔ اُس نے ایک ہیرا سا نکالا اور اس طرح اپنے اور بغراخان کے درمیان کیا کہ دیئے کی روشنی

اس پر پڑتی اور اس سے رنگ برنگی کرنیں لغراخان کی آنکھوں میں پڑتی تھیں ۔ یہ رنگ دلکش اور پُرفریب تھے ۔ جوگی نے لغراخان سے کہا کہ آنکھیں کھُلی رکھو اور اس ہیرے کو دیکھتے رہو ۔

"اس میں تمہیں ایک رنگ موت کا اور ایک زندگی کا نظر آئے گا"۔ جوگی نے کہا ۔ "ہم دیکھیں گے کہ تمہارا رنگ کون سا ہے"۔

رنگ ایسے دلفریب تھے اور جوگی کی باتوں کا بھی اثر تھا کہ لغراخان مدہوش سا ہونے لگا ۔ اُس نے شراب بھی پی رکھی تھی ۔ اُس کا شعور پہلے ہی مدہوش تھا ۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جوگی نے اپنی نظریں اُس کی آنکھوں میں جما رکھی ہیں ۔ جوگی مخمور سی آواز میں کہہ رہا تھا ۔ "مجھے ایک بڑی حسین زندگی نظر آرہی ہے ۔ میں ہوں اور وہ لڑکی ہے جسے میں چاہتا ہُوں ۔ میں اس زندگی کا بادشاہ ہوں"۔

جوگی نے ہیرنما شیشہ اوپر کیا ۔ لغراخان کی نظریں اُس پر جمی رہیں ۔ جوگی ہیرے کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے گیا ۔ پھر لغراخان کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ ہیرا درمیان سے ہٹ گیا ہے اور اُس کی نظریں جوگی کی آنکھوں میں جکڑی گئی ہیں اور جوگی کے الفاظ جن میں موسیقی سی تھی ، آنکھوں کی راہ اُس کے ذہن میں اُترتے جارہے ہیں ۔ وہ ہپناٹائز ہو چکا تھا ۔ وہ ایسے لہجے میں بولنے لگا جیسے خواب میں بول رہا ہو ۔

"ہاں .... یہی جنّت ہے ۔ مجھ سے یہ جنّت کوئی نہیں چھین سکتا ... میں غزنی کا بادشاہ ہوں .... میں قتل کر دوں گا .... میری تلوار پیاسی ہے"۔

التنگین دیکھ رہا تھا مگر اسے ایک لفظ بھی پلّے نہیں پڑ رہا تھا ۔ جوگی نے اُسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اُس پر بھی وہی عمل کیا اور وہ بھی ذرا سے وقت بعد لغراخان کی طرح بولنے لگا ۔

انسان جب اپنے کردار کو گناہوں کے دلفریب رنگوں میں رنگ لیتا ہے تو اسے ہپناٹائز ہوتے دیر نہیں لگتی ۔ گناہوں کی محبت اور شراب کی یہی کرشمہ سازی ہے کہ انسان کی روحانی قوت ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کی شخصیّت مر جاتی ہے اور وہ حسین باتوں کے فریب میں جلدی آجاتا ہے ۔ یہ عمل آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے ، صدیوں پہلے بھی ایسے ہی

ہوتا تھا۔ انسان اور شیطان کی چپقلش، نیکی اور بدی کی یہ کشمکش انسانی زندگی میں روزِ اوّل سے ہی شروع ہوگئی تھی شیطان نے انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خدا نے انسان سے کہا تھا کہ شیطان کی بات نہ سننا مگر شیطان نے ایسے طلسماتی حربے استعمال کیے کہ انسان نے شیطان کے آگے سجدے شروع کر دیئے۔

اسلام ایک سچا مذہب ہے جس کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی ہے مخالف قوتوں نے اسلام کو شکست دینے کے لیے بدی کی قوت استعمال کی۔ بدی میں وہ حسن اور کشش پیدا کی جو انسان کی کمزوریوں کو ابھارتی اور روحانی قوت کو کمزور کرتی ہے۔ اسلام کو آتش پرست اور بت پرست نہ سمجھے، یہود و ہنود سمجھے اور انہوں نے اسلام کی اخلاقی قدروں کا توڑ نکال لیا۔ یہودیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں صلیبیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں۔ شراب اور زر و جواہرات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا نشہ آور اشیا کا سہارا لیا اور اخلاقیات کے علمبردار اس جال میں آکر ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔

بلغراخان اور التگین کے ذہنوں پر دو بڑی ہی حسین لڑکیوں اور شراب کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا۔ روح پر نشہ طاری ہو چکا تھا جسم پر قبضہ مشکل نہ تھا۔ یہ جوگی اُن شعبدہ بازوں میں سے تھا جو تاریخ کے ہر دور میں ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ رسّے کو بین بجا کر لاٹھی کی طرح کھڑا کر دینا ان کا کمال تھا۔ انسانوں کے ہجوم کو ہپناٹائز کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے۔ ماں کے ہاتھوں اُس کے دودھ پیتے بچے کو مروا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

پنڈت اسی کو بلا لانے کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ وہ دو تھے۔ پہلے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا تھا کہ یہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ لڑکیوں نے دونوں کمانڈروں کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہیں شعبدہ بازی سے اپنا غلام بنا لیا جائے۔

شراب اور لذّت پرستی نے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی۔ جوگی نے ان کے ذہنوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

صبح طلوع ہوئی تو یہ قافلہ نگرکوٹ سے بہت دُور نکل گیا تھا بغراخان اور التگین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ساتھ دو اونٹ تھے۔ ان کی پالکیوں میں لڑکیاں تھیں اور ایک میں پنڈت۔ وہ دونوں آدمی بھی ساتھ تھے جنہیں پنڈت ساتھ لے گیا تھا اور دونوں ہندو عہدیدار بھی ساتھ تھے۔ بغراخان اور التگین شہزادوں کی طرح گردنیں تانے ہوتے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور جن کے وہ قیدی تھے انہیں وہ اپنا غلام سمجھے ہوئے تھے۔

قافلہ چلتا رہا، رکتا رہا، بغراخان اور التگین کو کھانے اور دودھ میں کوئی نشہ آور دوائی دی جاتی رہی اور وہ اپنے آپ سے، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے بےخبر چلتے چلے گئے۔

اور یہ قافلہ تھانیسر پہنچ گیا۔ تھانیسر اُس دور میں بہت بڑا مندر تھا۔ نگرکوٹ سے بھی بڑا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے لیے اُس کی حیثیت وہی تھی جو مسلمانوں کے لیے مکہ معظمہ کی تھی۔ اس مندر کے تہہ خانے بھی تھے۔ اس میں غلام گردشیں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ وہاں کے بڑے پنڈت کو معلوم تھا کہ غزنی کی فوج کے دو کمانداروں کو نشے کے زیرِ اثر لایا جا رہا ہے اور اُن کے ہاتھوں محمود غزنوی کو قتل کرایا جائے گا کیونکہ محمود تک اُس کی اپنی فوج کا ہی کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے۔

ان دونوں کے لیے مندر کے تہہ خانے میں دو کمرے تیار کئے گئے تھے۔ انہیں کسی محل کے کمرے بنا دیا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو چھوڑی گئی تھی جو مدہوشی اور سرور طاری کر دیتی تھی۔ بستر نرم و گداز تھے اور چھتوں کے ساتھ رنگین فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ دونو کماندار جب وہاں پہنچے تو اُن کا استقبال کرنے والے اُن کے آگے جھک گئے اور انہیں اپنے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے عورتیں آ گئیں۔ وہ جوان نہیں تھیں۔

بڑے پنڈت نے انہیں لانے والوں کو الگ کر کے یہ خبر سنائی کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے اور اپنی تھوڑی سی فوج نگرکوٹ میں چھوڑ گیا ہے۔ یہ پتہ نہیں چل سکا

کہ وہ جلدی واپس آنے کے لیے گیا ہے یا کتنے عرصے بعد واپس آئے گا۔ اس صورت میں ان دونوں آدمیوں کو یہاں رکھنا بڑے پنڈت کی نگاہ میں بیکار تھا۔

"وہ آئے گا"۔ ہندو عہدیداروں نے کہا۔ "وہ ضرور آئے گا۔ یہ آدمی ہمارے ہاتھ آچکے ہیں۔ انہیں ہم تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے کام آئیں گے۔ ہم انہیں مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالاروں کے قتل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں یہیں رکھا جائے، اور سلطان محمود کے قتل کے لیے تیار کیا جائے۔

سلطان محمود غزنوی غزنی چلا گیا تھا۔ غزنی کے مغرب میں غور کا پہاڑی علاقہ تھا جس کا حکمران محمد بن سوری تھا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان محمود ہندوستان میں برسرِ پیکار ہے تو اس نے دس ہزار نفری کی فوج ساتھ لی، اور غزنی کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ اس نے خیمہ گاہ کے ارد گرد خندق کھودلی۔ اس دفاع کے علاوہ اس فوج کو قدرت نے بھی دفاع مہیا کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ محمد بن سوری نے ایسی جگہ کیمپ کیا تھا جس کے تین طرف پہاڑیاں تھیں۔ صرف ایک طرف تھوڑی سی جگہ خندق نہیں تھی اور اس طرف پہاڑی بھی نہیں تھی۔

اس طرح یہ کیمپ قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ اس سے سوریوں کی فوج یہ فائدہ اٹھاتی تھی کہ اس کے جیش باہر آکر غزنی کی فوجی چوکیوں پر شبخون مارتے اور اپنے کیمپ میں چلے جاتے تھے۔ دو مرتبہ غزنی کی فوج کے ایک دستے نے ایک جیش کا تعاقب کیا اور دشمن کے کیمپ تک جا پہنچا۔ آگے خندق تھی۔ اندر جانے کا جو کھلا راستہ تھا، وہاں سے تیراندازوں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ کچھ دیر غزنویوں نے تیروں کا جواب تیروں سے دیا لیکن خندق آگے نہیں جانے دیتی تھی۔

دو بار ایسے ہی ہوا۔ غزنوی فوج پریشان ہو گئی۔ سوریوں کے شبخون بڑھنے لگے۔ وہ غزنوی فوج کی جنگی طاقت آہستہ آہستہ کمزور کر رہے تھے۔ موزوں وقت پر انہیں غزنی پر حملہ کرنا تھا۔ غزنی والوں نے سلطان محمود کو خبردار کر دینا مناسب سمجھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ

سلطان محمود کے دوسرے مسلمان دشمن سُوریوں کی مدد کے لیے آسکتے تھے۔ سلطان محمود کو یہ اطلاع اُس وقت ملی جب وہ نگرکوٹ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس اطلاع پر وہ چکرا گیا تھا۔ اسی غصے میں اُس نے نگرکوٹ پر یلغار کا حکم دے دیا۔ یہ یلغار اتنی دلیرانہ اور اتنی ہیبت ناک تھی کہ قلعے والوں نے مقابلہ ترک کر دیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ مندر کا صفایا کر کے، بتوں کو اوپر سے نیچے پھینک کر اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ اپنے ساتھ غزنی لے جانے کے لیے الگ کیا اور دوسرا نگرکوٹ میں رہنے دیا۔

اُس کا کوچ بہت تیز ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ غزنی کو کوچ کے دوران سلطان محمود جتنا غصے میں تھا، اتنا غصے میں اسے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے دشمن کے عوام کو کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ اُس کی لڑائی فوجوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اپنے حریفوں کے لیے وہ سراپا قہر تھا مگر اب کے غزنی کو جاتے ہوئے اُس نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا کہ پڑاو بہت کم ہوں گے اس لیے سوار اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں سے گذاریں تاکہ گھوڑے چلتے چلتے فصل کھاتے چلیں۔ ہاتھیوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے بیلوں کے لیے بھی یہی حکم دیا گیا۔ پیادہ فوج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں کوئی بھی بڑا گاؤں آئے، اُس کے لوگوں سے کہیں کہ تنور جلائیں، آٹا گوندھیں اور روٹیاں پکا دیں۔

مورخ لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کی فوج جس راستے سے گذری، فصلوں کا صفایا کرتی گئی۔ راستے میں آنے والے دیہات میں اناج نہ رہا۔ دودھ اور مکھن نہ رہا۔ بعض جگہوں پر فوج نے مویشی ذبح کیے اور کھا گئے۔ صرف عُطبی ایک مورخ ہے جس نے سلطان محمود کے ان احکام کی وضاحت کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ سلطان کو سُوریوں پر بھی غصہ تھا لیکن زیادہ تر غصہ پنجاب کے راجہ انند پال پر تھا کیونکہ وہ باجگزار ہوتے ہوئے ہندوستان کی ریاستوں کی فوجیں اکھٹی کر کے انہیں متحدہ کمان میں لے لیتا اور غزنی پر حملے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے انند پال کو ڈرانے کے لیے یہ حکم دیا تھا کہ پنجاب میں سے گذرتے ہوئے اس میں کچھ بھی نہ چھوڑا جائے۔

سُوریوں کی توقع کے خلاف سلطان محمود بہت جلدی غزنی پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا ایلچی

محمد بن سُوری کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم سے بے وفائی کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوا کرتا سلطنت اسلامیہ کو ریاستوں میں تقسیم کر کے حکمران بننے والوں کے نیچے سے تخت ہی نہیں زمین بھی نکل جایا کرتی ہے۔ قوم کو دھوکے میں رکھ کر لوگوں کو قوم سے الگ کرنا اور لڑانا ایسا گناہ ہے جس کی سزا خدا دُنیا میں دیتا ہے۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہاتھ میں قرآن لے کر تخت پر بیٹھنے والوں کے لیے اُن کے اپنے محل جہنم بن جایا کرتے ہیں.... اگر اپنی دنیا اور اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ وہاں محمد بن قاسم کی سرزمین بُت خانہ بن گئی ہے۔ آؤ، وہاں چل کر مسجدوں کو آباد کرتے اور انسانوں کو صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں۔

سلطان محمود نے پیغام میں لکھا کہ میں تمہارے آگے درخواست پیش نہیں کر رہا۔ ایمان فروشی تمہیں جس انجام تک پہنچائے گی، میں تمہیں وہ انجام دکھا رہا ہوں۔ حکمرانی کا نشہ تمہیں اُس پستی میں پھینکے گا جہاں تاریخ رہتی دنیا تک تم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔

میں تمہیں دو دنوں کی مہلت دیتا ہوں۔ میرے پاس آنا چاہو تو بھائیوں کی طرح آجاؤ۔ یہ پسند نہیں تو اپنی فوج واپس لے جاؤ۔

ایلچی جب محمد بن سُوری کے پاس پہنچا تو اُس نے رعونت سے پیغام ایلچی کے ہاتھ سے جھپٹا اور بولا "صلح کا پیغام لائے ہو؟"۔۔۔ ایلچی خاموش کھڑا رہا۔

محمد بن سُوری نے پیغام پڑھا اور قہقہہ لگا کر بولا ۔۔۔ "کیا تمہارے سلطان نے مجھے بھی اننڈپال اور بجی رائے سمجھ لیا ہے؟ جاؤ، اُس بدصورت سے کہو کہ محمد بن سُوری تمہارے کہنے سے نہیں جائے گا۔ ہمت ہے تو خود آؤ۔ ہم جانے کے لیے نہیں آئے" ۔۔۔۔۔ اُس نے گرج کر کہا۔ "جاؤ، اور اُس غلام بن غلام سے کہو کہ آجاؤ اور غزنی کی سلطنت طشتری پر رکھ کر لانا"

سلطان محمود غزنوی کو ان لوگوں سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی غور کے یہ لوگ جنگجو کم اور لیٹرے زیادہ تھے سلطان محمود غزنوی کے والد سلطان سبکتگین کے دور میں بھی وہ جنگی پیمانے پر غزنی کے علاقے میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اب سلطان محمود انہیں فیصلہ کُن

شکست دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ سُوری دس ہزار فوج لے کر آیا اور غزنی کی سرحد کے اندر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ سلطان محمود نے اپنے دو جرنیلوں التن تاش اور ارسلان جاذب سے کہا کہ وہ سُوری خاندان کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سلطان محمود نے بھیس بدلا اور سُوریوں کا کیمپ دیکھنے چلا گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سُوریوں کے دفاعی انتظامات کی تعریف کی اور سوچنے لگا کہ وہ اِن کے اِسی کیمپ کو ان کا قبرستان کس طرح بنا سکتا ہے لیکن اُسے یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔ حضرو کے مقام پر سلطان نے اپنے دستوں کو بالکل اسی طرح کے کیمپ میں رکھا اور ارد گرد خندق کھدوائی تھی۔ دشمن کی تیس ہزار نفری نے کیمپ پر ہلّہ بولا تھا تو نقصان دشمن کا ہی ہُوا تھا۔ سُوریوں کا اُسی قسم کا دفاع دیکھ کر سلطان محمود پریشان ہو گیا۔ واپس آ کر اُس نے اپنے سالاروں کو تفصیل سے بتایا کہ دشمن خندق کے پیچھے ہے جہاں سے اُسے نکالنا آسان نہیں ہو گا۔

رات بھر سوچ بچار ہوتی رہی اور رات کو ہی سلطان محمود نے فوج کو پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ فوج کو دشمن کے کیمپ سے کچھ دُور تیاری کی حالت میں رُکنے کو کہا۔ علی الصبح سلطان خود بھی روانہ ہو گیا اور جاتے ہی اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ سُوری تیر اندازوں نے غزنی کی فوج کو قریب نہ آنے دیا۔ سلطان محمود نے اُس جگہ پر ہلّہ بولنے کا حکم دیا جہاں خندق نہیں تھی۔ یہ کیمپ کے اندر باہر آنے جانے کا فراخ راستہ تھا مگر سُوریوں نے باہر آ کر آمنے سامنے کا معرکہ ایسے قہر سے لڑا کہ غزنویوں کے پاؤں اُکھڑنے لگے۔

سُوری آگے آتے، لڑتے اور پیچھے ہٹ کر کیمپ میں چلے جاتے۔ اُن پر کسی اور طرف سے حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ہر طرف پہاڑیاں بھی تھیں اور خندق بھی۔ سہ پہر کے وقت سلطان محمود نے اپنے دونوں سالاروں کو ایک اور چال بتائی اور اس کے مطابق خود ہلّہ بولا۔ محمد بن سُوری نے دیکھ لیا کہ سلطان خود آ رہا ہے۔ اُس وقت تک غزنی کی فوج کا بہت نقصان ہو چکا تھا جس سے سُوریوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ محمد بن سُوری نے سلطان محمود پر دھاک بٹھانے کے لیے اُس کا ہلّہ روکنے کو زیادہ نفری کے دو دستے باہر بھیج دیئے۔

تصادم خونریز تھا۔ سلطان محمود آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایسا حکم دیا جس نے اُس کے دستوں کو حیران کر دیا۔ سلطان نے چلّا کر کہا۔ "بھاگو، ورنہ سُوری کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔ اور وہ پیچھے کو بھاگ اُٹھا۔

اُس کی صفوں سے کئی اور آوازیں سنائی دیں۔ "بھاگو۔ سُوری آرہے ہیں بھاگو"۔

یہ آوازیں سوریوں نے بھی سنیں۔ محمد بن سُوری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حکم دیا۔ "تعاقب کرو۔ انہیں غزنی تک نہ پہنچنے دو"۔ اور اُس نے یہ حکم بھی دیا "سلطان محمود کو زندہ میرے سامنے لاؤ۔۔۔ غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجادو"۔

سُوری لشکر تعاقب میں نکل پڑا۔ کیمپ خالی ہو گیا۔ کم و بیش تین میل دُور جا کر سلطان محمود نے پسپائی روک دی اور دستوں کو جو پہلے دی ہوئی ہدایت کے مطابق ترتیب اور تنظیم سے بھاگ رہے تھے، پیچھے مُڑنے کا حکم دیا۔ کمانڈروں کو اس چال کا پہلے سے علم تھا۔ سُلطان نے پیچھے مُڑ کر اپنے تعاقب میں آتے سوریوں کا آمنے سامنے کا مقابلہ کیا۔ سالار التن تاش اور سالار ارسلان جاذب اس چال کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے سُوریوں کے کیمپ کا راستہ روک لیا، اور دوسرے نے پہلو سے حملہ کر دیا۔ مؤرخ عُتبی نے لکھا ہے "سیدھے سادے سُوری سلطان محمود جیسے شاطر جرنیل کے پھندے میں آگئے اور اب جو لڑائی ہو رہی تھی یہ غزنی کی فوج کے ہاتھوں سُوری فوج کا قتلِ عام تھا۔"

سورج غروب ہونے سے پہلے سُوریوں کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ محمد بن سُوری بھاگ نہ سکا۔ اُسے ایک کھڈ میں سے پکڑ لیا گیا جہاں وہ اپنے دو درباریوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ اِن تینوں کو سلطان محمود کے خیمے میں پیش کیا گیا۔

"محمد!" ۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں نے پرسوں جو تمہیں لکھا تھا وہ آج ایک حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگیا ہے۔ تمہیں شکست دے کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ آج جن دونوں فوجوں کا خون بہہ گیا ہے، انہیں کسی اور مقصد کے لیے لڑنا تھا۔ خدا کا یہ قانون میری سمجھ سے بالا ہے کہ گناہگار حکمرانوں کی سزا بے گناہ رعایا کو بھی ملتی ہے"۔

سلطان محمود بول رہا تھا کہ محمد بن سُوری کا پہلے سر ڈولا، پھر وہ گھٹنوں کے بل گرا

اور لڑھک گیا۔ اسے سنبھالنے لگے تو دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں ــــــ وہ مر گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو درباری تھے، انہوں نے بتایا کہ محمد بن سوری نے جو انگوٹھی پہن رکھی ہے، اس میں زہریلا ہیرا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ فوج ماری گئی ہے اور اُس کے اپنے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو ہیں سامنے کے کریہ ایک کمرے میں اُتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے انگوٹھی سے ہیرا نکالا اور نگل لیا اور فوراً بعد اُسے پکڑنے والے پہنچ گئے۔

یہ معرکہ ۱۰۱۰ء (۴۰۱ ہجری) کے موسم گرما میں لڑا گیا۔

سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان سے آئے چھ سات مہینے گذر گئے تھے۔ اُسے اطلاعیں مل چکی تھیں کہ دلی سے تیس چالیس میل مغرب کی طرف تھانیسر میں بہت بڑا مندر ہے جس میں بہت سے بُت ہیں۔ ان میں ایک بُت جگ سوما نام کا ہے جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اسی کی پرستش کی تھی۔ بعض مؤرخوں نے اِسے چکر سوامی کہا ہے اور یہ بھی کہ یہ وشنو دیوتا کا بُت تھا۔ اُسے اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ دُور دُور سے ہندو اس کی پوجا کرنے کے لیے آتے اور وہی درجہ حاصل کرتے جو مسلمانوں میں حاجیوں کو حاصل ہوتا ہے۔

سلطان محمود ایک تو اپنے عقیدے کے زیرِ اثر تھانیسر کے مندر کو تباہ کرنا چاہتا تھا، دوسرے اس لیے اُس نے فوراً کوچ کا حکم دے دیا تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے ابھی جھنڈو کی جنگ اور نگر کوٹ کی لڑائی سے سنبھلے نہیں ہوں گے۔ اُسے اپنے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں پر غزنی کی فوج کی دہشت طاری ہے اور اُن کے حوصلے پست ہیں۔ حوصلے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے خداؤں کے بُت توڑ دیئے گئے تھے اور مسلمان فوجی اُن کے سامنے گائے ذبح کر کے کھاتے رہتے تھے۔ گائے ہندوؤں کی گئو ماتا تھی۔

جاسوسوں نے یہ اطلاعیں غزنی پہنچا دی تھیں کہ ہندوستانی فوج کا ہی نہیں پوری

قوم کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی یہ حالت ہے کہ گھٹائیں گرجتی اور چمکتی ہیں تو لوگ مندروں کو دوڑ پڑتے ہیں یا اپنے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں اور مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے اور رو رو کر ان سے رحم مانگتے اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔

یہ صورتِ حال سلطان محمود کے لیے موزوں تھی۔ اُس نے پشاور پہنچ کر ہندوستان کو دو قاصد اور ایک ایلچی دوڑا دیا۔ ایک بھیرہ اور ملتان پیغام لے کر گیا اور دوسرا نگر کوٹ وہاں کے سالاروں کو (جن کے رُتبے آج کے گورنروں جیسے تھے) یہ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ فوج کا کچھ حصہ بالکل تیاری کی حالت میں رکھیں۔ پیغام میں انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تھانیسر پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

ایلچی کو پنجاب کے راجہ اننند پال کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ سلطان محمود کی فوج پنجاب میں سے گزرے گی معاہدے کے مطابق راجہ اننند پال کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ غزنی کی فوج بحفاظت گذر جائے اور اس کے راستے میں نہ کوئی رکاوٹ ہو نہ کوئی مزاحمت۔ اور یہ بھی کہ اننند پال اب دوسری ریاستوں کی فوج کو اکٹھا کر کے متحدہ فوج نہ بنائے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ راجہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور پھر سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے لاہور پر اور پھر پنجاب کے دوسرے دارالحکومت بھٹنڈہ پر حملہ کر کے دونوں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

راجہ جے پال نے اپنے ایک بھائی (جس کا نام تاریخ میں نہیں ملتا) کی زیرِ کمان دو ہزار سوار سلطان محمود غزنوی کے استقبال کے لیے بھیجے اور ساتھ (قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) یہ پیغام بھیجا "یہ میرا بھائی ہے اور میرا سفیر بھی۔ اسے میں آپ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ تھانیسر ہماری سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مقدّس عبادت گاہ ہے۔ اگر یہ فرض آپ پر آپ کے مذہب کی طرف سے عائد ہوتا ہے کہ دوسروں کے مذہب کو ختم کریں تو آپ نگر کوٹ کی تباہی سے اپنا یہ فرض پورا کر چکے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ تھانیسر کے متعلق اپنے ارادے بدل دیں۔ میں اس کے عوض سالانہ خراج دیا کروں گا۔ یہاں تک آنے میں آپ کی فوج پر جو خرچ ہوا ہے اور واپس جانے کا جو خرچ ہو گا، وہ میں ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو پچاس ہاتھی

اور کچھ بیش قیمت ہیرے جواہرات بھی پیش کروں گا۔"

قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے اس پیغام کا یہ جواب دیا۔ "میرے لیے خدا اور رسول صلعم کا حکم ہے کہ جہاں کہیں بُت پرستی ہو وہاں جاؤں اور بتوں کو تباہ کروں۔ میرے رسول صلعم کا نظریہ ہے کہ خدا اس کا اجر اگلے جہان میں دے گا۔ میں آپ سے بُت نہ توڑنے کا انعام قبول نہیں کرسکتا۔ میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ تھانیسر کا بُت خانہ نہ توڑوں۔"

کسی مورخ نے یہ نہیں بتایا کہ راجہ انندپال کو کس طرح پتہ چلا تھا کہ سلطان محمود تھانیسر جا رہا ہے۔ البتہ ان واقعات پر سب متفق ہیں کہ راجہ انندپال کے جواب میں سلطان نے اس کی پیش کش اور درخواست قبول نہ کی اور راجہ انندپال نے دِلّی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے مہاراجوں کی طرف قاصد بھیج دیئے کہ غزنی کا سلطان محمود ہماری طرف سے کسی اشتعال کے بغیر ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے اور اس کا ارادہ تھانیسر کے وشنو مندر کو تباہ کرنے کا ہے۔

تھانیسر میں سلطان محمود غزنوی کے قتل کا انتظام ہو چکا تھا۔

۱۰۱۱ء (۴۰۲ ہجری) کا سال تھا۔ سلطان کو نگر کوٹ سے گئے ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا۔ اُس کے دو کماندار لبغراخان اور التنگین جو لاپتہ ہو گئے تھے، ان کے گھروں کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ اُن کے مارے جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی اس لیے یہ یقین ہے کہ وہ ہندوستانی فوج کے قیدی ہیں۔

وہ قیدی نہیں شہزادے تھے۔ اس عرصے میں اُن کی توجیسے روحیں بھی بدلی جا چکی تھیں۔ انہیں جب کوئی نشہ آور چیز کھلا کر اور ہپناٹائز کر کے تھانیسر لایا گیا تھا تو دونوں کو الگ الگ کمرے دیئے گئے تھے اور اُن کی خدمت کے لیے عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔ وہ آتے اُن دو جوان اور بے حد خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تھے جو انہیں نگر کوٹ کے ایک گاؤں میں ملی تھیں۔ تھانیسر میں وہ اُن سے جُدا کر دی گئی تھیں۔

بغراخان کے زخم اور چوٹیں ٹھیک ہوگئیں اور وہ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہوگیا۔ التگین اور وہ مل بیٹھتے اور گپ شپ لگاتے تھے۔ اپنے میزبانوں کے ساتھ صرف بغراخان بات کرتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان وہی سمجھتا تھا۔ دونوں نے تین چار دن خاموشی اختیار کئے رکھی۔ آخر التگین نے بغراخان سے کہا کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو وہ یہاں رہیں گے ورنہ اپنی فوج میں چلے جائیں گے۔

ایک روز بغراخان نے اپنے ایک میزبان سے پوچھا کہ وہ لڑکیاں کہاں چلی گئی ہیں۔ یہ میزبان وہی تھا جو درویش یا جوگی کے بہروپ میں انہیں ہپناٹائز کرکے لایا تھا۔ یہاں وہ اصلی روپ میں تھا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی اور اس کی آواز بھی بناوٹی نہیں تھی۔

"تم دیویوں کو اپنے پاس بلانا چاہتے ہو؟" — اس آدمی نے کہا۔ "وہ انسان نہیں۔ تم چونکہ نگرکوٹ کے مندر کے بُت توڑنے والوں میں نہیں تھے اور تم زخمی ہوگئے تھے، اس لیے یہ دیویاں انسانوں کے رُوپ میں تمہارے پاس پہنچ گئیں اور انہوں نے تمہاری تیمارداری کی۔ وہ تمہارے ساتھ انسانوں کی طرح باتیں کرتی رہیں....

"تم نے اُن سے پیار مانگا تو انہوں نے تم سے پیار بھی کیا لیکن انہوں نے تمہیں بدی کی طرف نہیں جانے دیا۔ تم نے بری نیت ظاہر کی تو انہوں نے ہنس کھیل کر تمہارے دل سے بُرے خیال نکال دیئے۔ یہ اُن کا حکم تھا کہ تم دونوں کو فوج کی اتنی سخت زندگی سے، جنگ و جدل اور قتل و غارت سے نکال کر شاہانہ زندگی میں رکھا جائے۔"

"نہیں" — بغراخان نے کہا۔ "یہ غلط ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انسان تھیں۔"

"وہ انسان نہیں تھیں" — اس آدمی نے بغراخان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔ "وہ انسان نہیں تھیں۔ تم اُن کے پجاری ہو۔ تمہاری رُوح اُن کے قبضے میں ہے۔"

"ہاں" — بغراخان نے خوابناک آواز میں کہا۔ "میں اُن کا پجاری ہوں.... میری روح اُن کے قبضے میں ہے۔"

بُغرا خان کے ذہن پر یہ شعبدہ باز قابض ہوچکا تھا۔ اب وہ عامل تھا اور بغرا خان کا ذہن پہلے ہی اُس کے اپنے قبضے سے نکل چکا تھا۔ یہ شراب کا اثر تھا جو وہ اور التنگین خود ہی پینے لگے تھے اور یہ اُس نشہ آور دوائی کا بھی اثر تھا جو اِن دونوں کو شراب میں اور کھانے میں کھلائی جاتی تھی۔

التنگین کو دوسرے شعبدہ باز نے اپنے زیرِ اثر لے رکھا تھا۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال شہزادوں کی طرح ہوتی تھی۔ وہ جدھر سے گذرتے تھے، لوگ رُکتے اور اُن کے آگے جُھک جاتے تھے۔

دو تین مہینے اِن پر یہی عمل جاری رہا۔ جب یقین ہوگیا کہ اُن کے ذہن اُن کے اپنے قبضے سے پوری طرح نکل گئے ہیں تو انہیں ایک رات کہا گیا کہ انہیں اُن کی دیویوں نے بلایا ہے۔ دونوں کو مندر کے باغ میں لے جایا گیا۔ رات کی تاریکی تھی۔ باغ خوشنما تھا۔ انہیں ایک مسند پر بٹھا دیا گیا۔ قندیلیں جل رہی تھیں۔ اُن کے سامنے پندرہ بیس قدم دُور دو ٹوکرے رکھے تھے۔ ان پر چمکدار کپڑے لپٹے ہوتے تھے۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ تاروں کی طرح چمکتے تھے۔

ستار کے تار جھنجھنانے لگے اور دھیما دھیما اور وجد آفریں راگ الاپنے لگے۔ ماحول پُراسرار سا ہو گیا۔ بنسری کی لَے سنائی دینے لگی۔ بنسری اور ستار کی سنگت نے طلسم طاری کر دیا اور اس طلسم میں دو نوں لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ پھولدار پودوں کے پیچھے سے نکلیں یا درختوں کے پیچھے سے۔ ان کے لباس اتنے باریک کپڑے کے تھے جن میں سے اُن کے جسم نظر آتے تھے۔ اُن کے سروں پر اوڑھنیاں نہیں تھیں۔ اوڑھنیاں اُن کے بال ہی تھے جو اُن کے شانوں پر اور کچھ آگے سینے پر بکھرے ہوتے تھے۔ ہوا سے اُن میں لہریں اٹھتی تھیں۔

وہ جونہی نمودار ہوئیں، سب نے ہاتھ جوڑ دیئے اور سجدے میں چلے گئے۔ بُغرا خان اور التنگین نے نہ ہاتھ جوڑے نہ سجدہ کیا۔ وہ مبہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ لڑکیاں یوں

نہایت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ ان کے قدم اٹھتے نظر نہیں آتے تھے۔ سب سجدے سے اُٹھے۔ لڑکیاں ٹوکروں کے پاس رُک گئیں۔ انہوں نے دونوں بازو آگے کر کے ہاتھ پھیلا دیئے اور ایک لڑکی ایک ٹوکرے میں اور دوسری دوسرے ٹوکرے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ گھٹنوں تک ٹوکروں میں چھپ گئیں، پھر وہ آہستہ آہستہ اس میں بیٹھنے لگیں اور ٹوکروں میں غائب ہو گئیں۔

بڑے پنڈت نے بغرا خان اور التگین سے کہا کہ جاؤ اور ٹوکروں میں دیکھو۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ وہ مسحور تھے۔ ٹوکروں سے تین چار قدم دور تھے کہ ٹوکروں میں سے ایک ایک کبوتر اڑا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دونوں کمانداروں نے ٹوکروں میں جا کر دیکھا۔ ٹوکرے خالی تھے۔

"وہ دیویاں ہیں" ۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر انہیں کہا۔ "صرف تمہارے لیے زندہ روپ میں آئی تھیں۔ انہوں نے تم پر خاص کرم کیا ہے کہ آج ہم سب تمہارے غلام ہیں اور تم ہمارے بادشاہ ہو۔ یاد کرو تم کیا تھے، کہاں تھے، تمہاری زندگی کیا تھی۔ دیویوں نے ہمیں اشارہ دیا ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنے جیسی دو لڑکیاں بھیج دیں گی۔"

"کیا یہ ہمیں پھر بھی نظر آئیں گی؟" ـــ بغرا خان نے پوچھا۔

"دیویاں دیوتا ہماری خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے" ـــ انہیں پنڈت نے کہا۔ "تم پر یہ دونوں اس لیے خوش ہوئی تھیں کہ تم نے نگر کوٹ کے بتوں کی توہین نہیں کی تھی اور تم بتوں کی توہین کرنے والے سلطان کی فوج سے الگ ہو گئے تھے.... یہ دیویاں بت ہیں۔ دیکھنے میں پتھر ہیں، ہم تمہیں ان کا یہ روپ بھی دکھائیں گے۔"

وہ جب اپنے کمرے میں آئے تو التگین نے بغرا خان سے کہا۔ "ہمیں بتایا جاتا رہا ہے کہ ان لوگوں کا مذہب باطل ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست عالمِ غیب سے معلوم ہوتا ہے...... ہم کس کی عبادت کرتے ہیں؟"

ان دونوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اُسے معبود سمجھنے لگے تھے جسے وہ دیکھ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے اور جو اتنا حسین ہو کہ اُن کے جذبات میں ہلچل مچا دے۔ انسان گمراہ وہیں سے ہوتا ہے جہاں وہ جسم اور روح کا رشتہ توڑ کر صرف جسم بن جاتا ہے اور وہ

اُسی چیز کو برحق سمجھتا ہے جو اُس کی جسمانی ضرورت پوری کرے اور اُسے جسمانی لذّت مہیّا کرے۔ ایسے ہی انسان شعبدہ بازی کو معجزہ کہتے اور جذباتی اور دلفریب باتوں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ انسان جس قدر مادیّت پرست اور جس قدر کم فہم ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی مسحور ہوتا ہے۔ جس دور میں انسان ہپناٹزم سے واقف نہیں تھا، وہ اُس وقت بھی ہپناٹائز ہوا کرتا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے ان کے ملک میں جادوگری نہیں ہے" — پنڈت نے اپنے شعبدہ بازوں سے کہا۔ "ورنہ یہ دونوں اتنے حیران نہ ہوتے۔ ہمارے ہاں کسی کو ٹوکرے میں کھڑا کر کے غائب کر دینا معمولی سی قسم کی شعبدہ بازی ہے .... انہیں کچھ اور کرتب دکھاؤ۔ میں اب قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ انہیں ہم استعمال کر سکیں گے۔ اگر ان کے ہاتھوں سلطان محمود کو قتل نہ کرایا جا سکا تو نگر کوٹ کے سالار اور دوسرے اہم آدمیوں کو قتل کرایا جا سکتا ہے۔"

"شعبدہ بازی کے ساتھ بُوٹی نے بھی خوب اثر دکھایا ہے" — اس فن کے ماہر نے کہا۔ "انہیں اب یہ لڑکیاں بُتوں کے روپ میں دکھادو"

اور ایک رات انہیں یہ بُت بھی دکھا دیئے گئے۔ مندر کی عبادت گاہ میں دو چبوترے تھے جن پر پھولدار کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ان پر لوبان جل رہا تھا جس کا دھواں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی طرح اوپر اُٹھ رہا تھا اور بُتوں کے گرد لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ روشنی بُتوں کے پیچھے اور نیچے رکھی گئی تھی۔ بُت پہچانے جاتے تھے —— یہ وہی دو لڑکیاں تھیں۔ مادر زاد برہنہ چبوتروں پر کھڑی تھیں۔ بے جان بُت لگتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ پنڈت نے سب سے کہا کہ ماتھے رگڑو۔ سب نے ماتھے فرش سے لگا دیئے۔ بُغراخان اور التگین بھی سجدے میں چلے گئے۔

اُس رات کے بعد اُن کی اصلیّت اور اُن کی قومیّت ختم ہو گئی۔ اُن کی ہر ایک جسمانی ضرورت پوری کرنے کا انتظام کر دیا گیا۔ سحر کا عمل بھی جاری رہا، شعبدہ بازی بھی ہوتی رہی اور جب اُن کے متعلّق یقین ہو گیا کہ اب اصلیّت اور حقیقت کی طرف اُن کی واپسی کا خطرہ ختم ہو گیا ہے تو مندر کے شعبدہ بازوں نے اُن کے دماغوں میں سلطان محمود کے خلاف زہر بھرنا شروع کر دیا۔

"وہ یہاں سے خوبصورت لڑکیاں اور زروجواہرات لوٹنے آیا کرتا ہے" — اُن کے ذہن میں ڈالا جانے لگا "کیا تم اُن بتوں کی توہین کرو گے جو تم نے دیکھے ہیں؟ جن دیویوں نے تمہاری کایا پلٹ دی ہے، کیا تم انہیں توڑ پھوڑ سکو گے؟ اب تمہارے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ سلطان محمود اگر یہاں آ گیا اور اُس نے اِن بتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی تم دونوں کے جسم اپنے آپ ہی کٹنے لگیں گے۔ بتوں کا ایک بازو ٹوٹے گا تو تمہارے جسموں سے ایک ایک بازو الگ ہو جائے گا۔ دیویاں مرا نہیں کرتیں۔ تم بھی نہیں مرو گے مگر تمہارے جسم کوڑھی اور اپاہج ہو جائیں گے اور تم ویرانوں میں پڑے تڑپتے رہو گے۔"

"کیا سلطان محمود یہاں بھی آئے گا؟" — بغراخان نے پوچھا۔

"شاید آ جائے۔"

"آنے دو" — بغراخان نے کہا — "وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

چار پانچ مہینوں بعد اُن میں یہ تبدیلی آئی جیسے وہ کسی سحر یا شعبدے یا کسی نشے کے زیرِ اثر نہیں بلکہ اُن کی باتیں اور ان کی حرکتیں شعوری معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اب یوں نہیں چلتے تھے جیسے خواب میں چل رہے ہوں اور وہ یوں نہیں بولتے تھے جیسے نیند میں بول رہے ہوں۔ وہ اب مندر سے باہر بھی جاتے تھے اور نارمل انسانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔

ایک روز دونوں باہر ایک باغ میں سیر کو گئے۔ انہیں آواز سنائی دی — "التگین"۔

انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک جوگی جو ہندو لگتا تھا، اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر رنگ سے "اوم" لکھا ہوا تھا۔ اُس کے سر پر ہندوؤں کی چُٹیا تھی۔ اس نے قریب آ کر غزنی کی زبان میں کہا — "تمہارے متعلق ہمیں بتایا نہیں گیا۔ کب آئے ہو؟ کہاں ہو؟"

"اوہ!" — التگین نے حیرت سے کہا — "تم عبید ہو؟"

وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کبھی ایک ہی دستے میں تھے۔ عبید کو جاسوسی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ ماہر اور ذہین چھاپہ مار تھا۔ وہ بغراخان کو نہیں جانتا تھا۔ التگین نے اس کو بتایا کہ بغراخان کون ہے مگر یہ نہ بتایا کہ وہ کس طرح یہاں آئے ہیں۔ عبید یہی سمجھتا

رہاکہ یہ دونوں جاسوسی کے لیے آئے ہیں۔

"سلطان بہت قریب آگیا ہے"۔ عبید نے کہا۔ "تم نے کوئی خبر بھیجی ہے؟"

"تم نے کیا خبر بھیجی ہے؟"۔ التنگین نے پوچھا۔

"زیادہ خطرہ تو یہ ہے کہ پہلے کی طرح دوسرے مہاراجوں کی فوجیں بھی تھانیسر کو بچانے کے لیے جمع ہو جائیں گی"۔ عبید نے انہیں بتایا۔ "مگر ابھی تک یہاں وہی فوج ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے"۔

التنگین نے اُسے بتایا کہ اُس نے بغراخان کے ساتھ مندر کے اندر تک رسائی حاصل کرلی ہے اور وہ ہندو بن کر پنڈتوں وغیرہ کو زیر اثر کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عبید کو اندھیرے میں رکھا اور اُسے پھر ملنے کے لیے کہہ کر مندر میں آگئے۔ عبید جب واپس جا رہا تھا تو اُسے ایک آدمی نے روک کر پوچھا کہ وہ کون ہے۔ عبید نے اپنا کوئی ہندوانہ نام بتایا۔ یہ آدمی التنگین اور بغراخان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ وہ جہاں جاتے یہ انہیں پتہ چلے بغیر اُن سے کچھ دُور رہ کر اُن پر نظر رکھتا تھا۔

عبید پر اُسے شک ہوا کہ وہ ہندو نہیں۔ عبید نے اُسے کہا کہ وہ لاہور سے آیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور جوگی بھی ہیں اور انہوں نے جنگل میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ اُن کا ڈیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ عبید اُسے ساتھ لے گیا۔ جنگل میں واقعی چار پانچ جوگی اور سنیاسی قسم کے آدمی موجود تھے مگر یہ آدمی جو شک پر اُنہیں دیکھنے گیا تھا، واپس نہ آسکا۔ عبید اور اس کے ساتھیوں نے اُسے پکڑ کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسّیوں سے باندھ دیئے۔ خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور پوچھا کہ اُسے عبید پر کس طرح شک ہوا ہے۔

یہ ہندو پہلے تو کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ اُسے ایک درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر نیچے آگ جلادی گئی۔ تھوڑی سی دیر میں ہندو کا دماغ ٹھکانے آگیا اور اُس نے چلّانا شروع کر دیا۔ اُسے اُتار کر بٹھایا گیا۔ اُس نے التنگین اور بغراخان کے متعلق ساری کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ چونکہ وہ غزنی کی فوج کے کماندار ہیں اس لیے وہ سلطان محمود تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکیں گے۔ وہ سلطان کو بتائیں گے کہ وہ ہندوستان کی فوج کی قید سے فرار ہوئے ہیں اور اُن کے پاس بڑا قیمتی راز ہے جو صرف سلطان کو بتایا جائے گا۔ اس طرح وہ سلطان تک پہنچ کر

اُسے قتل کر دیں گے۔
اس آدمی کو انہوں نے رہا نہ کیا۔ جاسوسوں کا یہ گروہ جہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ گھنے جنگل میں ایک ڈھکی چھپی جگہ تھی۔

بغرا خان اور التگین جب مندر میں پہنچے تو وہاں کچھ گھبراہٹ اور بھگدڑ سی دیکھی۔ انہیں بتایا گیا کہ غزنی کی فوج آرہی ہے اور اس کا رُخ تھانیسر کی طرف ہے۔ مندر کے پنڈت اور دیگر لوگ مہاراجہ انند پال اور دوسرے مہاراجوں کی فوجوں کا انتظار کر رہے تھے مگر کوئی فوج آتی نظر نہیں آتی تھی۔
ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ تمام راجوں مہاراجوں کو اطلاع مل چکی ہے کہ سلطان محمود تھانیسر پر حملہ کرنے آگیا ہے اور وہ اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دے چکے ہیں لیکن سلطان محمود کی پیشقدمی سے یہ لوگ واقف نہیں تھے۔ وہ طوفان کی طرح آرہا تھا۔ مندر صرف عبادت گاہ نہیں تھی، یہ قلعہ نما تھا اور یہ فوجی ہیڈکوارٹر بھی تھا جس پر پنڈتوں کا سایہ تھا۔ ان کے بھی جاسوس تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سلطان محمود اگر اسی رفتار سے بڑھتا آیا تو وہ ایک دن اور رات میں پہنچ جائے گا۔
بغرا خان اور التگین نے مندر میں یہ خبر سنائی کہ انہیں سلطان محمود کا ایک جاسوس ملا ہے اور اس کے ساتھ چند اور آدمی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کل صبح اُن کی اُس سے پھر ملاقات ہوگی۔
مندر میں جو فوجی تھے، انہوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ اس جاسوس سے ملیں اور اپنے آپ کو جاسوس ظاہر کر کے اُن کا ٹھکانہ دیکھ آئیں تاکہ انہیں پکڑ کر ختم کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کمانداروں سے کہا گیا کہ وہ کل جاسوسوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے اُدھر چلے جائیں جدھر سے سلطان محمود کی فوج آرہی ہے۔ یہ کہہ کر اُس تک پہنچیں کہ وہ قید سے فرار ہو کر آئے ہیں اور سلطان سے تنہائی میں ملنا ضروری سمجھتے ہیں۔
اب تقریباً ایک سال کے عرصے میں بغرا خان اور التگین بالکل ہی بدل گئے تھے اور یہ تبدیلی ہندوؤں کے عزائم کے مطابق تھی۔ دونوں سدھائے ہوئے جانور بن چکے تھے۔

ان کے ذہن اور ان کی روحیں اُن کی اپنی نہیں رہی تھیں۔ عورت کے حسن، شراب اور حیوانی خیالات نے انہیں انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا۔ انہیں گاؤں والی دونوں لڑکیوں کے دونوں بُت کئی بار دکھائے گئے تھے اور وہ اُن کے پجاری بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت محسوس نہ کر سکے کہ یہ لڑکیاں زندہ ہیں اور انہیں دکھانے کے لیے چبوتروں پر بُتوں کی طرح کھڑی کی جاتی ہیں۔ لوبان، اور اگربتیاں ان کے قدموں میں اس طرح جلائی جاتی ہیں کہ ان کے دھوئیں میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ لڑکیاں سانس لے رہی ہیں۔

اب انہیں بتایا گیا کہ سلطان محمود ان بُتوں کو توڑنے آ گیا ہے تو دونوں آگ بگولہ ہو گئے۔

تھانیسر کی فوج میں ہلچل مچ گئی۔ مندر کے دفاعی مورچے مضبوط ہونے لگے۔ مندر کے اندر اور باہر فوج بھاگتی دوڑتی نظر آتی تھی۔ شہر کے لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور شہر کے لوگ تلواریں اور برچھے اٹھائے مندر کے دروازے پر جمع ہو رہے تھے اور فوجی انہیں بتا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں لڑائی کے لیے اِدھر اُدھر تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اس ہنگامے میں التگین اور تغرا خان اُس باغ میں چلے گئے جہاں علید اُن کا منتظر تھا۔ ان دونوں نے علید کو دو جھوٹ موٹ کی اہم خبریں سنائیں اور اسے کہا کہ اپنے ٹھکانے پر لے چلے۔ علید اُن کے کہنے کے بغیر بھی انہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اُسے اُن دونوں کی اصلیت کا پتہ چل چکا تھا ـــــ وہ انہیں جنگل میں ساتھ لے گیا۔

وہ جونہی اپنے چھپنے کی جگہ پہنچے، تین چار آدمیوں نے انہیں جکڑ لیا اور رسیّوں سے باندھ دیا۔ خطرہ یہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی آدمی ہو گا جیسے کل تھا۔ یہ آدمی اُن کے ٹھکانے کی نشاندہی کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے وہاں سے غائب ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ کل والے ہندو کو انہوں نے قتل کر دیا اور دو کمانداروں کے ہاتھ بندھے رہنے دیئے، پاؤں کھول دیئے اور انہیں ساتھ لے کر جنگل میں چلے گئے۔

انہیں بہت دُور نہ جانا پڑا۔ چند میل گئے ہوں گے کہ انہیں اپنی فوج کا ہراول دستہ مل گیا۔ علید نے اس کے کمانڈر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈر نے انہیں کہا کہ وہ

آگے جانے کی بجائے یہیں ٹھہریں۔ سلطان تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔

سلطان محمود اپنے محافظ دستے کے ساتھ سیلاب کی طرح آ رہا تھا۔ علیبد راستے میں کھڑا ہو گیا۔ محافظ دستے کا کمانڈر دوڑ آیا کہ اس فقیر کو راستے سے ہٹائے لیکن یہ فقیر ان کا اپنا آدمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ کیوں راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اتنے میں سلطان محمود پہنچ گیا اور وہ رک گیا۔ علیبد نے اُسے ایک خبر تو یہ سنائی کہ تھانیسر کے دفاع میں باہر سے کوئی فوج نہیں آئی اور قلعے پر شہری بھی فوج کے ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔

"اور یہ دو کمانڈر آپ کے قتل کے لیے تیار کیے گئے تھے"۔ علیبد نے سلطان محمود کو بتایا اور انہیں جس عمل سے گزارا گیا تھا وہ تفصیل سے سُنا دیا۔

"انہیں ساتھ رکھو" سلطان محمود نے کہا۔ "انہیں نہ کچھ کھانے کے لیے دو نہ کچھ پینے کے لیے۔ بھوک سے بیہوش ہو جائیں تو بھی کچھ نہ دینا۔ اس طرح نشہ آور دوائی کا اثر اتر جائے گا، پھر میں انہیں حقیقت دکھاؤں گا"۔

وہ دونوں گم صم کھڑے رہے اور سلطان محمود غزنوی آگے بڑھ گیا۔

سلطان محمود نے دوڑ جیت لی۔ تھانیسر کے فوجی کمانڈر بھی دیکھ رہے تھے کہ غزنی کی فوج پہلے پہنچتی ہے یا راجوں مہاراجوں کی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی برق رفتاری نے سب کو حیران کر دیا۔ اُس کی کوشش بھی یہی تھی کہ ہندوستان کی فوجوں سے پہلے ہدف پر پہنچے۔ وہ پہنچ گیا۔ اُس نے دفاع کا جائزہ لیا اور محاصرے کی بجائے یلغار کا حکم دے دیا۔ دیواروں کے اوپر تیروں کی ایسی بوچھاڑیں ماریں کہ اوپر والے سر نہ اُٹھا سکے۔ دروازہ توڑ لیا گیا۔ ہندوؤں کی فوج میں بھگدڑ مچانے کے لیے سلطان نے حکم دے دیا کہ شہر کو لُوٹ لیا جائے۔ ایسی قیامت بپا ہوئی کہ دفاع ٹوٹ گیا۔

مندر میں جا کر سلطان محمود نے تمام بُت باہر پھینک کر توڑ دینے کا حکم دیا لیکن سب سے زیادہ مقدّس بُت جس کی خاطر تھانیسر سارے ملک کی عبادت گاہ بنا ہُوا تھا، جگ سوما تھا۔ اسے وشنو دیوتا کہا جاتا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اِس بُت کو سالم غزنی

لے جایا جائے۔ اس حملے کے بعد جب سلطان واپس گیا تو یہ بُت اُس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت کے ایک واقع نگار حاجی محمد قندھاری کی تحریر کے مطابق اُس بت کو غزنی میں گھوڑ دوڑ کے میدان میں توڑا گیا اور بہت عرصے تک اُس کے ٹکڑے گھوڑوں کے قدموں تلے روندیا اور مسلے جاتے رہے اور انہیں اسی میدان کی مٹی میں مل گئے۔

مندر اور شہر کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے کر سلطان محمود نے کہا کہ بغرا خان اور التگین کو لایا جائے۔ انہیں اُس کے سامنے لے جایا گیا تو سلطان نے کہا کہ قیدیوں کو لاؤ۔ قیدیوں کی ایک قطار لائی گئی۔ اُس میں پنڈتوں، شعبدہ بازوں اور رلیوں کی کافی تعداد تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں کمانداروں کو کہا کہ اِن لڑکیوں کو دیکھو اور اپنی دیویوں کو الگ کرلو۔ دونوں نے دیکھا کہ وہ دونوں لڑکیاں وہاں موجود ہیں۔ سلطان نے شعبدہ بازوں سے کہا کہ ان لڑکیوں کو ٹوکروں میں غائب کرو اور پھر انہیں حاضر کرو۔

ٹوکرے منگوائے گئے۔ ایک شعبدہ باز نے لڑکیوں کو ان میں بٹھایا اور اُس نے خالی ٹوکرے دکھا دیئے۔ اس کے بعد اُس نے انہی ٹوکروں میں سے لڑکیاں برآمد کر دیں۔

"یہ ہندوستان کا ایک عام شعبدہ ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "اور ہندوؤں کا مذہب بہت بڑا شعبدہ ہے۔ یہ مذہب جسمانی ضرورت تک محدود ہے۔ رُوح تک اس کی رسائی نہیں۔ لذّت پرستی اس کا اصول ہے۔ مَیں نے بُت توڑ دیئے ہیں۔ انہیں کہو کہ مجھ پر قہر نازل کریں۔"

بُغرا خان اور التگین سُن رہے تھے۔ اُن کے ذہنوں سے نشے کا اثر بھوک اور پیاس نے اُتار دیا تھا۔ سلطان بول رہا تھا۔ اور اُس وقت مندر کے اوپر سے اذان کی بڑی ہی مقدّس، بڑی ہی پُرسوز اور وجد آفریں صدا بلند ہوئی۔ سلطان خاموش ہوگیا۔ بُغرا خان اور التگین کے جسم کانپنے اور اُن کے آنسو بہنے لگے۔

اذان ختم ہوئی تو سلطان نے اِن دونوں سے کہا۔ "مَیں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔ زندہ رہو۔ آزاد رہو اور سب کو بتاؤ کہ دشمن تمہیں صرف تلوار سے نہیں مار سکتا، اس کے پاس کچھ اور ہتھیار بھی ہیں جو تمہاری رُوح کو کاٹ دیتے ہیں۔"

سانپ سونا اور انسان

محمد قاسم

فرشتہ لکھتا ہے کہ ۴۰۲ھ (۱۰۱۱ء) کے آخر میں جب سلطان محمود غزنوی تھانیسر کی فتح کے بعد واپس غزنی آیا تو ہندوستانی شہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ غزنی کی فوج کی نفری اتنی نہیں تھی جتنی تعداد جنگی قیدیوں کی تھی۔ اُس دور میں جنگی قیدیوں کو غلام کہا جاتا اور انہیں فوجیوں میں عہدوں کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سلطان محمود جب بھی ہندوستان سے واپس آتا اُسے کے ساتھ دو تین ہزار غلام ہوا کرتے تھے مگر اب کے اس کے ساتھ دو لاکھ غلام تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب فوجی نہیں تھے۔

سلطان نے حکم دے رکھا تھا کہ ان غلاموں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے کہ یہ اپنے آپ کو مرتے دم تک غلام اور مویشی سمجھتے رہیں۔ انہیں اسلامی طرز بود و باش سے روشناس کرایا جائے اور ان کی قسمت اس طرح بدل دی جائے کہ یہ اپنے گھروں اور عزیزو اقارب کو ہی نہیں، اپنے مذہب کو بھی بھول جائیں اور خود کہیں کہ ہمیں مسلمان بنا لیا جائے۔ اب غلاموں کی تعداد دو لاکھ تھی اس لیے سلطان محمود نے اپنے اس حکم پر سختی سے عمل کرنے کو کہا کہ غلاموں کو انسان سمجھا جائے۔

متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی فوج میں ایک پوری رجمنٹ ہندوؤں کی تھی جس کے افسر بھی ہندو تھے۔ ہندو افسروں کو مسلمان افسروں کی نسبت زیادہ مراعات دی گئی تھیں۔ اس رجمنٹ کو ہندوستان میں لا کر کبھی نہیں لڑایا گیا تھا۔ اسے ان لڑائیوں میں استعمال کیا جاتا رہا جو سلطان محمود کو اپنے دشمن مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔

غزنی میں اُس رات چراغاں ہوا۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ فوجی ناچ رہے تھے۔ غزنی میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ تھانیسر کے مندر سے وشنو دیو کا جو بت لایا گیا تھا اُس کی نمائش سارے شہر میں کی گئی تھی۔ اُس بت کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں لے جایا گیا۔ سارا شہر تماشا دیکھنے کو اُمڈ آیا تھا۔ ہندوستان کے جنگی قیدیوں کو بھی میدان میں لے گئے تھے تا کہ وہ اپنے دیوتا کی اصلیت اپنی آنکھوں میں دیکھیں۔ بت کو توڑا گیا اور اس کے ٹکڑے میدان میں بکھیر دیئے گئے۔ جنگی قیدیوں سے (جو سب ہندو تھے) کہا گیا کہ یہ اُن کا خدا نہیں تھا۔ یہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کا فریب تھا۔ اگر یہ خدا ہوتا یا اس میں ذرا سی بھی خدائی طاقت ہوتی تو یہ ہم سب کو فنا کر دیتا۔

تکبیر کے نعرے بلند ہوتے۔ ہندو قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رات غزنی میں جو رونق اور جو دھاچوکڑی رہی، یہ اس شہر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلطان کے محل میں بھی چراغاں تھا مگر سلطان محمود غزنوی واحد آدمی تھا جس کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ اس رونق اور خوشیوں سے تعلق توڑے ہوئے اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ دونوں اُس کے جاسوسی اور فوجی مخبری کے محکمے کے افسر تھے۔ وہ سلطان کو بتا رہے تھے کہ غزنی کے اردگرد کی مسلمان ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ سلطان کا سب سے بڑا دشمن ایلک خان تھا۔ وہ سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غزنی پر فوج کشی کر چکا تھا اور اُسے بڑی ہی شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس کی نظر خراسان پر تھی۔

"ایلک خان وہ سانپ ہے جو جب تک زندہ ہے ڈسنے سے باز نہیں آئے گا" —— سلطان محمود کو انٹیلی جنس رپورٹ دی جا رہی تھی۔ یہ اطلاعیں سلطان کے وہ جاسوس لائے تھے جو ایلک خان کے فوجی سٹاف میں موجود تھے —— "آپ کی غیر حاضری میں ایلک خان نے اپنے بھائی طوغان خان اور قادر خان والیٔ قسدر کو اکسایا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ اتحاد کر لیں اور تینوں مل کر خراسان پر حملہ کریں مگر دونوں نے آپ کے خوف سے اس کا اتحادی بننے سے انکار کر دیا۔ ایلک خان نے اپنی فوج کے ساتھ اپنے بھائی طوغان خان کے علاقے

پر حملے کے لئے پیش قدمی کی لیکن وہ اُزگند تک ہی پہنچا تھا کہ برفباری کا طوفان آ گیا۔ ایلک خان کی فوج کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اُس کے سپاہی بھی مرے اور جانور بھی اور اُسے مجبوراً واپس جانا پڑا"۔

"اور طوغان خان کے ارادے کیا ہیں؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"وہ آپ کی طرف مائل ہے"۔ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ "ہمارے جو آدمی طوغان خان کے دربار میں ہیں، اُنہوں نے بتایا ہے کہ اُسے جب پتہ چلا کہ ایلک خان نے اُس کے علاقے پر فوج کشی کی کوشش کی تھی اور برفباری نے اُسے آگے نہیں آنے دیا تو طوغان خان نے ایلک خان کو پیغام بھیجا کہ اُس نے دوبارہ ایسی کوشش کی تو وہ سلطان محمود کے ساتھ اتحاد کر لے گا"۔

"کیا مجھے طوغان پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟"

"سلطانِ عالی مقام!" اُسے جواب ملا۔ "کسی کے دل کی بات خدا کے سوا کون جانتا ہے۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ طوغان خان آپ کا اتحادی ہے"۔

"اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایلک خان جیسے بدطینت انسان سے محفوظ رہنے کے لیے ہماری مدد چاہتا ہے"۔ سلطان نے کہا۔ "میں اُس کی مدد کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اُس کے ساتھ میری ملاقات ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئے ہیں .... طوغان خان کو میرا پیغام خفیہ طریقے سے دو کہ میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔ نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں اُس کے ہاں جاؤں گا۔ غزنی سے باہر جتنی دور اور جہاں بھی وہ ملنا چاہے مجھے بتا دے"۔

یہ وجہ تھی کہ سلطان محمود اداس تھا۔ خانہ جنگی کی تلوار اُس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سانپوں کے سر کچلنا لازمی ہو گیا ہے۔

طوغان خان نے سلطان محمود سے ملنے میں پس و پیش نہ کی۔ وہ چار روز بعد غزنی کے مضافات میں ایک جگہ پہنچ گیا۔ وہ جگہ خوشنما تھی۔ ایک چشمہ تھا جس کے ارد گرد گھنے پیڑ، خودرو پودے اور گھاس تھی۔ سلطان محمود طوغان خان سے بغلگیر ہو کر ملا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ آپ میرے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں؟" سلطان نے طوغان خان سے پوچھا۔

"میں نے آپ کے پاس اپنا سفیر بھیجنے کا ارادہ کر رکھا تھا"۔ طوغان خان نے جواب دیا۔۔۔ "اس سے پہلے آپ کا پیغام آگیا اور میں چلا آیا۔ میں آپ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا ہوں"۔

"اپنی ریاست کی حفاظت کے لیئے یا اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہونا چاہئیے؟"۔۔۔ سلطان نے کہا۔ "اگر آپ کو اپنی ریاست کی حفاظت درکار ہے تو میں اتحاد سے صاف انکار کروں گا۔ میں صرف خلافتِ بغداد کے نام پر اتحاد کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان حکمران اپنی اپنی ریاستوں کو قائم رکھیں لیکن خلافت کو اپنا مرکز سمجھیں۔ اگر اسلام کو کفار سے بچائے رکھنا ہے تو خلافت کے تحت اتحاد ضروری ہے"

طوغان خان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں مسرت کم، ملال زیادہ تھا۔

"سلطان محمود کو میں بہت دانشمند سمجھتا تھا"۔ طوغان خان نے کہا۔ "لیکن معلوم ہوتا ہے آپ میں صرف جنگی دانش اور حکمت ہے۔۔۔۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مذہب کا جنون طاری ہے، اور آپ جذبات کے غلبے میں ہیں"۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں طوغان خان؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"جس خلیفہ کو آپ اسلام کی مرکزیت اور عظمت کی علامت بنائے ہوئے ہیں وہ اقتدار کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا میرا بھائی ایلک خان اور دوسرے والی اور حکمران جو غزنی اور خراسان پر قابض ہونے کی خاطر آپ سے برسرپیکار رہتے ہیں"۔

"کیا آپ خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کی بات کر رہے ہیں؟" محمود غزنوی نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا"۔ طوغان خان نے کہا۔ "میں کچھ عرصہ پہلے بھی آپ کو اس خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا لیکن ایک تو اپنے بھائی ایلک خان کے ڈر سے خاموش رہا اور دوسرا خدشہ یہی تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور آپ میری نیت پر شک کریں گے۔ میں بھی آپ کی طرح خلافت کا معتقد ہوں لیکن اس خلیفہ

کا نہیں جو ایک علاقے کا حکمران بھی ہے اور وہ توسیع پسند ہے"۔

"طوغان خان!" — سلطان محمود نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "خلیفۂ وقت پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لو کہ الزام غلط ہوا تو میں اپنی فوج سے تمہاری اس چھوٹی سی ریاست کو کچل ڈالوں گا"۔

طوغان خان ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ بولا — "جب انسان پر طاقت کا گھمنڈ سوار ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنی لغزشوں کو بھی دانشمندانہ اقدام کہا کرتا ہے اور ان کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتا سلطان! دماغ کو اس گھمنڈ سے آزاد کریں۔ میں خلیفہ کے خلاف بات کر کے آپ سے کیا حاصل کر سکتا ہوں؟ .... میری نیّت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کے خلاف یہاں کا کون سا حکمران نہیں لڑا؟ صرف میں ہوں یا والیٔ قندر قادر خان۔ ہمارے نہ لڑنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم کمزور تھے۔ ہم مل کر آپ کے خلاف ایک طاقت بن سکتے تھے مگر میں اور قادر خان ہمیشہ خانہ جنگی کے خلاف رہے اور ہندوستان پر آپ کے حملوں اور کامیابیوں کے حامی رہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ایلک خان مجھے آپ کے خلاف اکسا چکا ہے، اور میرے انکار پر ....."

"تمہارے علاقے پر فوج کشی کر چکا ہے" — سلطان محمود نے اُس کی بات پوری کر دی جو اُسے اپنے جاسوس بتا چکے تھے۔ "اور طوفانِ برفباری نے اُسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اپنے دربار کی اور اپنی ذاتی زندگی کی کبھی کوئی بات مجھ سے پوچھ لو"۔

"اگر آپ کے جاسوس میری زندگی میں بھی موجود ہیں تو آپ کو میری نیّت پر شک نہیں ہونا چاہیئے" — طوغان خان نے کہا — "اگر آپ کو شک ہے تو آپ کے جاسوس اور مخبر یہاں کوئی کام نہیں کر رہے صرف تنخواہ لے رہے ہیں"۔

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو"۔

"خلیفۂ وقت القادر باللہ عباسی اقتدار پرست اور توسیع پسند ہے" — طوغان خان نے کہا — "کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ خراسان کا آدھا حصّہ اُس کی ریاست ہے؟ اور باقی خراسان آپ کا ہے؟ .... خلیفہ آپ کے خراسان پر بھی قابض ہونا چاہتا ہے، اور اس مقصد کے لیے وہ ایلک خان کو استعمال کر رہا ہے۔ اُسے شہہ دے رہا ہے۔ اُس

نے ایلک خان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے خراسانی علاقے پر فوج کشی کرے تو خلیفہ اُسے در پردہ مالی اور جنگی سامان اور گھوڑوں کی مدد دے گا مگر فوج نہیں دے گا ورنہ آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اگر خلیفہ کو قوم یا اُمتِ رسول ؐ کے اتحاد اور وقار کا خیال ہے تو وہ خلافت کی طاقت اور اختیارات کو ایلک خان کے خلاف کیوں نہیں استعمال کرتا؟ وہ آپ کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے کہ آپ ہندوستان پر حملے جاری رکھیں۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ آپ غزنی سے دور رہیں اور آپ کی جنگی طاقت ہندوستان میں گھٹتی رہے۔ خلیفہ اُس دن کے انتظار میں ہے جس دن اُسے اطلاع ملے گی کہ سلطان محمود ہندوستان میں مارا گیا ہے یا پکڑا گیا یا شکست کھا کر کہیں بھٹک رہا ہے۔ امیر عبدالملک، فائق بیگتوزن ابوالقاسم سجوری اور دارا بن قبوس آپ کے دشمن ہیں۔ ان سب کو آپ کے خلاف متحد کرنے والا خلیفہ القادر باللہ عباسی ہے۔ خانہ جنگیوں کے پیچھے خلیفہ کا ہاتھ ہے۔"

محمود غزنوی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جس گدی کو مقدس سمجھتا تھا وہی اُس کی دشمن نکلی۔

"اگر آپ کو ثبوت چاہیئے تو میں مہیا کروں گا"۔ طوغان خان نے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرا سفیر آپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔ میری فوجی طاقت کچھ زیادہ نہیں، لیکن میرا ایمان مضبوط ہے۔ ایلک خان نے میرے علاقے پر فوج کشی کی تو خدا نے میری مدد کی۔ برفباری کے طوفان نے اُسے پسپا کر دیا۔ وہ ایمان فروش ہے۔"

"جس قوم کا خلیفہ ہی ایمان فروش ہو جائے، وہ قوم ڈاکوؤں اور لیٹروں کا گروہ بن جایا کرتی ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔

مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ اور البرونی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنا دل برداشتہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ جب طوغان خان سے مل کر واپس غزنی آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہُوا اور اُس پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے اُس کی بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ وزیر کے پوچھنے پر بھی اُس نے نہ بتایا کہ طوغان خان کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی ہے جس کا ردِعمل اتنا شدید ہے۔

وہ اُس دور کے ایک ولی ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ خرقانی دو روز کی مسافت جتنی دور رہتے تھے۔ سلطان محمود کبھی کبھی جایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ وہاں اُس کی روح کو روشنی ملتی ہے۔ اب وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُس کی سوچنے کی صلاحیت ہی جیسے مفلوج ہو گئی ہو۔ مسئلہ ہی کچھ ایسا پیدا ہو گیا تھا۔ خلیفہ کو تو وہ اسلام کی عظمت کی مقدس علامت سمجھتا تھا مگر القادر باللہ عباسی خلافت کی سراپا توہین تھا کبھی اُسے طوغان پر غصہ آتا کبھی خلیفہ پر۔ اُسے یقین آ گیا تھا کہ طوغان خان نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ اُس کے لئے روحانی اذیت تھی۔ اُسے رہ رہ کر پیرو مرشد کا خیال آ رہا تھا۔

وہ اُسی روز ابوالحسن خرقانی سے ملنے کو روانہ ہو گیا۔ علی الصبح کا چلا ہُوا دوسرے دن سورج غروب ہونے کے بعد منزل پر پہنچا۔ اُس نے خرقانی کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے اور بولا۔ "روح عذاب میں ہے۔ کوئی راستہ دکھائیے"۔

"کیا ہندوستان سے شکست کھا کر آئے ہو؟" — ابوالحسن خرقانی نے پوچھا۔

"آپ کی دعا سے ہندوستان سے میں کبھی شکست کھا کر نہیں آؤں گا" سلطان محمود نے کہا۔ "فاتح سلطان جب بھی شکست کھاتے ہیں، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کھاتے ہیں"۔

"میں اُن بھائیوں سے بے خبر نہیں سلطان محمود!" — ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "لیکن خدا تمہارے ساتھ ہے"!

"آپ بے خبر نہیں ہوں گے" — سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن آپ یہ سچ ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکیں گے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی میرے خلاف خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے۔ یہ بات مجھے ایلک خان کے بھائی طوغان خان نے بتائی ہے"۔

خرقانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگے۔ "میں اِس سے بھی بے خبر نہیں۔ مجھے جب خلیفہ کی نیّت کا پتہ چلا اُس وقت تم ہندوستان میں تھے۔ تم نہ آتے تو میں خود تمہیں بلا کر اس خطرے سے آگاہ کرتا"۔

"تو کیا میں یقین کر لوں کہ طوغان خان نے خلیفہ کے متعلق جو انکشاف کیا ہے وہ غلط نہیں؟" — سلطان محمود نے کہا۔ "کیا میں دھوکے میں رہا ہوں کہ خلیفہ رسول مقبول صلعم کا خلیفہ

ہوتا ہے؟"

"وہ خلفا مدت گذری مر گئے ہیں جو صحیح معنوں میں خلفائے رسول ؐ تھے"۔۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔"اُن کے بعد جو آئے اور جو آئیں گے، وہ اپنے نفس کے خلیفہ تھے، اپنے نفس کے خلیفہ ہوں گے۔ موجودہ خلیفہ ایک ریاست کا حکمران بھی ہے۔ سمرقند کا والی بھی وہی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اس کے لیے سب سے زیادہ اہم مفاد یہ ہے کہ اُس کی بادشاہی محفوظ رہے۔ موجودہ خلیفہ تو دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنی ریاست کی توسیع کی کوشش میں ہے۔ وہ اُس حکمران کو اپنا دوست بناتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ کے دَور میں القادر باللہ عباسی نے قرامطیوں کے ساتھ در پردہ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا؟ صرف اس لیے کہ قرامطی ایک طاقت بن گئے تھے۔ اس کے بعد جب تم اپنے ایمان اور اپنے عزم کے بل بوتے پر ایک بڑی جنگی طاقت بن گئے اور جب تو نے غزنی پر ہندوؤں کے دو حملے روک کر اُنہیں اُن کے ملک میں جا کر شکست دی، اور جب تم نے قرامطیوں کی حکومت ختم کر کے اُن کے باطل نظریے کو بھی ختم کر دیا تو اِسی خلیفہ نے تمہیں امین الملت اور یمین الدولت کے خطاب عطا کر دیئے اور تمہیں اپنا مرید اور معتقد بنا لیا۔ اُسے، اِس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ہندوستان میں جا کر بت توڑے اور اسلام رائج کیا۔ اِسے دراصل تمہاری طاقت سے خطرہ ہے۔ اِس خطرے کا علاج وہ یہ کر رہا ہے ظاہری طور پر تمہارا دوست بنا ہوا ہے۔ اور در پردہ تمہاری طاقت ختم کرنے کے لئے خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے"۔

"کیا ایک خلیفہ کو ایسا کرنا چاہیئے؟"

"تم اُسے خلیفہ کہہ رہے ہو"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔"میں تو اسے خلیفہ سمجھتا ہی نہیں، نہ یہ شریعت کی رُو سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے لیے زہد و تقوٰی بنیادی شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قوم میں وہ اپنے دوست اور دشمن بنانے والا نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اُسے کوئی دنیاوی لالچ نہ ہو۔ اس شرط کی رُو سے وہ آدمی خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا جس کی اپنی ریاست ہو۔ حکمران خلیفہ ذاتی دلچسپیوں اور تعصّبات کے بغیر رہ نہیں سکتا"۔

"کیا ہم اس خلیفہ کو گدی سے ہٹا نہیں سکتے؟"

"نہیں" ۔۔ ابوالحسن خرقانی نے جواب دیا "خلافت ایک خاندان کی میراث بن گئی ہے، اور خلافت اب اسلام کی عظمت نہیں، ذاتی اقتدار کی گدی بن گئی ہے۔ اُمتِ رسول صلعم کا شیرازہ بکھرنے کا باعث یہی ہے کہ خلافت کا مطلب اقتدار بن گیا ہے۔ یہ شخصی حکومت بن گئی ہے۔ اب ہر خلیفہ ایسا ہی ہوگا اور قوم کا اتحاد اور وقار ریزہ ریزہ ہوتا رہے گا۔ خلیفے ہاتھ میں قرآن لے کر آئیں گے۔ اپنے دوست اور اپنے دشمن بنائیں گے۔ قوم کے لئے مجسم دھوکہ بنے رہیں گے۔ قوم میں پھوٹ ڈالتے رہیں گے۔ اپنے خوشامدی اور مدح سرا پیدا کرتے رہیں گے، اور قوم عربی اور عجمی، غزنوی اور مصری بنتی جائے گی۔ مسلمان مذہب کو بھی شکی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ خلیفہ جو بھی آئے گا وہ امر کل بھی ہوگا"۔

"پھر میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے؟" ۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں خلیفہ کا خوشامدی نہیں بنوں گا"۔

"خلیفہ کو جتا دو کہ تم اُس کی نیت سے واقف ہو چکے ہو" ۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "محمود! انسان جب ایمان فروشی پر اُتر آتا ہے تو اُسے ایمان والے احمق اور جھوٹے لگتے ہیں۔ تم ہندوستان میں اپنے امیر، حاکم اور سالار چھوڑ آئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں آجائیں گے۔ انسان میں دو کمزوریاں بہت ہی خطرناک ہیں۔ یہ کمزوریاں ابلیس کی طاقت ہیں۔ ایک جنسی لذت اور دوسری زر پرستی۔ ہندوستان شہ بازوں اور توہم پرستوں کی سرزمین ہے۔ وہاں کا طلسم بڑا ہی خطرناک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام جن حکام کے سپرد کر آتے ہو، وہ ایمان فروش نہ ہو جائیں۔ تمہارے لیے بہت خطرے ہیں۔ تمہارے لیے بڑی کڑی آزمائش ہے۔ گھبرا نہ جانا"۔

"تو میں خلیفہ کے کان کھول دوں؟"

"حق کی بات کہنے سے نہ ڈرو" ۔۔ خرقانی نے کہا۔ "میں بھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کروں گا"۔

واپس آکر سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کے نام پیغام لکھوایا:
"وہ خراسان کے بیشتر علاقے پر آپ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس میں بہت سا علاقہ سلطنتِ غزنی کا ہے۔ میں آپ کو نقشہ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے جن علاقوں پر نشان لگائے ہیں، وہاں سے اپنے امرا اور اپنی فوج نکال لیں۔ خلیفہ کو تو کسی خطے کا حاکم ہونا ہی نہیں چاہیئے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ میری بات قبول نہیں کریں گے۔ میں احترامِ خلافت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اب جبکہ میری آنکھوں سے پردے اُٹھ چکے ہیں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ صلح وصفائی سے نشان زدہ علاقے مجھے دے دیں۔ میں امید رکھوں گا کہ اپنے رُتبے کا خیال رکھتے ہوئے آپ پس وپیش نہیں کریں گے۔"

مؤرخین محمد قاسم فرشتہ، البیرونی اور گردیزی میں اس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کیا ہے کہ خلیفہ عبدالقادر باللہ عباسی سلطان محمود کی جنگی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ سلطان کی فطرت سے بھی آگاہ تھا کہ سلطان جو کرنے پہ آتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سلطنتِ غزنی کے لوگ سلطان محمود کے معتقد ہو گئے ہیں چنانچہ خلیفہ نے اس کے پیغام کے جواب میں خراسان کے وہ صوبے جن کا مطالبہ سلطان نے کیا تھا، سلطان کو دے دیئے۔ اور وہاں سے اپنے اُمراء اور فوج نکال لی۔

مؤرخین کے مطابق، سلطان محمود مطمئن ہونے کی بجائے طیش میں آگیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ خلیفہ نے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیانتدار نہیں اور شاطر ہے۔ سلطان نے بغداد ایک اور قاصد اس پیغام کے ساتھ خلیفہ کو بھیجا کہ سمرقند پر آپ کا قبضہ ناروا ہے۔ یہ شہر مجھے واپس کریں۔ اس پیغام کے جواب میں خلیفہ نے اپنے ایلچی کو جس کا درجہ سفیر کا تھا، سلطان کے پاس بھیجا۔ ایلچی نے سلطان کو یہ پیغام دیا کہ خلیفہ کسی قیمت پر سمرقند سے دستبردار نہیں ہوگا، اور خلیفہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ اپنے اس مطالبے پر زور دیں گے تو خلیفہ آپ کو ساری قوم کے سامنے

ذلیل و رسوا کر دے گا۔

"خلیفہ سے جا کے کہو کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ دارالخلافت بغداد میں آؤں؟" ___ سلطان محمود نے قہر آلود آواز میں کہا ___ "اگر خلیفہ کی یہی خواہش ہے تو اُسے کہہ دینا کہ اُس کے دارالخلافہ کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا اور ملبہ ہاتھیوں پر لاد کر غزنی لے آؤں گا"۔

ایک انگریز مؤرّخ سَر ایچ ایچ۔ ہوورتھ نے چند دوسرے مؤرخین کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلیفہ سلطان محمود کی اس دھمکی سے سہت ہٹپٹایا۔ اُس کا رُتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ سلطان محمود کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ قصرِ خلافت سے اس بدتمیزی کی معافی مانگے مگر خلیفہ کی کچھ کمزوریاں ایسی تھیں کہ اُس نے دھمکی کا جواب دھمکی سے نہ دیا بلکہ کچھ ایسا ڈھیلا سا جواب دیا کہ سلطان محمود نے سمرقند شہر میں اپنی فوج داخل کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۰۱۲ء آدھا گزر چکا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے سلطان محمود مطمئن تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ انند پال ابھی زندہ تھا مگر اُس کا ڈنک مار دیا گیا تھا۔ وہ سلطان کا باجگزار تھا۔ سلطان کو ہندوستان سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ وہاں کے راجوں مہاراجوں کی سرگرمیاں اور عزائم کیا ہیں۔ اُسے اطلاع ملی کہ انند پال مر گیا ہے اور اُس کی جگہ راج دربار کی گدّی پر اُس کا بیٹا ترلوچن پال بیٹھا ہے۔

تھانیسر کے بت وشنو دیو کی یہ توہین کہ سلطان محمود اُسے غزنی اُٹھا لے گیا تھا، ہندوؤں کے لئے نا صرف ناقابلِ برداشت تھی بلکہ دہشت ناک زیادہ تھی۔ ہندو دیوتاؤں کے قہر منتظر تھے۔ پنڈت تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ بت انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اس کی پرستش کی تھی۔ یہ بت اب غزنی نے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ٹوٹا پڑا تھا، اور اِس کے ٹکڑوں کو گھوڑے اور دوڑ کے مقابلے کے رتھ پیس رہے تھے۔ سارے ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں صبح و شام بجتی تھیں۔ بہت سے پنڈت گنگا کنارے

چلے گئے تھے اور پانی میں کھڑے ہو کر ہری کشن اور بگوان سے بخشش مانگ رہے تھے۔ آندھی آتی یا بجلی چمکتی تو ہندو ہاتھ جوڑ کر دعائیں بڑبڑانے لگتے تھے۔ اپنے باپ جے پال کے بعد مہاراجہ انند پال اٹھا تو طمطراق سے تھا اور اُس نے سلطان محمود کو دو تین میدانوں میں للکارا بھی تھا مگر ہر بار اُس نے شکست کھائی اور پسپا ہوا۔ سلطان سے دوستی کا اعلان کیا اور اُسے دھوکہ بھی دیا۔ آخر دم چھوڑ گیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اُس کی موت کا باعث پے در پے شکستوں کا غم تھا۔ تھانیسر کے مندر کی تباہی کے بعد وہ اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور اُس کے بیٹے ترلوچن پال نے گدّی سنبھال لی۔

اننند پال کی موت پر ہندوستان کے چھوٹے بڑے راجے، مہاراجے اور رائے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اُس کی لاش چِتا پر جل رہی تھی۔ قنوّج کے راجہ نے بلند آواز سے کہا۔ "آج وہ شخص جل کر راکھ ہو گیا ہے جس کی ساری عمر مندروں کی حفاظت میں اسلام کے خلاف لڑتے گزری۔ یہ واحد شخص تھا جس نے اپنے علاقے سے باہر جا کر محمود غزنوی سے ٹکر لی۔ یہ ہم سب کی بزدلی اور اپنے مذہب سے غدّاری ہے کہ ہمارے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں۔ آؤ، اننند پال کے جلتے ہوئے جسم کے شعلوں کی تپش میں عہد کریں کہ ہمیں اپنے مندروں کی آبرو بحال کرنی ہے اور یہاں مسجدوں کو مندر بنانا ہے۔"

"میں عہد کرتا ہوں"۔ کالنجر کے راجہ نے کہا۔ "کہ وشنو دیو کی توہین کا انتقام غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لوں گا۔"

ہر ایک راجہ اور مہاراجہ نے، پنڈت اور رِشی نے جلتی ہوئی چِتا کے قریب ہو کر عہد کیا کہ وہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے اپنی فوج کی لاشوں کا بند باندھے گا۔ یہ الفاظ ہر ایک نے کہے کہ وہ مسجدوں کو مندر اور مسلمانوں کو ہندو اور غزنی کو مہابھارت کی راجدھانی بنائے گا۔ انند پال کا جانشین ترلوچن پال پیچھے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

"راجکمار ترلوچن پال کو بھی جو اَب مہاراج ہیں، کچھ کہنا چاہیئے"۔ ایک رِشی نے کہا۔ "اب مہاراج کو غم کا بوجھ اتار پھینکنا چاہیئے۔ راجپوت آنسو نہیں خون بہایا

کرتے ہیں۔"

جواں سال ترلوچن پال آگے آیا۔ اپنے باپ کی چِتا کے شعلوں کو دیکھا، پھر سب کی طرف دیکھا۔

"آپ میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد پورے کیے ہیں"؟ ___ ترلوچن پال نے کہا ___ "آپ نے اسلام کے آگے لاشوں کا بند پہلے کیوں نہ باندھا؟ جب مسلمان تھانیسر کی طرف بڑھ رہے تھے، اُس وقت آپ سب کہاں تھے؟ یہاں کی مسجدوں کو مندر اور یہاں کے مسلمانوں کو ہندو بنا لینا کوئی مشکل نہیں لیکن راجپوت نہتوں پر وار نہیں کیا کرتے۔ آپ میرے باپ کی تعریفیں کر رہے ہیں لیکن ہر لڑائی میرے باپ کو اپنے علاقے میں لڑنی پڑی۔ آپ میں سے کون ہے جس نے ہمیں اپنی فوج کی کچھ نفری اس لئے دی تھی کہ اُسے ہم پشاور اور لمغان کے درمیان روکے رکھیں؟...... آپ کے پاس صرف الفاظ ہیں۔ آپ خطرے کے وقت اپنی فوجیں ہمیں اس لئے دے دیتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کو ہم اپنے علاقے میں روکے رکھیں اور آپ کی راجدھانیاں محفوظ رہیں۔"

"مہاراج!" ___ ایک مہاراجہ نے پوچھا ___ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"مَیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مَیں اپنی ریاست کو محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کو اپنا دوست سمجھوں گا" ___ ترلوچن پال نے کہا ___ "محمود نے حملہ کیا تو مقابلہ کروں گا مگر یہاں کے مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔"

"تو کیا آپ محمود کے باجگزار رہیں گے؟" ___ مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"ہاں!" ___ ترلوچن پال نے جواب دیا ___ "مَیں باج دیتا رہوں گا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کے مسلمان غزنی کے سلطان کے وفادار اور جاسوس ہیں؟" ___ مہاراجہ کالنجر نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ غزنی کی فوج میں ہزاروں ہندوؤں کا بھی دستہ ہے؟" ___ ترلوچن پال نے کہا ___ "ان میں سے کتنے ہیں جو وہاں سے فرار ہو آئے ہیں؟ ان کے پاس گھوڑے ہیں، ہتھیار اور ہاتھی ہیں۔ وہاں وہ آزاد ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگ کیوں نہیں آتے؟ .... یہاں کے بہت سے مسلمان ہمارے وفادار ہیں۔"

ایک جواں سال خوبصورت عورت عورتوں کے ہجوم میں سے نکل کر ترلوچن پال کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے ترلوچن پال کی نیام سے تلوار کھینچ لی اور تلوار بلند کر کے بولی ــ "تم سب جانتے ہو کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں جو مسلمانوں کو اپنا دوست کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے اُٹھا کر اپنے باپ کی چتا میں پھینک دے۔ چاہے تم مجھے اسی تلوار سے کاٹ دے، میں اعلان کرتی ہوں کہ میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہُوا مارا گیا ہے۔ میں اپنے مذہب کی توہین کا اور اپنے باپ کے خون کا انتقام لوں گی۔ آج سے میں نے اپنے اس خاوند کے ساتھ اپنا جسمانی تعلق توڑ دیا ہے۔ یہ بُزدل ہے جو غزنی کے سلطان کا باجگزار رہنے کا اعلان کر رہا ہے۔"

ترلوچن پال اُس کی طرف لپکا مگر ایک اور جواں سال آدمی تلوار سونت کر دونوں کے درمیان آ گیا۔ وہ بھیم پال تھا۔ ترلوچن پال کا چھوٹا بھائی۔ تمام تاریخ نویسوں نے اس کا نام بھیم پال نڈر لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر نڈر یعنی بے خوف اور دلیر تھا۔

"خبردار ترلوچن پال"! ــ اُس نے کہا "یہاں تمہیں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو تمہارا ساتھ دے گا۔ اگر اِس عورت پر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم اس کے خاوند اور میرے بھائی ہو۔ میں ہوں اپنے باپ کی گدّی کا وارث۔ اس گدّی پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو اس کی توہین کا انتقام لینے کے قابل ہو گا" ــ اُس نے سب کی طرف دیکھا اور تلوار بلند کر کے پوچھا "اگر میں غزنی کے سلطان کو باج نہ دینے کا اعلان کر دوں اور اگر میں وشنو دیو کی توہین کا انتقام لینے کی قسم کھا لوں تو کیا آپ مجھے اپنے باپ کی گدّی کا وارث تسلیم کریں گے؟"

"تم یقیناً مہاراج جے پال اور مہاراج انندپال کے جانشین ہو" ــ ایک پنڈت نے کہا۔

پھر ایک شور اُٹھا ــ "ترلوچن پال کو ہٹا دو .... ترلوچن پال سے تلوار لے لو .... نڈر مہاراج کی جے ہو ...."

یہ شور بلند ہوتا چلا گیا۔ انندپال کی چتا کے شعلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ جلتی ہوئی

لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ ہیبت ناک ہوگئی۔ اور ترلوچن پال جو دراصل بزدل نہیں بلکہ امن پسند اور حقیقت بیں تھا، اس شور اور شعلوں میں ڈوب گیا۔ اس کی حیثیت ایک راجکمار کی سی رہ گئی۔ بھیم پال نڈر اُس وقت کے پنجاب کا راجہ بن گیا۔

•

اُسی رات راج محل میں تمام راجوں، مہاراجوں اور پنڈتوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں ترلوچن پال نہیں تھا۔ اس کا بھائی بھیم پال گفتگو کی قیادت کر رہا تھا۔ سب سے بڑے پنڈت نے تجویز پیش کی کہ تمام مسجدیں مسمار کر دی جائیں اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ غزنی چلے جائیں یا ہندو بن جائیں۔

"یہاں میں اپنے بھائی ترلوچن پال کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم نہتّوں پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے" — بھیم پال نے کہا۔ "ہم دشمن نہیں، دوست پیدا کریں گے۔ مسجدوں کو ہم نے گرا بھی دیا تو کیا ہوگا۔ مسلمان جہاں کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے، وہی اس کی مسجد ہوتی ہے۔ ہمیں سلطان محمود جیسے طاقتور جنگجو سے لڑنا ہے۔ میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنے نام کے ساتھ یہ یاد نہیں چھوڑنا چاہتا کہ بھیم پال نے غزنی کے سلطان سے شکست کھائی اور نہتے مسلمانوں سے انتقام لیا۔"

"ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت گاہیں تباہ ہوئی ہیں اس کا یہ اثر ضرور پڑے گا کہ ہندو اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے" — ایک پنڈت نے کہا۔ "لوگ دیوتاؤں کے قہر سے ڈر رہے ہیں مگر ابھی تک قہر نہیں آیا۔ ہمیں خود قہر بن کر غزنی کی فوج پر گرنا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں، یہ ہمارے دیوتا ہیں اور ان کی توہین کرنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جن قلعوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے، انہیں محاصرے میں لے لیا جائے، مگر دو مہاراجوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ محمود غزنوی اپنی پوری جنگی طاقت سے آجائے گا۔ اس کے لیے ہمیں تیاری کی ضرورت ہے۔ ہمیں تیاری کے لیے وقت چاہئے، پھر ہم محمود کو ہندوستان میں گھسیٹ کر کسی بڑی ہی مشکل جگہ لائیں گے اور لڑائیں

گے ہم اِسے پھندے میں لائیں گے۔

"اس دوران کیا ہمیں یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہم بھیرہ، ملتان اور تھانیسر کے مسلمان سالاروں اور حکام کو ہاتھ میں لیں تاکہ وہ سلطان محمود کے وفادار نہ رہیں"۔۔۔ بھیم پال کے وزیر نے کہا۔ وہ بڑا ہی دانشمند اور تجربہ کار وزیر تھا۔ اس نے کہا۔۔۔"ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ہم ان حکام کو بیکار کر سکتے ہیں"۔

"یہ مسلمان اپنے ایمان اور کردار کے بڑے پکے ہوتے ہیں"۔ بھیم پال نے کہا ۔۔۔ "مجھے امید نہیں کہ آپ ان کے سالاروں اور حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے"۔

وزیر نے ہنس کر کہا ۔۔۔"مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں۔ ہر انسان اوتار اور پیغمبر نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں ایک سی کمزوریاں اور ایک سی خواہشیں ہوتی ہیں۔ جو انسان انہیں دبا لیتے ہیں، وہ رشی مُنی اور مولوی کہلاتے ہیں۔ ہم ان میں یہی کمزوریاں، خواہشیں اور سپنے بیدار کر کے انہیں پستیوں میں گرا سکتے ہیں ..... ہم یہ کام تھانیسر سے شروع کریں گے"۔

اس کانفرنس میں ایک فیصلہ یہ ہوا کہ محمود غزنوی کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دی جائیں اور دوسرا یہ کہ اس کے سالاروں وغیرہ کو ہاتھ میں لینے کی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ ان تیاریوں کے بعد بھیم پال کو سلطان محمود غزنوی کو یہ پیغام بھیجنا تھا کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور انند پال نے سلطان کے ساتھ دوستی کا جو معاہدہ کیا تھا، وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے تجربہ کار سالاروں عبداللہ الطائی، التن تاش اور ارسلان جاذب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ وہاں کی جنگیں اس کے لیے زیادہ خطرناک تھیں۔ ہندوستان میں وہ جن سالاروں کو چھوڑ گیا تھا، وہ تھے تو اچھے جرنیل لیکن ان تین سالاروں کے پائے کے نہیں تھے جنہیں سلطان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان پر شہری انتظامیہ کے حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے۔

تھانیسر میں بہرام غور سالار تھا اور شہری حاکم قطب گزک تھا۔ وہ پہلی بار ہندوستان میں آئے تھے۔ انہیں یہاں کی ہر چیز عجیب لگتی تھی۔ انہوں نے یہ شعبدہ بھی دیکھا تھا کہ دو لڑکیوں کو دو ٹوکروں میں بٹھایا گیا اور خالی ٹوکرے دکھا دیئے گئے۔ پھر لڑکیوں کو انہی

ٹوکروں میں سے برآمد کیا گیا۔ نسوانی حسن کے لحاظ سے غزنی بھی خوبصورت علاقہ تھا لیکن ہندوستان کا حسن انہیں زیادہ جاذب لگا۔ انہیں بتایا گیا کہ ہندوستان طلسماتی سرزمین ہے اور یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ شعبدہ کیا اور کرامات کون سی ہے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں لوگ سانپوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور عورتیں سانپوں کو دودھ پلاتی تھیں۔

ایک روز تھانیسر قلعے میں سات آٹھ راہب آ گئے۔ ان کے ساتھ چار جوان لڑکیاں تھیں۔ ان سب کا لباس ایک ایک سفید چادر تھی جو مردوں کے کندھوں سے ٹخنوں تک گئی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کا لباس بھی یہی تھا اور ان کے سروں پر باریک کپڑے کی اوڑھنیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے رنگ گورے، آنکھیں شربتی اور بال گہرے بادامی تھے۔ ان کے نقش ونگار میں کشش تھی۔ مردوں کی داڑھیاں تھیں۔ ان میں ایک سفید ریش تھا۔

شام کے بعد کا وقت تھا جب یہ گروہ قلعے میں داخل ہوا۔ یہ لوگ راہب اور پرہیزگار لگتے تھے۔ انہوں نے قلعہ دار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کے ساتھ جوان لڑکیاں ہیں اس لیے وہ سرائے میں ٹھہرنے سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لڑکیوں کے لیے محفوظ رہائشی جگہ کی ضرورت تھی۔ انہیں قلعہ دار قطب گزک تک جانے اجازت دے دی گئی۔ انہیں قلعہ دار کی طرف جاتا دیکھ کر سالار بہرام اور اس کا نائب بھی اس عجیب مخلوق کو دیکھنے چلے گئے۔ یہ لوگ لباس سے عجیب نہیں لگتے تھے۔ عجوبہ ایک تو یہ تھا کہ مرد بھی خوبصورت تھے اور لڑکیاں ان سے زیادہ حسین تھیں۔ دوسرا عجوبہ یہ تھا کہ ان میں جو سفید ریش تھا اس کے گلے کے گرد گز سوا گز لمبا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ یہ سیاہ پھن دار ناگ تھا جو اپنا منہ سفید ریش کے چہرے پر اور کبھی سر پر پھیرتا تھا۔ مردوں کے پاس بڑے خوبصورت عصا تھے۔ ہر عصا کے اوپر سانپ کا پھن بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں کی گردنوں سے رنگدار رسیاں لٹک رہی تھیں اور رسیوں کے سروں سے باریک گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں چلتی تھیں تو گھنٹیاں دھیمی آواز سے اس طرح بجتی تھیں جیسے ندی کا پانی پتھروں سے گزر رہا ہو۔

قطب گزک نے ان کا خیر مقدم کیا اور احترام سے بٹھایا کیونکہ وہ شکل وصورت

اور لباس سے قابلِ احترام لگتے تھے۔

"ہم شاید آپ کے دربار میں آنے کی جرأت نہ کرتے" سفید ریش نے کہا۔ "لیکن ہم آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ ایک باطل مذہب کے دشمن ہیں۔ ہمیں دلی خوشی ہے کہ آپ باطل کو کچل رہے ہیں۔ آپ یقیناً اونچے کردار کے لوگ ہیں"۔

"آپ کا مذہب کیا ہے؟" ۔ سالار بہرام نے پوچھا۔

"ہم سانپوں کے پجاری ہیں" ۔ سفید ریش نے کہا ۔ "اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارا حسب نسب اُن یونانیوں سے ملتا ہے جو سکندر اعظم کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ یونانیوں کا خاص فرقہ تھا جو سانپوں کا پجاری تھا۔ ان کے متعلق ایک روایت ہے کہ وہ ہمیشہ ایک شیش ناگ کی تلاش میں رہتے تھے جو انہیں یونان میں نہ مل سکا۔ یہاں ہندوستان میں انہیں مل گیا۔ وہ سکندر اعظم کی فوج سے الگ ہو گئے اور شیش ناگ کے پیچھے چل پڑے۔ روایت ہے کہ یہ ناگ اُن کے لیے خدا نے بھیجا تھا۔ اُس کا رنگ لال اور سنہری تھا۔ اُس کے سر پر کلغی تھی اور وہ ایک سیاہ ناگ کی پیٹھ پر سوار تھا....

"شیش ناگ آگے آگے چل پڑا۔ ہمارے آباؤ اجداد کے چند آدمی اُس کے پیچھے گئے۔ وہ ایسے دشوار گذار علاقے میں چلا گیا جہاں عام انسان نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں چٹانیں ہیں جو اوپر سے تلوار کی دھار کی طرح ہیں۔ دریائے جمنا کی ایک شاخ اس علاقے میں سے گذرتی ہے۔ اس کے اوپر قدرت کا بنایا ہوا پل ہے جو دریا کی چوڑائی جتنا لمبا پتھر ہے۔ چوڑائی میں لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے۔ اس پر ایک انسان کا پاؤں آ سکتا ہے۔ گرنے کا خطرہ ہر قدم پر ہے نیچے دریا تنگ ہے کیونکہ پہاڑوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ گہرائی بہت زیادہ اور بہاؤ بہت تیز ہے ....

"شیش ناگ اس کے اوپر سے گذر گیا۔ چار آدمی اس کے پیچھے گئے۔ دو پھسل کر گر پڑے اور دریا انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ دو آدمی پار جا پہنچے۔ وہاں ایک خوشنما جگہ تھی جو ناگوں کی بستی تھی۔ ہمارے آباؤ اجداد وہیں آباد ہو گئے۔ ہم وہیں سے آئے ہیں۔ ہم سانپوں میں رہتے ہیں"۔

"کیا آپ سانپ کو خدا مانتے ہیں؟"

"خدا تو ہم خدا کو ہی مانتے ہیں" — سفید ریش نے کہا "لیکن سانپ کو ہم اس لیے لائقِ پرستش سمجھتے ہیں کہ یہ خدا اور انسان کے رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ شیطان بھی ہے فرشتہ بھی۔ لوہے اور پتھر کو سونا بنانے کی طاقت اور کرامات کس کے پاس ہے؟ — صرف سانپ کے پاس۔ یہ ایک خاص قسم کا سانپ ہوتا ہے۔ اگر اس کی عمر ایک سو سال پوری ہو جائے تو اس کے جسم میں ایک گولی پیدا ہو جاتی ہے جو چمکتی ہے۔ اسے کوئی مَن کہتا ہے کوئی منکا۔ سانپ اسے ہر وقت منہ میں رکھتا ہے۔ کسی کسی وقت اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ گولی کو ہوا میں اچھالتا اور اسے پکڑ لیتا ہے۔ یہ گولی اگر لوہے کے ٹکڑے پر رگڑو تو لوہا سونا بن جاتا ہے۔ اسے اپنی تلوار پر رگڑیں تو تلوار سونا بن جائے مگر آج تک کوئی انسان یہ گولی حاصل نہیں کر سکا۔ رات کو سانپ سو نہیں سکتا۔ وہ گولی منہ سے نکال کر زمین پر رکھتا ہے اور اس پر کنڈلی مار لیتا ہے۔ تب اُسے نیند آتی ہے....

"ایسا سانپ صدیوں بعد سننے میں آتا ہے، مگر صرف سننے میں آتا ہے۔ اسے دیکھا کسی نے نہیں۔ اس کا منکا آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ اسے کوئی حاصل کر بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں مشہور ہے کہ یہ منکا جس کے ہاتھ آجائے گا، وہ سارے ہندوستان کا بادشاہ ہوگا۔ شیش ناگ بھی اس کا غلام ہوگا اور اُس کے محل، اس کی راجدھانی اور اُس کے قلعوں کی حفاظت سانپ کریں گے۔ وہ ساری دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند بادشاہ ہوگا۔"

"کیا آپ نے یا آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہ سانپ اور اس کا منکا دیکھا ہے؟"

"نہیں" — سفید ریش نے جواب دیا "ہمارے خطّے میں منکے والا سانپ موجود ہے لیکن وہاں تک ہم میں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی وہاں جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ہم وہ جگہ جانتے ہیں جہاں وہ سانپ ہے لیکن اُس تک پہنچنے کے لیے راستہ اس قدر خطرناک ہے کہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہاں سونا بکھرا

ہُوا ہے اور وہاں ہیرے اور جواہرات ہیں اور ہمارے پروہت کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہیں۔ باہر کی دنیا والوں کو اس خطے کے متعلق علم ہے لیکن سب کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں انسان نہیں، ناگنیں ہیں جنہوں نے اپنا روپ بدل رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ ہماری نسل کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جس قدر حسین ہیں اتنی ہی بدنصیب ہیں عمر کے ایک حصے تک وہ خوش رہتی ہیں مگر آگے چل کر وہ اداس رہنے لگتی ہیں کیونکہ انہیں مرد کی رفاقت میسر نہیں آتی۔"

سفید ریش ایسے انداز سے اس طلسم ہوشربا کی باتیں سنا رہا تھا کہ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام اور اس کے نائب سالار کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اُن کے سامنے چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان سب کے ہونٹوں پر تبسّم تھا۔ غزنی کے یہ حکام ان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ان سے زیادہ خوبصورت بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے؟ انہوں نے مہمانوں کی خوب خاطر مدارت کی اور ان کی رہائش کا شاہانہ انتظام کر دیا۔

وہ سب سونے کے لیے چلے گئے تھے مگر سفید ریش کو قطب گزک نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ وہ سفید ریش سے اُس خطے کے بھید لے رہا تھا اور سفید ریش اُسے کہہ رہا تھا کہ سارے ہندوستان کی بادشاہی کا راز ناگوں کے اِس خطے میں ہے جہاں کوئی اجنبی نہیں جا سکتا اور جانے کی جرأت بھی کوئی نہیں کرتا۔

"کیا وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے؟" ـــ قطب گزک نے پوچھا اور ذرا جھجک کر بولا ـــ "مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڑھاپے کی بیماریوں نے حملے شروع کر دیئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں ایسی جڑی بوٹیاں ہیں ....."

"جو بڑھاپے کے عمل کو روک دیتی ہیں" ـــ سفید ریش نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا ـــ "میرے بال سفید ہو گئے ہیں، لیکن میرے جسم کو ہاتھ لگائیں، جوانوں جیسا مضبوط اور توانا ہے اور میری عمر ایک سو سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ نے ٹھیک سنا ہے ہمارے خطے میں ایسی بُوٹی ہے جس میں سانپوں کا زہر ملا ہُوا ہے۔ صرف ہم لوگ اس بُوٹی سے آگاہ

ہیں۔ یہ صرف جوان ہی نہیں رکھتی بلکہ بڑی لمبی عمر دیتی ہے۔"

قطب گزک کا خیال تھا کہ اِن لوگوں سے وہ اکیلا ہی راز لے رہا ہے، لیکن سالار بہرام جو مردانگی کا خوبصورت مجسمہ تھا، اس عجیب وغریب گروہ کے ایک آدمی اور ایک لڑکی کو اپنے کمرے میں بٹھائے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے خطّے میں لے جا سکتے ہیں؟ وہ آدمی اسے بتا رہا تھا کہ وہ اپنے فرقے اور عقیدے کے ساتھ غدّاری نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کسی بہانے باہر نکل گیا اور لڑکی اس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بہرام نے اس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ اس نے اس سے زیادہ خوبصورت اور تنومند آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

"تم تو جنّت میں رہتی ہو" — بہرام نے کہا۔

"وہ جنّت نہیں جہنّم ہے جہاں اپنے جذبات کچلنے پڑیں" — لڑکی نے کہا۔ "ہماری زندگی ان راہبوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ یہ مُردہ دل لوگ ہیں۔ مجھے آپ کی عورتوں جیسی زندگی چاہیئے۔"

یہاں سے بات چلی تو اُس مقام تک جا پہنچی جہاں دل تو دو ہوتے ہیں لیکن دو جسموں کی جان ایک ہو جاتی ہے۔ لڑکی نے والہانہ محبّت کا اظہار کیا تو بہرام نے اس سے پوچھا کہ کہ سانپ کے منکے کا قصّہ کہاں تک درست ہے؟ لڑکی نے اُسے بتایا کہ وہ ساتھ چل کر اُس کی راہنمائی نہیں کر سکتی، اُسے راستہ سمجھا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے راستہ سمجھانا شروع کر دیا اور بہرام کاغذ پر لکیریں ڈالتا گیا۔

"آپ کے پاس تیروں کا ذخیرہ ہونا چاہیئے" — لڑکی نے کہا۔ "وہاں آپ کو قدم قدم پر سانپ نظر آئیں گے۔ آپ انہیں تیروں سے مار سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو جو سرنگ بتائی ہے اس کے دہانے پر ایک اژدھا کُنڈلی مارے بیٹھا ہوگا۔ اس کے سر پر تیر لگے تو مر جائے گا۔ جسم پر کہیں بھی تیر لگا تو یہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سُرنگ بہت لمبی ہے۔ اس میں سے آپ گزر گئے تو آپ کو شفاف پانی کا ایک چشمہ نظر آئے گا۔ اس کے کنارے پر آپ کو وہ سانپ نظر آئے گا، جس کے پاس وہ منکا ہے وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔ اسے بھی آپ تیر سے مار سکتے ہیں، پھر منکا آپ کا ہوگا۔"

"اور تم مجھے کہاں ملو گی؟"

"میں آپ کو مل جاؤں گی"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

دوسرے دن ناگ پرستوں کا یہ گروہ روانہ ہو گیا اور اپنے پیچھے پُر اسرار سا ہیجان چھوڑ گیا۔

قطب گزک نے اپنے محافظوں میں سے دو کو بلایا۔ یہ دونوں اُس کی نظر میں قابلِ اعتماد اور دلیر تھے۔ اس نے اُن سے کہا۔ "میں نے تمہیں قلعہ دار کی حیثیت سے نہیں، راز دار دوست کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اگر میرا ایک کام کر دو تو میں تمہیں عہدے دے کر غزنی بھیج دوں گا۔ اگر تم فوج سے نکل جانا چاہو گے تو تمہیں نکال دوں گا۔ تم جب یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے پاس اتنا سونا ہو گا کہ تمہاری سات پشتیں کوئی کام کیے بغیر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گی۔ شرط یہ ہے کہ تم یہ راز کسی کو نہیں دو گے کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میں تمہیں ایک خاص لباس میں بھیجوں گا۔"

دونوں نے رضامندی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیں گے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ قطب گزک نے ان کے آگے ایک نقشہ رکھ دیا اور انہیں راستہ سمجھانے لگا۔ جوں جوں محافظ راستہ سنتے جا رہے تھے، ان کے رنگ اُڑتے جا رہے تھے۔

"تم نے کل رات وہ لوگ دیکھے ہوں گے جو سفید چادروں میں ملبوس یہاں آئے تھے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اگر تم اس مقام سے دریا پار کر گئے تو تمہیں وہ سفید ریش آدمی ملے گا جو رات یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ تمہیں ایک بُوٹی اور بہت سا سونا دے گا۔ یہ تم لے کے میرے پاس آ جاؤ گے۔ بوٹی مجھے دے دینا اور سونا تم اپنے پاس رکھ لینا۔"

"یہ بوٹی کیسی ہے؟"۔ ایک محافظ نے پوچھا۔

"ایک بار کھا لو تو انسان ایک سو سال سے زیادہ بھی زندہ رہ سکتا ہے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اور مرتے دم تک انسان جوان رہتا ہے۔"

دو محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مُسکرا دیئے جیسے انہیں سونے

سے زیادہ اس بُوٹی کے ساتھ دلچسپی تھی۔

"دراصل جانا مجھے خود چاہیئے تھا" قطب گزک نے کہا "سفید ریش ناگ پرست نے کہا تھا کہ میں خود جاؤں لیکن تم جانتے ہو کہ قلعہ دار اتنے عرصے کے لیے کس طرح غیر حاضر ہو سکتا ہے۔ مجھے اتنا اختیار ہے کہ تم دونوں کو جہاں چاہوں اور جتنے عرصے کے لیے چاہوں بھیج سکتا ہوں۔"

گذشتہ رات جب بہرام لڑکی سے راستہ سمجھ رہا تھا، اُس وقت سفید ریش قلعہ دار کو راستہ سمجھا رہا تھا اور اُس نے قلعہ دار سے کہا تھا کہ وہ خود آئے۔ اُس نے قلعہ دار سے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان لوگوں کی جس طرح خاطر مدارت کی ہے، اس کے صلے میں وہ اسے ہمیشہ جوان رکھنے والی بُوٹی اور کچھ سونا بھی دے گا۔

اور اب جب ناگ پرست چلے گئے تھے، بہرام اپنے نائب سے کہہ رہا تھا ـــ "تم جاؤ یا میں چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی گیا تو بہانہ بھی معقول ہو سکتا ہے کہ نگر کوٹ تک کے علاقے میں چوکیوں کا انتظام دیکھنا اور اسے بہتر بنانا ہے۔ لڑکی نے مجھے راستہ سمجھا دیا ہے۔ اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو تصوّر میں لاؤ کہ ہم کیا سے کیا بن جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جاؤں یا تم جاؤ، چار پانچ قابلِ اعتماد آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے؟" ـــ نائب سالار نے کہا "کیا آپ نے سوچا ہے کہ اس لڑکی نے اتنا نازک راز آپ کو کیوں دے دیا ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی" ـــ بہرام نے جواب دیا ـــ "وہ چاہتی ہے کہ میں اُس پُراسرار اور دنیا کی نظروں سے اوجھل خطّے سے سونا سمیٹ لوں اور اُسے اپنے ساتھ لے آؤں"۔

"اور میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنی لڑکیوں کی عزّت بچانے کے لیے آپ کو اس لڑکی کے ذریعے دھوکہ دیا ہے" ـــ نائب سالار نے کہا ـــ "انہیں رات

یہاں قیام کرنا تھا۔ وہ دھوکہ دے کر اور اپنی لڑکیوں کی عزّت بچا کر چلے گئے ہیں۔"

"تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟" بہرام نے کہا۔ "میں نے تمہیں اپنا ماتحت نہیں اپنا عزیز دوست سمجھ کر اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ میں وہاں سے جو کچھ لاؤں گا اس میں تمہارا حصّہ بھی ہو گا۔ ذرا سوچو، کیا ہماری قسمت میں اپنے وطن، اور اپنے عزیزوں سے دُور، پردیس میں لڑنا اور کٹ مرنا ہی لکھ دیا گیا ہے؟ یہ مہاراجوں اور سلطانوں کی جنگ ہے۔ خزانے بھرتے ہیں تو ان کے عیش و عشرت ان کے حصّہ میں آئی ہے۔ وہ ہمارے خون اور ہماری جانوں کو جنگ میں جھونک کر سلطان اور مہاراجے بنے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں حق حاصل نہیں کہ ہم موت کے سائے سے نکل کر باقی عمر عیش و آرام سے گزاریں؟"

بہرام نے جب لڑکیوں کے حسن کا ذکر چھیڑا تو نائب سالار کی آنکھوں میں چمک آنے لگی۔ بہرام نے کہا۔ "تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم نہ جاؤ۔ میں جاؤں گا۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ تمہیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ میری غیر حاضری کو چھپائے رکھو اور یہی ظاہر کرو کہ میں دُور دراز کی چوکیوں کو دیکھنے اور انہیں بہتر بنانے کے لیے چلا گیا ہوں۔ قلعہ دار مجھے اس کام سے نہیں روکے گا۔ تمہارا دوسرا کام یہ ہو گا کہ قلعے پر حملے کا خطرہ تو نہیں، لیکن ہم دشمن کے پیٹ میں بیٹھے ہیں۔ دشمن پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر حملہ ہو جائے تو تم قلعے کو بچانے کے لیے جان لڑا دو تاکہ کسی کو میری کمی محسوس نہ ہو۔"

نائب سالار بہرام کی باتوں میں آ گیا۔ اُس نے راز چھپائے رکھنے کا وعدہ کیا اور ان کے سامنے اب مسئلہ یہ آ گیا کہ وہ کون سے چار آدمی ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سونے اور حسین عورت کے لالچ میں تو ہر کوئی اس خفیہ اور پُر اسرار مہم کے لیے تیار ہو جاتا مگر انہیں خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ اتنی زیادہ دولت دیکھ کر یہ آدمی بہرام کو قتل کر دیں گے اور سب کچھ خود لے اڑیں گے۔ ان کے آپس میں لڑ مرنے کا خطرہ بھی تھا، اس لیے چار آدمیوں کے انتخاب میں انہیں بہت محتاط ہونا تھا۔ اُنہوں نے اُسی وقت اپنے چھاپہ ماروں میں سے چار آدمیوں کا انتخاب شروع کر دیا۔

ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کے سوا اس پُر اسرار خطّے کا راستہ کسی اور کو معلوم نہیں۔ سفید ریش ناگ پرست قلعہ دار کو راستہ بتا گیا تھا اور وہ اپنے محافظوں کو وہاں بھیجنے

کے لیے تیار کر رہا تھا قلعہ دار کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا کہ اسے اپنی مہم کو خفیہ رکھنا تھا۔ وہ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جو راز اسے ملا ہے، وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

سفید ریش اپنے گروہ کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے قلعے سے روانہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس پالکیوں والے اونٹ تھے جن پر لڑکیاں سوار تھیں اور مردوں کے لیے دو دو گھوڑوں والی گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ جب یہ قافلہ تھانیسر شہر میں سے گزر رہا تھا تو لوگ انہیں دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے تھے۔ قافلہ شہر سے نکل گیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ سفید ریش نے اپنے ان دو آدمیوں کو جو گاڑی بان تھے، کہا۔ "واپسی پر بھی خیال رکھنا کہ کسی چوکی کے قریب سے نہ گزرنا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کی چوکیاں کہاں کہاں ہیں"۔

دن آدھا گزر گیا تھا جب قافلہ ویران اور سنسان علاقے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کھڈ نالے اور اونچے نیچے ٹیلے اور گھاٹیاں تھیں اور درخت بھی تھے لیکن یہ خنگل سرکنڈوں اور ہاتھی گھاس کا معلوم ہوتا تھا۔ سفید ریش نے قافلے کو آرام کے لیے روک لیا۔ لڑکیاں پالکیوں میں سے نکلیں۔ گھوڑوں سے زینیں اتار دی گئیں۔ دریاں زمین پر بچھا کر سب بیٹھ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ لڑکیاں اچھل کود رہی تھیں۔ سفید ریش اور دوسرے آدمی انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"ہمیں کس طرح پتہ چلے گا کہ ہم نے شکار مار لیا ہے"؟ ــــ ایک لڑکی نے پوچھا۔

"تھانیسر میں ہمارے آدمی موجود ہیں"ــ سفید ریش نے جواب دیا۔ "قلعے کے اندر بھی ہمارے آدمی ہیں۔ اگر قلعہ دار اور سالار ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو ہمارے آدمی کچھ دور تک ان کا تعاقب کریں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ہمارے گمراہ کیے ہوئے جا رہے ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ کہاں کہاں اطلاع پہنچانی ہے۔ وہ جائیں گے ضرور"۔

"جس سالار کے پاس مجھے بھیجا گیا تھا، وہ تو اسی وقت ہوش اور عقل کھو بیٹھا تھا" ــــ ایک لڑکی نے کہا۔

"یہ مت سوچو کہ یہ لوگ اب کیا کریں گے"ــ سفید ریش نے کہا ــ "وہ جو کچھ بھی کریں

گے، وہ ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ تھانیسر ہمیں واپس مل جائے گا۔"
ان میں سے کسی نے چونک کر کہا۔ "میں نے گھوڑے کی آواز سنی ہے۔"
"اپنے گھوڑے کی ہو گی۔" ایک نے کہا۔
کسی نے توجہ نہ دی لیکن یہ آواز اُن کے اپنے کسی گھوڑے کی نہیں تھی۔ یہ قافلہ جب تھانیسر سے دور جنگل میں چلا گیا تھا تو ایک نوعمر لڑکا جو ایک ٹیکری پر بیٹھا تھا، قافلے کو دیکھ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اُس وقت اونٹوں کی پالکیوں کے پردے اُٹھے ہوئے تھے اور لڑکیاں نظر آ رہی تھیں گھوڑا گاڑیوں سے بھی پتہ چلتا تھا کہ قافلہ قیمتی ہے۔ لڑکا اوپر سے سرک کر دوسری طرف سے اُتر گیا اور بہت تیز دوڑتا ہوا کسی طرف غائب ہو گیا تھا۔
لڑکا جہاں رُکا، وہاں دس بارہ آدمی زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور قریب ہی اُن کے گھوڑے بندھے تھے۔ لڑکے نے انہیں بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے، اور اس قافلے کا رُخ کدھر کو ہے۔ ان میں سے ایک آدمی اُٹھا اور لڑکے کے ساتھ چلا گیا۔ اُس نے بھی ایک جگہ چھپ کر دیکھا اور لڑکے کی پیٹھ ٹھونک کر واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ موٹا شکار ہے۔ پہلے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ قافلے کا تعاقب جاری رکھا جائے اور رات کو حملہ کیا جائے لیکن ایک نے کہا کہ دن اور رات کا خیال نہ کرو۔ صرف یہ دیکھو کہ غزنی والوں کی کوئی فوجی چوکی قریب نہ ہو۔ کسی چوکی تک آواز پہنچ گئی تو وہاں سے سپاہی دوڑے آئیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھاگ سکے گا۔
"اِن بدبخت مسلمانوں نے ہمارا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔" ان رہزنوں کے سردار نے کہا۔ "ہم مہاراجوں کو اِسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اپنی راجدھانیوں کے باہر کی وہ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ ان غزنی والوں نے تو جنگل میں بھی اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ یہاں تو ہماری حکومت تھی.... بہتر ہے چل پڑو۔ جہاں تک مجھے یقین ہے، قریب کوئی چوکی نہیں۔"
قریب تو کوئی چوکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سپاہی تھے لیکن غزنی کی فوج کے سات آٹھ سپاہی ایک چوکی میں سے واپس تھانیسر جا رہے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گپ شپ لگاتے چلے جا رہے تھے۔

ناگ پرستوں کا قافلہ کھانا کھا کر آرام کر رہا تھا۔ رہزنوں کا ایک گھوڑا ہنہنایا تھا جس کی آواز قافلے تک پہنچی تھی مگر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ رہزن اپنے گھوڑے ذرا دور چھوڑ آئے ہیں اور پیدل آکر انہوں نے گھیرا ڈال لیا ہے۔

ایک تیر آیا جو قافلے کے ایک آدمی کے سینے میں اُتر گیا۔ سب گھبرائے ہوئے اُٹھے۔ انہیں آواز سنائی دی ”سب ایک طرف کھڑے ہو جاؤ کسی کی آواز نہ نکلے اور کوئی حرکت نہ ہو“ سب ایک طرف ہو گئے سوائے اُس کے جس کے سینے میں تیر اُتر گیا تھا۔ اِردگرد کے سرکنڈوں میں سے دس گیارہ آدمی باہر آئے۔ اُن کی صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ سروں پر صافے اور چہروں پر سیاہ رومال لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ جونہی سامنے آئے، قافلے کے تمام آدمیوں نے اُن سفید چادروں کے اندر سے جو انہوں نے لباس کے طور پر اپنے جسموں پر لپیٹ رکھی تھیں، خنجروں سے بڑی اور بڑی تلواروں سے چھوٹی تلواریں نکال لیں۔

وہ جو لباس سے راہب اور بڑے ہی معصوم لگتے تھے، تیغ زن بن گئے۔ وہ لڑکیوں کو اپنے حصار میں رکھے ہوئے تھے اور رہزن اس حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رہزنوں کی یہ خوش فہمی جلدی رفع ہو گئی کہ وہ ان نہتے راہبوں کو زبانی دھمکی سے زیر کر لیں گے اور اُن کے پاس جو کچھ ہو گا وہ بھی اور ان کی چاروں لڑکیوں کو بھی اٹھالے جائیں گے، مگر اُن کی تلواریں لمبی تھیں۔ اس سے انہوں نے قافلے کے آدھے آدمی مار ڈالے۔ لڑکیوں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے مرے ہوئے آدمیوں کی تلواریں اٹھالیں۔ رہزنوں کو اب لڑکیوں کی یہ للکار سنائی دینے لگی ”راجپوتوں کی بیٹیوں کو تم ہاتھ نہیں لگا سکو گے“۔ دو تین رہزن بھی مارے گئے تھے۔

غزنی کی فوج کے وہ سات آٹھ آدمی جو کسی چوکی سے تھانیسر کی طرف جا رہے تھے، قریب سے گزرے۔ انہیں شور اور للکار سنائی دی۔ وہ رُک گئے اور ادھر دیکھا۔ انہیں ایک جگہ دس گیارہ گھوڑے نظر آئے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں رہزن اور

ڈاکو جنگلوں میں موجود رہتے ہیں اور قافلوں کو لُوٹ لیتے ہیں۔ وہ پیدل یا گھوڑوں وغیرہ پر سفر کرنے کا زمانہ تھا تاجر بھی ان قافلوں کے ساتھ اِدھر اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ اگر قافلہ چھوٹا ہوتا تو اس پر حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ راجوں مہاراجوں نے رہزنی کا کوئی سدّباب نہیں کیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جسے اس نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رکھا تھا، یہ حکم دیا تھا کہ قلعوں اور شہروں سے دُور جو فوجی چوکیاں ہیں، ان کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں گشت کا انتظام کریں اور مسافروں کو حفاظت اور سلامتی مہیّا کریں اور ڈاکوؤں اور رہزنوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر انہیں ختم کریں۔

ان فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کے رُخ اُدھر کو موڑے اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہاں انہیں لاشیں اور خون نظر آیا۔ تین چار نقاب پوش دو لڑکیوں کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجیوں نے انہیں للکارا تو وہ لڑکیوں کو پھینک کر بھاگ اُٹھے۔ ان کے ایک دو اور ساتھی بھی زندہ تھے۔ وہ بھی بھاگ گئے لیکن فوجیوں نے انہیں دُور نہ جانے دیا اور انہیں اُن کے گھوڑوں تک نہ پہنچنے دیا۔ سب کو زندہ پکڑ لیا۔

اِدھر آ کر دیکھا تو صرف یہ دو لڑکیاں زندہ تھیں۔ باقی دو اور ان کے ساتھ سب آدمی مارے گئے تھے۔ لڑکیوں نے ان کی لاشیں دیکھیں تو سفید ریش کے متعلق فوجیوں کو بتایا کہ ابھی زندہ ہے۔ اُسے دیکھا۔ اُس کے جسم پر کئی زخم تھے اور وہ زندہ تھا۔ فوجیوں نے اُس کے منہ میں پانی ٹپکایا اور اُسے اُٹھا کر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکیوں کو دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ رہزنوں کے ہاتھ باندھ کر ان کی رسّیاں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ اُن کے گھوڑے بھی ساتھ لے لیے گئے اور یہ قافلہ تھانیسر کی طرف چل پڑا۔ لاشیں وہیں رہنے دی گئیں۔

جب گھوڑا گاڑیاں، پالکیوں والے اونٹ، اتنے زیادہ گھوڑے اور چار پانچ قیدی گھوڑوں کے ساتھ بندھے ہوتے اور غزنی کے فوجی تھانیسر قلعے میں داخل ہوئے، اُس وقت سُورج غروب ہو چکا تھا۔ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام غور کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتے آئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ رہزن ہیں جنہوں نے راہیوں کے

قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی اور اِن کے کئی آدمی اور دو لڑکیاں قتل کر دی ہیں۔ انہیں ساتھ لانے والے فوجیوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ یہیں سے گئے تھے۔

قلعہ دار نے حکم دیا کہ سفید ریش کو بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ بظاہر یہ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ تھا لیکن قلعہ دار قطب گزک اپنی گم گشتہ جوانی اور لمبی عمر کی خاطر سفید ریش کو بچانا چاہتا تھا۔ طبیب فوراً سرگرم ہو گئے۔ دونوں لڑکیوں پر ایسی دہشت طاری تھی کہ اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں الگ کمرے میں رکھا گیا اور اِن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دو عورتوں کو بلا لیا گیا۔ قلعہ دار اور سالار نے انہیں تسلی دلاسے دیئے اور کہا کہ انہیں فوج کی حفاظت میں اُن کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا۔

سفید ریش بے ہوش تھا۔ رات بھر طبیب اور جرّاح اُس کے زخموں کی مرہم پٹی اور خون روکنے میں لگے رہے اور اُس کے منہ میں دوائیاں ٹپکاتے رہے قطب گزک ان کے سر پر سوار رہا۔ دوسرا دن آدھا گزر چکا تھا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور اُس نے سرگوشی میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ تھانیسر قلعے میں ہے اور قلعہ دار نے اپنی ذاتی نگرانی میں اُس کی مرہم پٹی کرائی ہے۔

وہ شام کے بعد ذرا بولنے کے قابل ہُوا۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کے گروہ کی دو لڑکیاں زندہ بچی ہیں۔ اُس نے دونوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو لڑکیوں کو اُس کے پاس لے گئے۔ اُن لڑکیوں نے بتایا کہ غزنی کے فوجیوں نے انہیں رہزنوں سے بچایا ہے اور انہی فوجیوں نے اُسے زندہ دیکھ کر اُسے تھانیسر تک پہنچایا ہے۔ لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ قلعہ دار اور سالار نے ان کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے اور ان کے لیے دو عورتیں مقرر کر دی تھیں۔

بوڑھے کے آنسو نکل آئے۔ اُس پر جذباتیت غالب آگئی۔ اُس نے لڑکیوں سے کہا۔ "میں ان لوگوں کو مزید دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ قلعہ دار کو میرے ساتھ اپنے فائدے کے لیے دلچسپی ہو سکتی ہے، اُن فوجیوں کو میرے ساتھ کیا دلچسپی تھی؟ یہ لوگ تم جیسی دلکش لڑکیوں کو احترام سے لائے اور تمہاری دیکھ بھال کی۔ انہوں نے مجھے

نئی زندگی دی ..... میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔"

اُس نے قلعہ دار قطب گزک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو قلعہ دار کو اطلاع دی گئی۔ وہ فوراً آگیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

"میں آپ کی فوج کو اس احسان کا صِلہ دینا چاہتا ہوں"۔ سفید ریش نے نحیف آواز میں کہا۔

"آپ اسے احسان نہ سمجھیں" ___ قطب گزک نے کہا۔ "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ میں نے دو آدمی تیار کرلیے ہیں جو آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا چاہیئے۔ باقی رہا ان سپاہیوں کا معاملہ جو آپ کو وہاں سے اٹھا لائے ہیں، تو جب آپ صحت یاب ہو کر واپس جائیں گے، تو ان کے لیے کچھ سونا بھیج دینا۔"

"میرے پاس نہ آپ کے لیے کچھ ہے نہ ان سپاہیوں کے لیے"___ سفید ریش نے کہا۔ "میں احسان کا صلہ آپ کو ہمیشہ جوان رکھنے والی بُوٹی اور سپاہیوں کو سونا دے کر نہیں دینا چاہتا بلکہ اس احسان کا صِلہ یہ ہے کہ آپ کو بتا دوں کہ نہ کوئی ایسی بُوٹی ہے جو انسان کو ہمیشہ جوان رکھ سکتی ہے اور نہ کسی جگہ سونا بکھرا ہوا ہے۔ جو میں کسی کو دے سکوں۔ اب آپ چاہیں تو مجھے اُٹھا کر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دیں اور جو دو لڑکیاں آپ کے پاس ہیں انہیں اپنے قبضے میں رکھ لیں۔ میں آپ کے ساتھ بہت بڑی نیکی کر رہا ہوں کہ آپ کو اپنا راز دے رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے بُوٹی لانے کے لیے دو آدمی تیار کر لیے ہیں، اگر وہ آدمی چلے جاتے تو جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر جاتے۔ آپ کے دو بڑے اہم آدمی میرے ساتھ کی لڑکیوں کے جھانسے میں آگئے تھے۔ وہ سونے اور ہر چیز کو سونا بنانے والے منکے کی تلاش میں نکل گئے ہوتے۔"

قلعہ دار کے چہرے نے کئی رنگ بدلے اور وہ کھسیانہ سا ہو کر دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہو جائیں"___ سفید ریش نے کہا۔ "میں اب بھی آپ کو اسی دھوکے میں رکھ سکتا تھا جو آپ کو دے دیا گیا تھا اور میں آپ کے ہاتھوں صحت یاب

بھی ہو سکتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی فوج کا اخلاق اس قدر اونچا ہے یہ آپ کے مذہب کا کرشمہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم سب لاہور سے آئے ہیں ہمیں بھیم پال ٹھاکر کے وزیر نے بھیجا ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو اور آپ کے سالاروں کو سونے، زروجواہرات اور حسین لڑکیوں کے خواب دکھا کر آپ کو گمراہ کر دیا جائے۔ آپ کو قلعہ سے غائب کرنا بھی مقصود تھا۔"

"آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم گمراہ ہو جائیں گے؟" ــــ قلعہ دار قطب گزک نے پوچھا۔

"آپ انسان ہیں، فرشتہ نہیں" سفید ریش نے کہا۔ "انسان کتنا ہی نیک اور عبادت گذار کیوں نہ ہو، اُس میں عیش وعشرت کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ آپ اس خواہش کو دبا سکتے ہیں، مار نہیں سکتے۔ دولت اور عورت کو عیش وعشرت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم انسان کی کمزوریوں سے آگاہ ہیں۔ ہر انسان میں ہمیشہ جوان رہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے بڑھاپے کو دیکھ کر آپ کی اس کمزوری کو بیدار کر دیا تھا۔ آپ نے کہا کہ آپ کو سونے اور خزانے کی ضرورت نہیں، جوانی کی ضرورت ہے، میں نے کہا کہ وہ میں دوں گا۔"

قطب گزک کے چہرے پر ندامت کے آثار نمودار ہوتے۔

"آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے" ــــ سفید ریش نے کہا ــ "آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ہمارے جال میں اسی طرح آتا جس طرح آپ آگئے تھے۔ ہم ان لڑکیوں کو اس لیے ساتھ لائے تھے کہ آپ کو اپنے بڑھاپے کا احساس ہو... میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے انسانوں کو اتنی قریب سے دیکھا ہے جیسے ان کے ضمیر، ان کے دل اور روحیں بھی دیکھ لی ہوں۔ میں نے آپ پر اپنے اس علم اور تجربے کو آزمایا ہے۔ اپنے نفس کی خواہشات اور دنیا کے لالچ میں آکر انسان اپنی عقل سے باغی ہو جاتا ہے۔ فرض کو انسان بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ تباہی کی طرف جارہا ہے۔ وہ تسلیم نہیں کرتا کہ جوانی کبھی واپس نہیں آتی اور روحانی مسرت سونے اور جواہرات سے اور جسمانی لذت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس راز کو پالیتا ہے۔ اُسے آپ مومن اور ہم رشی کہتے ہیں۔ یہ آپ کا ایمان اور ہمارا دھرم ہوتا ہے۔ جس انسان کی اپنی ذات کا قلعہ کمزور ہوتا ہے، وہ بڑے مضبوط قلعے ہار جاتا اور دشمن

کو دے بیٹھتا ہے۔ آپ اپنے فرض سے ہٹ گئے تھے۔ ہمیں اپنے منصوبے کو ابھی آگے چلانا تھا.....

"میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دو لڑکیاں رہزنوں سے بچ گئی ہیں، انہیں اپنے پاس نہ رکھ لینا، ورنہ یہ آپ کو آپ کے سالاروں اور کمانداروں سے اور انہیں آپس میں ٹکرا دیں گی۔ اگر شکست سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کو اپنے قبضے میں رکھیں۔"

سفید ریش کے زخم ایک مہینے میں ٹھیک ہو گئے۔ اس ایک مہینے میں سالار بہرام غور کو پتہ چل گیا کہ کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں سانپ اور انسان اکٹھے رہتے ہوں، اور دونوں لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ سانپ کے منکے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس انکشاف کے باوجود سفید ریش کا علاج ہوتا رہا اور قطب گزک اس کی تیمارداری میں دلچسپی لیتا رہا۔ دونوں لڑکیوں کو پوری عزت سے رکھا گیا۔ آخر ان کے جانے کا وقت آ گیا۔

"آپ جا رہے ہیں"۔ قطب گزک نے سفید ریش سے کہا۔ "آپ دشمن بن کر آئے تھے اور ہم آپ کو دوستوں کی طرح رخصت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے سلوک کی قدر کرتے ہیں تو ہمیں اس کے عوض یہ بتاتے جائیں کہ آپ کے مہاراجہ کی نیت اور ارادہ کیا ہے۔ کیا وہ ہمارے سلطان کا باجگذار رہے گا یا اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا؟"

"ہم نے آپ کے ایمان اور کردار پر جو حملہ کیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ مہاراجہ بھیم پال آپ کے سلطان کو للکارے گا"۔ سفید ریش نے کہا۔ "وہ اگلی لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ باجگذار نہیں رہے گا۔ اُس نے آپ کے تمام قلعہ داروں اور سالاروں کو ذہنی اور جذباتی طور پر بیکار کرنے کے لیے یہی منصوبہ بنایا ہے جس پر عمل کرنے ہم آتے تھے۔ اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ اس طرح غزنی کی جو فوج یہاں ہے وہ بیکار ہو جائے گی، لیکن اصل منصوبہ یہ ہے کہ وہ کسی بہت ہی دشوار جگہ سلطان محمود کو لڑائے گا اور اس کے ساتھ یہ اعلان کر دے گا کہ وہ سلطان کا باجگذار نہیں"۔

بھیم پال نندر کو تھانیسر سے اطلاع مل چکی تھی کہ اُس نے سفید ریش راہبوں

اور ناگ پرستوں کی صورت میں جو حملہ کیا تھا، ناکام ہوگیا ہے لیکن اُسے یہ نہ بتایا جا سکا کہ اُس کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے راز بھی فاش کر دیا ہے۔ وہ دراصل اس سکیم کا قائل بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی دلیری اور جرأت اور جنگی امور کی سُوجھ بوجھ پر بجا طور پر ناز تھا۔ اُس نے جنگی تیاریاں تیز کر دیں اور کسی بڑی ہی مشکل زمین کا انتخاب کرنے لگا۔

جہلم سے راولپنڈی کی طرف جائیں تو ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سے سڑک بھی گذرتی ہے اور ریل کی پٹڑی بھی۔ ان راستوں کی صورت درّوں کی سی ہے۔ یہاں ایک مقام ہے جسے ٹِلّہ جوگیاں کہتے ہیں اور اس پہاڑی کا نام بال ناتھ ہے۔ روایت مشہور ہے کہ رانجھے نے یہیں آکر جوگیوں کا روپ دھارا اور کانوں میں جوگیوں والے کڑے ڈالے تھے۔

یہ مقام جوگیوں کا مرکز ہُوا کرتا تھا۔ اس کے اردگرد کا علاقہ چٹانی ہے اور کھڈ نالے بھی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دَور میں یہ نشیب اور زیادہ گہرے اور دشوار ہوں گے۔

بھیم پال نڈر نے سلطان محمود غزنوی سے ٹکر لینے کے لیے اس علاقے کا انتخاب کیا اور اپنی فوج کو وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ سلطان کو للکارنے کی صورت میں غزنی کی فوج کو لاہور کی طرف بڑھنے کے لیے اسی علاقے سے گذرنا تھا۔ بھیم پال نڈر وسیع پیمانے پر گھات لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے فوجی کمانڈروں سے کہا کہ وہ فوج کو پہاڑی علاقے سے روشناس کرائیں اور پہاڑی جنگ کی مشق کراتے رہیں۔ وہ زیادہ تر توجہ تیر اندازوں کی طرف دے رہا تھا اور یہ ہدایت کہ تیر انداز بلندیوں سے نیچے نہ آئیں۔ وادیوں میں بکھری ہوئی غزنوی فوج کو گھیرنے کے لیے وہ سوار دستے تیار کر رہا تھا۔ ہاتھیوں کو اُس نے تنگ راستوں اور میدانی علاقوں کے لیے رکھا تھا۔

ایک روز بھیم پال نڈر کو اطلاع ملی کہ تھانیسر سے غزنی کے قلعہ دار کا ایلچی آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک سفید ریش بوڑھا اور دو لڑکیاں ہیں۔ بھیم پال نے انہیں

اندر بلالیا۔ ایلچی نائب سالار تھا جو بارہ محافظوں کے ساتھ آیا تھا۔

"مہاراج!"۔۔۔ ایلچی نے کہا"آپ کی امانت واپس کرنے آیا ہوں ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے بھیجے ہوئے باقی آدمی اور دو لڑکیاں رہزنوں کے ہاتھوں ماری گئی ہیں۔ یہ شخص زخموں سے چُور زندہ تھا۔ اسے ہمارے سپاہی اٹھالائے اور ان دو لڑکیوں کو رہزنوں سے چھُڑا لائے۔ ہم انہیں جلدی واپس کر دیتے لیکن اس بزرگ کا علاج ضروری تھا۔ وہ ہم نے کیا۔ آپ اس سے اور ان لڑکیوں سے پوچھ لیں کہ ہم نے امانت میں خیانت تو نہیں کی؟ ان سے پُوچھ لیں کہ ان کے گروہ کا کوئی فرد ہمارے ہاتھ سے تو نہیں مرا؟"

اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ بھیم پال نڈر جیسا جابر اور جری جنگجو اتنا شرمسار ہُوا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ نائب سالار کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"آپ ہمارے باجگزار ہیں"۔۔۔ نائب سالار نے کہا۔"ہمارا اور آپ کا معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کاروائی نہیں کریں گے لیکن آپ نے ایسی جنگی کارروائی کی ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہندو راجپوت سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے"۔

بھیم پال نڈر یکلخت بیدار ہو گیا اور اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر بولا ۔۔۔"باجگزار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے منہ میں جو آئے وہ کہہ ڈالو"۔۔۔

درباریوں نے اپنی تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے اور انہوں نے چہروں پر قہر بھرے غصّے کے آثار پیدا کر لیے۔ نائب سالار نے نظریں گھُما کر سب کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"ایک آدمی کے خلاف اتنے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟"۔۔۔ نائب سالار نے کہا۔"ہمارے سلطان کے دربار میں اگر اُس کا بیٹا بھی کسی مہمان کو گھُور کر اپنی تلوار پر ہاتھ رکھے تو سلطان اُس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ تلواریں میدان میں نکلا کرتی ہیں۔ اگر تم جنگجو ہوتے تو اس بوڑھے اور ان جوان لڑکیوں سے ہم پر حملہ نہ کرتے۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں۔ ان کی عزّت اور عصمت کو ہتھیار بناتے ہو؟"

ایک وقائع نگار لکھتا ہے کہ بھیم پال کے دربار میں جو آدمی ترجمان کا فرض ادا کر رہا تھا، اُس نے نائب سالار کے ان جملوں کا ترجمہ ذرا ڈھیلی سی زبان سے کیا کیونکہ الفاظ بڑے سخت اور توہین آمیز تھے۔ نائب سالار نے اُسے کہا ۔۔۔ "مجھے معلوم نہیں کہ تم میرے الفاظ کا صحیح ترجمہ کر کے اپنے مہاراج کو سنا رہے ہو یا نہیں، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرا جوش اور جذبہ مہاراج تک نہیں پہنچا رہے۔ میرے پرجوش لہجے میں میری بات مہاراج تک پہنچاؤ۔"

ترجمان نے یہ بھی مہاراجہ بھیم پال نڈر کو سنا دیا۔

"محترم مہمان!" ۔۔۔ بھیم پال نے کہا ۔۔۔ "آپ کا باجگذار میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ مجھے ابھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں باج ادا کروں گا یا نہیں۔ دوستی کا معاہدہ قائم رہے گا۔"

"میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو دعوتِ اسلام دوں" ۔۔۔ نائب سالار نے کہا ۔۔۔ "آپ کے دادا نے ہم سے شکست کھائی، آپ کے باپ نے ہم سے شکست کھائی، اب آپ کی باری ہے۔ آپ نے نوجوان لڑکیوں کی قربانی دی۔ آپ پتھر کے بتوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے۔ آپ کو کیا ملا؟ ۔۔۔ شکست، شرمناک شکست۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ آپ باطل کی پوجا کر رہے ہیں اور آپ کو وہ خدا سزا دے رہا ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور سزا بھی اور جزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے؟ آپ اسلام قبول کر لیں۔"

"ہم کسی ایلچی کو اتنی ڈھیل نہیں دیا کرتے کہ وہ کسی کے دربار میں اُس کے مذہب کی توہین کرے" ۔۔۔ بھیم پال نڈر نے کہا ۔۔۔ "آپ میری اور میرے مذہب کی توہین کر کے مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں دوستی کے معاہدے پر نظرِ ثانی کروں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

نائب سالار چلا گیا۔ سفید ریش اور دونوں لڑکیاں وہیں کھڑی رہیں۔

"لے جاؤ انہیں" ۔۔۔ بھیم پال نے گرج کر کہا ۔۔۔ "انہیں میری نظروں سے اوجھل کر دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حربہ استعمال کیا جائے۔ یہ بوڑھا اور یہ لڑکیاں میرے

لیے طعنہ بنی رہیں گی۔ میں کھلے میدان میں لڑوں گا اور سلطان محمود کو قیدی بنا کر اور مندر میں لے جا کر پوچھوں گا کہ اب بتاؤ خدا کس کا سچّا ہے"۔

جہلم کے قریب کا کوہستانی علاقہ فوجی کیمپ بن گیا۔ وہاں اتنے درخت نہ ہوں گے جتنے فوجی تھے۔ پنڈتوں نے ایک بار پھر مندروں میں سلطان محمود غزنوی کے خلاف وہی پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب کے بھی اس کا اثر وہی ہُوا جو پہلے بھی دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ غیر فوجی لوگ لاہور میں جمع ہونے لگے جو تیغ زنی اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ لوگ مہاراجہ بھیم پال کا خزانہ بھرنے لگے۔ عورتوں نے اپنے زیورات خزانے میں جمع کرا دیئے۔ ہر کسی کے دماغ پر اسلام کا اور جنگ کا بھوت سوار تھا۔ دُور دُور سے ہندو جوان لاہور آنے لگے اور انہیں جہلم کی طرف روانہ کیا جانے لگا۔

محمود غزنوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بھیم پال نڈر کا ارادہ حملہ کرنے کا ہے یا وہ حملے کی دعوت دینا چاہتا ہے۔ ۱۰۱۲ء کا سال گزر گیا۔ ۱۰۱۳ء (۴۰۴ھ) کا سال بھی گزرنے لگا۔ اکتوبر کے وسط میں اُسے مصدقہ اطلاع ملی کہ بھیم پال نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ غزنی کا باجگذار نہیں اور اُس نے دوستی کا معاہدہ بھی توڑ دیا ہے۔ سلطان کو جاسوسوں نے یہ بھی بتا دیا کہ بھیم پال نے اپنی تمام فوج جہلم کے قریب پہاڑی سلسلے میں گھات کی صورت میں پھیلا دی ہے۔

مہاراجہ بھیم پال کو نڈر کا خطاب دیا گیا تھا اور سلطان محمود غزنوی بے صبر تھا۔ کفر کے خلاف ہمیشہ پابرکاب رہتا تھا۔ وہ غصّے سے لال ہو گیا۔ اُس کی فوج نے آرام کر لیا تھا اور اُس نے فوج کی کمی بھی پوری کر لی تھی۔ بھیم پال کا خیال تھا کہ سلطان محمود کچھ دیر بعد غزنی سے چلے گا اور یہاں پہنچتے پہنچتے اُسے چھ مہینے لگ جائیں گے۔ اُس وقت تک موسمِ سرما گزر چکا ہو گا اور موسمِ بہار کا آغاز ہو گا اور یہ موسم لڑائی کے لیے موزوں ہو گا، مگر اُس کے خواب تباہ ہو گئے۔

وہ گھات مکمل کر کے لاہور میں بیٹھا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ غزنی کی فوج مار گلہ

کی پہاڑیوں میں سے نکل آئی ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیاں راولپنڈی کے قریب ہیں۔ بھیم پال نڈر سلطان محمود کی تیز رفتاری سے واقف نہیں تھا۔ وہ لاہور سے عجلت میں روانہ ہوا۔ یہ دوڑ تھی کہ وہ بال ناتھ تک پہلے پہنچتا ہے یا سلطان محمود۔ ہوا یوں کہ سلطان محمود مارگلہ سے نکل کر رات بھر کے لیے رُک گیا۔ اُسے اپنی انٹیلی جنس سے معلوم کرنا تھا کہ دشمن کہاں ہے اور اُس کا ڈیپلائے کیسا ہے اور وہ لڑائی میں کیا انداز اختیار کرے گا۔ اتنی دیر میں بھیم پال نڈر بال ناتھ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی ہے۔ بھیم پال نے اسے قلعے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں قلعہ بند ہو گیا۔

ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ یہ لڑائی مارگلہ میں ہوئی تھی لیکن بیشتر مؤرخین نے بال ناتھ کا سلسلۂ کوہ لکھا ہے۔ یورپی مؤرخوں نے اسے بال نٹ لکھا ہے۔ بیہقی، عطبی اور گردیزی نے اس جگہ کا پرانا نام نندانہ بھی لکھا ہے اور نردین بھی لیکن اس کا محلِ وقوع (عرض بلد اور طول بلد کے حساب سے) جو لکھا ہے وہ ٹلّہ جوگیاں اور پہاڑی بال ناتھ ہے۔

سلطان محمود کو اگلے روز صبح اطلاعیں مل گئیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھیم پال نڈر کس مقام پر قلعہ بند ہے اور وہ زمین کیسی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ بلندیوں پر تیر انداز ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ لاہور تک نہیں جائیں گے اور جہلم کے پہاڑی سلسلے میں سے جو راستہ گزرتا ہے، اُس راستے پر بھی نہیں جائیں گے۔ سلطان نے گائیڈوں کا انتظام کر لیا اور اپنے چھاپہ مار دستوں کو ضروری ہدایات دے کر آگے بھیج دیا۔

بھیم پال نڈر کی فوجی طاقت سلطان محمود کی نسبت خاصی زیادہ تھی اور وہ نہایت اچھی اور جنگی لحاظ سے برتر پوزیشن میں تھی۔ غزنی کی فوج حملہ آور ہو رہی تھی۔ مورچہ بند فوج پر حملہ کرنے والی فوج کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ اس کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ سلطان محمود کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے چھاپہ ماروں کو مہارت چابکدستی

اور ہوشمندی سے استعمال کرنا تھا۔ چھاپہ مار طریقۂ جنگ کا انحصار ذاتی شجاعت اور انفرادی جذبے پر ہوتا ہے۔ چند ایک چھاپہ مار رات کی تاریکی میں اپنے ہدف سے دُور رہیں اور کچھ بھی نہ کریں تو انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ واپس آکر اپنی کارگزاری کے متعلق جھوٹ بول سکتے ہیں۔

سُلطان محمود غزنوی کے چھاپہ ماروں کا انتخاب صرف جسمانی اور ذہنی بھرتی اور مستعدی پر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ مذہب کے لحاظ سے جنونی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسی لیے یورپی مورخوں نے غزنی کے چھاپہ ماروں کو "کریک ٹرولپس" لکھا ہے۔ سلطان محمود ان کے ساتھ دلی پیار سے پیش آیا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ وہ جانباز ہیں جن کی نہ قبر بنتی ہے نہ انہیں جنازہ اور کفن نصیب ہوتا ہے۔

رات کے وقت سلطان محمود کی فوج اس پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گئی جو راولپنڈی کی طرف سے سوہاوہ کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ رات کو ہی چھاپہ مار جَیش آگے چلے گئے۔ ہر جیش میں دس سے بارہ افراد تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ تھا۔ ان کا ہدف وہ چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں جن کے نرغے میں ٹلہ جوگیاں واقع تھا اور جہاں بھیم پال نڈر موجود تھا۔ یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیے کہ دسمبر کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ سردی عروج پر تھی۔ ہندو سمجھتے تھے کہ ایسی یخ بستہ راتوں کو کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوسکتی، اس لیے وہ اپنی پوزیشنوں میں دبکے پڑے تھے۔

چھاپہ مار دبے پاؤں پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ ہندو تیر انداز سوتے ہوئے تھے۔ صرف ایک ایک سنتری کھڑا تھا۔ ان سنتریوں پر قابو پانا مشکل نہ تھا۔ سوتے ہوئے تیر اندازوں کو ختم کر دیا گیا۔ دو تین چوٹیوں پر لڑائی ہوئی کیونکہ وہاں کے تیر انداز بیدار ہو گئے تھے۔ شور شرابا بھیم پال کی خیمہ گاہ تک پہنچا۔ اُس نے معلوم کرانے کے لیے آدمی دوڑائے لیکن کوئی ایک بھی آدمی واپس نہ آیا۔

اگلی صبح سلطان محمود کو رات کے اپریشن کی کامیابی کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنی فوج کے کچھ دستے آگے بھیج کر اس طرح پہاڑیوں پر چڑھا دیے کہ دشمن کو پتہ نہ چل سکا۔ بھیم پال نے جو کچھ سوچا تھا وہ سلطان محمود کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ بھیم پال نڈر کو یہ

بھی توقع تھی کہ سلطان محمود درّے میں سے گزرے گا اس لیے اس نے زیادہ تر فوج اس طرف پھیلائی تھی۔

دوپہر کے وقت (عطبی کے الفاظ میں) سلطان محمود کے دستے پہاڑیوں سے بھوکے بھیڑیوں کی طرح چیختے، چنگھاڑتے گرجتے، نعرۂ تکبیر بلند کرتے بہت تیزی سے اترے پیشتر اس کے کہ بھیم پال نڈر کا ہیڈکوارٹر اور اس کے دفاعی دستے سنبھلتے، مسلمان ان پر جھپٹ پڑے۔ گھات لگانے والے خود گھات میں آ گئے۔ اپنے دادا جے پال کی طرح بھیم پال خوش قسمت تھا کہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پکڑا نہ جا سکا۔ محمد قاسم فرشتہ کے مطابق، بھاگنے سے پہلے اُس نے یہ حکم دیا کہ تمام فوج یہاں سے نکالو اور لاہور کے دفاع میں لگا دو۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہ آیا۔

مرکز ختم ہونے سے اور جھنڈہ غائب ہو جانے سے اور مرکز سے احکام نہ ملنے کی وجہ سے بھیم پال کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ یہ دراصل قلیل تعداد چھاپہ ماروں کی کامیابی تھی۔ غزنی کی فوج جو ڈسپلن کی پابند اور رابطے اور نظم و نسق میں رہ کر لڑنے والی فوج تھی، سارے علاقے کو صاف کرتی گئی۔

جنگی قیدیوں نے بتایا کہ مہاراجہ بھیم پال نڈر کشمیر کی طرف نکل گیا ہے۔ سلطان محمود اس قدر غصّے میں تھا کہ اُس نے ایک سوار دستہ ساتھ لیا اور بھیم پال کے تعاقب میں چلا گیا۔ کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے کشمیر کی فوج نے جس کا کمانڈر تنگا نام کا جرنیل تھا سلطان محمود کی ہراول پارٹی کو گھیر کر مار ڈالا۔ تنگا اس آسان فتح پر اتنا خوش ہوا کہ وہ سلطان محمود کے سوار دستے پر حملہ آور ہوا مگر اسے جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اُس نے زندگی کی سب سے زیادہ بھیانک غلطی کی ہے۔ اُسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سلطان محمود نے اعلان کر دیا کہ یہاں تمام لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ کسی بستی کو آباد نہیں رہنے دیا جائے گا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ عطبی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ ٹلہ جوگیاں میں ایک مندر تھا جس میں ایک بُت تھا۔ (۳۱) کے

متعلق ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ چالیس ہزار سال پرانا ہے۔ سلطان محمود نے اس مندر کو بنیادوں سے ہی اکھاڑ پھینکا اور بُت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

سلطان محمود جولائی ۱۰۱۴ء میں واپس غزنی چلا گیا۔



قلعہ جو سر نہ ہُوا

۱۰۱۴ عیسوی کی آخری سہ ماہی کا واقعہ ہے۔ جہلم کے قریب کے سلسلۂ کوہ کی بال ناتھ ٹیکری پر معمولی سا ایک قلعہ تھا جس میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کا ایک زیادہ نفری والا دستہ رہتا تھا۔ پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کو اس مقام پر شکست دے کر سلطان محمود نے اسے اپنا باجگزار بنالیا تھا۔ سلطان یہاں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی غیر حاضری میں غزنی کی سلطنت کے حالات بگڑنے لگے تھے۔ معاہدے کے مطابق سلطان کو حق حاصل تھا کہ وہ پنجاب میں جہاں چاہے اپنے ایک دو دستے رکھے اور ان کے اخراجات مہاراجہ پنجاب ادا کرتا رہے۔

ان دستوں کو بال ناتھ میں رہتے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ قلعہ دار سارو‌گ نام کا نائب سالار تھا جو (غالباً) مکران کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ایک روز قلعے میں دو گھوڑ سوار آئے۔ ایک امام مسجد تھا اور دوسرا غزنی کی فوج کا سپاہی تھا۔ وہ کشمیر سے آئے تھے۔ سفر بڑا لمبا تھا جس کے اثرات اُن کے چہروں اور جسموں پر صاف نظر آرہے تھے۔ چہرے مرجھائے ہوئے اور ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ ان پر گرد کی دبیز تہہ بتا رہی تھی کہ وہ بہت تیز آئے ہیں اور راستے میں بہت کم رُکے ہیں۔ وہ آتے ہی قلعہ دار سارو‌گ کے پاس چلے گئے۔

"آپ لوگ بہت تھکے ہُوئے ہیں"۔۔۔ سارو‌گ نے انہیں کہا ۔۔۔ "آرام کرلیں پھر میں وہاں کی خبریں سنوں گا"۔

"ہمارے چہروں پر سفر کا اتنا اثر نہیں جتنا اس خبر کا ہے جو ہم سنانے آئے ہیں"۔۔۔ امام نے کہا۔

"کیا ہُوا؟" — ساروگ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا — "کیا ہندوؤں نے ہمارے آدمیوں کو قید میں ڈال دیا ہے؟ آپ لوگوں کو تبلیغ سے روک دیا ہے؟ سلطان کے احکام کی بجاآوری سے آپ کو کسی نے روکا ہے؟"

"نہیں" امام نے کہا — "میں اس سپاہی کو ساتھ لایا ہوں۔ یہ علیٰ شاہد ہے.... میں بھی سپاہی ہُوں۔ صرف امام مسجد نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں خوف سے بھاگ آیا ہُوں۔ کالنجر (کوٹلی کشمیر) جادوگروں کا دیس ہے یا اُس غیر مرئی مخلوق کا جو انسانوں کو دھوکا دینے کے لیے کبھی کبھی انسانوں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ مخلوق جنّات بھی ہو سکتے ہیں اور ارواحِ خبیثہ بھی۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ ہندوؤں کی شعبدہ بازی کا شکار ہو گئے ہیں" — ساروگ نے کہا — "آپ جو کچھ کہ رہے ہیں، اسے میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کروں گا۔ سلطان مجھے ذاتی طور پر منتخب کر کے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں میرے متعلق بتایا گیا تھا کہ میں توہمات سے ڈرنے اور تصوّرات سے خوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ نے ہندوؤں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ آپ امام ہیں۔ امام کو حقیقت بیں ہونا چاہیے۔ آپ قوم کے قائد ہیں۔"

"ہم جو اتنی دور سے آتے ہیں" — امام نے کہا — "اور اتنا تیز آئے ہیں کہ نیند اور بھوک کا خیال نہیں کیا، کیا آپ اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ معاملہ کتنا سنگین ہے؟ آپ نے میری بات سننے سے پہلے ہی کیوں کہ دیا ہے کہ میں حقیقت بیں نہیں ہوں؟"

"اُس لیے کہ جب آپ وہاں کے واقعات سنانے لگیں تو ان میں مبالغہ نہ ہو" ساروگ نے کہا — "اب سناؤ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"کشمیر اس قدر حسین خطّہ ہے کہ طلسماتی لگتا ہے" — امام نے کہا — "کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ انسانوں کا نہیں پریوں کا دیس ہے، یا وہاں اُن انسانوں کی روحیں رہتی ہیں جو زندہ تھے تو نیک اور پاک رہے۔"

"روح خدا کی امانت ہوتی ہے" — ساروگ نے کہا — "انسان مر جاتا ہے تو روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔ کوئی روح زمین پر نہیں رہتی۔ خوابوں اور خیالوں

کی باتیں نہ کریں محترم امام! ..... آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"ہم وہاں گئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ اسلام کیا ہے"۔ امام نے کہا"۔ ہم انہیں نماز پڑھانے لگے اور بتانے لگے کہ مسلمان کے فرائض کیا ہیں اور خدا کے ساتھ مسلمان کا کیا تعلق ہے۔ وہاں کے لوگ سلطان کے حکم سے مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ہم انہیں اسلام کی تعلیم دینے لگے تو وہ دل وجان سے اسلام کو قبول کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں راتوں کو بجلی چمکنے لگی۔ آسمان پر نہ بادل ہوتا ہے نہ گھٹا، بجلی چمکتی ہے۔ میں جس گاؤں میں تھا، وہاں میں نے بجلی کی چمک دیکھی .....

"ایک رات گاؤں کے قریب گھوڑے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں مگر یوں نہیں ہوا کہ آوازیں دور سے آئی ہوں اور قریب سے گزر کر دور چلی گئی ہوں، بلکہ آوازیں اٹھیں اور خاموش ہو گئیں۔ یہ بلاشبہ دوڑتے گھوڑوں کی آوازیں تھیں۔ دن کے وقت گڈریئے جنگل کو نکلے تو ڈرے ہوئے، دوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے سنایا کہ جنگل سے انہیں پہلے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے جا کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ رونے کی آوازیں بند ہوئیں تو بڑی گونجدار آواز آئی "دیوتاؤں کا قہر آ رہا ہے .... پہاڑ پھٹ جائیں گے، جنگل کو آگ لگ جائے گی۔ اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہ کرو....

"میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ ڈریں نہیں۔ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف اللہ کو یاد کریں، مگر ان کی تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار دنوں بعد دوسرے گاؤں کے چند ایک آدمی خوف سے بری طرح کانپتے ہوئے ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہوں نے سنایا کہ ان کے گاؤں کے قریب ایک پہاڑ پھٹ گیا ہے اور اس میں سے کبھی کبھی شعلے نکلتے ہیں اور کبھی کبھی پہاڑ گرجتا ہے۔ جہاں سے پہاڑ پھٹا ہے وہاں سے عجیب وغریب ڈراؤنی شکلوں کے انسان نظر آتے ہیں ....

"ان کی باتیں سن کر میرے گاؤں کے لوگ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ گاؤں سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے انہیں روکا اور بہت سمجھایا مگر وہ خوف سے مرنے لگے۔ میں یہ سمجھا کہ یہ ہندو پنڈتوں کی کارستانی ہے۔ وہ لوگوں کو ڈرا

رہے ہیں کہ وہ اسلام قبول نہ کریں مگر کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں عقل سمجھ نہیں سکتی۔ مثلاً بجلی کی چمک کو میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر میں سمجھ بھی جاؤں تو میں لوگوں کو نہیں سمجھا سکتا۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہُوا ہے جو آپ کو یہ سپاہی سنائے گا۔"

"ہماری چوکی دریا کے کنارے ہے"۔ سپاہی نے کہا۔ "ہمیں ایک رات دو تین عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ چوکی کا کماندار زبیر جلالی مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ ہم آوازوں کی طرف گئے تو آوازیں خاموش ہوگئیں۔ ایک طرف سے دو آدمی آئے۔ زبیر جلالی نے اُن سے پوچھا کہ عورتیں کہاں رو رہی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ایسی کوئی آواز نہیں سُنی۔ اتنے میں عورتیں پھر رونے لگیں۔ زبیر نے ان آدمیوں سے کہا کہ یہ کس کی عورتیں رو رہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ انہیں تو کسی کے رونے کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔ بہت حیران ہُوئے کہ جو آواز ہم سُن رہے تھے، وہ اُن کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی ....

"ان آدمیوں نے ہمیں بتایا کہ اس علاقے میں دو جوان لڑکیاں کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔ جسے نظر آتی ہیں اُسے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ ان کے قریب جاؤ تو غائب ہوجاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں .... ہم چوکی میں واپس آگئے۔ دوسرے دن زبیر جلالی نے مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لیا۔ کہنے لگا کہ وہ رات کے رونے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہاں قریب کوئی آبادی نہیں۔ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں سامنے پہاڑی کی ڈھلان پر دو لڑکیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے کندھوں سے پاؤں تک آسمانی رنگ کا اتنا باریک کپڑا لپٹا ہُوا تھا جس میں سے ان کے جسم نظر آ رہے تھے۔ اُن کے بال کھلے ہُوئے تھے ....

"وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ ہمیں بلا رہی تھیں۔ جہاں وہ کھڑی تھیں وہاں بڑی خوبصورت گھاس اور پھولدار جھاڑیاں تھیں۔ نیچے بھی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ چیل کے لمبے لمبے درختوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ نیچے سے اوپر تک ایک دوسرے کے ساتھ

ملے کھڑے تھے اور انہوں نے سورج کی شعاعوں کو روک رکھا تھا لگتا تھا یہ لڑکیاں اس حسین سبزہ زار کا حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ ہم رک گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہیں۔ زبیر جلالی نے کہا کہ وہ آگے جائے گا۔ ہم نے اسے روکا مگر وہ نہ رُکا۔ ہم دونوں سپاہی آگے نہ گئے۔ ایک لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے زبیر جلالی کو بلایا۔ ہمارے روکنے کے باوجود وہ بڑھتا گیا۔ جب لڑکیوں کے قریب گیا تو یکلخت غائب ہو گیا۔"

"کیا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا؟" ___ سارو گ نے طنزیہ پوچھا۔

"نہیں" ___ سپاہی نے جواب دیا ___ "وہ بہت تیزی سے زمین میں دھنس گیا۔ ہم نے اُسے غائب ہوتا دیکھ کر جب لڑکیوں کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ ہم دونوں سپاہی وہاں سے بھاگ آئے۔ یہ امام صاحب ہمارے علاقے کے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا۔ یہ پہلے ہی ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔"

"مجھے اپنی جان کا اتنا ڈر نہیں جتنا یہ خدشہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ اسلام سے ہٹتے جا رہے ہیں"۔ امام نے کہا ___ "انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہوں نے چونکہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اس لیے ان پر قہر نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں کی مخلوق انہیں سزا دینے کے لیے زمین پر اتر آئی ہے۔"

"چوکی میں اپنے سپاہی بھی اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سلطان نے یہاں کے لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کیا ہے اس لیے یہاں مافوق الفطرت واقعات ہو رہے ہیں" ___ سپاہی نے کہا ___ "کمانڈر زبیر جلالی کا یوں زمین میں دھنس جانا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو سنتا ہے اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ خود اپنے سپاہیوں کے دلوں میں شکوک اور شبہے پیدا ہو گئے ہیں۔"

"کیا تم میں کوئی اتنا دلیر اور جرأت مند نہیں تھا جو وہاں جا کر دیکھتا جہاں تمہارا کمانڈر زمین میں دھنس گیا ہے وہاں گڑھا تو نہیں"۔ سارو گ نے کہا ___ "پہاڑی علاقوں میں گھاس اور جھاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے گڑھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں گڑھا کھودا گیا ہو اور لڑکیاں محض شعبدہ ہوں ... محترم امام! کیا آپ ایمان کی قوت سے واقف نہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایمان مضبوط ہو تو کوئی شعبدہ کامیاب

نہیں ہو سکتا ؟"

امام خاموش رہا ـــ سپاہی بھی چپ رہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا" ـــ سارو گ نے کہا ـــ "سلطان مجھے یہاں اس ملک کی پاسبانی کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے فروغ کے لیے اور اس عظیم مذہب کی پاسبانی کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔"

یہ واقعات کالنجر کے علاقے کے ہیں۔ کالنجر جنوبی کشمیر کا علاقہ تھا جس میں کوٹلی، راجوڑی اور پونچھ تک کا علاقہ شامل تھا۔ آگے چل کر کسی دور میں کالنجر کوٹلی بن گیا اور یہ آج بھی کوٹلی کہلاتا ہے۔ راجوڑی کے قریب لوہ کوٹ یا لوہا کوٹ کا ایک قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اسے لوہا اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ ایک پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔ بلندی کے علاوہ اس کی مضبوطی بھی مشہور تھی اور اسے ناقابلِ تسخیر کہا جاتا تھا۔ کالنجر کا مہاراجہ نندہ رائے تھا۔ پنجاب سے جب بھی کسی مہاراجے نے شکست کھائی وہ بھاگ کر کالنجر جا پہنچا کیونکہ وہ بڑا مضبوط گوشہ عافیت تھا۔ جے پال سلطان محمود سے شکست کھا کر وہیں پناہ گزین ہوا تھا۔ اس کے بیٹے انند پال نے سلطان سے شکست کھائی تو وہیں بھاگ گیا۔ اب بھیم پال نڈر کو غزنی کی فوج نے ٹلہ جوگیاں کے علاقے میں شکست دی تو وہ بھی کشمیر کی وادیوں میں جا چھپا۔

تفصیل سے پچھلی قسط میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بھیم پال نڈر کے تعاقب میں کشمیر تک جا پہنچا۔ راجہ نندہ رائے کے ایک جرنیل تنگا نے سلطان کے ہراول دستے کو گھیر کر بالکل ہی ختم کر دیا لیکن اس کی اُسے یہ قیمت ادا کرنی پڑی کہ اُسے سلطان محمود کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تنگا اپنے دوستوں کے ساتھ جنگی قیدی ہو گیا۔ سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے تنگا اور اس کے تمام کمانڈروں کو ہلاک کر کے لاشیں دریائے جہلم میں پھینک دیں اور اُس کے سپاہیوں کو غلاموں کی حیثیت سے غزنی بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے حکم جاری کر دیا کہ لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ بستیاں اجاڑ دی جائیں گی۔

مہاراجہ نندہ رائے کو جرأت نہ ہوئی کہ قلعے سے باہر آ کر سلطان محمود کا مقابلہ کرتا۔

اُس کی فوجی طاقت خاصی کمزور ہوگئی تھی۔ سلطان نے اُسے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ بھیم پال کو اُس حوالے کر دے یا بھیم پال کی طرح باجگزار ہو جائے۔ راجہ نندہ رائے نے دوسری شرط قبول کرلی۔ بھیم پال نڈر پہلے ہی باجگزار تھا معاہدے کے مطابق کالنجر کے علاقے میں بھی سلطان محمود نے دو تین چوکیاں قائم کر دیں جن میں ایک کماندار کی کمان میں تھوڑی سی نفری رکھ دی اور خود غزنی چلا گیا۔ اُس نے وہاں کی تمام آبادی کو مسلمان ہو جانے کا حکم دے دیا تھا اور اُس نے یہ انتظام بھی کر دیا تھا کہ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ سے ایسے بہت سے مسلمانوں کو جو مذہبی سبق دے سکتے تھے کشمیر بھجوا دیا تھا۔

"کسی پر کوئی مذہب ٹھونسا نہیں جا سکتا" ___ سلطان محمود نے (متعدد مؤرخوں کے مطابق) کہا تھا ___ "میں نے بیشک حکم دیا ہے کہ یہاں کا ہر فرد داشر مسلمان ہو جائے لیکن میں کفّار کا یہ الزام صحیح ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ گنوار اور اجڈ ہیں۔ یہ لوگ حاکم کے حکم کو مذہب سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب وہی ہے جو اُن کے مہاراجہ کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں بتایا جائے کہ مذہب کا تعلق خدا کے ساتھ ہے کسی انسان کے ساتھ نہیں اور خُدا مٹی اور پتھر کا بُت نہیں .... اس علاقے میں مسجدیں کھڑی کر دو تاکہ یہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں تو انہیں پتہ چلے کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی امیر ہے یا غریب، راجہ ہے یا رعایا، ہر کسی کا ماتھا ایک ہی طرح ایک ہی زمین پر سجدے میں رگڑا جاتا ہے۔"

ایک مشہور تاریخ دان سر آرل سٹین کی تحریر کے مطابق سُلطان محمود غزنوی نے کہا تھا ___ "چونکہ لوگوں کو اسلام کی عظمت اور برکت عملاً نہیں دکھائی جاتی اور سلطان کہتا کچھ اور کرتا وہ ہے جو اُس کی اپنی ذات کی عظمت کے لیے موزوں ہوتا ہے، اس لیے مسلمان اپنے ہی مذہب سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی سلطنت میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔ ان لوگوں کو ذہن نشین کراؤ کہ خدا کیا ہے۔ اس کا رسول ﷺ کون ہے اور ان کے احکام کیا ہیں۔"

مہاراجہ نندہ رائے کی شکست خوردہ حکومت دو قلعوں کے اندر قید ہوگئی تھی۔ باہر سلطان محمود اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے احکام دے گیا تھا۔ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ

سے بہت سے ایسے مسلمانوں کو جو تبلیغ اور امامت کرا سکتے تھے، بلا کر علاقے میں پھیلا دیا گیا تھا۔ بعض جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہونی شروع ہو گئی تھیں اور بیشتر گاؤوں میں لکڑی کا ایک ایک جھونپڑہ کھڑا کر کے اسے مسجد بنا لیا گیا تھا۔

اس خطّے کے رہنے والوں کا مذہب وہی تھا جو اُن کے مہاراجہ کا تھا۔ ان کا مذہب پیٹ سے تعلق رکھتا تھا یا اپنی جان سے۔ اب انہوں نے مسلمان فوج کو فاتح دیکھا تو اُس کا مذہب اختیار کر لیا۔ سلطان محمود اسلام کو ان کی روحوں میں اتار دینے کا اہتمام کر گیا تھا مگر ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بھیم پال نڈر کالنجر یا لوہ کوٹ کے قلعے میں پناہ لینے کی بجائے کشمیر کی کسی دُور دراز وادی میں چھپا رہا۔ جب اُسے بتایا گیا کہ سلطان محمود واپس چلا گیا ہے تو وہ کسی ویران راستے سے لاہور پہنچ گیا۔

بہت دنوں بعد لاہور میں دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے جمع ہو گئے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے مندروں کے پنڈت بھی شریک تھے اور ایک بار پھر تجویزیں اور منصوبے پیش ہو رہے تھے کہ اسلام کے سیلاب کو کس طرح روکا جائے۔ پنڈت حسبِ معمول فوجی حکام کو لعن طعن کر رہے تھے۔ بعض نے سلطان محمود کو قتل کرنے پر زور دیا۔ دبی دبی سی ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ سلطان محمود کو اب دریائے سندھ کے پار، پشاور سے بھی دُور روکا جائے اور اس کی فوج کو پہاڑیوں کے اندر گھیر کر بھوکا اور پیاسا مار دیا جائے، مگر اس اجتماع میں کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔

"آپ سب میں اتفاق اور اتحاد صرف اس لیے پیدا نہیں ہو رہا کہ آپ کو اپنے اپنے راج کا فکر ہے" ــــ بڑے پنڈت نے کہا "آپ سب مسلمانوں سے ڈر گئے ہیں۔ تعداد میں مسلمانوں کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے اور وہ اتنی دور سے آ کر لڑتی ہے۔ یہاں کا بچہ بچہ اس فوج کا دشمن ہے۔ یہاں کی زمین اس فوج کی دشمن ہے مگر فتح ہر بار مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا محمود دیو ہے؟ جن ہے؟ بھوت ہے؟ .... وہ آپ کی طرح کا انسان ہے لیکن وہ آپ سب پر اس لیے غالب آ گیا ہے کہ اس کا مذہب جو کچھ بھی ہے وہ اپنے مذہب کا شیدائی ہے۔ اسی

کو مسلمان ایمان کہتے ہیں یہی ان کی طاقت ہے۔ آپ میں سے کسی کو بھی اپنے مذہب کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کے سامنے اپنا دھرم نہیں، بلکہ اپنا آپ، اپنا تخت اور اپنا تاج ہے۔"

سب خاموش تھے۔ پنڈت نے سب پر نگاہ دوڑائی۔

"ہندوستان ہندوؤں کا دیس ہے، ہندوستان دیویوں اور دیوتاؤں کا دیس ہے۔ یہ اللہ اکبر کا نہیں، ہری کشن اور ہر ہر مہادیو کا دیس ہے مگر ہمارے مذہب کی جو توہین ہو رہی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ دھرتی پکار پکار کر کہ رہی ہے کہ یہ کسی ایک بھی مسلمان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آج آپ نے اس دھرتی کی پکار نہ سنی تو ہماری یہ نسل جو جوان ہو رہی ہے مسلمانوں کی غلام ہو گی اور کرشن مراری کی بنسری ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ اپنی آنے والی نسلوں کو اس قہر سے بچاؤ۔ یاد کرو۔ کہ ہمارے باپ دادا نے محمد بن قاسم کا لگایا ہوا اسلام کا پودا جو درخت بن گیا تھا، کس طرح اکھاڑا تھا۔ اس درخت کی جڑیں چندرگپت اور اشوک کے اس دیس کی دھرتی میں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ ہمارے پنڈتوں اور ریشیوں نے دھرم کی لگن دل میں رکھ کر یہ جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں۔ انہوں نے اذانیں خاموش کر دی تھیں....

"جس پاپ کی آپ سب کو سزا مل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے اس جنگ کو اپنے راج پاٹ کی جنگ سمجھ لیا ہے۔ اپنے خیال بدل ڈالو۔ یہ دو مذہبوں کی جنگ ہے اور جو مذہب جیت رہا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام پھیل رہا ہے۔ شکست مہاراج بھیم پال نڈر کو نہیں ہوئی، ہندومت کو ہوئی ہے۔ کالنجر کے اتنے وسیع علاقے کے لوگوں کو ڈرا کر مسلمان بنا لیا گیا ہے اور وہاں مولویوں اور اماموں کی ایک فوج بھیج دی گئی ہے۔ اگر وہاں اسلام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تو آپ کبھی بھی اسلام کو اس دیس سے نہیں نکال سکیں گے۔"

"ہمارے لیے یہ باتیں نئی نہیں" ۔۔ مہاراجہ بھیم پال نڈر نے کہا ۔۔ "اب سوچنا یہ ہے کہ کالنجر کے علاقے میں جس طرح اسلام کا بیج بویا جا رہا ہے، اس کا کیا علاج کیا جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے محمود سے شکست کھائی ہے اور کالنجر کی فوج بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ مجھے تمام مہاراجوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہے۔"

"آپ نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے تو یہ بھی تسلیم کریں کہ آپ آئندہ بھی شکست کھا سکتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "تیاری میں وقت لگے گا۔ اگر یہ جنگ فیصلہ کن نہ ہوئی تو جنگ کے لیے تیاری میں مزید وقت ضائع ہو گا۔ فوری ضرورت یہ ہے کہ کالنجر میں جس طرح تمام تر آبادی کو مسلمان بنا لیا گیا اور اسلام کو ان کے دلوں میں اتارنے کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس کا توڑ سوچا جائے۔"

"آپ وہاں اپنے مذہب کا پرچار نہیں کر سکتے"۔ کالنجر کے راجہ نندہ رائے نے کہا۔ "سلطان محمود وہاں اپنی چوکیاں قائم کر کے کچھ فوج وہاں چھوڑ گیا ہے۔ یہ فوج گشت پر رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس فوج کو سلطان محمود یہ اختیار دے گیا ہے کہ جو کوئی ہندو مت کا پرچار کرے، اسے وہیں قتل کر دو۔ وہاں اگر ہندو مت رہ گیا ہے تو وہ میرے قلعے میں ہے۔ باہر اسلام کی باتیں اور چرچے ہیں اور جن مولویوں اور اماموں کا ذکر آپ نے کیا ہے، انہیں اپنی فوج کا تحفظ حاصل ہے۔"

"ہر کام تلوار سے نہیں کیا جا سکتا"۔ بھیم پال نڈر کے وزیر نے کہا۔ "شعبدے دکھاؤ۔ اگر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو حکم چلائے بغیر انہیں ہم اسلام سے متنفر کر سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پیدا کر سکتے ہیں۔ کہاں ہیں اس فن کے استاد؟ .... انہیں استعمال کرو۔ کالنجر کے جنگل، پہاڑ اور وادیاں اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو ڈراؤ، فریب دو اور خوبصورت چھلکے بھی۔ محمود اپنی فوج کی جو تھوڑی سی نفری چھوڑ گیا ہے، اس پر خوف بھی طاری کرو اور انہیں حسین جال میں بھی پھانس کر بیکار کر دو۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اس دوران جنگی تیاری کرتے رہو۔ اگر ہم نے وہاں اپنی درپردہ کارروائیاں نہ کیں تو وہ علاقہ مسلمانوں کا گڑھ بن جائے گا اور ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"انسان کی کمزوریوں کو استعمال کرو"۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "پیار اور خوف ہر

کسی کی کمزوری ہے۔ پیار اور محبت کا پیغام خواہ جھوٹا ہی ہو، انسان اسے فوراً قبول کرتا ہے۔ مسلمان کو زہر پیار میں لپیٹ کر دو، اور ان لوگوں کے ذہنوں میں ایسے توہمات ڈال دو جو اُن پر خوف طاری کردیں۔ افواہیں پھیلاؤ۔ جھوٹ پھیلاؤ۔ اسلام پھیلانے والے اور اسلام قبول کرنے والے آپ کے جال میں آجائیں گے۔"

یہ ایسی تجویز تھی جو سب کو پسند آگئی اور سب نے اس پر اتفاق کیا۔

۱۰۱۴ء کی آخری سہ ماہی میں آج کے جنوبی کشمیر میں ایسے واقعات رونما ہونے لگے تھے کہ وہاں توہمات اور خوف کی حکمرانی تھی۔ جن گاؤں میں کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں ہُوا تھا وہاں دوسری جگہوں سے افواہیں پہنچ جاتی تھیں۔ ان کے مطابق پہاڑ آگ اگلتے تھے۔ آسمان صاف ہوتا تھا مگر بجلی چمکتی تھی۔ بڑی خوبصورت چڑیلیں مسافروں کے راستے روکتی تھیں۔ لوگ سُن کر ہی ڈر جاتے تھے اور یہ ڈر اُس وقت دہشت بن جاتا تھا جب کوئی اجنبی خوف سے کانپتے ہوئے انہیں سُناتا تھا کہ غزنی کے مسلمان لوگوں کے بچوں کو ذبح کرکے کھاتے ہیں۔

سلطان محمود کی فوج کی ایک چوکی کا کماندار زبیر جلالی زمین میں دھنس گیا تھا۔ یہ حادثہ بڑا سنگین تھا۔ اس کی اطلاع سارو گ تک پہنچانا ضروری تھا۔ تمام چوکیاں جو کالنجر میں قائم کی گئی تھیں، ان کا کمانڈر سارو گ تھا جس کا ہیڈ کوارٹر تلہ جوگیاں کے مقام پر تھا۔ اُسے امام اور سپاہی نے آکر اطلاع دی تو وہ کالنجر کو روانہ ہوگیا۔ اس کے قافلے میں اُس کے چند ایک محافظ تھے۔ قافلہ گھوڑوں پر سوار تھا اور ان کا سامان خچروں اور ٹٹوؤں پر لدا ہُوا تھا۔ اُن سے کچھ دُور دُور دو گھوڑ سوار جا رہے تھے جو لباس اور حال حُلیے سے غریب اور بے ضرر مسافر لگتے تھے۔ وہ سارو گ کے قافلے کو دیکھ کر آگے نکل گئے۔

امام اور سپاہی جب کشمیر سے آرہے تھے تو وہ دیکھ نہیں سکے تھے کہ یہی دونوں گھوڑ سوار اسی طرح اُن سے کچھ دُور دُور چلے آرہے تھے۔ جب امام اور سپاہی بالناتھ میں داخل ہُوئے تو گھوڑ سوار کہیں چلے گئے تھے۔ اب سارو گ امام اور سپاہی کے ساتھ روانہ ہُوا تو دونوں سوار اُن سے دُور دُور چلے جا رہے تھے۔

ساروگ کو کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اہام اور سپاہی راستے سے واقف تھے۔
وہ مسافت کی عام رفتار سے تیز چلے جا رہے تھے۔ اُن کے نیچے سے اونچی نیچی زمین،
پتھریلے کھڈ نالے اگھاٹیاں اور ٹیلے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ انہیں کشمیر کے پہاڑوں
کی برف پوش، سپید سپید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اہام ساروگ کو بتا رہا تھا کہ ان چوٹیوں
کے دامن میں جو خطّہ ہے وہ کس قدر حسین ہے اور وہاں کے لوگوں کا حُسن اس خطّے سے
زیادہ دلکش ہے۔

سفر کی پہلی رات چٹانوں اور ٹیلوں کے علاقے میں آئی۔ قافلہ رات بھر کے لیے رُک
گیا۔ موسم سرد تھا۔ قافلہ جب منزل کو روانہ ہونے لگا تو ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور
بے لگام ہو کر دوڑ پڑا۔ یہ ایک محافظ کا گھوڑا تھا۔ ابھی سوار اس کی پیٹھ پر نہیں بیٹھا تھا۔ محافظ
نے چلّا کر کہا۔ "سانپ ..... ناگ"۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور گھوڑا ڈر کر دوڑ پڑا۔ گھوڑے
اور ٹٹو چلنے کو تیار تھے اس لیے کھلے ہوتے تھے۔ دو گھوڑوں کی خوفزدہ آوازیں سُن کر تمام
گھوڑے، خچر اور ٹٹو ڈر کر بھاگ اُٹھے۔ کسی پر کوئی سوار نہیں تھا۔

سب نے دیکھا کہ ایک ڈیڑھ گز لمبا سانپ رینگ رہا تھا۔ وہ علاقہ سر سبز تھا۔
گھاس اونچی بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی بھی خودرو پودے تھے اور درخت بھی۔ وہاں چٹانیں
اور ٹیلے تھے۔ خچر اور ٹٹو سامان سمیت بھاگ گئے تھے۔ کسی کو سانپ کو مارنے کا ہوش
نہ رہا۔ اصل مسئلہ گھوڑوں کو پکڑنے کا تھا۔ علاقہ ایسا تھا کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ جانور کدھر
نکل گئے ہیں۔ سب اُن کے پیچھے دوڑ پڑے۔ سانپ سے ڈرے ہوئے جانور کو پکڑنا
بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ سب چٹانوں اور ٹیلوں میں غائب ہو گئے تو ایک چٹان کی اوٹ سے دو آدمی
سامنے آئے۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ اِن میں سے ایک آدمی نے سانپ
کو گردن سے پکڑا اور پرے لے جا کر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے
تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ وہاں ایک اور گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ آدمی ایک گھوڑے
پر سوار ہوا اور دوسرے کی لگام پکڑ کر اِدھر آ گیا۔ اُس کا ساتھی گھوڑے پر سوار ہوا اور

دونوں وہاں سے غائب ہو گئے۔

"آج کا دن تو یہ اپنے گھوڑے ٹٹو پکڑتے رہیں گے" ۔۔۔ ایک نے کہا۔ "آگے چلو۔ یہ واپس نہیں جائیں گے" ۔۔۔ "ہو سکتا ہے واپس چلے جائیں" ۔۔۔ دوسرے نے کہا۔۔۔ "ان پر نظر رکھو۔"

دن کا پچھلا پہر تھا جب ساروگ کا قافلہ اس حال میں کالنجر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ نصف قافلہ پیدل تھا اور سامان والے صرف دو ٹٹو ساتھ تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے ان دو چار گھوڑوں اور دو ٹٹوؤں کو پکڑا تھا۔ ساروگ عزم کا پکا تھا۔ میدانِ جنگ کا دھنی تھا۔ کسی دشواری اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُس نے قافلے سے کہا کہ جو پیدل چلتے تھک جائے وہ گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ مَیں خود پیدل چلوں گا۔ ہندوستان کے ناگ ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔

اب راستہ پہاڑیوں کے اندر سے گزرتا تھا۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف دُور نیچے کو گئی ہوئی ڈھلان تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر راستہ مُڑتا تھا۔ کبھی وہ پہاڑیوں کے درمیان چلا جاتا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوائیں یخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں تھا تو بھی بھوک اور پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا..... وہاں پانی کی بہتات تھی اور پھلدار درخت بھی تھے۔ بچے کھچے گھوڑوں کے لیے گھاس ہی گھاس تھی۔

قافلے نے رات چٹانوں میں قدرتی گفوں میں گزاری۔ گھوڑے باہر بندھے رہے۔ روانگی کے لیے گھوڑوں پر زینیں ڈالی گئیں اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ ساروگ خود پیدل چلنے لگا۔ اُس نے امام کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا۔ چونکہ وہ خود پیدل چل رہا تھا اس لیے اُس کے محافظ بھی پیدل چلنے لگے ۔۔۔ اور اچانک امام کا گھوڑا رُک کر تھر تھر کانپنے لگا۔ گھوڑوں کی کیفیت کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی گھوڑوں کے ساتھ گزری ہو۔ ساروگ نے گھبرا کر کہا۔ "گھوڑے سے کُود آؤ" ۔۔۔ اور امام گھوڑے سے کود آیا۔ یہ گھوڑا خوف

سے ہنہنا کر بھاگ اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے گھوڑے بھی بے قابو ہو کر ہنہنانے لگے۔

"سانپ۔ سانپ" ___ کسی نے چلاّ چلاّ کر کہا۔

اب ایک کی بجائے دو سانپ تھے۔ دونوں ایک ہی رنگ کے اور ایک ہی لمبائی کے تھے۔ گھوڑے لگامیں چھڑا کر اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھے تھے اس لیے سب انہیں پکڑنے کو دوڑے، سانپوں کو مارنے کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ دو گھوڑے ڈھلان سے پھسل کر لڑھک گئے۔ نیچے دریائے جہلم بہا چلا جا رہا تھا۔ ساروگ کے محافظ دُور اُوپر کھڑے گھوڑوں کو دریا میں بہتا دیکھتے رہے۔

قافلے کے تمام آدمی جب ہری بھری چٹانوں میں گھری ہوئی اس جگہ سے جہاں انہوں نے رات گزاری تھی، چلے گئے تو وہی دو آدمی سامنے آئے جو چھُپ چھُپ کر قافلے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے دونوں سانپوں کو پکڑ لیا اور تھیلے میں ڈال کر تھیلا ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔

سارو گ کے آدمیوں نے ایک دو گھوڑے اور ایک ٹٹّو پکڑ لیا اور منزل کو روانہ ہو گئے۔

"ایسا ہو نہیں سکتا" امام نے سارو گ سے کہا ___ "یہ علاقہ سانپوں کا نہیں۔ اگر یہاں سانپ ہیں بھی تو باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ سردی ان کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔ مَیں اس سپاہی کے ساتھ اسی راستے گزرا تھا۔ رات کو اس جگہ قیام کیا تھا۔ ہمیں کوئی سانپ نظر نہیں آیا تھا"

"پھر سوچ" ___ سارو گ نے کہا ___ "آپ راستہ بھُول گئے ہیں۔ کوئی آبادی دیکھتے ہیں۔ اس علاقے میں راستے سے بھٹک جانا کوئی بڑی بات نہیں"

سارو گ کا حوصلہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ قافلے کو پیدل لے جا رہا تھا۔ سب کو حوصلہ دے رہا تھا اور وہ اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ امام اُسے غلط راستے پر لے جا رہا ہے۔ وہ چلتے گئے اور شام سے ذرا پہلے انہیں ایک موڑ مڑتے ہی دو گھوڑ سوار آتے نظر آئے۔

سوار اُن کے قریب آکر رُک گئے۔ وہ کُود کر گھوڑوں سے اُترے اور سڑک کے کنارے گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سارو گ اُن کے قریب جا رُکا۔ ان دونوں نے سر جھکا لیے۔ سارو گ نے امام سے کہا کہ آپ ان کی زبان جانتے ہیں۔ انہیں اٹھاؤ اور ان سے راستہ پوچھو۔

امام نے انہیں اٹھنے کو کہا ۔۔۔ وہ اٹھے اور ایک نے ہاتھ جوڑے ہوئے بھکاریوں کے لہجے میں کہا ۔ "ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ ہم نے آپ کا مذہب قبول کر لیا ہے۔"

امام نے انہیں اپنی منزل بتا کر پوچھا "کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟"

"نہیں" ۔۔۔ ایک نے کہا ۔ "ہم آپ کو بہت دُور سے دیکھ کر آئے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ آپ اس علاقے سے زندہ کس طرح نکل آئے ہیں۔ اسے ہم موت کی وادی کہا کرتے ہیں۔ اس علاقے میں تو شیر بھی نہیں آتا۔ یہ سانپوں کا علاقہ ہے۔ آپ جدھر جا رہے ہیں، اُدھر ہر درخت کے ساتھ ایک سانپ لپٹا ہوا نظر آئے گا۔ آپ یہ راستہ چھوڑ دیں" ۔۔۔ اور وہ راستہ بتانے لگا، پھر بولا ۔ "مگر آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ تین چار موڑ مڑ کر آپ بھول جائیں گے کہ کدھر جانا ہے۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ چلے چلیں گے۔"

امام نے سارو گ کو بتایا تو سارو گ نے کہا کہ انہیں ساتھ لے چلو۔ ہم انہیں اُجرت دیں گے۔

دونوں سوار اس پیدل قافلے کے گائیڈ بن گئے۔ راستے میں سارو گ نے امام کی معرفت اِن آدمیوں سے پوچھا کہ وہ ان عجیب و غریب واقعات سے واقف ہیں جو کالنجر کے علاقے میں رونما ہو رہے ہیں؟

"ہم اُدھر سے ہی بھاگ کر آئے ہیں" ۔ ایک آدمی نے جواب دیا ۔ "ہم اپنے بال بچوں کو اِدھر لے آئے ہیں۔"

"کیا تم نے پہاڑوں سے آگ نکلتی دیکھی ہے؟"

"ہم بہت دُور رہتے تھے" ۔۔۔ اسی آدمی نے جواب دیا ۔ "ہم نے دُور سے روشنی

دیکھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُدھر سے آسمان جل رہا ہو۔ راتوں کو بجلی چمکتی دیکھی ہے
.... اور آوازیں آتی ہیں کہ اپنا مذہب نہ چھوڑو۔"

"تم نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے؟"

"ہاں!" ــ اُس نے کہا ــ "ہم اسلام کو سچا مذہب سمجھتے ہیں اِس لیے اُدھر سے بھاگ آئے ہیں۔ ہم آپ کا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔"

دونوں باری باری ساروگ کو وہ واقعات سناتے رہے جو امام اور سپاہی نے ساروگ کے پاس آکر اُسے سنائے تھے۔ دونوں آدمی ڈرے ہُوئے تھے اور امام انہیں تسلّی دے رہا تھا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا .... وہ آدمی غلاموں کے انداز سے آگے آگے چلے جا رہے تھے۔

دیوکوٹ جنوبی کشمیر میں ایک گاؤں ہُوا کرتا تھا جو دیودار اور چیل کی لکڑی کے بنے ہُوئے بیس پچیس گھروں سے مل کر بنا تھا۔ اس کی ساری آبادی ہندو تھی اور وہاں لکڑی کا مندر بھی تھا۔ اس سے تھوڑی دُور غزنی کی فوج کی ایک چوکی تھی جس میں تیس کے لگ بھگ سپاہی رہتے تھے اور اُن کا ایک کماندار ازمیر تھا جو ملتان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ کسی وقت وہ قرامطی ہُوا کرتا تھا۔ سلطان محمود نے ملتان کو فتح کر کے قرامطیوں کی اصلیت بے نقاب کر دی تو قرامطیوں نے سنّی عقیدہ قبول کر لیا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

ایک روز وہ دو سپاہیوں کے ساتھ روزمرّہ گشت پر گاؤں میں گیا۔ سلطان محمود کے حکم سے وہاں سے مندر ہٹا کر مسجد بنا دی گئی تھی اور وہاں ایک امام بھی مقرّر کر دیا گیا تھا جو وہاں کے لوگوں کو اسلام کے سبق دیتا اور انہیں اسلامی عبادت سکھا رہا تھا۔

اس گاؤں کے لوگ بھی دہشت زدہ تھے۔ انہوں نے قریب کی پہاڑی پر بجلی چمکتی اور اس کی روشنی گاؤں پر پڑتی دیکھی تھی۔ امام نے ایک رات باہر جا کر ایسی ہی روشنی میں تین لڑکیاں بالکل برہنہ دیکھی تھیں۔ ہوا بہت تیز تھی جس سے اُن کے بال اُڑ اُڑ کر ان کے چہروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ وہ چٹان کی ڈھلان پر چیل کے پیڑوں کے درمیان کھڑی تھیں۔ رات تاریک تھی۔ سامنے والے پہاڑ پر چمک ہوئی۔ اس کی روشنی

اس چٹان پر پڑی۔ امام اتفاق سے باہر کھڑا تھا۔ اُسے اس روشنی میں جو بہت تیز نہیں تھی سی تھی، ما یہ لڑکیاں نظر آئیں۔ روشنی بجھ گئی۔ ذرا دیر بعد پھر روشنی اسی جگہ پڑی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

امام نے احکام کے مطابق قریبی چوکی میں جا کر کمانڈر ازمیر کو بتایا تھا کہ رات اُس نے کیا دیکھا ہے۔ اُس نے ازمیر کو یہ بھی بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگ اُس کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں کہ اگر اسلام خدا کا مذہب ہے تو امام انہیں اس کا معجزہ دکھائے۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے کی سزا مل رہی ہے اور بہت بڑی آفت آ رہی ہے۔

ازمیر گاؤں میں گیا۔ اُس نے لوگوں کا خوف دور کرنے کی کوشش لیکن وہ خود چکرایا ہُوا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں تھا۔ ولی اللہ نہیں تھا پیغمبر نہیں تھا۔ اُس کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی جس کے زور پر وہ ڈرے ہوئے لوگوں کو قائل کرتا۔ اُس کے پاس ایک ہی دلیل تھی جو اُس نے ان الفاظ میں دی ۔" اگر کسی نے اسلام کے خلاف بات کی تو اُس کی گردن اُڑا دی جائے گی۔"

وہ امام کے ساتھ مسجد میں چلا گیا اور امام سے کہا۔" میں فوجی ہوں۔ آپ امام ہیں۔ عالم ہیں۔ کیا آپ کا علم یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں کو کچھ بتائیں، ورنہ مسلمان سپاہی بھی اسلام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ میں ہاتھوں سے لڑ سکتا ہوں اور لڑا ہوں۔ میں نے قلعوں کی دیواریں پھلانگی ہیں مگر مذہب کے معاملے میں اُجڈ اور بڑا ہی کمزور انسان ہوں۔ مجھے یہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسلام کی پاسبانی اور آپ کی حفاظت کروں۔ سلطان کا حکم ہے کہ لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرو مگر یہاں ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ لوگوں کے دل شکوک اور خوف سے بھر گئے ہیں۔ مجھے کچھ بتائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی گمراہ ہو جاؤں۔"

امام کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ ازمیر وہاں کے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آ گیا۔ وہ پریشان اور مضطرب تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگوں کی یہ آوازیں جیسے تنہائی میں بھی سنائی دے رہی تھیں ۔" اگر اسلام سچا مذہب ہے تو اس کا معجزہ دکھاؤ۔"

اُس کی چوکی ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھی۔ یہ بھی لکڑی کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ رات کو ازمیر بالائی منزل کی کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات اندھیری تھی اور سرد بھی تھی۔ اُسے باہر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کشمیر کے پیڑ پودوں کی مہک اُسے مسحور کر رہی تھی۔ وہ اسلام کا شیدائی تھا مگر یہاں آکر اسلام کڑے امتحان میں پڑ گیا تھا۔ ازمیر کو یقین تھا اور یہ اُس کا ایمان تھا کہ ہندوؤں کا مذہب باطل ہے اور بت پرستی کفر ہے مگر اُس کے لیے ثابت کرنا محال ہو گیا تھا کہ اُس کا مذہب برحق ہے۔

اُسے دُور کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا ڈھلان پر روشنی سی نظر آئی۔ اچھی خاصی چمک تھی۔ یہ روشنی ایک دو بار چمکی اور بجھی۔ ازمیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ کل کسی گاؤں سے یہ خبر اُٹھے گی کہ رات اُن کے گاؤں پر بجلی چمکی تھی، یا یہ کہ رات ایک پہاڑی نے شعلے اُگلے تھے۔

کماندار ازمیر اتنا پریشان ہُوا کہ قبلہ رُو ہو گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے آپ دعا کے لیے اُٹھے۔ وہ گڑگڑایا ــــ "خدائے ذوالجلال! اپنے نام کی لاج رکھ لو۔ اپنے مذہب کی لاج رکھ لو۔ مجھے اپنے نُور کی چمک دکھاؤ کہ میں باطل کی ان روشنیوں کا راز پا کر انہیں بجھا سکوں"۔

اگلی صبح اُس کے دل پر یہی بوجھ تھا۔ وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اپنے مذہب کی عظمت ثابت کرے مگر اُس کے پاس اتنا علم نہیں تھا اور اتنی عقل بھی نہیں تھی۔ سورج اوپر اُٹھ آیا تو وہ گھوڑے پر سوار ہُوا اور اکیلا ہی باہر نکل گیا۔ وہ لوگوں کے جھونپڑوں میں جا کر اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

اُس زمانے میں اس علاقے کا جنگل گھنا تھا اور اس میں درندے بھی پائے جاتے تھے۔ ریچھ بھی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ ازمیر کے پاس برچھی تھی اور کمان بھی۔ وہ چوکی سے کچھ دُور جنگل میں چلا گیا۔ آگے ایک ندی تھی۔ اُسے عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے درختوں کی اوٹ میں جا کر دیکھا تین جوان لڑکیاں ندی میں نہا رہی تھیں اور

ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھیں۔ کمر کے اوپر سے وہ برہنہ تھیں۔ اس سے نیچے ہر لڑکی نے باریک سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔

ازمیر لڑکیوں کے حُسن پر حیران نہ ہوا کیونکہ خدا نے اس خطے کو نسوانی حُسن سے نوازا تھا۔ حیران وہ اس پر ہوا کہ قریب کوئی آبادی نہیں تھی اور یہاں کوئی عورت نہانے یا کپڑے دھونے کے لیے نہیں آتی تھی۔ یہ لڑکیاں دیہاتی بھی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اُسے شک ہونے لگا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ چڑیلیں یا بدروحیں ہیں اور وہ کہیں کہیں، آبادیوں سے دُور نظر آتی ہیں۔

وہ انہیں مبہوت ہو کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی نے ایک طرف دیکھتے ہوئے بڑی زور سے چیخ ماری اور دوڑ پڑی۔ ایک اور لڑکی اُس کے پیچھے دوڑی۔ تیسری جو ندی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اٹھی اور جب دوڑنے لگی تو پانی میں گر پڑی۔ پانی گہرا نہیں تھا۔ گھٹنوں سے بھی نیچے تھا۔ ازمیر درختوں سے آگے ہو گیا۔ تب اُس نے ایک بہت بڑا ریچھ دیکھا جو ندی میں اُتر رہا تھا اور بڑے غصّے سے غرّا رہا تھا۔ لڑکی اُٹھی لیکن ریچھ کو اتنی قریب دیکھ کر اُس پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ پھر گر پڑی۔ ریچھ اُسے پکڑنے کے لیے ندی میں اُتر گیا۔

ازمیر فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکیاں انسان ہیں، چڑیلیں، یا بدروحیں نہیں۔ اُس نے لگام کو جھٹکا دے کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ازمیر نے برچھی کو دائیں ہاتھ میں تول کر پوری طاقت سے برچھی پھینکی۔ برچھی تیر کی طرح گئی۔ ریچھ پانی میں اچھلتا کودتا لڑکی تک پہنچ گیا لیکن اڑتی ہوئی برچھی اُس کے پہلو میں اُتر گئی۔ ریچھ بڑی زور سے غرّایا اور پانی میں گرا۔ وہ پھر اٹھا اور ایک جگہ گھومنے لگا۔ آخر گر پڑا۔

ازمیر گھوڑے سے اُترا اور دوڑ کر ندی سے لڑکی کو اٹھا لیا۔ ریچھ پانی میں آہستہ آہستہ تڑپ رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں جانے کہاں بھاگ گئی تھیں۔ ازمیر نے لڑکی کو گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا۔ کنارے پر پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے اُٹھائے اور اُس پر ڈال دیئے اور واپس چوکی کی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی کو بچانے کی کوشش کر رہا

تھا اور وہ لڑکی سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور دوسری لڑکیاں کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

وہ چوکی میں پہنچا تو اُسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ازمیر نے اُسے گھوڑے سے اتار لیا۔ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خوف اور زیادہ گہرا ہوگیا۔ پہلے وہ ریچھ سے ڈر کر بے ہوش ہوئی تھی، اب ازمیر کو اور اجنبی جگہ کو دیکھ کر اتنی ڈری کہ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ ازمیر نے ہندوستانی زبان میں بات کی جو لڑکی نے سمجھ لی۔ ازمیر نے اُسے کپڑے پہننے اور چلنے کو کہا۔

"تم نے مجھے ریچھ سے بچایا ہے؟" ــ لڑکی نے پوچھا۔

"اگر میں نہ ہوتا یا میرے پاس برچھی نہ ہوتی تو تم زندہ نہ ہوتیں" ــ ازمیر نے کہا ــ "تمہارا جسم چیرا پھاڑا ہوا ندی میں بہہ رہا ہوتا۔ میں نے ریچھ کو مار ڈالا ہے۔ ڈرو مت۔ جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔"

لڑکی کپڑے پہن کر اندر چلی گئی۔ ازمیر اُسے الگ کمرے میں لے گیا اور اُسے غور سے دیکھا۔ لڑکی اُس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" ــ لڑکی نے پوچھا۔

"جس سلوک کا تمہیں ڈر ہے، وہ میں جنگل میں ہی کر سکتا تھا" ازمیر نے کہا ــ "میں نے تمہارے ننگے جسم پر کپڑے ڈالے تھے۔ میں تمہیں بُری نیت سے یہاں نہیں لایا۔ اب بتاؤ کہاں جاؤ گی۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں کی رہنے والی نہیں۔ تمہاری زبان اس خطّے کی نہیں۔ تمہاری ڈیل ڈول اور تمہارا چہرہ اس خطّے کا نہیں۔ تم کسی غریب کسان یا گڈریئے کی بھی بیٹی نہیں۔"

"اگر میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہ دوں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"پوچھے بغیر چھوڑوں گا نہیں" ــ ازمیر نے کہا ــ "ایک پاک امانت کی طرح یہیں رکھوں گا۔"

لڑکی ہنس پڑی اور اُس نے ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں شروع کر دیں جیسے ازمیر

کو بچپن سے جانتی ہو۔ وہ ازمیر کو اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔

"میں مسلمان ہوں لڑکی!" ــــ ازمیر نے کہا ــ "میں اپنے مذہب اور اپنے سلطان سے غداری نہیں کروں گا۔ مجھے پتھر سمجھو۔"

لڑکی نے کچھ اور داؤ آزمائے۔ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی پتھر ہے۔

"تم نے میری جان بچائی ہے" ــــ لڑکی نے کہا ــ "اور تم ویسے نہیں جیسا میں سمجھتی تھی۔ تمہارا حق ہے کہ میں تمہیں اپنے راز سے آگاہ کر دوں، پھر میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو کرنا ... میں اُن چڑیلوں میں سے ایک ہوں جو لوگوں کو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کے روپ میں نظر آتی ہیں، لیکن میں انسان ہوں۔ سب لڑکیاں انسان ہیں۔ ہمارا مستقل ٹھکانہ قلعہ کالنجر میں ہے۔ عارضی ٹھکانہ وہاں سے تھوڑی ہی دُور پہاڑ پر ہے جہاں سے تم مجھے اُٹھا لائے ہو۔ آج رات میں وہاں سے اُس گاؤں پر بجلی چمکانی تھی جو اُس پہاڑی کی دوسری طرف ہے۔"

"بجلی چمکانے کا راز کیا ہے؟"

"تم اُن لوگوں کو پکڑ سکتے ہو" ــــ لڑکی نے کہا ــ "مگر اب مشکل ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میں انہیں زندہ یا مُردہ نہیں ملوں گی تو وہ اپنا راز فاش ہونے کے خوف سے یہاں سے چلے جائیں گے۔ کیا تم کوئی طریقہ سوچ سکتے ہو؟"

"میں تمہیں وہیں لے جا کر چھوڑ دوں گا جہاں سے لایا ہوں" ــــ ازمیر نے کہا ــ "اور خود چھُپ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔ میں انہیں پکڑ لوں گا.... اگر تم نے دھوکہ دیا تو یاد رکھو کہ میں جہاں بھی چھُپوں گا، تم میرے تیر کی زد میں ہو گی۔"

"میں دھوکہ نہیں دوں گی" ــــ لڑکی نے کہا ــ "تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہیں اس کا انعام دوں گی۔"

لڑکی اُسی جگہ پہنچ گئی جہاں ریچھ نے اُس پر حملہ کیا تھا۔ ریچھ ندی میں مرا پڑا تھا۔ پانی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اُسے بہا لے جاتا۔ لڑکی کنارے کنارے آگے چلی گئی اور اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ خاصی دیر بعد ندی کے دوسرے کنارے پر دو آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں

نے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی نے انہیں اشارہ کیا کہ اِدھر آجاؤ۔ وہ دونوں ندی سے گزر کر لڑکی کے پاس آگئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کہاں رہی ہے۔

اونچی گھاس میں سے ازمیر اور چار سپاہی اُٹھے۔ ازمیر کے ہاتھ میں کمان تھی۔ دونوں آدمیوں نے انہیں دیکھا تو وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے مگر ازمیر کی للکار نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔ قریب جا کر انہیں گھیر لیا۔

"ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے چلو" ــــ ازمیر نے انہیں کہا۔

دونوں نے ٹالنے کی اور کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کی لیکن ازمیر نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دونوں نے لڑکی کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اُن کا راز اُسی نے فاش کیا ہے۔ ازمیر نے تلوار نکال لی اور انہیں آگے آگے چلنے کو کہا۔ وہ چل پڑے اور گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ذرا آگے جا کر وہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ درخت بہت زیادہ تھے بیلیں زمین پر بھی پھیلی ہوئی اور درختوں پر بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اُدھر سے کبھی کسی کا گذر نہیں ہوا تھا۔

خاصا اوپر گئے تو پہاڑی کی ابھی چوٹی نہیں آئی تھی۔ وہاں پہاڑی دیوار کی طرح سیدھی ہو گئی تھی۔ وہاں خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس سے ذرا پرے ایک گُف سی بنی ہوئی تھی۔ باہر کی آوازیں سن کر گُف میں سے دو لڑکیاں نکلیں۔ ازمیر نے انہیں ندی میں نہاتے دیکھا تھا۔ وہ فوجیوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ازمیر نے گُف میں جا کر دیکھا۔ وہاں پانچ چھ فٹ اونچا لکڑی کا ایک تختہ رکھا تھا جو قدِ آدم آئینہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ آئینے کی طرح شفاف اور چمکدار تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ــــ ازمیر نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" ــــ ایک آدمی نے کہا ــــ "ہم تو ایسے ہی یہاں آ گئے ہیں"

ازمیر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔ یہ لڑکی ازمیر کی احسان مند تھی۔ اس کے عوض اُس نے ازمیر کو یہ راز بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب پردہ ڈالنا بیکار ہے کیونکہ وہ پردہ اُٹھا چکی ہے۔

ازمیر کو وہ اوپر لے گئے۔ وہاں سے اُس نے دیکھا۔ دور نیچے درختوں اور سبزہ زار نے

میں اپنی چوکی نظر آرہی تھی اور اس سے دُور وہ گاؤں درختوں میں سے ذرا ذرا دکھائی دے رہا تھا جہاں ازمیر گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ پہاڑی جہاں سے عمودی ہو جاتی ہے، وہاں لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی جائے گی۔ یہ آگ نیچے کے گاؤں والوں کو نظر نہیں آ سکتی۔ اس کے سامنے اور اوپر جہاں وہ کھڑے تھے، یہ آئینہ رکھا جائے گا۔ آگ پر تیل پھینکتے رہیں گے جس سے شعلہ اور زیادہ بھڑکے گا اور اوپر کو لپکے گا۔ اس کی چمک آئینے پر پڑے گی۔ آئینے کو چوکی اور پھر گاؤں کی سمت کر کے آہستہ آہستہ ایک دوبار ہلایا جائے گا۔ اس کی چمک دُور نیچے اس طرح پڑے گی جس طرح بجلی چمکتی ہے۔

ازمیر کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ اس رات اس کی چوکی اور گاؤں پر چمک ماری تھی۔ اس سے پہلے کسی اور جگہ سے گاؤں پر چمک ماری جا چکی تھی۔

"یہ عقل کا کھیل ہے ۔۔۔ ایک آدمی نے کہا۔" رات کو پہاڑی سے آگ کا عکس اس چمکدار تختے پر سے لیا جاتا ہے تو دُور نیچے سے دیکھنے والوں کو یوں نظر آتا ہے جیسے یہ چمک آسمان کی ہو۔ ان پہاڑیوں کی بلندیوں سے جو لوگ واقف ہیں، رات کو بھی شک نہیں کر سکتے کہ یہ چمک پہاڑ سے آرہی ہے۔ اگلے روز ہمارے آدمی گاؤں میں جا کر افواہیں پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کے ذہنوں پر یہ غلط بات مسلط کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس لیے انہیں دیوتاؤں کے دہشتناک اشارے مل رہے ہیں کہ وہ اپنے مذہب میں واپس آجائیں ورنہ اُن پر قہر نازل ہو گا ۔۔۔۔ خوبصورت برہنہ لڑکیوں کے روپ میں نظر آنے والی چڑیلیں یہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس خطے کی رہنے والی نہیں۔ یہ لاہور اور بھٹنڈہ کے راج محل کی خاص لڑکیاں ہیں۔"

خُدا نے ازمیر کی دُعا قبول کر لی اور اپنے نور کی چمک دکھا دی تھی۔ یہ اسے اب لوگوں کو دکھانی تھی۔ اُس نے ان آدمیوں اور لڑکیوں کو اپنی چوکی میں لے جا کر پہرے میں بٹھا دیا اور اُن سے پوچھنے لگا کہ ان کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں۔

ساروگ کا قافلہ ابھی تک دو گائیڈوں کی راہنمائی میں چلا جا رہا تھا۔ امام نے کئی بار گائیڈوں سے کہا کہ اب تک انہیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ گائیڈوں نے

انہیں بتایا کہ انہوں نے راستہ لمبا اختیار کیا ہے لیکن یہ محفوظ اور آسان راستہ ہے۔

یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ اُن کے گائیڈ انہیں منزل سے بہت دُور ویرانے میں لے گئے تھے۔ ایک شام قافلے نے ایک جگہ قیام کیا اور گائیڈوں نے انہیں بتایا کہ کل دن کے پہلے پہر وہ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ کھا پی کر فوراً سو گئے۔ صبح اُن کی آنکھ کھلی تو دونوں گائیڈ غائب تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر چلے گئے تھے۔ انہیں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بیکار تھا۔ وہ کہاں نظر آ سکتے تھے۔ ان کے اردگرد اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ نیچے سے اوپر تک چیل کے درختوں نے پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ انہیں وہی راستہ معلوم تھا جس راستے سے وہ آئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور منزل کتنی دُور ہے۔

"ہندو ڈنک مار گیا ہے"۔ ساروگ نے امام سے کہا۔ "اِن دونوں آدمیوں کو معلوم تھا کہ آپ مجھے یہاں کے پُراسرار واقعات بتاتے جا رہے ہیں"۔

"ہم جب بالناتھ سے آ رہے تھے تو میں نے تین چار بار کچھ دور دو آدمی جاتے دیکھے تھے"۔ ایک محافظ نے کہا۔ "میں انہیں مسافر سمجھتا رہا۔ یہ وہی نہ ہوں"۔

"میں نے انہیں اس سے پہلے بھی دیکھا تھا جب ہم نے پہلا سانپ دیکھا تھا"۔ ایک اور محافظ نے کہا۔ "ان کے چہرے نظر نہیں آئے تھے"۔

"وہی تھے یا کوئی اور تھے، اب کیا فرق پڑتا ہے"۔ ساروگ نے کہا۔ "ہم بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈو..... اور دیکھو۔ تھیلوں میں کھانے کی جو بھی چیز باقی ہے وہ پھینک دو۔ ہو سکتا ہے وہ ان میں زہر ملا گئے ہوں"۔

ان کی بڑی ہی کٹھن اور خطرناک مسافت شروع ہو گئی۔ دن بھٹکتے گذر گیا۔ رات آ گئی جو انہوں نے سو کر گذاری لیکن یہاں سردی زیادہ تھی۔ اگلا دن بھی سبز پوش وادیوں میں بھٹکتے گذر گیا۔

اگلی رات جب وہ سردی سے بچنے کے لیے کوئی جگہ دیکھ رہے تھے، اُن کے

گائیڈ جو انہیں اتنے حسین ویرانے اور اتنی پُر پیچ بھول بھلیوں میں چھوڑ گئے تھے، قلعہ لوہ کوٹ میں ہندو قلعہ دار کے پاس بیٹھے اپنی کارگزاری سنا رہے تھے۔

" تم نے انہیں ہلاک کیوں نہ کر دیا؟" — قلعہ دار نے کہا " سلطان محمود کا قلعہ دار معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بہت موٹا شکار پکڑا ہے لیکن اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔"

" کالنجر سے ہمیں حکم ملا تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے" — ایک گائیڈ نے کہا — "ہم خود نہیں سمجھ سکے کہ ایسا حکم کیوں ملا تھا۔ ہم ان کے کھانے میں بڑی آسانی سے زہر ملا سکتے تھے۔"

"مہاراجہ کالنجر نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے" — قلعہ دار نے کہا — " وہ شاید محمود پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ معاہدے کے مطابق اُن کے فوجیوں کی جانیں یہاں محفوظ ہیں۔ اگر وہ خود ہی کہیں بھٹک بھٹک کر مر جاتے ہیں تو ہم انہیں روک نہیں سکتے۔"

اور ساروگ کو اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے سے کوئی بھی نہ روک سکا۔ انہیں کہیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی نہ کوئی اکیلا دکیلا جھونپڑا یا کوئی انسان نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی انہیں لو یا شیروں کا جوڑا نظر آ جاتا تھا یا بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دنیا کا اتنا حسین اور جانفزا خطہ انہیں بڑا ہی ہولناک اور پُر اسرار دکھائی دیتا تھا۔

ہندوؤں نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔ سلطان محمود فوج کی جو نفری یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کا سب سے بڑا افسر ساروگ تھا۔ ساروگ کو غائب کر دینے سے ہندو یہ فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جو شعبدہ بازی کی طرح کی مہم چلا رکھی تھی اسے بے خوف و خطر اور تیز کر دیں۔ ہندو عیارانہ چالوں میں ہمیشہ تیز اور دانشمند رہا ہے۔ مندروں میں پنڈت بھجنوں کے ساتھ ہندوؤں کو بتاتے تھے کہ گئو ماتا جتنی مقدس ہے، مسلمان اتنا ہی ناپاک ہے اور اسلام کا خاتمہ دھرم کا فرض ہے۔ پنڈتوں نے مسلمان کے قتل کو ایک نیکی اور مذہبی فریضہ قرار دے رکھا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ہندوستان

سے اسلام کے خاتمے کو آج بھی مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی ہندو اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی بیٹی کی عصمت قربان کر دیا کرتا ہے۔

۱۰۱۱ء میں راجہ نندہ رائے کالنجر کے قلعے میں اپنے تخریب کاروں کے استاد ہدایت کار سے یہ رپورٹ سن رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کو بجلی کی چمک اور حسین لڑکیوں کو چڑیلیں اور بدروحیں بنا کر دکھانے اور افواہ بازی کی جو مہم شروع کی تھی وہ بے نقاب ہو گئی ہے اور غزنی کے فوجیوں نے ہمارے دو آدمیوں اور تین لڑکیوں کو سامان سمیت پکڑ لیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان فوجی ان آدمیوں اور لڑکیوں کو ہر گاؤں میں لے جاتے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ یہ ہے بجلی کی چمک اور چڑیلوں کی حقیقت۔

ازمیر نے جن آدمیوں اور لڑکیوں کو گرفتار کیا تھا، اُن سے اس وعدے پر اُن کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ لیا تھا کہ وہ اُن کی جان بخشی کر کے انہیں رہا بھی کر دے گا۔ اُس نے جس طرح انہیں پکڑا تھا، اسی طرح اُس نے اُن کی نشاندہی پر اُن کے ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ اُن کے پاس بھی یہی سامان تھا لیکن اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وہ زیادہ آدمی تھے۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کو ڈراتے تھے۔

ایک روز ازمیر نے یہ انتظام کیا کہ دو تین گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیا اور اُن کے سامنے ان افواہ بازوں کو کھڑا کر کے انہیں کہا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے ہیں وہ سب جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان آدمیوں نے لوگوں کو اپنی اصلیت بتا دی۔ پھر شام کے بعد ازمیر نے لوگوں کو بجلی کی چمک بھی دکھائی اور تینوں لڑکیوں کو نیم برہنہ کر کے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر کھڑا کر کے دور اوپر سے اُن پر آئینہ نما تختے سے روشنی ڈلوائی، پھر لڑکیوں کو اسی نیم برہنہ حالت میں نیچے بلا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مہاراجہ نندہ کو جب پتہ چلا کہ اُن کی مہم ناکام اور بے نقاب ہو گئی ہے تو اُس نے یہ حکم دے دیا کہ اس علاقے میں جو مسلمان امام اور استاد لوگوں کو اسلامی طریقے اور عبادت سکھا رہے ہیں، انہیں اس طرح غائب کر کے قتل کر دیا جائے کہ کسی کو ان کا سراغ نہ ملے۔ غزنی کی فوجی چوکیوں میں جو فوجی ہیں، انہیں بھی اکیلے دکیلے غائب کرنا شروع کر دیا جائے۔

ازمیر ایک رات اپنی چوکی میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک کمرے میں اُس نے ان ہندو مردوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا جو لوگوں کو فریب دیتے اور نظریاتی تخریب کاری کرتے پھر رہے تھے۔ ان پر اُس نے پہرہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اُس نے انہیں کہہ دیا تھا کہ کل وہ مردوں کو بالناتھ بھیج دے گا جہاں اُن کی قسمت کا فیصلہ ساروگ کرے گا اور لڑکیوں کو سپاہیوں کی حفاظت میں کالنجر بھیج دیا جائے گا۔

ایک سپاہی نے اُسے آ کر بتایا کہ ایک لڑکی اُس سے ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے لڑکی کو بلایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔

"کیا تم آج رات بھی مجھے اپنے پاس نہیں بلاؤ گے"؟ لڑکی نے اُس سے پوچھا ۔ "یہ میری خواہش ہے۔"

ازمیر کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے کہا ۔ "مجھے احساس ہے کہ تم غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی ہو۔ بخدا میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ میں تمہاری حیرت کو بھی سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسا جوان فوجی جو اتنی مدت سے گھر سے دور جنگلوں میں موت کے سائے میں پڑا ہے تم جیسی حسین لڑکی کی طرف وہ توجہ کیوں نہیں دیتا جس کی تمہیں توقع ہے۔ اگر تم مسلمان ہوتیں، اگر تم پر یہ فرض عائد ہوتا جو مجھے سونپا گیا ہے اور اگر تم ایمان کا مطلب سمجھ سکتیں تو تمہیں حیرت نہ ہوتی۔ تمہاری نظر جسم پر ہے۔ یہ تمہارا مذہب ہے۔ میری نظر رُوح پر ہے۔ یہ میرا مذہب ہے۔"

"اگر میں تمہاری خاطر تمہارا مذہب قبول کر لوں تو؟"

"ناگن کا زہر نکال دو تو بھی وہ ناگن ہی رہے گی" — ازمیر نے کہا — "اُسے شہد کھلاتے رہو تو بھی اُس میں زہر بنے گا اور ناگن ڈس لے گی۔ یہ اس کی فطرت ہے..... میں یہاں عشق بازی اور شادی کرنے نہیں آیا۔ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہی میری طاقت ہے کہ میری نگاہ نہ اپنے جسم پر پڑتی ہے نہ تم جیسی کسی حسینہ کے جسم پر..... اور لڑکی! میرے مذہب کا حکم ہے کہ دشمن کی عورت تمہاری قید میں ہو تو اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا گناہ ہے۔ اُس سے الگ رکھو۔"

لڑکی کے آنسو نکل آئے اور وہ ازمیر کی چارپائی پر اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک بازو ازمیر کے گلے میں ڈال دیا اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کے بکھرے بکھرے ریشمی بال ازمیر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔

"تم نے مجھے بیچو سے بچایا ہے" لڑکی نے کہا۔ "اب تم مجھے رہا کر کے حفاظت سے واپس بھیج رہے ہو اور ہم تین لڑکیاں اتنے دنوں سے تمہارے پاس تمہارے رحم و کرم پر ہیں مگر تم ہمارے لیے پتھر بنے رہے ....."

لڑکی بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اُس نے ازمیر کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ اُس کے چہرے پر درد کے آثار بڑے صاف تھے۔

"مجھے خون کی بُو آ رہی ہے" ۔ لڑکی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے تکلیف میں معلوم ہوتے ہو۔ ازمیر! کیا تم زخمی ہو؟"

ازمیر نے بایاں ہاتھ اوپر کیا۔ اس ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر کی نوک خون آلود تھی۔ لڑکی اُس کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکی تھی کہ جب وہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی تو ازمیر نے اپنے سرہانے کے نیچے سے خنجر نکال کر اس کی نوک اپنے ننگے پاؤں کے اوپر والے حصے میں اُتار دی تھی اور نوک کو دبا رہا تھا۔ لڑکی نے خون آلود خنجر دیکھا تو اُٹھ کر ازمیر کے سامنے آ گئی۔ اُسے ازمیر کا زخمی پاؤں نظر آ گیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے حیران ہو کر دیکھا۔

"حیران نہ ہو لڑکی!" ازمیر نے کہا۔ "میں فرشتہ نہیں، انسان ہوں اور جوان آدمی ہوں۔ تمہارے جسم کے لمس نے میرے ذہن سے میرا فرض اُتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطان کے آگے جوابدہ نہیں بلکہ خدا کے آگے جوابدہ ہوں۔ یہاں مسئلہ مہاراجوں اور سلطانوں کی فتح و شکست کا نہیں۔ یہاں تمہارے اور میرے مذہب کی ٹکر ہے۔ میں اپنے مذہبی اصولوں کو تمہارے حسن پر قربان نہیں کر سکتا اور میں اپنے اوپر جبر بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی توجہ تم سے ہٹانے کے لیے خنجر کی نوک اپنے پاؤں میں اُتاری تھی ..... جاؤ، تم چلی جاؤ۔"

لڑکی نے اُس کا ایک ہاتھ تھاما اور اپنی آنکھوں سے لگایا پھر اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لڑکی اچانک گھومی اور کمرے سے نکل گئی۔

اگلی صبح ازمیر نے تینوں لڑکیوں کو گھوڑوں پر بٹھایا۔ آٹھ دس سوار ساتھ لیے اور کالنجر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لڑکی اپنا گھوڑا بار بار ازمیر کے گھوڑے کے قریب لے آتی تھی مگر ازمیر سوائے مسکرانے کے اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ کالنجر کے دروازے پر پہنچے۔ ازمیر نے لڑکیوں کو گھوڑوں سے اتارا اور واپس ہونے لگا۔

"میں تمہارے احسان کا صلہ نہیں دے سکی" ۔۔۔ لڑکی نے کہا۔ "مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔ اپنے آپ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا"۔

"صلہ خدا دے گا" ۔۔۔ ازمیر نے کہا ۔۔۔ "اپنے راجہ سے کہنا کہ مردوں کی طرح میدان میں آئے۔ عورتیں جنگ نہیں جیت سکتیں"۔

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو اُس کی روح بھی مسرور تھی۔ خدا نے اُسے اپنا نور دکھا دیا تھا وہ خدا کے سامنے سرخرو تھا۔ اُس نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے اور جنگجوؤں کی طرح ادا کر دیا تھا۔

نائب سالار سارو گ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی تک وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ اگر وہاں پھلدار درخت اور پانی کی افراط نہ ہوتی تو وہ اب تک زندہ نہ رہتے۔ پہلے لوہ کوٹ کے قلعہ دار کو اطلاع دی گئی کہ بالناتھ کے قلعہ دار سارو گ کو اُس کے محافظوں اور ایک امام کے ساتھ فلاں علاقے میں چھوڑ دیا گیا ہے قلعہ دار نے یہ اطلاع کالنجر کے راجہ نندہ رائے کو دی۔ نندہ رائے نے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر کے قلعے میں لایا جائے۔ اس سے پہلے اُس کا یہ حکم تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کی بجائے انہیں غائب کیا جائے۔ اب جب اُسے یہ پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف اُس نے جو مہم شروع کرائی تھی، وہ ناکام ہو گئی ہے اور تینوں لڑکیاں واپس آ گئی اور تمام آدمی سلطان محمود کے فوجیوں کی قید میں ہیں تو اُس نے حکم دیا کہ سارو گ اور اس کے ساتھیوں کو ڈھونڈو۔ وہ زندہ مل جائیں تو انہیں یہاں لے آؤ۔

بہت دنوں بعد ایک اور چوکی کا ایک سپاہی ازمیر کے پاس آیا اور اپنی چوکی کے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہوگا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پتھر بھی ہمیں پانی دیں گے۔"

اور پتھروں نے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آملتی تھی۔ وہاں جاکر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہناتے اور وادی کی طرف چل پڑے

"اُتر آؤ رشی"۔۔۔ عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جاکر رشی کو اپنی باہوں میں لے کر اتارا اور کہا۔۔۔ "انہوں نے پانی کی بُو سونگھ لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا"

دوسرے گھوڑے پر نظام اور ریزی سوار تھا۔ وہ بھی اُتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بُو دور سے سونگھ لیتے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور اندر جاکر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت قاسم بلخی اور فاطمہ غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بلخی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا اُسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر اندر سے وہ لمغان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

راج محل کے ناچنے گانے والیاں اور دیگر عورتیں رہتی تھیں۔ جب یہ خبر اُس لڑکی کے کانوں میں پڑی جسے ازمیر نے ہاتھ سے بچایا تھا تو وہ باہر نکل آئی۔ وہ بھی مسلمان فوجیوں کی قید میں رہ چکی تھی، اس لیے اُسے ان قیدیوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ تینوں قیدیوں کو ایک درخت تلے بٹھا دیا گیا تھا۔ لڑکی نے قریب آکر دیکھا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

لڑکی ہندو فوجیوں کے کمانڈر کو الگ لے گئی اور اُسے کہا کہ وہ ازمیر کو چھوڑ دے۔ اُس نے اپنے کمانڈر کو بتایا کہ اس آدمی نے اُس کی جان بچائی تھی اور اُس نے اس کا صلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندو کمانڈر ازمیر کو رہا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ منہ مانگا انعام دے گی اور ازمیر کو اس طرح قلعے سے نکالے گی کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا۔

یہ لڑکی اپنا جادو چلانے کی ماہر تھی۔ ہندو کمانڈر کو اُس نے رام کر لیا۔ اس کے عوض لڑکی نے جو انعام پیش کیا، اُسے وہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔

قیدیوں کو ابھی کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قیدیوں کو اب قید خانے میں بند کرنا تھا۔ لڑکی ازمیر کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں پودوں اور جھاڑیوں کی اوٹ تھی۔ اندھیرا ابھی گہرا ہو رہا تھا۔ لڑکی دوڑی گئی اور کچھ کپڑے اُٹھا لائی۔

"آج مجھے سکون نصیب ہُوا ہے" ــــ لڑکی نے ازمیر سے کہا۔ "میں تمہارے احسان کا صلہ دے رہی ہوں۔ جاتے جاتے ایک اور خبر سُن لو۔ یہاں دو اور مہاراجوں کی فوج آ رہی ہے۔ ایک فوج لاہور کی ہے۔ راجہ بھیم پال خود ساتھ آ رہا ہے۔ ان کے آتے ہی مہاراجہ نندہ رائے سلطان محمود کو پیغام بھیجے گا کہ وہ اس کا باجگزار نہیں۔ اگر اس میں ہمّت ہے تو خود آکر باج وصول کرے۔ میں تمہیں یہ اطلاع اس لیے دے رہی ہوں کہ اس کے فوراً بعد تمہاری چوکیوں پر حملے ہوں گے۔ مُجھے صرف تمہاری ذات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ تمہاری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ تم مارے جاؤ گے یا پکڑے جاؤ گے، پھر میں تمہیں چھڑا نہیں سکوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اپنی چوکی سے چلے جاؤ؟"

ازمیر ہنس پڑا۔ اُس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اُس کے لائے ہوئے کپڑے

پہن چکا تھا۔
قلعے کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اندر سے ایک گھوڑا دروازے پر آرکا۔ گھوڑے پر بڑھے ہوئے پیٹ والا ایک پنڈت سوار تھا۔ اُس کے سر پر پنڈتوں والی پگڑی تھی۔ اُس کے ساتھ لڑکی تھی۔ اُس نے قلعے کے دروازے کے انچارج سے کہا کہ پنڈت جی مہاراج ہمارے پاس آئے تھے یہ اب ساتھ والے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ وہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ ان کے لیے دروازہ کھلوا دوں۔
وہ راج محل کی لڑکی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس لڑکی کی کیا اہمیت ہے۔ اُس کے کہنے پر دروازہ کھول دیا گیا اور پنڈت جی مہاراج نکل گئے۔ اُن کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ازمیر نے گھوڑا دوڑایا نہیں۔ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ قلعے سے دُور جا کر اُس نے کُرتے کے اندر ٹھونسے ہُوئے وہ کپڑے نکال کر پھینک دیئے جو اُس کا پیٹ بڑھا ہُوا دکھانے کے لیے ٹھونسے گئے تھے۔ اُس نے پگڑی بھی اتار پھینکی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اگلے دن کے پچھلے پہر وہ اپنی چوکی میں پہنچ گیا۔ نائب سالار ساروگ، امام اور دیگر تمام افراد جو ٹلّہ جوگیاں بالناتھ سے چلے اور تخریب کاروں نے انہیں ویرانے میں گمراہ کر دیا تھا اب ازمیر کی چوکی میں پہنچ چکے تھے کیونکہ یہ چوکی اُس جگہ کے ذرا نزدیک تھی جہاں معرکہ لڑ کر انہیں چھڑایا گیا تھا۔
"تم کہاں تھے اور کس طرح آگئے ہو؟" ــــ ساروگ نے ازمیر سے پوچھا۔
" جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے، پہلے وہ سُن لیں"۔ ازمیر نے کہا۔"یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں کالنجر قلعے سے کسی کی مدد سے فرار ہو کر آرہا ہوں۔ کالنجر کے مہاراجہ نے اس علاقے میں اسلام کے خلاف جو تخریب کاری کرائی ہے، وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ کفار کا وار خالی گیا ہے۔ آپ کو گرفتار کر کے کالنجر لے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ مہاراجہ کالنجر اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے راجے اور رائے ہمارے باجگزار نہیں رہنا چاہتے اور وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مجھے قلعے میں پتہ چلا ہے کہ کالنجر میں ان لوگوں کی فوجیں اکٹھی ہو رہی ہیں اور لاہور کا

مہاراجہ تھیم پال بھی آرہا ہے۔ غالباً متحدہ افواج کی کمان وہ اپنے ہاتھ میں رکھے گا یہ مہاراجے سب سے پہلے سلطان کو پیغام بھیجیں گے کہ وہ اُس کے باجگزار نہیں۔ اگر سلطان میں اتنی ہمت ہے تو خود آ کر باج وصول کرے۔ اس کے بعد ہماری چوکیوں کو صاف کیا جائے گا"

"ایسا ہونا ہی تھا" ۔ سارتگ نے کہا ۔ "دشمن کو اپنی شکست کا انتقام لینا ہی چاہیئے اور پھر ہندو ایسا دشمن ہے جو شکست کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو تلوار تمہارے قدموں میں رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ مظلوم اور بھکاری بن جاتا ہے۔ اگر اُسے کہو کہ اپنی تمام بیٹیاں اور بہنیں ہمارے حوالے کر دو تو فوراً حوالے کر دے گا مگر تمہاری تلوار کے نیچے سے نکلتے ہی سانپ بن جائے گا اور اُس کی ساری سوچیں اور ساری کوششیں اس پر مرکوز رہیں گی کہ وہ کس طرح اور کتنی جلدی تمہیں ڈنک مارے۔ ہندو کے ساتھ ہماری جنگ زمین کے لیئے نہیں، یہ مذہبی جنگ ہے جو اُس وقت تک لڑی جاتی رہے گی جب تک ہندوستان میں ایک بھی مسلمان یا ایک بھی ہندو زندہ رہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو ہم پر کب حملہ کرتا ہے"

"میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں دیکھتے نہیں رہنا" ۔ ازمیر نے کہا ۔ "ہمیں آج ہی ایک قاصد غزنی کو روانہ کرنا ہے۔ دشمن کے ارادوں اور اُس کی طاقت کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے ۔ آپ کے پاس تو اتنی نفری نہیں کہ آپ حملہ روک سکیں"

اُسی وقت دو قاصد تیار کر کے انہیں پیغام دیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ کم سے کم رکیں اور راستے کی چوکیوں سے گھوڑے بدلتے جائیں۔

قاصد توقع سے زیادہ تیز گئے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو برق رفتاری کی بڑی سخت ٹریننگ دے رکھی تھی اور ادنیٰ سپاہیوں کے ذہن میں بھی ڈال رکھا تھا کہ چند لمحوں کی تاخیر شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ قاصد متوقع وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہ جب سلطان محمود کو کشمیر کے حالات اور دشمن کے ارادے سنا رہے تھے تو اُن کے سر ڈول رہے تھے اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

ایک انگریز تاریخ دان سر ہنری ہوورتھ نے اپنے ایک مقالے میں (۱۸۹۸ء میں)

سلطان محمود کے دور کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان نے اپنے سالاروں اور دیگر کمانڈروں کو مقصد اور پروگرام بتائے بغیر نہایت عجلت میں کوچ کا حکم دے دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اسلام کے معاملے میں جذباتی تھا۔ اس نے جب سنا کہ وہ جنوبی کشمیر میں جہاں اسلام رائج کر آیا تھا اگر ہندوؤں نے اس کے خلاف پُراسرار اور زمین دوز تخریبی کارروائیاں کیں اور نائب سالار سارو گ اور اس کے ہمسفروں کو گرفتار کیا تو سلطان ایسے غصے میں آگیا جس پر وہ قابو نہ پا سکا۔

سر ہنری ہوورتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ سلطان نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کشمیر جا رہا ہے اور اُس کے وہاں پہنچنے تک برفباری شروع ہو چکی ہو گی جو شکست کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

ایک اور وقائع نگار محمد حیدر گرکانی بن محمد حسین نے اپنی تصنیف "تاریخ راشدی" (انگریزی ترجمہ سر ای ڈینی سن راس) میں بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سُلطان نے غالباً پہلی فتوحات کے زعم میں پلاننگ کے بغیر ایسے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کا حکم دے دیا جس کی دشواریوں، راستوں، خطروں اور موسمی حالات سے وہ پوری طرح واقف نہیں تھا۔

اُس نے کچھ فوج پشاور سے اپنے ساتھ لی اور حسبِ معمول اتنی تیزی سے کشمیر پہنچ گیا جس پر تاریخ دان بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جنوری ۱۰۱۵ء (۴۰۶ ہجری) کے پہلے ہفتے میں کشمیر پہنچا تھا۔ پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف کی چادر بچھ چکی تھی چیل کے پیڑ بھی برف سے لد گئے تھے۔ سُلطان کو یہ انٹیلی جنس رپورٹ ملی کہ مہاراجہ نندہ رائے اور بھیم پال کالنجر کی بجائے قلعہ لوہ کوٹ میں ہیں۔ لہٰذا کالنجر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے لوہ کوٹ محاصرے میں لیا جائے۔ یہ قلعہ سر ہو گیا تو کالنجر بغیر محاصرے کے مل جائے گا۔

اُدھر لوہ کوٹ میں مہاراجوں کو اطلاع ملی کہ سلطان محمود آگیا ہے۔ مہاراجہ نندہ رائے نے اپنے جاسوسی اور تخریب کاری کے نظام کے سربراہ کو بلا کر کہا کہ اُن آدمیوں کو لے آؤ۔ تھوڑی دیر میں اُس کے سامنے دس بارہ آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔

"کیا تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارا کام کیا ہے؟" ___ نندہ رائے نے ان سے پوچھا۔

سب نے بلند آواز سے کہا "معلوم ہے مہاراج!"۔ اور ان میں سے ایک نے کہا ۔ "ہم اس علاقے کے رہنے والے مسلمان ہیں۔ ہم اس علاقے کے لباس میں سلطان محمود کے پاس جائیں گے۔ اُسے بتائیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور اُس کی رہنمائی کے لیے آئے ہیں کیونکہ برف نے راستے بند کر دیئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہ کوٹ تک کس راستے سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم اسلام کے شیدائیوں کی طرح باتیں کریں گے۔ ہم نے نماز اور کلمے زبانی یاد کر لیے ہیں۔"

"شاباش!"۔ نندہ رائے نے کہا ۔ "اُسے لوہ کوٹ تک لے آنا۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ اُسے یہاں سے پسپا ہونا پڑے گا۔ اُسے تم ہی واپس لے جاؤ گے۔ واپسی کے سفر میں تم اپنی استادی دکھانا۔"

یہ دس بارہ آدمی ہندو تھے اور تربیت یافتہ تخریب کار۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھیاں رکھ لی تھیں اور لباس بھی بدل لیے تھے۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ اُس دور میں یہ رواج تھا کہ حملہ آور جس اجنبی علاقے میں جاتے وہاں کے گائیڈ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں گائیڈوں کی ضرورت زیادہ شدید ہوتی تھی۔ سلطان محمود کی فوج کی جو چوکیاں پہلے سے موجود تھیں، انہوں نے مخبروں اور گائیڈوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ سلطان نے پیش قدمی کی تو راستے میں اُسے دس بارہ آدمی ملے جنہوں نے جوشیلے اور جذباتی انداز سے راہنمائی کی پیش کش کی۔ انہوں نے چونکہ کہا تھا کہ وہ اس علاقے کے مسلمان ہیں اور وہ یہاں کے مہاراجوں سے اُس سلوک کا انتقام لینا چاہتے ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا، اس لیے سلطان نے انہیں اپنی فوج کے سالاروں میں تقسیم کر دیا۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن اُسے جب قلعہ نظر آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اسے بہت کم بتایا گیا ہے۔ وہ قلعے سر کرنے کا ماہر تھا لیکن لوہ کوٹ کا قلعہ دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں دھچکہ سا محسوس کیا۔ اس قلعے کو بجا طور پر ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ تمام مؤرخوں نے اِسے ناقابلِ تسخیر لکھا ہے۔ یہ پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا لیکن

تو یہ بلندی اس کی تسخیر میں حائل تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں اور مٹی کی تھیں اور بہت چوڑی اور اس کے کئی بُرج تھے جہاں سے محاصرہ کرنے والی فوج کو نہایت آسانی سے تیروں کی زد میں لیا جا سکتا تھا۔ دیواروں میں نقب لگانے والے ماہر اور بے حد دلیر نقب زن بھی یہاں بے بس تھے۔ قلعے کے دروازوں کے باہر ایسی ڈھالائیں تھیں کہ ہاتھیوں کی ٹکروں سے یا بڑے بڑے شہتیر بَیلوں کے ساتھ باندھ کر ان سے بھی دروازے نہیں توڑے جا سکتے تھے۔

سلطان محمود نے قلعے کو دیکھا تو اپنی فوج کو روک کر اکٹھا کر لیا۔ خود گھوڑے پر سوار ذرا بلندی پر چلا گیا اور بڑی بلند آواز سے اُس نے اپنی فوج کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے کہا۔
"اللہ کے سپاہیو! آج تم سلطنتِ غزنی کی خاطر نہیں، اپنے اللہ اور رسولؐ کی خاطر لڑو گے۔ ہم نے یہاں کے بچے بچے کو مسلمان کر دیا تھا مگر یہاں کے کفار نے یہاں کی غریب اور مجبور مخلوق کو صرف اس لیے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا کہ یہ مسلمان ہو گئی ہے۔ آج تمہیں یہاں انہی کفار کے خون سے اسلام کی قندیل روشن کرنی ہے ۔۔۔۔ وہ قلعہ نظر آ رہا ہے۔ برف میں ڈھکا ہُوا یہ قلعہ تمہیں للکار رہا ہے۔ یہاں کا موسم تمہیں للکار رہا ہے۔ تم میدانوں اور ریگستانوں میں لڑے ہو۔ آج ثابت کر دو کہ زمین و آسمان جم جائیں مگر مسلمان کی رگوں میں خون گرم رہتا ہے اور ایمان کی حرارت برف کے پہاڑ پگھلا دیا کرتی ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہم خُدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ قسمیں کھاؤ کہ اس قلعے پر اسلام کا پرچم لہراؤ گے ورنہ واپس نہیں جاؤ گے۔"

سلطان محمود نے ایسی تقریر کبھی نہیں کی تھی۔ وہ سپاہیوں تک جو شیلے پیغام اُن کے کمانڈروں کے ذریعے پہنچایا کرتا تھا۔ اُس نے فوج کو ٹریننگ دے رکھی تھی۔ اس کے سامنے جذباتی تقریریں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں، لیکن اُسے لوہ کوٹ کا قلعہ اور موسم نظر آ رہا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ عزم کا اس قدر پکا سلطان، خود اعتمادی سے دبنگ آواز میں بولنے والا جس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی، اُس وقت جانے کیسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ اس کی آواز میں لرزہ تھا اور کبھی تو وہ چپ ہو جاتا تھا جیسے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے گھوڑے سے اُتر کر دو رکعت نفل نہ پڑھے اور یہ بھی نہ کہا (جیسے وہ اکثر کہا کرتا تھا) کہ مجھے اللہ کا اشارہ مِل گیا ہے، فتح ہماری ہوگی۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا نیچے اُتار لیا۔

اللہ اکبر کے نعرے لوہ کوٹ کے اردگرد گرجنے لگے۔ قلعہ جس پہاڑی پر کھڑا تھا اس سے ہٹ کر ٹیکریاں اور اُونچی نیچی چٹانیں تھیں۔ ان پر درخت تھے لیکن قلعے والی پہاڑی کی ڈھلان سے تمام درخت کٹوا دیئے گئے تھے۔ اس پہاڑی کے دامن اور اردگرد کی چٹانوں کے دامن میں کچھ فاصلہ تھا۔ سلطان محمود نے قلعے کے گرد گھوم کر جائزہ لیا۔ قلعے کی دیواروں اور بُرجوں سے ہندو اُسے للکار رہے تھے اور لعن طعن بھی کر رہے تھے۔ ایک وقائع نگار نے لکھا ہے کہ فارسی کا ایک نعرہ بار بار سنائی دیتا تھا "سلطان غزنی! تمہارے خدا نے تمہاری قسمت میں برف کی قبر لکھ دی ہے۔"

سلطان نے اردگرد کی چٹانوں پر تیر انداز چڑھا کر دیواروں پر تیر برسائے اور ان کے سائے میں نقب زنوں کو اس کام کے لیے آگے کیا کہ وہ قلعے والی پہاڑی میں سرنگ کھودیں۔ اُسے معلوم تھا کہ کشمیر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں۔ ان میں مٹی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کھدائی آسان تھی۔ سلطان نے یہ بھی سوچا تھا کہ سُرنگ چند گز کھودی گئی تو کھودنے والے اس کے اندر تیروں سے محفوظ ہو جائیں گے اور کھودتے چلے جائیں گے۔

نقب زنوں نے سرنگیں کھودنے کے لیے ہلّہ بولا لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ اُوپر سے تیر صحیح معنوں میں مُوسلادھار بارش کی طرح آئے اور تمام نقب زن وہیں ختم ہو گئے۔ اردگرد کی چٹانوں سے دیواروں پر جو تیر چلائے جاتے تھے وہ دُوری کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں کرتے تھے۔

چند ایک سپاہیوں نے دلیری کا یہ بے مثال مظاہرہ بھی کیا کہ وہ دروازہ توڑنے کا سامان اور آگ لگانے والی اشیا کے ساتھ قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے مگر دروازے کے نیچے ڈھلان پر برف پڑی ہوئی تھی۔ سپاہی اُوپر چڑھتے پھسلتے تھے۔ اوپر سے تیروں کی بوچھاڑیں آئیں اور سب کی لاشیں لڑھکتی ہوئی نیچے آئیں۔

دوسرے دروازوں پر بھی ایسے ہی حملے بولے گئے۔ صرف ایک دروازے تک چند ایک سپاہی پہنچ سکے اور انہوں نے کلہاڑوں سے دروازہ توڑنا شروع کیا مگر اوپر سے ان پر جلتی ہوئی لکڑیاں اور دہکتے ہوئے انگارے انڈیل دیئے گئے۔ سپاہیوں کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ ان کے جسم جھلس گئے۔

عتبی، گردیزی، ابن الاثیر اور دو یورپی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رات کو بھی سلطان کے نقب زن جانباز قلعے کی پہاڑی کی ڈھلان میں سرنگیں کھودنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح سلطان نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں نقب زنوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ سلطان کے منہ سے غصے سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ وہ ہر طرف گھوڑا دوڑاتا اور سرنگیں کھودنے کے حکم دیتا پھر رہا تھا۔ اسلام کے نام پر سپاہی اور کمانڈر قربان ہوتے چلے جارہے تھے۔

پھر ایک اور رات آگئی اور اس رات کے ساتھ صرف برفباری نہیں بلکہ برفانی طوفان آگیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ جھکڑ اتنے تیز اور برفباری اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑے بھی برداشت نہ کرسکے۔ بیشتر گھوڑے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کوئی اوٹ نہیں تھی چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ چٹانیں برف تلے دبتی جارہی تھیں۔ طوفان کا جدھر کا رخ تھا ادھر دریائے جہلم تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ سوار بھی ادھر کو ہی ہٹتے جارہے تھے اور اوپر سے لڑھکتے دریا میں گرتے جارہے تھے۔ وہاں دریا بہت نیچے بہتا ہے۔ اس کا پاٹ تنگ ہے اس لیے گہرا بھی ہے اور بہاؤ بہت تیز۔

صبح طلوع ہوئی تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کل والی جگہ ہے۔ طوفان ختم گیا تھا اور برف کئی کئی فٹ پڑ چکی تھی۔ اس برف میں غزنی کے ہزاروں فوجی دب گئے تھے۔ سالاروں نے سلطان سے کہا۔ "اللہ کو یہی منظور تھا۔ اتنی فتوحات کے بعد ایک شکست کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم پھر آئیں گے۔ باقی فوج کو بچالیں"۔

سلطان محمود نے خود اعتمادی اور تحمل سے تسلیم کرلیا کہ وہ ہار گیا ہے۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا۔ اب تو واپسی بھی محال ہوگئی تھی۔ راستے بند ہوگئے تھے۔ اس مشکل وقت میں وہ گائیڈ آگے آئے جو دراصل ہندو تھے مگر اپنے آپ کو جوشیلے مسلمان ظاہر کرتے تھے۔

انہوں نے سلطان کو تسلی دی کہ واپسی کا ایک راستہ ابھی محفوظ ہے۔ فوج بکھری ہوئی تھی۔ یہ تین حصّوں میں بٹ گئی۔ گائیڈوں نے اپنے آپ کو ان تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ سلطان کے سینکڑوں سوار گھوڑوں سمیت دریا میں بہہ گئے تھے۔ آدھی فوج لوہ کوٹ کے تیروں اور برف کے طوفان کی نذر ہوگئی تھی۔ اب بچی کھچی فوج تین حصّوں میں تقسیم ہو کر گائیڈوں کے پیچھے چلی تو اس کا جو حشر ہُوا اسے محمد قاسم فرشتہ یوں بیان کرتا ہے:

"سلطان محمود محاصرہ اُٹھانے اور غزنی کو واپس چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ اُس کی فوج کو مقامی گائیڈوں نے ایسا گمراہ کیا کہ بہت دنوں تک اُس کی فوج برف کی اس دنیا میں بھٹکتی رہی۔ برف کے نیچے کھائیاں اور کھڈ تھے۔ دریا کی ڈھلانیں بھی برف تلے چھپ گئی تھیں گھوڑے اور پیادے پھسلتے اور سیدھے دریا میں جاتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ بہت سے سپاہی اکڑ کر مر گئے۔ اگر کوئی رُک گیا تو وہیں اکڑ گیا...."

"یہ سلطان کی بہترین فوج تھی۔ وہ قلعہ تو سَر نہیں کر سکا تھا لیکن گائیڈوں نے اُسے گمراہ کیا اور خود غائب ہو گئے۔ سلطان محمود جب ٹِلہ جوگیاں کے نائب سالار ساروگ کے کیمپ میں پہنچا، تو اُس کے ساتھ اتنی تھوڑی فوج تھی جسے وہ بڑی آسانی سے گن سکتا تھا۔ چند دنوں بعد وہ غزنی چلا گیا۔"

طمع تخت کی اور تاج کی

۳ جولائی ۱۰۱۷ء (۵ صفر ۴۰۸ھ) کے روز سلطان محمود غزنوی کو اپنی تاریخ کی ایک بہت بڑی جنگ بہت بڑے اور بے حد خطرناک ایمان فروشوں کے خلاف لڑنی پڑی۔ اُس کی سلطنت اور اسلام کے خلاف یہ بڑی ہی خطرناک اور دُور رس نتائج کی حامل سازش تھی جس کے پیچھے یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ محمود غزنوی ۱۰۱۵ء میں کشمیر سے شکست کھا کر واپس گیا تھا۔ اُسے کشمیر کی برفباری نے شکست دی تھی اور اُس کی شکست خوردہ فوج کو ہندو گائیڈوں نے مسلمانوں کے بہروپ میں گمراہ کیا اور فوج برف سے اَٹی ہوئی وادیوں اور برف سے لدی ہوئی چٹانوں میں تباہ برباد ہو گئی تھی۔

اتنے زیادہ نقصان کی تلافی کے لیے کئی سال درکار تھے۔ اس عرصے کے لیے سلطان محمود غزنوی فوجی لحاظ سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ معمولی سا معرکہ لڑنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ غزنی میں اُس کی کچھ فوج موجود تھی اور کچھ سرحدوں پر خیمہ زن تھی۔ اس سے وہ حملہ روک سکتا تھا۔ جوابی حملہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ہندوؤں کے حملے کا خطرہ نہیں تھا۔ اُس وقت تک وہ ہندوؤں پر دہشت طاری کر چکا تھا۔ وہ کشمیر سے شکست کھا کر ٹلہ جوگیاں (بال ناتھ) رکا تھا۔ راجہ بھیم پال نڈر تھوڑی سی فوج سے اُس پر حملہ کر دیتا تو اُسے زندہ پکڑ سکتا تھا مگر راجے مہاراجے اُسے زخمی شیر سمجھتے ہوئے اُس کے قریب نہیں جاتے تھے۔

سُلطان محمود کو خطرہ اپنے بھائیوں سے تھا جن کی ریاستیں اُس کی سلطنت کے ارد گرد تھیں۔ وہ سب مل کر کبھی اور باری باری بھی اُس کے خلاف لڑ کر شکست کھا چکے

تھے اور اس سے خائف رہتے تھے۔ اب ان کے لیے بڑا اچھا موقع تھا کہ اُس پر ٹوٹ پڑتے۔

مئی ۱۰۱۵ء میں سلطان محمود جب ہندوستان سے واپس غزنی گیا تو اُس کی حالت کٹی ہوئی پتنگ جیسی تھی جو ہوا کے رحم و کرم پر ڈولتی زمین کی طرف آتی ہے اور اُسے پتہ نہیں ہوتا کہ زمین پر گرے گی یا کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر پھٹ جائے گی۔ اُس کے ساتھ تھوڑی سی فوج تھی اور یہ فوج ماتمی جلوس کی طرح غزنی میں داخل ہوئی تھی۔ غزنی کے لوگ جو اُس کے استقبال کے لیے راستے میں آن کھڑے ہوئے تھے، اُن کے ہونٹ سِل گئے تھے۔ اُن کے فاتحانہ نعرے اُن کے سینوں میں قید ہو گئے تھے۔ عورتیں جو دروازوں میں اور منڈیروں پر کھڑی تھیں، انگلیاں دانتوں تلے دبا کر رہ گئیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی قوم کو اِس اُداس سکوت میں دیکھا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے سالار الطنطاش کو بلایا۔

"الطنطاش! یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اگر فوج ماری گئی ہے تو ان کے نعرے کیوں مر گئے ہیں؟ .... انہیں کہو کہ فوج قوم کے لیے زندہ رہتی ہے۔ انہیں کہو کہ تم نہ مر جاؤ۔ نعرے لگاؤ۔ کہو اسلام زندہ باد۔ کہو سلطنتِ غزنی زندہ باد۔ اپنے زخمی سپاہیوں کے حوصلے بڑھاؤ۔ تمہارے نعرے ان زخمی شیروں کو اٹھا دیں گے اور وہ جو شہید ہو گئے ہیں وہ اپنی زندگی قوم کو دے گئے ہیں"۔

الطنطاش نے بلند آواز سے سلطان محمود کے الفاظ دہرائے تو غزنی کے در و دیوار اور غزنی کا آسمان اسلام زندہ باد، پاسبانِ اسلام زندہ باد اور بُت شکن زندہ باد کے نعروں سے لرزنے لگے۔

"اور ان ماؤں اور بہنوں سے کہو کہ اسلام کی ناموس تم سے تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی مانگ رہی ہے"۔

الطنطاش نے بلند آواز سے سلطان کے یہ الفاظ بھی دہرائے تو عورتوں نے اُن پھولوں کا جو انہوں نے سلطان کی حالت دیکھ کر چھپا لیے تھے، زخم خوردہ فوج پر مینہ برسا دیا۔ عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ، ہمارے بھائیوں

کو لے جاؤ ۔"

سلطان محمود غزنوی نے قوم کا حوصلہ بڑھا دیا تھا مگر اُس کے اپنے سینے میں جو خلش تھی، یہ اُسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے لوہ کوٹ (کشمیر) میں اپنی شکست کی تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر ڈال لی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں اور غزنی میں مقیم اپنی فوج کے کمانداروں کو بلا کر کہا کہ فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس شکست کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں نے وہاں کے موسم کی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں سے وہاں کی کیفیت نہ پوچھی اور پھر میں ہندو راہنماؤں کے جھانسے میں آ گیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قوم کو یہ شکست فتح میں بدل کر دکھائیں۔ ہمارا کام صرف حکومت کرنا نہیں۔ میرا یہ حکم یاد رکھو اور اس کی تعمیل کرو کہ قوم کا کوئی فرد تمہیں شکست کا طعنہ دیتا ہے تو اس طعنے کو خندہ پیشانی سے قبول کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ تمہاری فوج تمام شکوے دُور کر دے گی۔

ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے باوجود اُسے چین نہ آیا اور وہ اپنے مرشد ابوالحسن خرقانی سے ملنے روانہ ہو گیا۔ خرقانی ایک دن اور آدھی رات کی مسافت جتنی دُور رہتے تھے۔ اُس نے اپنے محافظوں کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ مسافت طے کی اور اپنے مرشد کے قدموں میں جا گرا۔

"سلطان کا انداز بتا رہا ہے کہ شکست کھا کر آیا ہے" — ابوالحسن خرقانی نے کہا — "مگر سلطان کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟"

"ندامت کے" — سلطان محمود نے کہا — "میرے مرشد میری روح بے چین ہے۔ جن کی لاشیں کشمیر کی برف تلے چھوڑ آیا ہوں، ان کی روحیں راتوں کو سونے نہیں دیتیں۔ میں کچھ سوچنے کی حالت میں نہیں رہا۔"

"وہم ہے سلطان!" — خرقانی نے کہا — "شہیدوں کی روحیں اُنہیں بے چین نہیں کیا کرتیں جو اُن کے لہو کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ بھی تمہاری فوج ہے۔ اسلام کے نام پر لڑنے کے لیے جس میدان میں جاؤ گے یہ روحیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تم جیسے پُرعزم جنگجو کے راستے میں یہ جذبات رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمت

نہ ہارو سلطان! ہندوستان کی مسجدیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں "۔

" میں بہت بڑے دھوکے میں آ گیا تھا" سلطان محمود نے کہا ۔ "ایک تو موسم نے دھوکہ دیا، دوسرے ہندو راہنماؤں نے مسلمان بن کر دھوکہ دیا"۔

" یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی" ۔۔۔ خرقانی نے کہا ۔ "کفر اسلام کو دھوکے دیتا چلا آیا ہے، دھوکے ہی دیتا چلا جائے گا۔ آئندہ اِن دھوکوں سے بچو۔ ابھی تو آپ کو اپنی زمین پر جنگ لڑنی پڑے گی یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں خلیفہ جو امّتِ رسول ؐ کے اتحاد کی علامت تھا، وہ خود اقتدار کی ہوس کا شکار ہو گیا ہے۔ ملّت کی مرکزیّت بکھر گئی ہے اگر آپ اسلام کی خاطر جنگ وجدل کے شیدائی ہیں تو سلطانی کو دل سے نکال دیں۔ نظر دشمن پر رکھیں۔ فوجی طاقت سے دشمن کو مرعوب کریں، اپنی قوم کو نہیں۔ تاج اور تلوار ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ محبت تاج سے ہوتی ہے یا تلوار سے۔ وہ تلوار قابلِ نفرت ہوتی ہے جو تاج کی حفاظت کے لیے چلے۔ ایک شکست سے دل برداشتہ نہ ہو سلطان! اُٹھتے وہی ہیں جو گرتے ہیں۔ گر کر اُسی شان سے اٹھو جس شان سے آپ نے دشمن کو للکارا تھا۔ اپنی غلطی اپنے سر لو۔ قوم کو دھوکے میں نہ رکھنا"۔

" آپ نے فرمایا ہے کہ یہودی اور عیسائی ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں" ۔۔۔ سلطان محمود نے پوچھا ۔ "آپ کا یہ اشارہ کس طرف ہے؟"

" اسلام کا سب سے بڑا دشمن یہودی ہے" ۔۔۔ شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا ۔۔۔ " وہ مسجدِ اقصیٰ کو اپنی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو اپنا وطن بنا کر خانہ کعبہ پر بھی قبضہ کر لے اور ہمارے اس مقدّس مقام کو مسمار کر دے۔ یہودی خود لڑنے والی قوم نہیں۔ اس کے پاس دولت ہے جسے وہ مسلمان کی جڑیں کاٹنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ ہندوؤں کی طرح یہودی بھی اپنی بیٹیوں کو استعمال کرتے اور عیسائیوں کو مدد دے رہے ہیں۔ قرامطی فرقہ انہی کی پیداوار ہے۔ آپ کے خلاف لڑنے والے مسلمان ان سے درپردہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہیں۔ آپ کو خانہ جنگی میں الجھانے

والے یہودی اور عیسائی ہیں ..... ہو سکتا ہے آپ کو اب ایک معرکہ اسی سرزمین پر لڑنا پڑے۔ اپنے حریفوں کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کرو۔ اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو ہوش میں رہو اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ رکھو۔ فوراً فوج تیار کرو اور خوارزم کی طرف توجہ دو۔ میں نے سنا ہے کہ خوارزم میں یہودیوں کا جادو چل رہا ہے۔"

اُس دور میں خوارزم ایک الگ ملک تھا جس کا دارالحکومت جرجانیہ تھا۔ بعد میں یہ گرگنج کہلایا۔ آج کل یہ ارگنج کہلاتا ہے۔ بخارا اسی ملک کا ایک صوبہ تھا۔ خوارزم میں مامونی خاندان کی بادشاہی تھی۔ بادشاہ خوارزم شاہ کہلاتا تھا۔ یہ پہلے بھی مسلمان ملک تھا۔ ۹۹۵ء میں ابو علی مامون بن محمد بن علی نے خوارزم پر حملہ کر کے اس کے بادشاہ ابو عبداللہ کو قید میں ڈال دیا اور تمام تر ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ دو ہی سال بعد ۹۹۷ء میں ابو علی مامون قتل ہو گیا لیکن اس کے دشمن مامونی خاندان کا تختہ نہ الٹ سکے۔ ابو علی کے بیٹے ابوالحسن علی مامون نے بادشاہی سنبھال لی۔ وہ بارہ سال بعد ۱۰۰۹ء میں بڑھاپے سے بہت پہلے مر گیا۔ وفات سے تین ساڑھے تین سال پہلے اُس نے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے استحکام کے لیے سلطان کی چھوٹی بہن کے ساتھ جس کا نام کاہ کالجی تھا، شادی کر لی تھی۔ ابو علی کی وفات کے بعد کاہ کالجی سلطان محمود کے پاس واپس آ گئی تھی۔

ابوالحسن علی مامون کی وفات کے بعد اُس کا چھوٹا بھائی ابوالعباس مامون تخت نشین ہوا۔ اُس کی عمر اُس وقت پچیس سال تھی۔ اُس کی دو بیویاں تھیں۔ خوارزم شاہ کا وزیر ابوالحارث بن محمد تھا۔ وہ ابوالعباس مامون کے باپ ابو علی مامون کے وقتوں سے وزیر چلا آ رہا تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسے مامونی خاندان کے ساتھ دلی محبت پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے سینے میں ایک سچے مسلمان کا جذبہ اور درد بھی تھا۔ ابو علی مامون کے بیٹے اُس کے ہاتھوں میں جنے پلے تھے۔ وہ انہیں سگے باپ کی طرح مشورے دیا کرتا اور انہیں نامردانہ حرکتوں سے روکا کرتا تھا۔ خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر (امیر) البتگین پختہ عمر کا تجربہ کار اور گھاگھ آدمی تھا۔ اُس کے متعلق وزیر ابوالحارث کی رائے اچھی نہیں تھی۔ بظاہر وہ خوارزم شاہ کا وفادار بلکہ خوشامدی تھا مگر اُس کے مشورے اور اس کی رپورٹیں نیک نیتی پر مبنی نہیں

ہوتی تھیں۔

ابوالعباس جب تخت نشین ہوا تو اُس نے اپنے وزیر ابوالحارث کو تنہائی میں بلایا اور اس کے ساتھ اپنے ملک کے دفاع اور رعایا کی خوشحالی کے لئے تبادلہ خیالات کرنے لگا۔

"میرا باپ قتل ہوگیا تھا اور میرا بڑا بھائی مرگیا ہے" — ابوالعباس نے کہا "میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ راز کی ایک بات ہے جو دل میں کانٹے کی طرح اُتر گئی ہے۔ کیا آپ اس راز سے پردہ اُٹھا سکتے ہیں؟"

"جن پردوں کو میری بوڑھی آنکھیں چاک کر سکتی ہیں، اُن پردوں میں چھپے ہوئے راز مامونی خاندان سے کبھی نہیں چھپائے" — وزیر نے کہا "مجھے اپنے دل کا کانٹا دکھائیں۔ شاید میں نکال سکوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرے بھائی کی وفات پر ہمارا امیر بخارا التگین آیا تھا" — ابوالعباس نے کہا — "اُس نے مجھے کہا تھا کہ آپ کے بڑے بھائی کی وفات کے افسوس کے ساتھ میں آپ کو خوارزم شاہی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ پر یہ راز فاش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے والد مرحوم کو قتل کیا گیا تھا اور آپ قاتلوں کو جانتے ہیں مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کے بھائی ابوالحسن مامون بھی قتل ہوئے ہیں، طبعی موت نہیں مرے ہیں۔ اس خبر پر حیران نہ ہوا کیونکہ میں اپنے دشمنوں کو جانتا ہوں۔ التگین نے بتایا کہ میرے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جس کے اثرات پیٹ کی کسی بیماری سے ملتے جلتے تھے۔ یہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا اور طبیب اسے پیٹ کا مرض سمجھتے رہے۔"

"یہ ممکن ہے" — ابوالحارث نے کہا — "دشمن کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کے دشمن آپ کی جنگی طاقت سے خائف ہیں وہ ایسے ہی اوچھے حربے استعمال کر رہے ہیں۔"

"لیکن محترم وزیر!" — ابوالعباس نے کہا — "التگین نے وثوق سے کہا ہے کہ میرے بھائی کو سلطان محمود نے زہر دلوایا ہے اور یہ زہر اُسے سلطان محمود کی بہن کاہ کانجی نے جو اُس کی بیوی تھی، پلایا تھا۔ اُس نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ سلطان محمود نے میرے بھائی سے کہا تھا کہ اُس کی اطاعت قبول کرے۔ میرے بھائی نے انکار کر دیا تھا۔ کیا میں

یقین کر لوں کہ التگین نے سچ کہا ہے؟"

"نہیں" ــــ وزیر ابوالحارث نے جواب دیا ــ "میں اس انکشاف کو اس لیے صحیح نہیں مان سکتا کہ یہ التگین نے کیا ہے، اور اس لیے بھی نہیں مانوں گا کہ سلطان محمود مردِ میدان ہے۔ اُسے زہر دیا جا سکتا ہے، وہ زہر دے نہیں سکتا۔ میں اُس کے ذاتی کردار سے واقف ہُوں۔ وہ سلطانی کا اور اپنی سلطنت کی توسیع کا خواہشمند ہوتا تو زندہ رہنے کی کوشش کرتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ کتنی بار ہندوستان کے دور اندر جا کر جنگیں لڑ چکا ہے اور اب پھر ہندوستان گیا ہُوا ہے۔ وہ اسلام کا شیدائی اور مبلّغ ہے۔ وہ بُت شکن ہے۔"

ان کے درمیان یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود غزنوی کشمیر میں لوہ کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہُوئے تھا اور اُس کی فوج برف باری میں تباہ ہو رہی تھی۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان محمود کتنی بار مرنے کی کوشش کر چکا ہے" ــــ وزیر ابوالحارث نے کہا ــ "ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی جنگی طاقت معمولی نہیں۔ اس طاقت سے صرف محمود ٹکر لے سکتا ہے اور وہ لے رہا ہے۔ ایسے جنونی اور جنگجو کسی کو زہر نہیں دیا کرتے۔"

"میں قتل نہیں ہونا چاہتا" ــــ ابوالعباس نے کہا ــ "میں دوست بنانا چاہتا ہُوں جو زندہ رہیں اور زندہ رہنے دیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ میں ترکستان کے خوانین کو دوست بناؤں یا سلطان محمود کو۔ مجھے سلطان محمود سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ آپ کی رائے اس کے متعلق جو کچھ بھی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جس طرح اپنے دشمنوں کو زیر کر کے اُن کے علاقے سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا ہے، اسی طرح وہ مجھے بھی کسی وقت کہہ دے گا کہ میری اطاعت قبول کرو۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مخلص اور طاقتور دوست کی ضرورت ہے۔"

"اور وہ صرف سلطان محمود ہے" ــــ وزیر نے کہا۔

"میرے دل میں جو بات آئی ہے وہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہُوں" ــ ابوالعباس

نے کہا۔ "دوستی کے رشتے باتوں اور وعدوں سے پکے نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں سلطان محمود سے اُس کی بہن کاہ کالجی کا رشتہ مانگ لوں۔ وہ میرے بڑے بھائی کی بیوہ ہے۔ مجھے اچھی لگتی تھی۔ عمر میں مجھ سے شاید ایک سال بڑی ہے۔ کیا سلطان محمود مجھے یہ رشتہ دے دے گا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" — ابوالحارث نے کہا اور ہنس کر بولا — "کیا آپ نے یہ خطرہ محسوس نہیں کیا کہ اس عورت نے آپ کے بھائی کو زہر دیا ہے تو وہ آپ کو بھی زہر دے سکتی ہے؟"

"نہیں" — ابوالعباس نے کہا — "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی" — اُس نے وزیر سے نگاہیں پھیر کر خلا میں دیکھا اور جذباتی سی سرگوشی کی — "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی" — وہ وزیر سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز سے بولا — "وہ جان گئی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ روحانی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ میں اِس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔ مجھے پیار سے شہزادہ کہتی تھی.... سچ بتادوں محترم وزیر! بھائی کے مرنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ بھائی کی جدائی کو میں نے برداشت کر لیا ہے، کالجی کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کیا آپ محبت کی خاطر کالجی سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا سلطان محمود کے ساتھ دوستی قائم کرنے کے لیے؟"

"دونوں باتیں میرے سامنے ہیں" — ابوالعباس نے جواب دیا — "لیکن غالب کالجی کی محبت ہے حقیقت یہ ہے کہ کالجی کو مجھ سے پیار تھا وہ پاک محبت تھی جیسی ایک بہن یا اچھی بھابھی کی ہوتی ہے لیکن اب صورت بدل گئی ہے۔ میں کالجی میں اتنا گھل مِل گیا تھا کہ میری چھوٹی بیوی الجوری مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ الجوری کے باپ الواسحاق کو آپ جانتے ہیں، ہماری فوج کا ایک سالار ہے۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ الجوری کو مجھ سے شکایت ہے۔ میں نے اپنے اس سُسر سے کہا تھا کہ وہ مجھ پر اور میرے بھائی کی بیوی پر ایک بے ہودہ الزام عائد کر رہا ہے اور وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرے۔

میں نے اُس کے ماتھے پر جو شکن دیکھے تھے وہ اچھے نہیں تھے۔"
"سلطان محمود کو ہندوستان سے واپس آنے دیں"۔ وزیر نے کہا۔ "آپ کی اس تجویز میں آپ کی محبّت بھی شامل ہے اور سیاست بھی۔ آپ ابھی سوچیں، مَیں بھی سوچوں گا۔"

یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود کو کشمیر کی برفباری شکست سے دوچار کر رہی تھی اور اُس کی وہ جنگی طاقت جس کی وجہ سے ابوالعباس اُسے اپنا برادر نسبتی اور اتحادی بنانا چاہتا تھا، وہ دریائے جہلم میں ڈوب رہی تھی اور برف کے نیچے دفن ہو رہی تھی۔

اس سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے کہ وزیر ابوالحارث ایک روز ابوالعباس کے پاس گیا اور اُسے تنہائی میں لے جا کر کہا۔ "غزنی سے ایک عجیب خبر آئی ہے۔ سلطان محمود ہندوستان سے ایسی بُری شکست کھا کر آیا ہے کہ اُس کے ساتھ فوج کا دسواں حصّہ بھی نہیں اور جو فوج آئی ہے وہ زخمی ہے۔ اب کے محمود کے ساتھ نہ سونے جواہرات سے لدے ہُوئے ہاتھی ہیں نہ ہندوستان کے جنگی قیدی۔ وہ اپنی جنگی قوت تباہ کر آیا ہے۔"
"مَیں اس کے باوجود اُس کی بہن کاہ کالجی کے ساتھ شادی کروں گا"۔ ابوالعباس نے کہا۔ "آپ کو زندگی کا جو تجربہ ہے وہ مجھے نہیں، لیکن آپ میری تائید کریں گے کہ مَیں سلطان محمود کے مشکل وقت میں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ میرا ممنون و مشکور ہو گا، پھر ہم پر کبھی مشکل وقت آن پڑا تو وہ ہماری مدد کو ضرور پہنچے گا.... آپ یہ بتائیں کہ اُس تک پیغام پہنچانے کا کون سا موقع موزوں ہو گا، اور کیا مجھے خود جانا چاہیئے؟"
"موقع یہی موزوں ہے"۔ وزیر نے کہا۔ "شکست پر اظہارِ افسوس کرنا ضروری ہے اور رسمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ اُس کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ کا جانا ضروری نہیں مَیں جاؤں گا اور مَیں شادی کا پیغام بھی دُوں گا۔"
چند دنوں بعد وزیر ابوالحارث دو ایلچیوں، دس بارہ محافظوں اور تحائف سے لدے ہوئے چار اونٹوں کے ساتھ غزنی پہنچا۔ سلطان محمود کو اطلاع ہُوئی کہ خوارزم شاہ ابوالعباس مامون کا وزیر آیا ہے تو سلطان نے اُسے اُسی وقت بُلا لیا۔

"خوارزم شاہ ابو العباس مامون نے سلطانِ عالی مقام کی خدمت میں برادرانہ سلام اور کچھ تحائف بھیجے ہیں" ـــ وزیر نے کہا ـــ "اور دلی رنج کا اظہار کیا ہے کہ سلطانِ عالی مقام کو ہندوستان کی مہم میں بہت نقصان اٹھانا پڑا اور ناکامی ہوئی۔ خوارزم شاہ نے فرمایا ہے کہ خدائے ذوالجلال نے سلطان کو جہاں اتنی فتوحات عطا فرمائی ہیں وہاں ایک شکست بھی اُسی کی دین ہے۔ سلطانِ غزنی کو اللہ تعالیٰ نے جو حوصلہ عطا فرمایا ہے، اس کے سامنے یہ شکست کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خوارزم شاہ ابو العباس مامون نے فرمایا ہے کہ میری طرف سے کسی بھی قسم کی مدد اور کسی بھی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بھائی مشکل کے وقت کام آتے ہیں"۔

"یہ میرے دربار کے آداب کے خلاف ہے کہ ایک بادشاہ کا وزیر میرے سامنے کھڑا ہو کر بات کرے" ـــ سلطان محمود نے کہا ـــ "آپ میرے برابر بیٹھ جائیں" ـــ

وزیر سلطان محمود کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تو سلطان نے کہا "میں خوارزم شاہ ابو العباس مامون کا مشکور ہوں کہ اُنہوں نے اُس وقت دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے جب مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے حریف میری کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اُن کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دینا اور کہنا کہ مجھے دوستوں کی ضرورت ہے لیکن میں مدد صرف اللہ سے مانگا کرتا ہوں ..... مجھے خوارزم کے اندرونی حالات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ابو العباس ابھی نوجوان ہے۔ کیا وہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ دریائے زرافشاں کے کنارے بخارا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا وہ ایلک خان کے بیٹے امیر ایلتگین کی نیت کو سمجھتا ہے؟"

"اگر وہ نہیں سمجھتا تو میں جو ہوں" ـــ ابو الحارث نے کہا ـــ "امیر ایلتگین کی نیت پر مجھے بھی شک ہے لیکن ہمیں اپنی فوج پر بھروسہ ہے"۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں، آپ کو اپنی فوج پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے" ـــ سلطان محمود نے کہا۔ "فوج کیا ہوتی ہے؟ .... سالاروں اور نائب سالاروں کو فوج کہتے ہیں۔ فیصلے اُن چند ایک آدمیوں کے ہوتے ہیں اور فوج کو آلۂ کار کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ سالاروں پر طاری ہوتا ہے لیکن قوم کی نفرت فوج کے حصے میں آتی ہے۔ سالاروں کی بداعمالیوں کی سزا سپاہیوں کو ملتی ہے۔ آپ

کو نظر سالار وں پر رکھنی چاہیئے۔"

کچھ دیر اُن کا تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ وزیر تجربہ کار اور دانشمند تھا۔ اُس نے شادی کا پیغام دینے کا موقع پیدا کر لیا۔

"سلطانِ غزنی!" — وزیر نے کہا — "ابوالعباس مامون نے مدد کی پیش کش تو آپ کو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مدد کے طلبگار ہیں۔ انہیں فوری طور پر کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ دوستی کے خواہاں ہیں۔ انہیں ایسا دوست چاہیئے جو انہیں وقت پر دھوکہ نہ دے۔ ایسا دوست آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس دوستی کے دائمی استحکام کے لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آپ کی بہن کاہ کالجی کے ساتھ شادی کر لیں جو اُن کے بڑے بھائی کی بیوہ بھی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ سلطانِ عالی مقام اُن کی عرضداشت کو قبول فرمائیں گے؟"

"اس کا فیصلہ کالجی خود کرے گی" — سلطان محمود نے کہا — "میں کسی کی دوستی کو پکا کرنے کے لیے اپنی بہن کو اس طرح استعمال نہیں کروں گا۔ میں اُسے مشورہ دے سکتا ہوں۔ خوارزم اور غزنی کی دوستی کی اہمیت بتا سکتا ہوں، لیکن اُس پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔ کچھ دنوں بعد آپ مجھ سے جواب لے سکتے ہیں۔"

"ابوالعباس اُس وقت اچھا لڑکا تھا جب وہ خوارزم کا بادشاہ نہیں تھا؟" سلطان محمود کو اُس کی بہن کاہ کالجی نے جواب دیا — "اب وہ جوان ہے اور بادشاہ بھی۔ اب دیکھنا پڑے گا کہ اُس میں کیا تبدیلی آئی ہے۔"

"اُس کے پیغام کا جواب تم دو گی" — سلطان محمود نے کہا — "فیصلہ میرا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابوالعباس کے وزیر کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا تھا کہ میں اپنی بہن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔"

"لیکن مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت تو ہے" — بہن نے کہا — "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے خوارزم شاہ کے ساتھ شادی کر کے غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کے ساتھ شادی کر لیتی ہوں۔ میرے دل میں کسی بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے

کی خواہش نہیں۔ میں کسی کے حرم کی زینت نہیں بننا چاہتی ہیں ملکہ بھی نہیں بننا چاہتی۔ جس کے بھائی کے شب و روز جہاد میں گزر رہے ہوں، وہ بہن ملکہ نہیں بنے گی۔ مجھے یہ بتائیں کہ ابوالعباس خوارزم شاہ کی تیسری بیوی بن کر اسلام اور سلطنت غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کی زوجیت کو قبول کر لونگی۔"

"خوارزم ایک ایسا ملک ہے جس کی فوج جہاد میں استعمال کی جا سکتی ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "مسلمان بادشاہیاں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ ان میں سے دو تین کے حکمران متحد ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں کسی طاقتور حریف سے خطرہ ہوتا ہے۔ اُن کا اتحاد اسلام کی خاطر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مسلسل خانہ جنگی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ میں انہیں کفر کے خلاف متحد کرنا چاہتا ہوں۔ خوارزم ایک طاقتور ملک ہے لیکن مجھے اطلاعیں ملی ہیں کہ اس ملک میں کوئی فتنہ سر اُٹھا رہا ہے۔ شاید ابوالعباس کو اس کا علم نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ التونتگین اُسے میرے خلاف کر دے۔ خوارزم کی فوج ان حالات میں غزنی پر چڑھ دوڑے گی جب میں فوج کی کمی پوری کر رہا ہوں۔ میں اُن کا مقابلہ اب بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ خانہ جنگی ہوگی۔ یہ دو مسلمان ملکوں کی جنگ ہوگی جس میں اسلام کی طاقت ضائع ہوگی اور اس کا فائدہ کفار کو پہنچے گا اور اس کا فائدہ ہندوستان کے ہندوؤں کو بلکہ ہندوؤں کے باطل مذہب کو پہنچے گا۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ابوالعباس کی زوجیت میں جا کر اُسے التونتگین کی فتنہ پردازیوں سے بچا سکتی ہوں تو مجھے اُس کی زوجیت قبول ہے۔" ــــ کاہجی نے کہا۔

"یہ تم بہتر سمجھتی ہو کہ جب تم اُس کے بھائی کی بیوی تھیں تو ابوالعباس پر تمہارا کتنا کچھ اثر تھا" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "اور تمہارا اُس کے ساتھ کوئی رابطہ تھا یا نہیں۔"

"اُس وقت وہ میرے زیرِ اثر تھا" ــــ کاہ کاہجی نے کہا۔ "میرے دل میں اُس کا پیار تھا اور وہ میرے پیار کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ زیادہ وقت میرے پاس گزارتا تھا۔ اُس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اُس کی ماں مر گئی تھی۔ وہ تھا تو شہزادہ مگر شاہانہ جاہ و

جلال سے جذبات کی پیاس نہیں بجھ سکتی ۔ وہ مجھے اپنی ماں بھی اور اپنی بہن بھی سمجھا کرتا تھا۔ اُس کی شادی ہوئی، پھر اُس کی دو بیویاں ہو گئیں مگر وہ رُوحانی تسکین مجھ سے حاصل کیا کرتا تھا۔ اُس کا بھائی مر گیا اور مَیں تین ماہ بعد اُس کے گھر سے رخصت ہوئی تو آپ تصوّر میں نہیں لا سکتے کہ وہ کس طرح رویا تھا۔ اپنے بھائی کی موت پر وہ اتنا نہیں رویا تھا۔"

"پھر تم اُسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہو" سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "اُس کے دل میں صرف غزنی کی نہیں اسلام کی محبت پیدا کرنی ہے ۔ مجھے اپنی سلطنت کو خطروں سے بچانے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر اُس کا دماغ پھر نہیں گیا تو مَیں اُسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں" کالجی نے کہا ۔۔۔ "مَیں آپ کے عزم اور اسلام کی ناموس کے لیے اپنے جذبات اور اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتی ہوں۔ میں خوارزم کی فوجی طاقت کا دھارا کفّار کی طرف موڑ دوں گی۔ مَیں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتی لیکن مَیں آپ کے جہاد میں جان ڈال سکتی ہوں۔ آپ کو طاقت دے سکتی ہوں۔"

سلطان محمود نے اُسی روز تحائف کے ساتھ ابوالعباس مامون کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سلطان کی بہن کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔

ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔

اور یہ شادی اتنے بڑے طوفان کا باعث بن گئی جس نے عالمِ اسلام کو ہلا ڈالا۔ صرف زمین پر ہی لڑائی نہ ہوئی، سلطان محمود غزنوی کو دریا میں لڑنا پڑا جس میں دونوں فریقوں کی ہزارہا کشتیوں نے حصّہ لیا۔ اس ہولناک جنگ سے پہلے ایک ڈرامہ کھیلا گیا جس کی ابتدا شادی کی ضیافت پر ہی کر دی گئی۔

یہ بہت بڑی ضیافت تھی۔ خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ میں چراغاں نے دن کا منظر بنا دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان نے اپنے تمام ستارے جرجانیہ کے قلعے کی دیواروں اور شہر کی منڈیروں پر بکھیر دیے ہوں۔ دوسری ریاستوں کے نمائندے بھی ضیافت میں موجود تھے، اور

اِس ضیافت میں سلطان محمود کی نمائندگی اُس کے دو مشہور سالار ــــ ابوعبداللہ محمد الطائی اور التنطاش کر رہے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ محافظوں کے علاوہ دو اور فوجی کمانڈر تھے جو سلطان محمود کے محکمۂ جاسوسی اور سراغرسانی کے اعلیٰ حاکم تھے۔

ضیافت میں خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر الپتگین بھی تھا۔ ابوالعباس مامون کی اُس فوج کا سالار خمرطاش بھی تھا جو خوارزم کے ایک بڑے شہر ہزاراسپ میں مقیم تھی اور وہ سالار ابواسحاق بھی تھا جو ابوالعباس مامون کا سُسر تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر خوشی کا ہلکا سا تاثر بھی نہ تھا۔ وہ تینوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ سلطان محمود کے نمائندہ سالاروں سے تپاک سے ملے تھے مگر اُن سے دُور بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے غزنی کے وہ دو فوجی کمانڈر بیٹھے تھے جو جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے۔ اِن دونوں کو سلطان محمود نے خاص مقصد کے لیے بھیجا تھا۔

”یہ نہ سمجھو کہ میری بہن کے ساتھ شادی کر کے ابوالعباس مامون میرا دستِ راست بن گیا ہے“ ــــ سلطان محمود نے انہیں کہا تھا ــــ ”ہو سکتا ہے ابوالعباس میرا دستِ راست بن ہی جائے لیکن آپ ہی نے اپنے ذرائع سے وہاں کے اندرونی اور زیر زمین حالات معلوم کر کے مجھے بتایا ہے کہ خوارزم کے امراء الو الٹ میں اور وہاں کے سالاروں کی منڈلی میں کوئی لاوا پک رہا ہے۔ کوئی سازش سر اٹھا رہی ہے۔ وہاں جا کر تمہارا تعارف یہ نہیں کرایا جائے گا کہ تم الطائی اور التنطاش کے ساتھ آئے ہو۔ تم شہری لباس میں ہو گے اور اپنے آپ کو سمرقند کے تاجر ظاہر کرو گے۔ وہاں ہزاروں مہمان ہوں گے۔ کھیل تماشے ہوں گے مگر تمہاری توجہ اُس کھیل پر ہوگی جو وہاں درپردہ کھیلا جا رہا ہے۔ تم وہاں کے تین آدمیوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنا۔ اُن کی باتیں نہ سن سکو تو اُن کے انداز اور اُن کی حرکتیں دیکھنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ اُن کے ارادے کیا ہیں۔ ان میں ایک الپتگین امیر بخارا ہے، دوسرا ابواسحاق اور تیسرا خمرطاش۔ یہ دونوں سالار ہیں۔“

اِن دونوں کو اِس سے زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی اپنے جاسوسوں سے معلوم کر چکے تھے کہ خوارزم میں کوئی بہت بڑا خطرہ پرورش پا رہا ہے چنانچہ جرجانیہ کی ضیافت میں وہ گئے تو کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ دونوں فوجی ہیں اور ایسے

سراغرساں کہ اُن کی نظریں زمین کی تہوں میں بھی اور انسانوں کے سینوں کے اندر بھی چلی جاتی ہیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے جسموں والے احمق سے تاجر لگتے تھے۔ دونوں التگین، ابواسحاق اور خمرطاش کے پیچھے بیٹھے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں گھوڑ دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ گھوڑ سواری کے کرتب دکھائے جانے تھے۔ تیغ زنی کے مظاہروں اور کُشتیوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

ابوالعباس مامون کی آمد کا اعلان ہنگامہ خیز موسیقی سے ہُوا۔ ابوالعباس کاہ کالجی کے ساتھ آرہا تھا۔ کالجی دراز قد، خوبصورت اور جوان تھی۔ اُس کی چال میں شاہانہ جلال اور انداز میں وقار تھا۔ ابوالعباس بھی خوبرو تھا۔ اِن دونوں کے پیچھے ابوالعباس کی پہلی دو بیویاں آرہی تھیں۔

"سلطان محمود نے اپنی بہن کے عوض خوارزم شاہ کو نہیں پورے خوارزم کو خریدنے کی کوشش کی ہے"۔۔۔ خوارزم کے سالار ابواسحاق نے جو ابوالعباس کا سُسر بھی تھا، طنزیہ کہا۔

التگین نے پیچھے دیکھا۔ پیچھے دو اجنبی بیٹھے ہوئے تھے جو سلطان محمود کی جاسوسی کے نظام کے اعلٰی حاکم تھے۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"۔۔۔ التگین نے مسکرا کر اُن سے فارسی زبان میں پوچھا۔ دونوں مسکرائے اور سر ہلا دیئے۔ یہ اشارہ تھا کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے، حالانکہ ان دونوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ التگین، خمرطاش اور ابواسحاق نے باری باری اُن سے اشاروں میں پوچھنے کی کوشش کی تو ایک نے کہا "کرک تاغ"۔۔۔ یہ مشرق میں بہت دُور ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں کی زبان کچھ اور تھی۔

"یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے"۔۔۔ التگین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔۔۔ "میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ ہاں، ابواسحاق! آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ یہ شادی غزنی اور خوارزم کی ہوئی ہے"۔۔۔ ابواسحاق نے کہا "سلطان محمود اور اُس کی بہن اس نوجوان مامون کو انگلیوں پر نچائیں گے اور اسے پتہ ہی نہیں چلے گا کہ خوارزم پر غزنی کا قبضہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ اس صورت کو برداشت کر

لیں گے التگین!

"وقت آنے دو" — التگین نے کہا — "خوارزم میں غزنوی آئے تو ان کی لاشیں کبھی نہیں ملیں گی۔"

"اس کا انتظام پہلے سے ہونا چاہئے" — سالار خمر طاش نے کہا۔

"فوج آپ کی کمان میں ہے" — امیر التگین نے کہا — "اسے اپنے اثر میں لے لیں۔"

"کیا ہمیں یہ باتیں یہاں کرنی چاہئیں؟" — ابو اسحاق نے کہا۔

"گھبرائیں نہیں" — خمر طاش نے کہا — "پیچھے والے دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے۔"

"دائیں بائیں آواز جا سکتی ہے" — التگین نے کہا — "احتیاط ضروری ہے..... ابو اسحاق! کیا آپ کی بیٹی کا ابو العباس پر کوئی اثر نہیں؟"

"ہے تو سہی" — ابو اسحاق نے کہا — "لیکن اب کیسے رہے گا۔ محمود کی بہن بہت چالاک عورت ہے۔ اب میری بیٹی کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اُن کی باتیں غور سے سُن رہے تھے۔ التگین اور اُس کے ساتھیوں نے جب بھی پیچھے دیکھا، اُن دونوں کو گھوڑوں کے کھیل تماشے میں محو پایا۔ گھوڑوں کے دوڑنے کا اور مہمانوں کی چیخ و پکار کا شور بہت زیادہ تھا۔ سلطان محمود کے یہ دو نوجوان التگین اور دونوں سالاروں کی باتیں سُننے کی کوشش کرتے رہے مگر انہوں نے موضوع بدل لیا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔

جشن کا ہنگامہ آدھی رات کو ختم ہوا۔

امیر بخارا التگین، سالار ابو اسحاق اور خمر طاش ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک عورت اندر آئی جس کا چہرہ نقاب میں تھا۔ اندر آتے ہی اُس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ابو العباس کی بیوی اور ابو اسحاق کی بیٹی الجوری تھی۔

"رات کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں" — الجوری نے بیٹھتے ہوئے کہا — "کان کا کچی

کی جو خادمہ رات کے لیے مقرر کی گئی تھی، میں نے اُسے پہلے ہی ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رات اُس نے حجلۂ عروسی کے دروازے کے ساتھ کان لگائے رکھے تھے۔ اُسے کوئی وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُسے دروازے پر ہی موجود رہنا تھا۔ اُس نے دروازے کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے اندر بلا لیا گیا تھا۔ اُس کی موجودگی میں بھی ابوالعباس اور کاکجی باتیں کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ کاہ کاکجی صرف بیوی بن کر نہیں آئی۔ وہ ایک پیغام اور ایک پھندہ بن کر آئی ہے۔ ابوالعباس بھی اُسے صرف بیوی نہیں سمجھتا، اُسے اپنے دل کی ملکہ اور سراپا عشق کہتا ہے۔ خادمہ نے جو باتیں سُنائی ہیں وہ میں آپ کو سنا دیتی ہوں "

کسی بادشاہ اور ملکہ کی رات کی خادمہ کے لیے رات کی باتیں معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خادمہ نے الجبری کو جو باتیں سنائیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

" ابوالعباس!" ۔۔۔ کاہ کاکجی نے کہا ۔۔۔ " اگر تم نے میرے ساتھ صرف اس لیے شادی کی ہے کہ تمہیں تیسری بیوی کی ضرورت تھی تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری محبّت کو سینے میں دفن کر کے اس پر آنسو بہا لوں گی "

" مجھے تمہاری ضرورت تھی!" ۔۔۔ ابوالعباس نے کہا ۔۔۔ " میرے لیے بیویوں کی تو کمی نہیں ..... کیا تم جب میرے بھائی کی بیوی تھیں تو بھی مجھے اسی طرح چاہتی رہی ہو؟"

" وہ محبّت کچھ اور تھی ابوالعباس!" ۔۔۔ کاکجی نے جواب دیا ۔۔۔ " ایک بُت شکن سلطان کی بہن اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ تمہاری عادتیں اچھی لگتی تھیں "

" تو میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری زوجیت اس لیے قبول کی ہے کہ میں تمہیں اچھا لگتا تھا؟"

" صرف اس لیے نہیں" ۔۔۔ کاہ کاکجی نے کہا ۔۔۔ " جس طرح تمہارے لیے بیویوں کی کمی نہیں اسی طرح میرے لیے بھی خاوندوں کی کمی نہیں تھی۔ سلطنتِ غزنی میں ایک سے ایک خوبصورت اور بہادر جوان تھا لیکن تمہاری زوجیت قبول کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں تمہارے لیے صرف محبّت نہیں لائی، ایک پیغام بھی لائی ہوں۔ یہ پیغام

میرے باپ کا نہیں، خدا کا ہے.... کیا تم اس سے انکار تو نہیں کرو گے کہ غزنی کو آنے والی نسلیں بُت شکنوں کا اور باطل کو روندنے والوں کا شہر کہا کریں گی؟ اور کیا تم اس سے انکار کرو گے کہ غزنی اپنے ارد گرد کی تمام مسلمان امارتوں اور ریاستوں کے حکمرانوں کے دلوں میں کانٹا بن کر اٹکا ہوا ہے اور وہ اسلام کی تاریخ کے اس درخشاں باب پر سیاہی انڈیلنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے انکار نہیں" ــــ ابوالعباس نے کہا ــــ "تم جو کہہ رہی ہو یہ بالکل سچ ہے لیکن تم نے ان باتوں کے لیے آج کی رات کیوں منتخب کی ہے؟ کیا تم میرے رومانوں اور میرے اتنے پیارے خوابوں کو آج ہی رات میدانِ جنگ میں لے جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں.... آج ہی رات" ــــ کاہ کاکجی نے کہا ــــ "ازدواجی زندگی کی پہلی رات بڑی مقدس ہوتی ہے ابوالعباس! یہ رات تمہارے لیے نئی نہیں، اور یہ رات میرے لیے بھی نئی نہیں۔ میں تمہیں رومانوں اور خوابوں سے محروم نہیں کروں گی۔ اگر تمہارے خواب میرے وجود سے حسین ہیں تو میں اُن کا حسن پامال نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے دل کی بات کر لینے دو اور مجھے اپنے دل کی بات سمجھ لینے دو۔ ابھی ساری رات باقی ہے۔ ابھی ساری عمر کی راتیں باقی ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیے میری سُن لو....

"آج کی رات جو ہم دونوں کے لیے مسرتوں اور رومانوں کی رات ہے، غزنی کی ہزاروں ماؤں اور ہزاروں بہنوں کے لیے بڑی ہی اُداس اور غمناک رات ہے۔ وہ اُن بیٹوں اور اُن بھائیوں کے انتظار میں جاگ رہی ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہندوستان گئے تھے اور حق اور باطل کے خونریز تصادم میں پس گئے۔ وہ خدا کے حضور سرفرو ہوئے کہ وہ جدھر گئے مسجدیں آباد رکھیں اور بُت خانے زمین سے ملا دیئے۔ وہ اللہ کے عظیم پیغام پر قربان ہو گئے۔ میں آج رات کی مسرتیں اُن کی نذر کرتی ہوں......

"اور پھر اُنہیں یاد کرو جو تخت و تاج کے ہوس کاروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہماری سرزمین خانہ جنگی کے خون سے لال ہو گئی تھی، اور اگر آج رات تم میری باتیں غور سے نہیں سنو گے تو یہاں بھائی کی تلوار بھائی کی گردن کاٹتی رہے گی۔ بھائیوں کی

کمانوں سے نکلے ہوئے تیر بھائیوں کے سینوں میں اُترتے رہیں گے۔ آج کی رات مجھے اُن کی بھی مائیں اور بہنیں یاد آرہی ہیں جو اپنے بادشاہوں کی خواہشوں پر کٹ مرے تھے۔ تم ابھی جوان ہو ابوالعباس! میں بھی ابھی جوان ہوں۔ آؤ، تھوڑی سی دیر جوانی کے اُبال کو اور عروسی کے جذبات کو الگ رکھ کر دو چار باتیں کر لیں ....

" خوارزم نے ابھی تک غزنی پر حملے کی کیوں نہیں سوچی؟ تمہارا باپ کیوں قتل ہو گیا تھا؟ کیونکہ اُس نے غزنی پر قبضہ کرنے کی نہیں سوچی تھی۔ اُسے کہا گیا تھا۔ وہ نہ مانا اور قتل کر دیا گیا۔ تمہارے بڑے بھائی کا دماغ خراب ہو چلا تھا لیکن اُس نے میرے ساتھ شادی کر لی۔ میں نے پہلی رات اُس کے ساتھ بھی باتیں کی تھیں۔ یہ باتیں اُس کے دل میں اُتر گئیں۔"

" کیا تم نے بھی سُنا تھا کہ میرے بھائی کو تمہارے بھائی سلطان محمود نے زہر دلوایا تھا؟" — ابوالعباس نے کہا — " اور زہر دلوانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

" کیا تمہیں اس جھوٹ پر یقین آگیا تھا؟" — کاہ کالجی نے پوچھا۔

" مجھے شک تھا۔"

" شک بھی نہیں ہونا چاہیے تھا" — کاہ کالجی نے کہا — " اپنی فوج سے چار پانچ گنا زیادہ فوج پر ٹوٹ پڑنے والا سلطان کسی کو زہر نہیں دیا کرتا۔ اُسے تمہارے بھائی کی موت کی ضرورت ہوتی تو وہ یہاں خود آتا۔ جُرجانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا اور تمہارا بھائی اُس کے قید خانے میں پڑا ہوا ہوتا۔ میں تمہیں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی نے میری باتوں کا اثر لیا اور اُس نے غزنی کے ساتھ دشمنی مول نہ لی۔ یہ شک مجھے بھی ہے کہ تمہارے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جو آہستہ آہستہ بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ مجھے بیوہ کر گیا۔ اگر اُسے زہر ہی دیا گیا تھا تو اُن لوگوں نے دیا تھا جو غزنی اور خوارزم کو لڑانا چاہتے تھے۔"

" وہ کون ہو سکتے ہیں؟" — ابوالعباس نے پوچھا۔

" وہ ہیں تو مسلمان لیکن ان سازشوں اور خانہ جنگی کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے"

— کاہ کاہجی نے کہا — "یہ یہودیوں اور عیسائیوں کا خفیہ ہاتھ ہے اور اس میں قرامطی بھی شامل ہیں جن کے مرکز اور سرغنہ کو میرا بھائی ختم کر چکا ہے۔"

"کاہجی!" — ابوالعباس نے گھبرا کر کہا — "میں اسی عمر میں قتل نہیں ہونا چاہتا۔"

"کہو، میں قتل ہونا چاہتا ہوں لیکن اللہ کی راہ میں" — کاہجی نے کہا — "میرا بھائی ہندوستان میں جا کر قتل ہونے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں، بلکہ خدا چاہتا ہے کہ تم میرے بھائی کے دوش بدوش چلو۔ میں اپنا سہاگ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اتنا کرو کہ سلطنتِ غزنی کے ساتھ اتحاد کر لو۔"

"آج کل سلطان کو ایک طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے" — ابوالعباس نے کہا — "اس کی جنگی طاقت بہت کمزور ہو گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے" — کاہ کاہجی نے کہا — "غزنی کی جنگی طاقت اتنی کمزور نہیں ہوئی جتنی تم سمجھتے ہو۔ غزنی میں خاصی فوج موجود ہے۔ ہندوستانیوں کے دستے بھی ہیں جنہیں ہندوستان میں نہیں لے جایا جاتا۔ انہیں یہاں لڑانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے پاس بہت خوش ہیں اور اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ سلطنتِ غزنی سے ہزار ہا رضاکار عارضی طور پر فوج میں شامل ہو گئے ہیں، اور جو کمی ہے وہ جذبے سے پوری کی جائے گی۔ لہٰذا دل سے یہ خیال نکال دو کہ سلطان محمود کو اپنی سلطنت کے دفاع کے لیے کسی طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔ البتہ تمہیں ایک مخلص اور طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔"

ابوالعباس کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر سوچ کر بولا — "میں تمہارے بھائی سے اتحاد کر لوں گا لیکن اس کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔ اگر اس نے کہا کہ خطبے میں اس کا نام لیا جائے تو اس کی اجازت نہیں دوں گا..... کاہجی! میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری محبت کے علاوہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اندرونی اور بیرونی خطرات میں اتنا گھر چکا ہوں کہ مجھے تمہارے بھائی کی دوستی کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا۔"

"میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا" ــــ کابجی نے کہا ــــ "لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان امارتیں کفر کے خلاف متحد نہ ہوں تو خوارزم اور غزنی اس محاذ پر دوش بدوش لڑیں۔"

"ایسا ہی ہوگا" ــــ ابوالعباس نے کہا۔

اور ابوالعباس نے رومانی اور جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ خادمہ نے الجوری کو بتایا کہ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی، اُن کی باتیں سُن سکتی تھی۔ خادمہ کا خیال تھا کہ اتنی خشک باتیں کرنے والی اور جہاد کا وعظ دینے والی عورت رومانی باتوں اور حرکتوں میں کوری ہوگی مگر اُس کی ہنسی بھی رومان انگیز تھی اور باتیں ایسی کہ ابوالعباس پر نشہ طاری ہوگیا ہوگا۔ کابجی کھلنڈری لڑکی بن گئی۔ خادمہ نے بتایا کہ اُس کی باتیں تو بہ شکن تھیں۔

التگین نے خادمہ کو دینے کے لیے الجوری کو سونے کے دو دینار دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ان دونوں کی ہر ایک بات خادمہ سے پوچھتی رہے خواہ کوئی بات کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔

الجوری چلی گئی تو التگین نے ابواسحاق اور خمر طاش سے کہا۔ "ہمارا خیال صحیح نِکلا۔ یہ شادی بلا مقصد نہیں ہُوئی۔"

"یہ اتحاد نہیں ہوگا" ــــ ابواسحاق نے کہا ــــ "خوارزم شاہ ابوالعباس کو جوانی اور رومانوں نے اندھا کر رکھا ہے۔ ہم اس کے وزیر الوالحارث کو ہاتھ میں لیں گے۔"

"ابوالحارث بہت خطرناک آدمی ہے" ــــ التگین نے کہا ــــ "اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔ وہ مامونی خاندان کا پروردہ اور وفادار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔ اگر ابوالعباس زن مرید بن گیا تو اُسے زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ابوالعباس بچّہ ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ محمود نے بہن دے کر خوارزم کا سودا کیا ہے۔"

"ہمیں فوج کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے" ــــ سالار خمر طاش نے کہا ــــ "فوج خوارزم شاہ کی وفادار ہے۔"

"دارالحکومت (جرجانیہ) میں فوج تھوڑی ہے" ــــ التگین نے کہا ــــ "فوج

کا زیادہ تر حصہ ہزار اسپ میں اور میرے پاس بخارا میں ہے۔ اس فوج کو اپنے اثر میں لانا ہے .... مجھے سوچنے دو۔ میں شاید کوئی انتظام کر لوں گا۔ خانہ جنگی کے لیے فوج کو کوئی گھاگ استاد ہی تیار کر سکتا ہے۔"

خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ سے پچاس میل دور جنوب میں دریا کے کنارے ہزار اسپ بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ وہاں فوج ایک مدت سے فارغ پڑی تھی۔ وہ جنگ وجدل کا زمانہ تھا مگر خوارزم کی اس فوج نے برسوں سے کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی۔ کمانداروں اور سپاہیوں کے دماغ فارغ تھے۔ اُن کے شب و روز ہنسی مذاق، گپ بازی اور بیکار مشاغل میں گزر رہے تھے۔ فوج کا رجحان مذہب کی طرف کم ہی تھا

ایک روز ایک فقیر جس کی داڑھی سیاہ و سفید تھی، اور جو کندھوں سے پاؤں تک لمبے کرتے میں ملبوس تھا جس کا رنگ سبز تھا، فوجیوں کی بارکوں کے قریب سے گزرا۔ اُس نے سر پر سبز رنگ کا صافہ لپیٹ رکھا تھا۔ صافے پر موٹے دانوں کی تسبیحاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صافے کے علاوہ ایسی ہی تسبیحاں جن کے دانوں کے کئی رنگ تھے، اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں لمبا عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ دھماکہ نما بلند آواز سے بولتا جا رہا تھا "لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ"—— اس کے ساتھ ہی وہ عصا زور سے زمین پر ٹھونکتا تھا۔

فوجیوں نے اس قسم کا فقیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سپاہیوں کے ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ وہ رک گیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے بولا —— "دریا کے کنارے ڈوب جائیں گے۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ آسمان آگ برسائے گا .... لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ"

اُس نے اپنے گرد کھڑے سپاہیوں کی طرف نہ دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اُس نے لا الہ الا اللہ کے دھماکوں کے ساتھ عصا زمین پر مارا تو سپاہیوں نے اُسے راستہ دے دیا۔ بعض سپاہی اس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک درہم دے دیا۔ چند اور سپاہیوں نے اسے دینے کے لیے جیبوں سے

درہم نکالے۔ وہ اسے بھکاری فقیر سمجھ رہے تھے لیکن فقیر کے ہاتھ میں جو درہم تھا وہ اُس نے دانتوں میں لے کر دوہرا کر دیا اور اسے ہوا میں اچھال کر دُور پھینک دیا۔ باقی سپاہیوں نے جیبوں سے نکالے ہوئے درہم اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔ اُس کی اس بے نیازی سے سب مرعوب ہو گئے۔

دو آدمی تیز تیز چلے آ رہے تھے انہوں نے سپاہیوں کے ہجوم کو روک لیا۔ ان میں سے ایک نے سپاہیوں سے کہا ——"اسے پریشان نہ کرنا۔ اسے پیسے کبھی نہ دینا۔ اس کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ یہ غیب کا کوئی پیغام دے رہا ہے۔ یہ پندرہ سولہ سال بعد نظر آیا ہے تمہیں یاد ہو گا کہ پندرہ سولہ سال پہلے سمرقند میں زلزلہ آیا تھا۔ زلزلے سے ایک دو دن پہلے یہ فقیر سمرقند کی گلیوں میں نظر آیا تھا۔ یہ اسی طرح لا الٰہ الا اللہ پڑھتا، عصا زمین پر ٹھونکتا اور بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا۔"سمرقند کی زمین گناہگاروں کے بوجھ سے تھک گئی ہے"—— اس کی پکار کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ وہاں سے غائب ہو گیا اور زمین اتنے زور سے ہلی کہ آدھا سمرقند تباہ ہو گیا۔ شراب خانے اور قحبہ خانے زمین سے مل گئے۔"

"اور اب یہ یہاں نظر آیا ہے"—— دوسرے آدمی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا ——"اب معلوم نہیں دریا میں سیلاب آئے گا یا کوئی پہاڑ پھٹے گا یا آسمان سے آگ کس طرح برسے گی۔ کچھ ہو گا ضرور۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

سپاہیوں پر خوف طاری ہو گیا۔ اُن کے رنگ زرد ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے؟ کیوں آ رہی ہے؟ کیا یہ ٹل سکتی ہے؟ اَن پڑھ اور توہم پرست سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے بارکوں میں چلے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں تمام تر فوج میں یہ دہشت ناک خبر پھیل گئی کہ ایک فقیر تباہی کا پیغام دیتا پھر رہا ہے۔ خبر جُوں جُوں پھیلتی گئی، زیادہ سے زیادہ دہشت ناک ہوتی گئی۔ بارکوں میں یہی فقیر موضوع بن گیا اور سب اس مسئلے کا حل سوچنے لگے کہ فقیر سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے۔

دوسرے دن خبر پھیل گئی کہ فقیر کو دریا کے کنارے دیکھا گیا ہے جہاں اُس نے چھوٹا سا ایک خیمہ لگا رکھا ہے۔ چند ایک سپاہی دریا کو چل دیئے۔ انہوں نے وہاں چھوٹا سا ایک خیمہ دیکھا جس کے قریب تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ سپاہی اِن کے قریب چلے گئے۔ خیمے کے اندر سے دھماکے جیسی آوازیں آ رہی تھیں ــــ "لاالٰہ الااللہ۔ لاالٰہ الااللہ۔۔۔۔ خون کا طوفان ہے۔ روک لو۔ روک لو"

باہر جو آدمی بیٹھے تھے، انہوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ رات بھر یہاں رہے ہیں اور فقیر اپنا عصا پانی میں ڈبو ڈبو کر اس کی گہرائی دیکھتا رہا ہے۔ ان آدمیوں نے فقیر کے پاؤں چھو کر پوچھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ فقیر نے آسمان کی طرف دیکھا تو تین ستارے اکھٹے ٹوٹے اور شرارے بکھیرتے بہت دور دور جا پھٹے۔ فقیر نے منہ اوپر کیے ہوئے کہا۔ "ابھی وقت ہے۔ باز آجاؤ۔ خون کی طغیانی کو روک لو۔"

ان آدمیوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ اس فقیر کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ سپاہی وہاں کھڑے فقیر کی آوازیں سنتے رہے اور ان آدمیوں کو فقیر کے متعلق جو کچھ معلوم تھا، پوچھتے رہے اور فقیر ان کے لیے خدا کا ایلچی بن گیا۔ یہ سپاہی جب بارکوں میں گئے تو انہوں نے فقیر کے متعلق کچھ نئی باتیں بنا کر سنسنی پھیلا دی۔ اُس روز کے بعد فقیر کا چھوٹا سا خیمہ سپاہیوں اور شہر کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا۔ وہ وہاں جاتے اور خیمے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ خیمے کے اندر فقیر قرآن کی آیات بلند آواز سے پڑھتا اور للکارنے لگتا۔ "خون کا طوفان آ رہا ہے۔ انسان انسان کو کھائے گا۔۔۔۔ بادشاہ عورت کا غلام ہو گیا ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کے وہ دو حاکم جو اُس کے نظامِ جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے، سلطان محمود کو بتا چکے تھے کہ انہوں نے ابوالعباس کی شادی کے جشن پر امیر الپتگین، سالار ابو اسحاق اور سالار خمرطاش کی باتیں سنی تھیں اور ان تینوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس جشن کو اڑھائی تین مہینے گزر گئے تھے۔ سلطان محمود نے ان دونوں سے کہا تھا کہ وہ ابوالعباس کے محل میں اور جرجانیہ میں اپنے چند ایک تجربہ کار آدمی

بھیج دیں جو اس سازش کا سراغ لگاتے رہیں۔ اِس حکم کے تحت تین چار آدمی جرجانیہ بھیج دیئے گئے تھے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُن کا رابطہ کاہ کاکجی کے ساتھ بھی ہو گیا تھا اور وہ انہیں یہی اطلاعیں دیتی رہی کہ ابو العباس سُلطان محمود کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ تھا وہ ہزار اسپ اور بخارا میں تھا۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے فقیر لوگوں خصوصاً فوجیوں کے دلوں پر چھا گیا تھا۔ وہاں سے دو سو میل دُور بخارا میں دریائے زرافشاں کے کنارے ایک اور فقیر مشہور ہو گیا جس نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے تھے لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چار پانچ مرد اور اتنی ہی عورتیں تھیں۔ اس فقیر کی یہ کرامات مشہور ہو گئیں کہ وہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا ہے جن سے انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان لمبی عمر اور بڑھاپے میں بھی جوانی کا طلبگار ہوتا ہے لیکن فوجی پر چونکہ ہر وقت موت منڈلاتی رہتی ہے اس لیے وہ ایسے تعویذ کی ضرورت زیادہ محسوس کرتا ہے جو موت کو ٹال سکے۔ چنانچہ بخارا کے فوجی جوق در جوق اس فقیر کے پاس جانے لگے۔

پھر دونوں فقیروں نے لوگوں کو وعظ سنانے شروع کر دیئے۔ دونوں کے وعظوں کا لُبِ لُباب یہ ہوتا تھا کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اور تمہارے پڑوس کی تمام ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور وہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہتی ہیں۔ اگر تم نے کسی پڑوسی پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ مسلمان ہے تو تم پر ایسی تباہی آئے گی کہ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ان دونوں نے فقیری اور درویشی کا ایسا تاثر ... ایک لفظ سپاہیوں کے دل میں اتر جاتا تھا۔

التگین ایک رات اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے جو خوارزم کے رہنے والے نہیں تھے اور وہ مسلمان بھی نہیں تھے۔ دونوں فرنگی تھے۔

”آخر اس ڈھونگ سے آپ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“ ـــ التگین

نے اُن سے پوچھا۔

"آپ نے ہماری مدد کیوں حاصل کی ہے؟" — ایک نے جواب دیا — "صرف اس لیے کہ آپ فوج کو اپنا حامی بنا کر خوارزم شاہ بننا چاہتے ہیں مگر خوارزم کی فوج آپ کا یہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ جرجانیہ یعنی اپنے دارالحکومت پر حملہ کر کے وہاں کی فوج کو شکست دیں اور ہزاراسپ اور بُخارا میں جو فوج مقیم ہے وہ اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے۔ ہم نے یہاں آکر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ خوارزم کی فوج ابھی تک آپس میں لڑنا تو درکنار، اپنے کسی مسلمان پڑوسی کے خلاف بھی نہیں لڑی اور اس فوج کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف نہیں لڑا کرتا۔ ہمیں سب سے پہلے ہزاراسپ اور بُخارا میں جو دستے مقیم ہیں ان کے دلوں سے اسلام کا رشتہ توڑنا ہے ....

"توہم پرستی واحد ذریعہ ہے جس سے کسی کے مذہب کو کمزور کیا جاسکتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ آنے والے وقت کے حالات اور ہونے والے واقعات جاننا چاہتا ہے۔ انسان کی دوسری کمزوری سنسنی اور جذباتیت ہے جو انسان سنسنی خیز باتوں کو پسند کرنے لگتا اور عقل پر جذبات کو غالب کر لیتا ہے، اُسے نہایت آسانی سے اپنے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ انسان جتنا اَن پڑھ اور پسماندہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ انسان کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ لمبی عمر چاہتا اور مرنے تک جوان رہنا چاہتا ہے ....

"ہم نے آپ کے کمانداروں اور سپاہیوں کی یہ خامیاں اِن دو فقیروں کے ذریعے بیدار کر دی ہیں۔ یہ دونوں فقیر اِس فن کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مذہب کا نام لے کر سپاہیوں کے دلوں میں مذہب کی جگہ توہم پرستی بھر دی ہے۔ دونوں فقیر آپ کے قرآن سے آیات پڑھ کر بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات قرآن کے اُلٹ اور اسلام کے منافی ہوتی ہے۔ ہمارے اُستادوں نے آپ کی فوج کے دلوں میں اسلام کی محبت قائم رکھتے ہوئے پڑوسی مسلمانوں کے خلاف شکوک اور وسوسے پیدا کر دیئے ہیں ....

"ہم عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں آپ کے مذہب کی ہر بات معلوم

ہے۔ ہم نے آپ کے سپاہیوں پر مذہبی جنون طاری کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے آدمی جو مسلمان ہی ہیں، آپ کی چھاؤنیوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ افواہیں پھیلاتے ہیں اور وہ ہر محفل میں کہتے ہیں کہ خوارزم کو سلطان محمود سے صرف التگین بچا سکتا ہے۔ خوارزم شاہ ابوالعباس اور اس کی بیوی کاہ کالجی کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا گیا ہے کہ سپاہی انہیں ناپسند کرنے لگے ہیں۔ چند دنوں میں ہی آپ کی فوج بغاوت کے لئے تیار ہو جائے گی ....

"آپ کے دو نائب سالار جو ابوالعباس کے کٹر حامی تھے، انہیں ہم نے دو جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے اثر میں لے لیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں آپ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اب وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اگر کوئی اور مدد چاہیے تو ہمیں بتاویں ہم آپ کو مالی مدد دے سکتے ہیں۔ اسلحہ دے سکتے ہیں۔ جانور دے سکتے ہیں۔"

"ابھی نہیں" — التگین نے کہا — "اگر آپ نے مجھے مدد دی تو خوارزم شاہ کو پتہ چل جائے گا۔ مجھے ایک بہانہ اور ایک موقع چاہیے تاکہ میں فوج کو اس کے خلاف بھڑکا سکوں اور اپنا حامی بنا لوں۔ میں نے خوارزم شاہ کا تختہ الٹ دیا تو آپ سے مدد لوں گا۔"

"اور میں ایک بار پھر کہہ دوں کہ ہمیں آپ سے کچھ نہیں لینا" — دوسرے فرنگی نے کہا — "ہمیں آپ کی صرف دوستی چاہیے، پھر ہم آپ پر ثابت کریں گے کہ کلیسا اور کعبہ میں کتنا پیار ہے۔ اس پیار میں سلطان محمود حائل ہے۔ محمود کا خاتمہ ضروری ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں" — التگین نے کہا — "محمود سلطنت غزنی کی توسیع چاہتا ہے۔"

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ آپ کی فوج کسی مسلمان ملک کے خلاف تو نہیں لڑے گی، یہ غزنی کے خلاف بالکل ہی نہیں لڑے گی" — فرنگی نے کہا — "یہ سلطان محمود کی بہن کاہ کالجی کا اثر ہے۔ ہماری آنکھیں اس کمرے کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں جس میں ابوالعباس اپنی پہلی دو بیویوں کو فراموش کر کے کاہ کالجی کے جادو میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے۔

ابوالعباس غزنی کو فوجی مدد دے دے گا۔ اس کے خلاف لڑے گا نہیں"۔

وہ بڑی دلکش لڑکیاں ان تینوں کو شراب پلا رہی تھیں اور التونتگین پر شراب کا نشہ کم اور لڑکیوں کا خمار زیادہ طاری ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ان لڑکیوں کو دیکھتا تھا۔ دونوں فرنگی اس پر خوارزم شاہی کا نشہ طاری کر رہے تھے۔

کاہ کالجی کے پاس غزنی سے ایک نیا ملازم آیا تھا۔ وہ جبیس نام کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ کالجی نے ابوالعباس کو بتایا تھا کہ یہ اُس کا خاص ملازم تھا جسے اُس کے بھائی سلطان محمود نے اس کے پاس بھیج دیا ہے۔ ابوالعباس کو بھی یہ ملازم بہت پسند آیا تھا۔ اُس میں خاص قسم کی شائستگی، نفاست اور ذہانت تھی۔ وہ دوسرے ملازموں، خدمت گاروں اور خادماؤں پر نگرانی کی، اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی مہارت رکھتا تھا۔

ایک روز کالجی باغ میں بیٹھی تھی اور جبیس اُس کے سامنے سر جھکائے اور ہاتھ نماز کی طرح باندھے کھڑا تھا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے وہ کالجی کی بات سُن رہا ہو مگر وہ سُن نہیں رہا بول رہا تھا اور کالجی سُن رہی تھی۔

"کوئی گڑبڑ ضرور ہے"۔ جبیس کہہ رہا تھا۔ "بخارا اور ہزار اسپ سے جو اطلاعیں آئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی فوج پر کوئی شیطانی اثر کام کر رہا ہے۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے ایک فقیر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جو بڑی خوفناک پیش گوئیاں کرتا ہے اُس نے ایسا ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ سپاہی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ قرآن پاک ہاتھ میں رکھتا اور سپاہیوں کو درس اور وعظ دیتا ہے"۔

"کیا یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ کوئی تارک الدنیا عالم نہیں ہے؟"۔۔۔ کاہ کالجی نے پوچھا۔

"وہ عالم ہو سکتا ہے تارک الدنیا نہیں، اور وہ علم نہیں ابلیسیت پھیلا رہا ہے۔ ۔۔۔ جبیس نے کہا۔۔۔ "وہ غزنی کے خلاف زہر اُگلتا ہے اور قرآن کی آیات پڑھ کر کہتا ہے کہ غزنی والے اور اردگرد کی تمام مسلمان ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور سچے مسلمان خوارزم کے لوگ ہیں"۔

"کیا وہ خوارزم شاہی کے خلاف بھی باتیں کرتا ہے؟" ___ کالجی نے پوچھا۔
"نہیں"۔ جنبس نے جواب دیا ___ "لیکن سپاہیوں اور کمانداروں کے خیالات میں ایسی تبدیلی دیکھی گئی ہے جو خوارزم شاہی کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے .... بخارا میں بھی دریا کے کنارے ایک فقیر نے چند ایک مریدوں اور بڑی خوبصورت عورتوں کے ساتھ خیمے گاڑ رکھے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا اور کہتا ہے کہ ان سے عمر بہت لمبی ہوگی اور جوانی سدا قائم رہے گی۔ اس کے ساتھ جو جوان عورتیں ہیں وہ راتوں کو دریا کے کنارے یا جنگل میں کمانداروں کے ساتھ دیکھی گئی ہیں۔ وہاں کی فوج کی باتوں میں بھی تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ اس فقیر کے گرد میلہ لگا رہتا ہے۔ وہ بھی وعظ کرتا اور غزنی کے خلاف زہر افشانی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی اور خوارزم کے درمیان عداوت پیدا کی جا رہی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے دونوں چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ کر اور ان فقیروں کے مرید بن کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہی سپاہی جو فارغ رہ رہ کر غلیظ اور فحش باتیں یا حرکتیں کیا کرتے تھے، اب غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پتہ چلا ہے کہ وہاں بہت سی بدکار عورتیں پہنچ گئی ہیں جو سپاہیوں کو خراب کر رہی ہیں۔ ہمارے ایک آدمی نے ایسی ایک عورت سے ملاقات کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ عورتیں صرف عصمت فروش نہیں بلکہ غزنی کے خلاف اور خوارزم شاہ ابوالعباس کے خلاف زہر پھیلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان کا تعلق ان فقیروں کے ساتھ معلوم ہوتا ہے ....

"ہمارے اس آدمی نے بتایا ہے کہ اس عورت نے اُسے دریا کے اندھیرے کنارے پر جا کر اتنے پیار سے باتیں کیں جیسے وہ اسے بچپن سے چاہتی ہو۔ اُس نے ہمارے آدمی سے پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ فوج کے ایک جیش کا کماندار ہے۔ یہ سنتے ہی عورت کا انداز پہلے سے زیادہ دل کش بلکہ مسحور کن ہو گیا جیسے وہ اس پر مرمٹی ہو۔ یہ عورتیں غیر معمولی طور پر حسین ہیں۔ ہمارا یہ آدمی کہتا ہے کہ اسے اپنے فرض کا احساس نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس عورت کا ہو جاتا۔ عورت نے اس پر نشہ

طاری کر کے کہا۔ "تمہارا خوارزم شاہ تو زن مرید ہو گیا ہے۔ غزنی کی کاہ کا بجی نے اس کی عقل پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ اسے انگلیوں پر نچا رہی ہے،....

"ہمارے آدمی نے پوچھا کہ تم محل کے اندر کی باتیں کس طرح جانتی ہو؟ اس نے کہا۔ "میں محل کے حرم کی لڑکی تھی مگر جب سے ابوالعباس نے سلطان محمود کی بہن سے شادی کی ہے غزنی سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی آئی ہے جو کاہ کا بجی ابوالعباس کو پیش کرتی ہے۔ اس کے کہنے پر حرم کی پہلی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو نکال دیا گیا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ رو پڑی اور بولی۔ "تم ہی بتاؤ ہم کدھر جائیں۔ ہمارے لیے زندہ رہنے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ کیا تم مجھے پناہ میں لے سکتے ہو؟ مجھے اس غلیظ زندگی سے بچا سکتے ہو؟"۔ ہمارے آدمی نے اسے تسلی دی اور پھر ملنے کا وعدہ کیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر الپتگین کے ہاں دو اجنبی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں جو مسلمان نہیں لگتے۔ وہ فرنگی ہو سکتے ہیں۔ یہودی ہوں گے یا عیسائی۔ اب آپ ہمیں بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیا آپ خوارزم شاہ کو بتائیں گی کہ ان کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے؟"

"نہیں"۔ کا بجی نے جواب دیا۔ "انہیں بتایا تو میں ان کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی کہ مجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں۔ ابوالعباس میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں انہیں کہہ سکتی ہوں کہ ہزار اسپ اور بخارا کے دستوں کو دارالحکومت میں بلا لیں اور ان کی جگہ یہاں کے دستے بھیج دیں تاکہ دستے ایک ہی جگہ پڑے پڑے اکتاہٹ محسوس نہ کریں لیکن میں ایسا مشورہ اس لیے نہیں دوں گی کہ جس طرح وہاں کی فوج خراب ہو رہی ہے، اسی طرح یہ دستے بھی وہاں جا کر ان فقیروں کا اثر قبول کر لیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان دونوں فقیروں کو قتل کر دو۔ اگر یہ غزنی میں ہو رہا ہوتا تو انہیں گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہاں اس سازش کو قتل سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارے آدمی یہ کام کر سکتے ہیں؟"

"کر سکیں گے"۔ جبیس نے کہا۔ "ہمیں صرف حکم اور ہدایت کی ضرورت ہے"۔

"اور ایک آدمی غزنی کو روانہ کر دو جو سلطان کو یہ ساری باتیں بتا آئے جو تم نے مجھے

سنائی ہیں" ۔۔ کاہ کابجی نے کہا۔" اور سلطان کو یہ بھی بتادیا جائے کہ میرے کہنے پر ان دونوں فقیروں کو قتل کیا جارہا ہے۔"

اس سے اگلی رات ہزار اسپ سے باہر دریائے اوکسس کے کنارے فقیر کے خیمے کے باہر ہجوم چھٹ رہا تھا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ بعض آدمی عورتوں کے ساتھ دور چلے گئے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دو آدمی سب کے چلے جانے کے انتظار میں اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ فقیر مشعل بجھا کر خیمے میں چلا گیا اور خیمے کے باہر صرف دو آدمی رہ گئے۔ وہ اس طرح بیٹھے رہے جیسے انہیں یہیں رہنا تھا۔ ان سے کچھ دور جو دو آدمی گھوم پھر رہے تھے، وہ ان دو آدمیوں کو دیکھتے رہے۔"

"معلوم ہوتا ہے یہ فقیر کے ساتھی یا محافظ ہیں" ۔۔ دُور کے آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ "یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"یہ خیمے کے اندر چلے گئے تو ہم اپنا کام نہیں کر سکیں گے" ۔۔ دوسرے نے کہا۔

"ایک طریقہ آزماتے ہیں" ۔۔ پہلے نے کہا ۔۔ "تم ان کے پاس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو کماندار ظاہر کر کے ان سے فقیر کی باتیں اس طرح پوچھو جیسے تم فقیر سے بہت متاثر اور مرعوب ہو۔ میں اپنا کام کردوں گا۔"

دوسرا آدمی ان دو آدمیوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے کہنے کے مطابق ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اُس نے جب کہا کہ وہ کماندار ہے تو دونوں آدمیوں نے اس کے ساتھ دلچسپی سے باتیں شروع کردیں۔ اس نے کہا کہ فقیر شاید سو رہا ہوگا، اس لیے ہمیں پرے چلے چلنا چاہیئے۔ ہماری باتیں انہیں بے آرام کریں گی۔ وہ انہیں پرے لے گیا۔ فقیر نے خیمے کے دونوں طرف کے پردے گرا لیے تھے۔

اُس کا ساتھی جو اندھیرے میں کھڑا تھا، آہستہ آہستہ خیمے کی پچھلی طرف چلا گیا اور بیٹھ گیا، پھر پیٹ کے بل لیٹ کر اُس نے پردے کے نیچے سے اندر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں اسے فقیر نظر آیا۔ وہ شراب پی رہا تھا اور اس آدمی کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اس آدمی نے کمر سے ایک رسّی کھولی اور رسّی ہاتھ میں لے کر پردے کے نیچے سے رینگتا ہوا

اندر چلا گیا۔ فقیر کو خبر نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پاؤں پر بیٹھ کر رسّی پیچھے سے فقیر کی گردن میں پھینکی۔ یہ پھندا تھا جو گردن میں پڑتے ہی تنگ ہو گیا۔ فقیر کی آواز بھی نہ نکلی۔ پھندا تیزی سے تنگ ہوتا گیا۔ فقیر بُری طرح تڑپا اور اُس کا جسم بے حس ہو گیا۔ وہ آدمی اس اطمینان سے کہ فقیر مر چکا ہے، خیمے سے نکلا اور کچھ دُور تک ہاتھوں کے بل چلتا گیا۔

اُس کا ساتھی فقیر کے دو آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُسے اُلو کی آواز سنائی دی۔ وہ ان آدمیوں سے مصافحہ کر کے آ گیا اور اپنے ساتھی سے آن مِلا، پھر دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

بخارا وہاں سے بہت دُور تھا۔ یہ آدمی اُسی رات وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہاں کے فقیر کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اُس کے ساتھ چند ایک آدمی بھی رہتے تھے۔

یہ دونوں آدمی اُسی وقت گھوڑوں پر بخارا کی سمت روانہ ہو گئے۔ اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ ایک جگہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا جہاں دریا کی گہرائی کم ہونی چاہیے تھی۔ انھوں نے وہیں گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ بعض جگہوں پر گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑوں کو تیرنا پڑا ——— اُن کے سامنے دو سو میل کی مسافت تھی۔

دوسرے دن ہزار اسپ میں اس خبر نے سنسنی پھیلا دی کہ فقیر مر گیا ہے۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ وہ مرا نہیں اسے مارا گیا ہے۔ شہروں کے لوگ اور فوجی دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ وہاں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ فقیر کو غزنی والوں نے قتل کیا ہے اور قاتلوں نے قرآن پاک کی بھی توہین کی ہے۔ اس خبر کو اس لیے سچ مان لیا گیا کہ فقیر غزنی کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔ اس خبر نے چھاؤنی کو جیسے آگ لگا دی ہو۔ فرنگی تخریب کاروں اور شرپسندوں کے خفیہ گروہ نے دہشت ناک باتیں مشہور کر دیں۔ ہر طرف خوف چھا گیا کہ فقیر جس تباہی کی پیشین گوئی کیا کرتا تھا وہ اب آئی کہ آئی۔ فوج کے کمانڈر بھی ڈرے ہوئے اور غزنی کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔

فقیر کے قاتلوں نے دو سو میل کی مسافت گھوڑوں کو تھوڑی دیر آرام دے کر اور سرپٹ رفتار پر اگلے روز اُس وقت تک طے کر لی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک شہر میں گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملا جو کسی نہ کسی بہروپ میں شہر میں رہتے اور ایوانِ امارت کی سرگرمیوں کی اطلاعیں لیتے رہتے تھے۔ ان میں سے دو آ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

"اکیلے فقیر کا قتل آسان تھا" ــــ ایک نے کہا ــــ "یہاں ایک گروہ ہے فقیر کو ہم نے دیکھا ہے۔ رات خیمے میں اکیلا ہوتا ہے لیکن دوسروں کے خیمے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں"۔

"مشکل یہی ہے نا کہ دوسرے جاگ اُٹھے تو ہم پکڑے یا مارے جائیں گے" ــــ ایک نے کہا ــــ "اپنے حلف کو یاد کرو جو غزنی سے روانہ ہونے سے پہلے ہم سے لیا گیا تھا۔ ہمیں جانیں قربان کرنی ہیں اگر ہم سلطان کو دھوکہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن ہم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ فقیر قرآن پاک ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس فتنے کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسلام کے خلاف اور اسلام کی تباہی کے لیے ہو رہا ہے۔ یہاں امیر التنگین خوارزم شاہی کے لالچ میں قرآن پاک کی توہین کرا رہا ہے ہمیں اپنے مذہب اور مقدس کتاب کی عظمت اور ناموس پر قربان ہونا ہے"۔

چاروں نے گھوڑے دریا کے قریب جنگل میں باندھے اور رات اُس وقت فقیر کے خیموں کی طرف گئے جب لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ وہ لوگوں میں گھومتے پھرتے رہے حتیٰ کہ آخری آدمی بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں تاریک گوشوں میں عورتوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آدھی رات کے بعد خیموں کے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ چاروں اُس خیمے کی طرف بڑھے جس میں فقیر سوتا تھا۔ پردے گرے ہوئے تھے اور اندر روشنی تھی۔

ان میں سے ایک کی ٹھوکر کسی چیز سے لگی۔ یہ چھوٹا سا مٹکا تھا۔ اس آدمی نے بُو سے پہچان لیا کہ اس میں مشعلوں اور دیئوں کا تیل ہے۔ اُس نے مٹکا اُٹھا لیا۔ دو آدمی فقیر کے خیمے کے پردے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خنجر تھے۔ پردہ ذرا سا کر دیکھا۔ فقیر نیم برہنہ تھا اور اس کے پاس ایک نیم برہنہ جوان لڑکی تھی۔ فقیر شراب کے

نشے میں بدمست ہوا جا رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے پردوں کی رسی کھینچی اور اندر چلے گئے۔ فقیر اور لڑکی نے ادھر دیکھا مگر اُن کے منہ سے کوئی آواز نکلنے سے پہلے ہی ایک آدمی نے لڑکی کے منہ پر دوسرے نے فقیر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو گرا دیا اور ہاتھ دبائے رکھے۔ لڑکی ایسے تنومند مرد کے آگے کچھ بھی نہیں تھی اور فقیر کی طاقت شراب نے سلب کر رکھی تھی۔ خنجر دونوں کے دلوں میں اُتر گئے۔ دو دو وار دل کے مقام پر کئے گئے اور دونوں جلدی ہی ختم ہو گئے۔

ان کے دو ساتھی باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تیل کا چھوٹا سا مٹکا تھا۔ ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اب نکل جانا چاہیئے تھا لیکن مٹکے والے آدمی نے انتقام سے بے قابو ہو کر فقیر کے خیمے کے اندر اور دوسرے خیموں کے پردوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ اندر والے اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ نہ چل سکا۔ فقیر کے خیمے کے دیئے سے ایک کپڑے کو آگ لگا کر تمام خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ تیل کی وجہ سے خیمے فوراً ہی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اندر والوں کی چیخ و پکار بلند ہونے سے پہلے ہی چاروں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔

کاہ کاجی کو جلدی ہی اطلاع دے دی گئی کہ دونوں فقیروں کا کام تمام کر دیا گیا ہے۔ مگر بخارا میں جو دستے مقیم تھے، اُن کا ردِّعمل تخریبی تھا۔ وہاں بھی یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ غزنی والوں کی کارستانی ہے۔ فوج غزنی اور سلطان محمود کے خلاف بھڑک اٹھی۔

سلطان محمود کو اطلاعیں دو تین دنوں کے وقفے سے ملیں۔ پہلی اطلاع اُسے وہی ملی جو کاہ کاجی کے ملازم نے اسے تفصیل سے سنائی تھی۔ اسی تفصیل سے سلطان محمود کو سنائی گئی۔ دوسری اطلاع یہ ملی کہ کاہ کاجی کے حکم سے دونوں فقیروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سلطان سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے کہ جرجانیہ سے کاجی کا بھیجا ہوا ایک اور آدمی غزنی پہنچا۔ اُس نے سلطان محمود کو بتایا کہ ابوالعباس کے صوبہ بخارا کے امیر الپتگین نے فرنگیوں کی پُشت پناہی سے بغاوت کی تیاری مکمل کر لی ہے اور دو سالاروں ابواسحاق اور خمرطاش، نے بخارا اور ہزار اسپ کے دستوں کو ابوالعباس

کے خلاف متنفّر کر دیا ہے۔ ابوالعباس کی حمایت میں وہی فوج ہے جو اُس کے دارالحکومت جرجانیہ میں ہے مگر ان چند ایک دستوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

سلطان محمود نے اُسی وقت ابوالعباس کے نام پیغام لکھوایا جس کے الفاظ مورخوں کے مطابق کچھ اس طرح تھے ـــ "...میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ملک کی اس صورتِ حال کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ آپ نو عمر اور ناتجربہ کار ہیں۔ پیشتر اس کے کہ آپ کا تختہ اُلٹ دیا جائے یا آپ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، مجھے آپ کی مدد کو پہنچ جانا چاہیے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ خودمختار اور آزاد رہتے ہوئے سلطنتِ غزنی کی اطاعت قبول کر لیں اور خطبے میں میرا نام شامل کر دیں۔ میں آپ کی آزادی برقرار رکھوں گا۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ آپ کو میری مدد حاصل ہوگی اور میں اپنی فوج کے بہترین دستے آپ کے دارالحکومت میں آپ کی خوارزم شاہی کی حفاظت کے لیے رکھ سکوں گا۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کو اگر مشورہ لینے کی ضرورت ہو تو اپنے وزیر ابوالحارث سے مشورہ لیجیے گا۔ اگر آپ نے اپنے امیر الپتگین سے اور اپنے سالاروں سے مشورہ لیا تو آپ کو گمراہ کیا جائے گا۔ آپ اس قدر ناتجربہ کار ہیں کہ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور مجھے سینکڑوں میل دور غزنی میں پتہ چل گیا ہے کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں۔ میں اُمید رکھوں گا کہ آپ سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کریں گے۔"

مشہور مورّخ بیہقی نے لکھا ہے کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کو جب یہ پیغام ملا تو اُس نے اپنے وزیر اور مشیروں کا اجلاس بلایا جس میں الپتگین، سالار ابواسحاق اور سالار خمرطاش بھی تھے۔ ابوالعباس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کی حمایت کی۔ اُس نے پیغام کسی کو نہ دکھایا۔ اجلاس میں صرف یہ مسئلہ پیش کیا کہ سلطان محمود نے اُس کی اطاعت قبول کرنے اور خطبے میں اُس کا نام شامل کرنے کو کہا ہے۔ اجلاس میں سب نے اس کی مخالفت کی۔ بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پیغام کی اطلاع فوج کو بھی مل گئی اور فوج نے اس کی مخالفت میں بغاوت کر دی۔ ابوالعباس نے سپاہیوں میں بٹنے

کے ٹکڑے تقسیم کر کے انہیں ٹھنڈا کیا۔ اجلاس ایک بار پھر بلایا گیا جس میں ابوالعباس نے سب کو بتایا کہ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر سلطان محمود خوارزم پر حملہ کرے تو ترکستان کے خوانین سے مدد لی جائے۔ لہٰذا ان کے ساتھ دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا جائے اور اسے خفیہ رکھا جائے۔

بیہقی نے ہی لکھا ہے "سلطان محمود کو اپنے جاسوسوں سے اطلاع ملی کہ ابوالعباس ترکستان کے ساتھ فوجی نوعیت کا معاہدہ کر رہا ہے۔ سلطان محمود اپنی ایک لاکھ نفری کی فوج اور پانچ سو ہاتھی لے کر خوارزم کی سرحد کے قریب بلخ چلا گیا اور ابوالعباس کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے ورنہ اُس کے ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔ ترکستان کے خوانین سلطان محمود کے مقابلے میں ابوالعباس کو فوجی مدد دینے سے گھبرا گئے۔ انہوں نے بلخ آ کر سلطان محمود سے درخواست کی کہ وہ خوارزم پر حملہ نہ کرے۔ سلطان محمود کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ نہ مانا اور اس نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا۔ ترکستان کے خوانین نے ابوالعباس خوارزم شاہ کو اس پر رضامند کر لیا کہ وہ سلطان کی اطاعت قبول کر لے اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیا جائے۔ سلطان محمود اپنا مطالبہ پورا ہونے پر اپنی فوج واپس لے گیا۔

دوسرے مؤرخین نے جن میں عطبی، ابن الاثیر اور گردیزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خیال رہے کہ عطبی جس کا پورا نام ابونصر محمد العطبی تھا، سلطان محمود کے دور کا وقائع نگار تھا اور سلطان محمود نے اُسے کئی بار اپنا سفیر اور ایلچی بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجا تھا۔ اس کی کتاب "کتاب الیمینی" اس کے ذاتی مشاہدات پر لکھی گئی ہے اور محمود غزنوی کے حالات و واقعات پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے مطابق ابوالعباس سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے ہچکچا گیا تھا کیونکہ اُسے اپنی آزادی سلب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اُس کے وزیر نے اُسے بتایا تھا کہ سلطان کی اطاعت قبول کرنے میں اتنا خطرہ نہیں جتنا اپنی فوج کی بغاوت میں ہے۔ ابوالعباس سے اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کاہ کاجی نے کرایا تھا۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا بھائی آپ کی آزادی سلب نہیں کرے گا"۔ کالجی نے اُسے کہا۔ "وہ آپ کو اپنا اتحادی بنانا اور آپ کو بغاوت سے بچانا چاہتا ہے"۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ کون بغاوت کر رہا ہے"۔ ابوالعباس نے کہا۔ "مجھے اپنی فوج پر اعتماد ہے"۔

"مگر فوج میں آپ کا اعتماد ختم کر دیا گیا ہے"۔ کالجی نے کہا۔

"کس نے ختم کیا ہے؟"

"آپ کے امیر البتگین نے"۔ کالجی نے کہا۔ "آپ کے سُسر ابواسحاق نے خمرطاش نے اور ان کے در پردہ فرنگی دوستوں نے۔ آپ کی بادشاہی سلطان محمود کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ مجھ سے دھوکے فریب کی توقع نہ رکھو ابوالعباس! اپنی خوش فہمیوں کے دھوکے میں نہ رہو۔ سلطان کی اطاعت قبول کر لو"۔

ابوالعباس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور خطبے میں سلطان محمود کا نام شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب یہ شاہی حکم نامہ ہزار اسپ اور بخارا پہنچا تو وہاں جیسے جنگل کو آگ لگ گئی ہو۔ البتگین نے بخارا کی فوج کے چھوٹے بڑے کمانڈروں کو بلا کر انہیں کہا کہ فقیر جس تباہی سے خبردار کرتے رہے ہیں وہ غزنی کی فوج کی صورت میں آ رہی ہے۔ ہم اس تباہی کو روک سکتے ہیں ورنہ ہم سب اور تمہاری مستورات غزنی کی درندہ صفت اور لٹیری فوج کی غلام ہو جائیں گی۔ ہندوستان سے زر و جواہرات لوٹ کر لانے والا سلطان محمود اب خوارزم کو لوٹنے اور یہاں کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا کر غزنی لے جانے آ رہا ہے۔ اُسے خوارزم شاہ ابوالعباس خود بلا رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے خوارزم شاہی ختم کر کے فوج کی حکومت قائم کرنی ہے۔ اپنے سپاہیوں سے کہہ دو کہ جو فقیر تمہیں غیب کی باتیں بتانے آئے تھے اور جنہوں نے تمہاری قسمت بدل دینے کا وعدہ کیا تھا، اُن کے قاتل تمہاری قسمت کو تباہ کرنے آ رہے ہیں۔

ہزار اسپ میں ابواسحاق اور خمرطاش نے بھی اپنے دستوں کو اِسی طرح بھڑکا

دیا۔

چند دنوں بعد شام کو ابوالعباس اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک قاصد نے آکر اُسے پیغام دیا کہ ترکستان کے چار خوانین آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ امیر الپتگین بھی ہے۔ انہوں نے چشمے والے باغ میں قیام کرنا پسند کیا ہے۔ امیر الپتگین نے اُن کی عزّت افزائی کے لیے مشورہ بھیجا ہے کہ خوارزم شاہ یہاں آکر ان کا استقبال کریں۔
ابوالعباس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ کاہ کاجی کو پتہ چلا کہ ابوالعباس کہیں جا رہا ہے تو دوڑی آئی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ابوالعباس نے اُسے بتا دیا۔ کاجی نے اُسے جانے سے روکا۔

"ترکستان کے مہمان آئے ہیں" ــــ اُس نے کاجی سے کہا ــــ "میں ان کی عزّت کرنا چاہتا ہوں۔ الپتگین اُن کے ساتھ آیا ہے"۔

"نہ جاؤ" ــــ کاجی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "الپتگین نے قاصد کیوں بھیجا ہے؟ خود کیوں نہیں آیا؟"

"تم گھبرا کیوں گئی ہو کاجی؟"

"خدا کے لیے نہ جاؤ ابوالعباس! میرا دل ڈوب رہا ہے"۔ کاجی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میں نے تمہیں جانے سے کبھی نہیں روکا۔ نہ جاؤ۔ مصروفیت کا بہانہ کر دو"۔

"کیا میں عورت ہوں؟"

"آج ایک عورت کی بات مان جاؤ" ــــ کاجی کے آنسو نکل آئے ــــ "نہ جاؤ۔ مجھے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہے"۔

ابوالعباس نے ہنس کر کہا ــــ "محبّت میں اتنا وہمی اور جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے میری حیثیت سے نہ گراؤ کاجی! وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

کاہ کاجی بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ابوالعباس باہر نکلا تو وہ اُس کے پیچھے دوڑی مگر ابوالعباس کی بگھی محافظوں کے جلو میں جا چکی تھی۔ کاجی کی جذباتی حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا ملازم اور خادمہ اُسے بہلانے لگے لیکن اس کی گھبراہٹ

اور بے چینی بڑھتی گئی۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ محل کے ارد گرد بہت سے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں اور نعرے سنائی دینے لگے۔ کابجی اس امید پر دوڑتی باہر گئی کہ ابوالعباس آ گیا ہے مگر یہ فوجی سوار تھے جو محل کو گھیرے میں لے رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے۔ "زن مرید خوارزم شاہ کو ختم کر دیا گیا ہے..... غزنی کا غلام جہنم واصل ہو گیا..... خوارزم شاہ الپتگین زندہ باد"۔

کاہ کابجی کا دماغ چکرا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں محل میں اودھم بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے ابوالعباس کے وزیر ابوالحارث کو قتل کیا گیا۔ مشیروں کو باہر نکال کر ان کے سر تن سے جُدا کر دیئے گئے۔ محل کے اندر اور باہر ہزار اسپ اور بخارا کے فوجی دستے پھیل گئے۔ الپتگین کے حکم سے لُوٹ مار نہ ہوئی۔ ابوالعباس کے حامیوں کو پکڑا جا رہا تھا اور انہیں باہر لے جا کر قتل کیا جا رہا تھا۔ جرجانیہ میں جو دستے تھے، ان میں سے دو نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اُن کی نفری اتنی تھوڑی تھی کہ ان سے فوراً ہی ہتھیار ڈلوا لئے گئے۔ انہیں مزاحمت کا حکم دینے والے ایک نائب سالار اور اُس کے ماتحت کمانڈروں کو قتل کر دیا گیا۔

الپتگین نئے خوارزم شاہ کی حیثیت سے قصرِ شاہی میں داخل ہُوا۔ وہ خودساختہ بادشاہ تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں اُس کی خوارزم شاہی اور ابوالعباس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔

ابوالعباس کو اس دھوکے سے باہر بلا کر کہ ترکستان کے خوانین آئے ہیں، قتل کر دیا گیا تھا۔ بغاوت بہت جلدی کامیاب ہو گئی۔ بیہقی اور گردیزی کے مطابق یہ واقعہ ۱۵ شوال ۴۰۷ھ (۱۷ مارچ ۱۰۱۷ء) کا ہے۔ فوج محل کی حدود میں داخل ہوئی تو کاہ کابجی کے خاص ملازم نے جو دراصل غزنی کا جاسوس تھا، اس کو خطرے میں دیکھا اور دوڑتا ہُوا اُس کے کمرے میں گیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی — "میں نے اُسے روکا تھا۔ اُسے موت لے گئی تھی" ملازم نے اُسے تسلّی دی اور وہ اُسے وہاں سے

نکال لے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔
کاہ کالجی نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل سادہ کپڑے پہن لیے اور سر پر اوڑھنی لے لی۔ ملازم نے اُسے اس لباس میں دیکھ کر کہا کہ وہ اسے ابھی نکال لے جائے گا، مگر وہ کمرے کے دروازے میں ہی پہنچے تھے کہ باغی سالار ابو اسحاق کی بیٹی الجوری آ گئی۔ وہ ابوالعباس کی دوسری بیوی تھی۔
"تمہاری خوارزم شاہی ختم ہو چکی ہے کالجی!" ـــ الجوری نے طنزیہ کہا ـــ "بھاگ کے کہاں جا رہی ہو؟ باہر نکلو گی تو قتل ہو جاؤ گی یا تمہیں فوجی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ اب حکومت تمہاری نہیں فوج کی ہے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیتی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں حرم میں داخل کر دوں گی۔ وہاں تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر چاہو تو میرے باپ کے ساتھ شادی کر لو۔ تم غزنی نہیں جا سکو گی۔"
"الجوری!" ـــ کالجی نے بے خوف آواز میں کہا ـــ "مجھے غزنی جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ غزنی والے یہاں آ جائیں گے" ـــ وہ اچانک گرج کر بولی ـــ "نکل جاؤ یہاں سے ..... میں اب بھی شہزادی ہوں۔ سلطان غزنی کی بہن ہوں، اور تم کس باپ کی بیٹی ہو؟ ..... نمک حرام سالار کی جسے بادشاہی کی ہوس نے اپنے انجام سے بے خبر کر دیا ہے۔ جاؤ، انہیں کہو مجھے قتل کر دیں۔ مجھے قید میں ڈال دیں، پھر اپنا، اپنے باپ کا اور خود ساختہ خوارزم شاہ کا انجام دیکھ لینا۔"
الجوری ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی۔ ملازم نے کاہ کالجی سے کہا کہ آؤ، یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔
"نہیں حبیب!" ـــ کالجی نے کہا ـــ "میں فرار نہیں ہوں گی۔ میں اس فریب کار خوارزم شاہ کا سامنا کرنا چاہتی ہوں" ـــ وہ اُدھر کو چل پڑی۔ حبیب کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ رک گئی اور بولی ـــ "مجھے خدا کے سپرد کرو۔ تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کوئی غزنی اطلاع دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ اگر کچھ پتہ نہ چلے تو تم چلے جاؤ۔ اصطبل سے گھوڑا لے لو۔"

التپتگین اُسی تختِ نما مسند پر بیٹھا احکام دے رہا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے تک ابو العباس بیٹھا رہا تھا۔ دربار میں کچھ لوگ دست بستہ کھڑے احکام سُن رہے تھے۔ سب فوجی تھے۔ شہری انتظامیہ کا کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ وزیر ابو الحارث بھی نہیں تھا۔ دربار میں شور سا تھا۔ سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ التپتگین نے دیکھا۔ کاہ کاجی اُس کی طرف آ رہی تھی۔

"اوہ! کاہ کاجی!" — التپتگین نے زیرِ لب کہا — "اس کے متعلق تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں" — اُس نے کاجی سے مخاطب ہو کر کہا — "کاہ کاجی! میں جانتا ہوں تم جان بخشی کے لیے آئی ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ اپنے خاوند کو تم نے مروایا ہے۔ تم نے اُس پر جادو طاری کر کے اُسے غزنی کا غلام بنایا تھا۔ خوارزم کے لوگ اور خوارزم کی فوج کسی غیر ملکی کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔ قوم اور فوج مجھے گھسیٹ کر اس مسند پر لائی ہے۔ میں اب اُنہی کے کہنے پر اس مسند سے اُٹھوں گا۔ قوم نے مجھے جو فرض سونپا ہے وہ مجھے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔"

"میں جان بخشی کے لیے نہیں جان دینے کے لیے آئی ہوں" — کاہ کاجی نے کہا — "میں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ تم نے خود بھی قرآنِ پاک کی توہین کی ہے اور فرنگیوں سے بھی کرائی ہے۔ خدا تمہیں بخشے گا نہیں۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے تم یہ جھوٹ بول رہے ہو کہ تمہیں قوم اور فوج گھسیٹ کر لائی ہے۔ اگر تم قوم کے اتنے ہی محبوب اور خدا کے اتنے ہی برگزیدہ آدمی ہو تو تم نے گلی گلی میں اور شہریوں کے ہر دروازے پر پہرے کیوں کھڑے کر دیئے ہیں؟ انہیں باہر کیوں نہیں آنے دیتے؟ شہر میں خاموشی کیوں ہے؟ قوم تمہارے نام کے نعرے کیوں نہیں لگاتی؟ ہر طرف فوج ہی کیوں نظر آ رہی ہے؟"

کسی درباری کی آواز گرجی — "تمیز سے بات کرو خاتون! تم خوارزم شاہ سے مخاطب ہو۔"

"میرا خاوند مارا گیا ہے" — کاجی کہتی چلی گئی — "خدا تو نہیں مارا گیا؟ اگر تم یہ

اُمید لے کر آئے ہو کہ فوج کے چھاتے کے نیچے بیٹھ کر خوارزم شاہ بنے رہو گے تو میں تمہیں خبردار کرتی ہوں کہ وہ طوفان جلدی آئے گا جو تمہارے اس چھاتے کو اڑا لے جائے گا۔ اس مسند پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو اس کا اہل ہو۔ تم ماموئی خاندان کے جوتے چاٹ چاٹ کر امارت کے رُتبے تک پہنچے تھے۔ اب تمہاری قسمت میں قید خانے کا تہہ خانہ لکھ دیا گیا ہے"۔

"لے جاؤ اسے"۔۔۔ التونتگین نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔ "اسے اسی کے کمرے میں رکھو اور باہر پہرہ کھڑا کر دو۔ اسے اُسی کمرے میں جس میں اس نے پورا ایک سال ازدواجی زندگی کی راتیں گذاری ہیں، نظر بند کر دو۔ میں سلطان محمود کو پیغام بھیجوں گا کہ اگر تم نے خوارزم پر حملہ کیا تو تمہیں اپنی بہن کی چھوڑی ہوئی لاش ملے گی۔ اسے یرغمال میں رکھو لیکن اسے تکلیف نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ خوارزم شاہ التونتگین نے ایک بے بس عورت پر ظلم کیا تھا"۔

"آنے والی نسلیں تمہاری قبر پر بھی لعنت بھیجا کریں گی"۔۔۔ کاہجی نے کہا۔ "جس فوج کو کفر کے خلاف حق کے معرکے لڑنے تھے اُس سے تم نے اپنے ہی ملک کو فتح کر لیا ہے اور اس فوج کو تم نے حکمران بنا دیا ہے۔ یہ فوج ایک دن بھی لڑنے کے قابل نہیں رہے گی"۔

کسی نے کاہ کاہجی کو بازو سے پکڑا اور اُسے اُس کے کمرے میں لے گئے۔

اُس وقت کے ایک مشہور مؤرخ اور مبصر الفضلی نے اپنی کتاب "آثار الوزرا" میں لکھا ہے۔۔۔ "چار ماہ تک التونتگین خوارزم کا انتہائی ظالم ڈکٹیٹر بنا رہا۔ تمام تر خوارزم پر اُس نے وحشت طاری کئے رکھی۔ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان کہتا رہا لیکن جس کے منہ سے ذرا سی بھی مخالفانہ بات نکل جاتی تھی، اُسے قتل کرا دیتا تھا۔ فوج گلیوں میں گھومتی پھرتی رہتی۔ مخبر لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ شک پر بھی لوگوں کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا جاتا یا جلاد کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش اور آسودہ زندگی صرف فوج کے لیے رہ گئی تھی"۔

یہ چار مہینے سلطان محمود کیا کرتا رہا؟ ۔۔۔ اسے اس کامیاب بغاوت کی اطلاع آٹھویں روز مل گئی تھی۔ اُس کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اتنی زیادہ فوج اور رسد سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ پورے خوارزم کو ایک ہی ہلّے میں لے لے۔ کشمیر کی شکست کے زخم ابھی پوری طرح ملے نہیں تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو فرار کرانا چاہتا تھا۔ "آثار الوزراء" میں لکھا ہے کہ اُس نے اپنی بہن کا مسئلہ اپنی مشاورتی کونسل کے سامنے رکھا۔ سب مشیر اور سالار بھڑکے ہوئے تھے۔

"میرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے" ۔۔۔ سلطان محمود نے مشاورتی کونسل سے کہا ۔۔۔ "میرا بہنوئی قتل ہوگیا اور میری بہن بیوہ ہوگئی ہے۔ اگر میں نے انتقامی کارروائی کا فیصلہ خود کیا تو یہ میری ذاتی رنجش کا ردِعمل ہوگا۔ تاریخ یہ کہے گی کہ میں نے ذاتی انتقام لینے کی خاطر دو مسلمان فوجوں کا خون بہا دیا ہے۔ آپ صورتِ حال سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیں۔ یہ بغاوت فرنگیوں نے کرائی ہے اور ایک اسلامی ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ کچھ عرصے بعد خوارزم پر فرنگی چھا جائیں گے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے نتائج غزنی کے لیے اور اسلام کے لیے کیا ہونگے۔"

"کاہ کاجی غزنی کی آبرو ہے" ۔۔۔ وزیر نے کہا ۔۔۔ "اسے وہاں سے نکالنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم نے حملہ کیا تو کاجی قتل ہو جائے گی اور اس کے ساتھ نہ معلوم کیسا سلوک ہو۔ التونتگین کو پیغام بھیجا جائے کہ وہ کاہ کاجی کو باعزت طریقے سے واپس کر دے۔ اگر نہ کرے تو چھاپہ ماروں کے ذریعے اُسے فرار کرایا جائے اور اس کے بعد خوارزم پر فوج کشی کی جائے۔"

سب نے اس کی تائید کی۔ کچھ اور مشورے پیش ہوئے، پھر ایک پلان تیار ہو گیا۔ ایک ایلچی کو اس پیغام کے ساتھ جرجانیہ بھیج دیا گیا کہ کاہ کاجی کو باعزت طور پر رہا کیا جائے۔

غزنی اور جرجانیہ کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ تھا جس میں آدھا علاقہ پہاڑی

تھا اور باقی ریگستان جو صحرائے غز کہلاتا ہے۔ قاصد کو جاتے اور واپس آتے ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ کاکجی کی رہائی کے پیغام کا یہ جواب لایا کہ البتگین کو خوارزم شاہ تسلیم کیا جائے اور اُس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔

البتگین نے ایلچی کو وہ کمرہ دکھایا تھا جس میں کاہ کاکجی کو رکھا گیا تھا۔ اُس کے حکم پر دروازہ کھول کر اُسے دکھایا گیا تھا کہ کاکجی کو قید خانے میں نہیں بلکہ اس کے اپنے کمرے میں رکھا ہُوا ہے۔ یہ اطلاع اُن چھاپہ ماروں کے کام آئی جنہیں یہ خطرناک کام سونپا گیا کہ وہ کاکجی کو وہاں سے فرار کرائیں۔ کاکجی کا ملازم جبیس غزنی آگیا تھا۔ وہ اس کمرے اور اس کے گردو پیش سے اچھی طرح واقف تھا۔ چار چھاپہ ماروں کو منتخب کیا گیا۔ پانچواں جبیس تھا۔

پانچوں غیر معمولی رفتار سے جرجانیہ پہنچ گئے۔ اُن کے پاس ایک گھوڑا فالتو تھا۔ انہوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ان میں سے ایک کو جبیس نے ساتھ لیا اور اُسے محل کے باہر تک لے گیا۔ شہر میں انہوں نے فوجیوں کو گھومتے پھرتے دیکھا اس سے اگلے روز وہ سرائے سے نکلے تو انہوں نے خوارزم کی فوج کا لباس پہن رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے اُن پر خوارزم کے جھنڈے کے رنگوں والے کپڑے کی جھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہاں کے سوار دستوں کا امتیازی نشان تھا وہ رسالے کے سواروں کی طرح گردنیں تانے اور سینے پھیلائے ہُوئے جا رہے تھے۔ گھوڑوں کی چال بتاتی تھی کہ یہ فوج کے سدھائے ہوئے گھوڑے ہیں۔ شہر میں انہیں کئی جگہ فوجی ملے جن میں بعض سوار بھی تھے۔ ان پانچوں نے انہیں مسکرا کر انہی کی زبان اور انہی کے لہجے میں سلام کیا۔ شہری فوج سے اتنے ڈرے ہُوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر پرے ہٹ جاتے اور سلام کرتے تھے۔ وہ خوارزم کی فوج کا لباس اور نیزوں کی جھنڈیاں اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے گھوڑے فوج کے تھے۔ وہ خود بھی فوجی تھے اس لیے انہیں اداکاری نہ کرنی پڑی۔

جبیس کی راہنمائی میں وہ محل کے صدر دروازے تک پہنچے۔ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں انہیں معلوم تھا انہیں کیسی سزا

ملے گی ___ وہ خود اعتمادی سے دروازے میں داخل ہو گئے ۔ وہاں کے پہرہ داروں نے انہیں اپنی فوج کے سوار سمجھتے ہوئے نہ روکا ۔ جبیس انہیں ایک راستے سے اُدھر لے گیا جہاں کاہ کابجی کا کمرہ تھا ۔ محل کی اندرونی دنیا میں بھی کئی جگہ فوجی نظر آئے ۔ وہ اللہ کا نام لیتے بڑھتے گئے ۔

جبیس نے ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو روک لیا اور ایک سوار اور فالتو گھوڑے کے ساتھ محل کے کسی حصے میں غائب ہو گیا ۔ وہ دونوں گھوڑوں سے اُترے اور کاہ کابجی کے کمرے والی غلام گردش میں چلے گئے ۔ آگے سنتری کھڑا تھا ۔ یہ کاہ کابجی کا کمرہ تھا ۔ جبیس نے سنتری سے کہا دروازہ کھولو ۔ خاتون کو خوارزم شاہ الپتگین کا پیغام دینا ہے ۔ سنتری نے دروازہ کھول دیا ۔ دونوں سنتری کو دھکیل کر اندر لے گئے اور تلواروں کی نوکیں اُس کے پہلو سے لگا کر اُس کی وردی اُتروائی ، پھر اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے ۔ کاہ کابجی سے کہا کہ وہ فوراً یہ وردی پہن لے ۔

وہ جب باہر نکلے تو کابجی وردی میں ملبوس تھی ۔ چھاپہ ماروں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھادی اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے ۔ فالتو گھوڑا کابجی کے لیے لے جایا گیا تھا ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے اور فوجی شان سے فوجی ترتیب میں محل کے صدر دروازے سے بھی نکل گئے ۔ شہر سے گذرتے اُن کی چال وہی رہی ۔ وہ اُسی باوقار چال سے شہر سے بھی نکل گئے ۔ شہر جب درختوں کی اوٹ میں ہو گیا تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگادی ۔ کاہ کابجی گھوڑ سواری کی ماہر تھی ۔ اُس نے چھاپہ ماروں کو احساس نہ ہونے دیا کہ وہ عورت ہے اور مردوں کی طرح اتنا لمبا اور اتنا کٹھن سفر نہیں کر سکے گی ۔

سلطان محمود فوج کی کمی بہت حد تک پوری کر چکا تھا ۔ اماموں سے مسجدوں میں کچھ عرصے سے اعلان کرائے جا رہے تھے کہ فوج کی کمی پوری کرنے کے لیے رضا کاروں کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ ہزارہا رضا کار فوج میں آ گئے ۔ وہ اپنے گھوڑے

یا اونٹ ساتھ لائے تھے۔ جو خود نہ آسکے انہوں نے اپنے گھوڑے دے دیئے۔ اُس نے جب کوُچ کا حکم دیا اُس وقت اُس کی فوج کی تعداد (مورخ بیہقی کے مطابق) ایک لاکھ (سوار اور پیادہ) تھی اور پانچ سو ہاتھی تھے۔

وہ فوج کو بلخ لے گیا۔ اس سے آگے بڑا ہی وسیع و عریض صحرا تھا سلطان نے صحرا سے بچنے کا یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ بیس ہزار بڑی کشتیاں تیار کروا کے ترمز کے مقام پر دریا کے کنارے رکھوی تھیں دریائے اوکسس کا رُخ خوارزم کی طرف تھا سلطان کی فوج، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ وغیرہ کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ سامان بھی لاد دیا گیا۔ یہ بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہ کشتیوں کا سب سے بڑا بیڑہ تھا جو کسی بادشاہ نے کبھی دریا میں ڈالا ہو۔

یہ بیڑہ ہزار اسپ سے آگے نکل گیا اور خوارزم کے دارالحکومت جُرجانیہ سے تھوڑی دُور جا رکا۔ تمام فوج کشتیوں سے اُتر آئی اور عارضی طور پر خیمہ زن ہو گئی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ البتگین کو جب سلطان محمود کی آمد اور اس کی جنگی طاقت کی اطلاع ملی تو اُس نے سلطان کے پاس اپنے ایلچی صلح نامے کی شرائط کے ساتھ بھیجے مگر سلطان محمود نے صلح کی جو شرائط بتائیں وہ اتنی سخت تھیں کہ البتگین اور زیادہ گھبرایا۔ اُس نے خوارزم کی تمام تر فوج اکٹھی کی تو اس کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ اُس نے تین چار بڑے ہی قابل اور تجربہ کار سالاروں کو صرف اس لیے مروا دیا تھا کہ وہ ابوالعباس کے حامی تھے۔ کچھ فوجی مشیر بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

جنگ کی ابتدا سلطان محمود کے لیے نقصان دہ اور بہت بُری ہوئی۔ اُس کی فوج کے ہراول دستے اس کے مشہور اور بڑے ہی تجربہ کار سالار ابو عبداللہ محمد الطائی کی زیرِ کمان فوج کے بڑے کیمپ سے دُور آگے خیمہ زن تھے۔ صبح کی نماز کا وقت تھا اور تمام تر نفری باجماعت نماز پڑھ رہی تھی۔ خوارزم کے سالار خمرطاش کے دستے قریب ہی تیار کھڑے تھے۔ شاید خمرطاش کو معلوم تھا کہ سلطان محمود کے حکم کے مطابق خیمہ گاہ میں فوج باجماعت نماز پڑھا کرتی ہے۔ اُس نے یہی موقع موزوں سمجھا اور سوار دستوں سے حملہ کر دیا۔

ابوعبداللہ محمد الطائی جس کا تاریخوں میں احترام اور اہمیت سے ذکر آیا ہے، انتہائی مشکل حالات میں معرکے لڑانے اور جیتنے والا سالار تھا۔ میدانِ جنگ میں جنگی چالوں اور اعلیٰ قیادت کے لحاظ سے سلطان محمود کا ہم پلہ تھا مگر اُس پر نماز کی حالت میں حملہ ہوا۔ دستے نہتے تھے اور ایک جگہ جمع تھے۔ انہیں ہتھیار اُٹھانے کی مہلت نہ ملی اور سلطان محمود کی فوج کے بہترین دستے مارے گئے۔ سالار الطائی اپنے چند ایک کمانداروں اور سپاہیوں کے ساتھ بچ نکلا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی تو اُس نے قلب کے باڈی گارڈز کو خمر طاش کے دستوں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ خمر طاش، محمد الطائی کے دستوں کو کچلتا ہُوا نکل گیا ہے۔ باڈی گارڈز کا دستہ فوج کے چُنے ہوئے سپاہیوں کا دستہ تھا۔ گھوڑے بھی چُنے ہُوئے تھے۔ خمر طاش دور نہیں گیا تھا۔ اُس کے اور اُس کے دستوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ پہلے ہلّے کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے اور ذرا آرام کے لیے رُک گئے تھے۔

یہ ریگستان تھا۔ انہیں گرد کے بادل اُٹھتے دکھائی دیئے۔ خمر طاش نے گرد سے اندازہ لگایا کہ غزنی کے بہت سے دستے جوابی حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ اُس نے حملہ روکنے کی تیاری کا حکم دیا۔ سوار گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ سلطان کے باڈی گارڈز کا دستہ گھیرے میں لینے کی ترتیب میں ہو گیا۔ خمر طاش کے سواروں نے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوڑتے گھوڑوں کی اڑائی ہُوئی گرد سے انہیں سلطان محمود کے حملہ آور دستوں کی صحیح نفری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے پیچھے ہٹنے اور نکل بھاگنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

اس معرکے کا فیصلہ بہت جلد ہی ہو گیا۔ خمر طاش پکڑا گیا اور اس کے دستے کو بہت بڑی شکست ہُوئی۔

سلطان محمود نے رات کو اپنی فوج کو نئے سرے سے منظم کر لیا۔ فوج کے ایک حصّے کو دریا کے کنارے بھیج دیا۔ اس حصّے کو وہاں حکم کا انتظار کرنا تھا۔ حکم ملتے ہی انہیں

کشتیوں پر سوار ہو کر جُرجانیہ کی سمت چلے جانا اور جُرجانیہ کے قریب جاکر کشتیوں سے نِکل کر شہر پر حملہ کرنا تھا۔ دوسرے دن سلطان محمود نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ تاثر یہ دینا چاہتا تھا کہ وہ ابھی حملے کے لیے تیار نہیں۔ الپتگین فنِ حرب وضرب میں اناڑی تھا۔ اُس کا ایک سالار خمرطاش قید ہو چکا تھا۔ سالار ابواسحاق کو اُس نے دریا کے قریب کہیں ریزرو میں رکھا تھا۔ دوسرے قابل سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ قتل کرا چکا تھا۔

وہ سلطان محمود کی چال نہ سمجھ سکا، نہ اُس نے سلطان کی فوج کی تقسیم دیکھی۔ اُس نے اپنے دشمن کی ترتیب اور تنظیم کا بھی جائزہ نہ لیا اور اس خوش فہمی میں حملہ کر دیا کہ غزنی کی فوج ابھی خیموں میں ہے۔ یکم صفر ۴۰۸ھ (۳ جولائی ۱۰۱۷ء) کا دن تھا۔ آثارالوزراء میں الفضلی نے اس معرکے کی جو تفصیل لکھی ہے، اس کے مطابق الپتگین نے اپنی فوج کی قیادت خود کی۔ وہ سب سے آگے تھا۔ اُس نے دائیں بائیں کا خیال رکھے بغیر سامنے سے حملہ کیا۔

اُس وقت کی دیگر تحریروں کے مطابق الپتگین کے سپاہیوں نے بے جگری کے مظاہرے کیئے اور بڑی بہادری سے لڑے۔ وہ غزنی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور انہیں خدا کے بھیجے ہوئے، غیب کی خبریں دینے والے فقیروں کا قاتل کہہ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں سلطان محمود اور غزنی کی فوج کے خلاف بڑی کاوش سے نفرت پیدا کی گئی تھی۔ وہ نفرت میدانِ جنگ میں بے پناہ قوت بن گئی تھی۔ اگر فتح صرف بہادری سے لڑنے اور قہروغضب سے کشت وخون کرنے سے حاصل ہو سکتی تو فتح الپتگین کی تھی، لیکن چالیں سلطان محمود کی عمدہ تھیں۔

ایک تو سلطان نے گھوڑے سے اُتر کر دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے مدد مانگی، دوسرے اُس نے الپتگین کے دائیں پہلو پر ہاتھیوں سے حملے کا حکم دیا۔ ابھی تک ہاتھی میدانِ جنگ میں نظر نہیں آئے تھے۔ ہاتھی پہلو سے آئے۔ تمام ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ خوارزم کی فوج کبھی ہاتھیوں کے خلاف نہیں لڑی تھی۔ سپاہی گھبرا گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہاتھی جتنا ہیبت ناک لگتا ہے، اتنا ہی کمزوریوں کا حامل ہے۔ ہاتھیوں

کے دائیں اور بائیں پیادہ دستے اور پیچھے گھوڑسوار تھے۔ ہاتھی دوڑے آرہے تھے اور زمین ہل رہی تھی۔ الپتگین نے اپنی فوج کو جوش دلایا مگر سپاہی بکھر گئے۔

دو ہاتھی قلب میں جا پہنچے جہاں الپتگین تھا۔ قلب نے بہت مقابلہ کیا مگر الپتگین کے باڈی گارڈ دل چھوڑ گئے۔ شام تک معرکے کا فیصلہ ہو گیا۔ الپتگین بھاگ نکلا لیکن اُسے پکڑ لیا گیا۔

جرُجانیہ دارالحکومت تھا۔ اس پر قبضہ لازمی تھا۔ سلطان محمود نے فوج کے اُس حصے کو جسے اُس نے دریا کے کنارے بھیج رکھا تھا، کشتیوں میں سوار ہو کر جرُجانیہ کی طرف جانے کا حکم بھیج دیا۔ یہ فوج جن کشتیوں میں سوار ہوگئی اس کی تعداد کم و بیش چار ہزار تھی۔ کشتیاں جب جرُجانیہ کے قریب پہنچیں تو سامنے سے تقریباً تین ہزار کشتیاں آرہی تھیں۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ یہ الپتگین کے سالار ابو اسحاق کی فوج تھی جسے الپتگین نے ریزرو میں رکھا ہوا تھا مگر اُسے آگے بلانے کی مہلت نہ ملی۔ ابو اسحاق نے اپنے طور پر دیکھ لیا تھا کہ غزنی کی کچھ فوج دریا کے کنارے حکم کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اس چال کو سمجھ گیا۔ اُس نے اپنی فوج کو کشتیوں میں سوار کیا اور جرُجانیہ سے آگے آگیا۔

سلطان محمود کی کشتیاں آگے بڑھیں تو دیکھا کہ دشمن دریائی جنگ کے لیے تیار ہے۔ دونوں فوجیں دریا میں ٹکرا گئیں۔ کشتیاں قریب کر کے سپاہی ایک دوسرے کی کشتیوں میں کود کر دست بدست معرکہ لڑ رہے تھے۔ کشتیاں ایک دوسری سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُلٹ بھی رہی تھیں۔ دریا سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

سلطان محمود کو تیز رفتار قاصد نے اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ فاصلہ میلوں کا تھا۔ پیادہ دستے اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان نے گھوڑ سوار اور شتر سوار دستوں کو بھیج دیا اور خود اُن کے پیچھے گیا۔ یہ دستے جب دریا کے کنارے پہنچے تو دریا میں دُور دُور تک دونوں فریقوں کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ تھیں۔ شتر سواروں نے دریا کے کنارے سے کشتیاں پہچان پہچان کر تیر چلائے۔ بعض گھوڑسواروں نے یہاں تک شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ گھوڑے دریا میں ڈال

دیئے لیکن زیادہ گہرے پانی میں نہ گئے۔ سلطان محمود نے آکر صورتِ حال دیکھی تو اُس نے گھوڑسواروں کو دریا سے نکل آنے کا حکم دیا۔

اُس وقت کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار نے لکھا ہے کہ دارالحکومت جرجانیہ کے لوگ چار مہینوں میں ہی التینگین کی فوجی حکومت سے اس قدر بدحال ہو گئے تھے کہ ہر کسی پر گرفتاری کا خوف طاری رہتا تھا۔ بدنظمی ایسی کہ عدل و انصاف ناپید ہو گیا۔ سپاہی کی بات حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ چلا کہ دریا میں غزنی اور خوارزم کی فوج کی لڑائی ہو رہی ہے اور پھر صحرا کی لڑائی سے بھاگے ہوئے سپاہیوں سے پتہ چلا کہ التینگین اور خمرطاش پکڑے گئے ہیں تو شہر کے لوگ نیزے، بھالے، تلواریں، اور جو ہتھیار ہاتھ لگا اُٹھا کر گھروں سے نکل آئے اور اُس فوج پر ٹوٹ پڑے جو شہر اور محل کے دفاع کے لیے وہاں موجود تھی۔

دریا کی یہ سب سے بڑی لڑائی سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اس طرح ختم ہوئی کہ خوارزم کے سالار ابواسحاق کو جو دریا کے کنارے پر کہیں اپنے دستوں کو احکام دے رہا تھا، شہر کے لوگوں کی بغاوت کی اطلاع ملی تو وہاں سے فرار ہو گیا۔ بعد میں اس کے اپنے سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر غزنی کی فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگ فوج کے خلاف اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان میں سے بعض دریا پر جا پہنچے اور غزنی کی فوج کی مدد کی۔

سب سے زیادہ بھڑکا ہوا تو سلطان محمود تھا۔ ابنِ اسفندیار اور بیہقی لکھتے ہیں کہ سلطان دریا کے کنارے گھوڑا دوڑاتا اور تیر اندازوں کو احکام دیتا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ رات بھر غزنی کی فوج قیدیوں کو پکڑتی اور اپنی لاشوں اور زخمیوں کو سنبھالتی رہی۔ سلطان بھی رات بھر جاگتا رہا۔ اُس کے پاس خوارزم کے ایسے شہری اور فوجی حکام آ گئے تھے جنہوں نے اُن افراد کی نشاندہی کی جو ابوالعباس کے قتل میں شامل تھے اور جنہوں نے اُس کا تختہ الٹنے میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا تھا۔ رات سے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

اگلے روز التپتگین، سالار ابو اسحاق اور سالار خمرطاش کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس دَور کے تین مبصّروں اور تاریخ نویسوں ــــ بیہقی، عطبی اور گردیزی نے اُن سزاؤں کی جو ان تینوں کو اور اِن کے معاونین اور مشیروں کو سلطان نے دیں، تفصیل لکھی ہے ــــ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنے قہر اور غضب میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کو جو سزائیں دیں، ان کے تصوّر سے سلطان خود بھی کانپ اُٹھا ہوگا۔ وہ ظالم اور قہار سلطان نہیں تھا لیکن وہ اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔

"تم تینوں صرف ابوالعباس کے قاتل نہیں ہو" ــــ سلطان محمود نے ان تینوں سے کہا۔ وہ بولتا تھا تو اُس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑتے تھے۔ یہ غصّے کی انتہا تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی غصّے سے کانپ رہے تھے۔ اُس نے کہا "تم ان ہزاروں آدمیوں کے قاتل ہو جو دونوں کی لڑائی میں دونوں طرف سے مارے گئے ہیں۔ اپنی فوج کے جانی نقصان کا حساب کرو۔ یہ فوج نہ تمہاری ہے نہ میری۔ یہ اسلام کی فوج تھی۔ یہ اللہ کے سپاہی تھے جنہیں تم نے اپنے سروں پر سجانے کے لیے ایک دوسرے کا قاتل بنا دیا"

سلطان محمود غصّے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا ــــ "تم نے وہ خون دیکھا ہے جو صحرا نے چوس لیا ہے؟ تم نے وہ خون دیکھا ہے جو دریا میں بہہ گیا ہے؟ تم نے صحرا میں تڑپ تڑپ کر مرتے زخمیوں کو دیکھا ہے؟ فرنگیوں کی امداد سے تخت پر بیٹھنے والو! حق کی بات کرنے والوں کی گردنیں کاٹنے والو! ہاتھ میں قرآن لے کر لوگوں کو فریب دینے والو! اپنے آپ کو سچّا مسلمان کہہ کر سچّے مسلمانوں کا خون بہانے والو! تم خدا کی موجودگی کو بھول گئے تھے۔ تم بھُول گئے تھے کہ خُدا اپنے مظلوم بندوں کی فریادیں سنتا ہے۔ تم نے اپنی قوم کی قسمت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ تمہاری عقل پر اور تمہارے ایمان پر فرنگی عورت، زر و جواہرات، شراب اور حکومت کا طلسم طاری ہو گیا تھا۔ تم نے اپنا ایمان بیچا۔ ایمان فروشو! میں بُت شکن ہوں اور تم باطل کے بُت ہو۔ میں تمہیں اُسی طرح توڑ کر ریزہ ریزہ کروں گا جس طرح میں نے ہندوستان کے بُت توڑے ہیں

.... تمہیں سرکاری خزانے سے اس لیے تنخواہیں اور روٹی ملتی رہی کہ اپنے ملک اور مذہب کے دفاع میں اپنی جانیں لڑا دو گے مگر تم نے اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے اپنے ہی ملک پر قبضہ کر لیا اور اپنے مذہب کی آڑ میں قوم کا جینا حرام کر دیا ... انہیں باہر لے جاؤ اور انہیں کوڑے لگاؤ۔"

شہر کی آبادی اُس میدان میں اُمڈ کر آگئی جہاں التینگیس، ابواسحاق اور خمرطاش کو کوڑے لگائے جانے تھے۔ اب یہ تین نہیں تھے۔ رات کو اور انہیں باہر میدان میں لانے تک اُن کے بہت سے ساتھی پکڑے گئے تھے۔ وہ بھی میدان میں اُن کے ساتھ کھڑے تھے۔ چار چار کو آگے لا کر تنومند سپاہیوں سے انہیں کوڑے لگوائے گئے۔ اُن کی چیخیں لوگوں کے نعروں میں دب گئی تھیں۔ سلطان خود بھی وہیں تھا۔ بیہقی، عُطبی اور گردیزی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے کوڑا زنی بند کرا دی۔ انہیں جب ہوش آیا تو انہیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں سے کہا گیا کہ ان کے قریب سے گذر کر انہیں دیکھو۔ لوگوں نے انہیں قریب آ کر اس طرح دیکھا کہ ان پر تھوکا اور بعض نے زمین پر سے مٹی اُٹھا کر اُن پر پھینکی۔ انہیں گالیاں دیں، لعن طعن کی اور میدان کے اِرد گِرد جا کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ایسا حکم دیا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی کو جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ان کے بازو کندھوں سے کاٹ دو۔ سپاہی تلواریں لیے آئے۔ مجرموں نے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی۔ منتیں کیں۔ سلطان کو پکار پکار کر بخشش مانگی مگر سلطان کے اعصاب پر دونوں فوجوں کے وہ سپاہی چھائے ہوئے تھے جو ان کی طمع کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ تمام مجرموں کے بازو کاٹ دیئے گئے۔

سلطان نے اسی پر بس نہ کی۔ اُس نے پہلے ہی پندرہ بیس ہاتھی منگوا کر ایک طرف کھڑے کر رکھے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ ان پر ہاتھی چھوڑ دو۔ ہر ہاتھی پر ایک مہارت سوار تھا۔ ہاتھی دوڑتے آئے۔ مجرموں کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان سے

وہ آہستہ آہستہ صرف چل سکتے تھے۔ وہ ہاتھیوں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہوتے لیکن مہاوتوں نے ہاتھیوں کو گھما پھرا کر سب کو کچل ڈالا۔ تین چار بار ہاتھی ان کے اوپر سے گذارے گئے۔

اس کے بعد ان تمام کی کچلی مسلی ہوئی لاشیں اُٹھوا کر ابوالعباس کی قبر تک لے جائی گئیں اور ان کی گردنوں میں رسے ڈال کر لکڑی کے اُن کھمبوں کے ساتھ لٹکا دیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں پہلے ہی گاڑ دیئے گئے تھے۔

چند دن اور کوئی نہ کوئی پکڑا جاتا رہا۔ اُس کا جرم ثابت ہونے پر اُسے یہی سزا دی گئی، پھر پکڑ دھکڑ بند کر دی گئی۔ سلطان محمود نے التنطاش کو خوارزم کا خوارزم شاہ بنا دیا اور ارسلان جاذب کو اُس کا نائب مقرر کیا اور خوارزم کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا۔ ان دونوں نے جاسوسی اور مخبری کے نظام کو جسے دیوانِ شغلِ اشرافِ مملوکات" کہا جاتا تھا خوب استعمال کیا۔

سلطان محمود کا یہ محکمہ آج کی انٹیلی جنس کا کام کرتا تھا۔ اس میں کام کرنے والوں کو مُشرف کہا جاتا تھا۔ دشمن کے ملک میں اُس ملک کے جس باشندے کو اپنا مخبر یا ایجنٹ بنایا جاتا، اُسے بھی مشرف کہتے تھے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ مشرفوں کو سلطان محمود بے دریغ تنخواہیں اور الاؤنس اور انعامات دیا کرتا تھا۔ ان کے اہل وعیال کو وہ الگ وظیفے دیتا تھا۔ اس مورخ کے مطابق سلطان محمود کے مُشرف اتنے ہوشیار تھے کہ اپنے دشمن ملک کے بادشاہ کی سانسیں بھی گن لیا کرتے تھے۔

التنطاش اور ارسلان جاذب نے اِس محکمے کے بڑے ہوشیار اور ذہین مُشرف غزنی سے بلائے، کچھ خوارزم سے لیے اور اُن زمین دوز تخریبی کارروائیوں کا سراغ لگا لیا جو یہودیوں اور عیسائیوں نے ابھی تک جاری رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کو گرفتار کر کے ویسی ہی سزائیں دی گئیں جیسی البتگین وغیرہ کو دی گئی تھیں۔ شہریوں کے بنیادی حقوق بحال کر کے اُن میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔

سلطان محمود جب غزنی کو واپس جا رہا تھا تو صحرا میں اُس جگہ رُک گیا جہاں دونوں فوجوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑا ادِھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہاں ابھی تک

گدھ، گیدڑ اور کُتّے لاشوں کی ہڈیاں نوچ رہے تھے۔ سلطان محمود کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب اُس نے ہاتھ منہ پر پھیرے تو ہاتھ آنکھوں پر ہی رہنے دیئے ـــــ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

طوفان جو غزنی سے آیا

دِلّی کے جنوب مشرق میں تقریباً دو سو میل دُور گنگا کے دائیں کنارے پر قنوج نام کا ایک شہر ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قنوج ایک طاقتور ہندو ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہاں کے مہاراجہ کا نام راجیا پال تھا۔ مورخ کہتے ہیں کہ شمالی ہند میں قنوج کے راجکماروں کو باعزت مقام حاصل تھا۔ دِلّی سے اسّی پچاسی میل جنوب میں جمنا کے کنارے متھرا کا شہر ہے جو ہندوؤں کے مطابق چار ہزار سال سے مقدّس چلا آ رہا ہے۔ ان کا کرشن مہاراج متھرا میں ہی پیدا ہوا تھا۔ آج بھی ہر سال دُور دور سے ہندو متھرا جاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

متھرا میں ایک بڑے مندر کے علاوہ چند اور چھوٹے مندر تھے۔ یہ تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے کمرے، راہداریاں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ شہر کے ارد گرد مضبوط دیوار تھی اور ایک قلعہ بھی تھا۔ متھرا الگ ریاست نہیں تھی۔ ان کے دفاع کی ذمہ داری قنوج کے مہاراجہ راجیا پال اور پڑوس کی ایک اور چھوٹی سی ریاست مہابن کے حکمران رائے کول چند نے سنبھال رکھی تھی۔ کچھ اور رائے اور راجے بھی تھے جنہوں نے متھرا کے دفاع کے لیے اپنی اپنی فوجی نفری دے رکھی تھی۔

متھرا سے ملحق ریاست مہابن گھنے جنگلوں کا علاقہ تھا۔ راجدھانی کا نام مہابن تھا۔ یہ بھی جمنا کے دائیں کنارے پر واقع تھا اور یہ متھرا سے پچیس میل کے لگ بھگ دُور تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ان ریاستوں کی بڑی آب وتاب تھی مگر سلطان ان پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ تھانیسر تک کے بُت توڑ کر وہاں اپنی چوکیاں قائم کر گیا تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ بھیم پال نڈر بھی اُس کا باجگزار تھا۔ چھوٹے چھوٹے رائے اور راجے تو سلطان محمود کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔

۱۰۱۷ء میں جب سلطان محمُود نے خوارزم کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا ہمتھرا میں ہندوؤں کا سالانہ اجتماع تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام تر ہندوستان کی آبادی متھرا میں آ گئی ہو شہر میں بڑے بڑے مندر ہیں اور دریا کے کنارے مرد اور عورتیں چیونٹیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ شہر کے باہر چھوٹے بڑے ہزاروں خیمے نصب تھے۔ شہر سے دو تین میل دور جنگل میں کہیں کہیں زنگا رنگ کپڑوں کے محل کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ راجوں مہاراجوں کے شامیانے اور قناتیں تھیں۔ اِن کے ارد گرد ان کے محافظ دستوں کے خیمے تھے۔ ان کے ساتھ ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ راجے مہاراجے بھی متھرا کی پرارتھنا اور جمنا کے اشنان کے لیے آتے تھے۔

زیادہ وسیع اور دلکش قیام گاہ مہاراجہ قنوج راجیاپال کی تھی اور ایسی ہی قیام گاہ پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کی تھی۔ اِن کے اندر جا کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شامیانے اور قناتیں ہیں۔ رنگا رنگ فانوسوں قندیلوں اور ریشمی پردوں نے محل کا سماں باندھ رکھا تھا۔ راجوں مہاراجوں کی بیویاں اور ناچنے گانے والیاں بھی ساتھ تھیں مگر متھرا کے پنڈتوں کے تیور دیکھ کر کسی کو رقص وسرود کی محفل گرم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تو ہر سال میلے کا سماں ہوا کرتا تھا۔ باہر کے آتے ہوئے لوگ بھی ناچا اور گایا کرتے تھے مگر اب چیونٹیوں جیسے اس ہجوم پر اداسی بھی طاری تھی اور دہشت بھی۔

اس اداسی اور دہشت کا باعث سلطان محمود غزنوی تھا۔ ہندوؤں کے لیے "محمود" خوف اور نفرت کا ایک نام بن گیا تھا۔ پنڈتوں کی زبان پر یہی الفاظ تھے ——— "وِشنو دیوا اور کرشن واسدیو کے قہر سے تم بچ نہیں سکو گے"۔ یہ پجاری اور باہر سے آتے ہوئے لوگ یہی ایک آواز سنتے تھے ——— "دیوی دیوتاؤں کی توہین کرا کے تم زندہ کس طرح ہو۔ تم راتوں کو سوتے اور پیٹ بھر کر کھاتے کس طرح ہو۔ جب تک تم غزنی کی اینٹ

سے اینٹ نہیں بجادو گے اور محمود کے خون سے کشن واسدیو کے پاؤں نہیں دھوؤ گے، دیوتاؤں کا قہر ٹلے گا نہیں۔ اب گنگا جل اور جمنا جل تمہیں پاک نہیں کر سکتا۔"

کرشن واسدیو (کرشن مہاراج) کے پاؤں پر ماتھے رگڑنے والے اب اس بُت کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ وہ جب بُت کے پاؤں پر ماتھا رکھتے تو ان کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ مندر کی گھنٹیوں میں بھی اداسی تھی۔ بچوں والی عورتیں اتنی ڈری ہوئی تھیں کہ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کے لیے ان کے قدموں میں اپنے زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ مرد بُت کے آگے ہاتھ جوڑ کر قسمیں کھاتے تھے کہ وہ اپنے مندروں اور دیوتاؤں کی توہین کا انتقام لیں گے۔ بعض بلند آواز سے کہتے تھے کہ اب محمود آیا تو وہ اسے اور اس کی فوج کو زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔

راجیاپال مہاراجہ قنوج جب کشن واسدیو کے بُت کی پوجا کرنے اندر گیا تو اُس کا خاص محافظ جگن ناتھ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ جگن ناتھ گٹھے ہوئے دل کش جسم کا دراز قد اور خوبرو آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر صحت اور جوانی کی سرخی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کشش اور اُس کی آنکھوں میں جادو کا سا اثر تھا۔ وہ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں، اُسے جو مہارت حاصل تھی، وہ کم ہی کسی میں تھی۔ اُسے مہاراجہ راجیاپال کے پاس آئے دو سال ہو گئے تھے۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی مہاراجہ کا دل موہ لیا تھا۔

یہ ملاقات جنگل میں اُس وقت ہوئی تھی جب مہاراجہ شکار کھیل رہا تھا۔ مہاراجہ نے ایک ہرن پر تیر چلایا تو ہرن تیر کمان سے نکلتے ہی بھاگ اُٹھا اور تیر خطا گیا۔ اچانک جگن ناتھ سامنے آ گیا۔ مہاراجہ کے محافظوں نے اُسے وہاں سے ہٹانے کو بُرا بھلا کہا۔ اُس نے مسکرا کر مہاراجہ سے کہا کہ میں اُڑتے ہرن کو تیر سے نہ گرا سکوں تو میرا گھوڑا لے لیا جائے اور مجھے دھکّے دے کر یہاں سے چلتا کیا جائے۔

ہرن جب تیز دوڑتا ہے تو اتنی لمبی چوکڑیاں بھرتا ہے جیسے اُڑ رہا ہو۔ اس کی ایک ایک جست پچیس تیس گز لمبی ہوتی ہے اور وہ زمین سے سات آٹھ گز اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ مہاراجہ راجیاپال نے دلچسپی اور مذاق کی خاطر اُسے اپنی کمان اور صرف ایک تیر

دے کر کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ کوئی ہرن نظر آیا تو اُسے بھگادیں گے۔ تم دوڑتے گھوڑے سے ہرن کو ایک تیر میں گرالینا۔ اگر تیر خطا گیا تو گھوڑا ہم لے لیں گے۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ ایک جگہ چھ سات ہرن کھڑے تھے۔ مہاراجہ کے کہنے پر اُس کے آدمیوں نے شور مچایا تو ہرن بھاگ اُٹھے۔ جگن ناتھ نے ان کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ اُس کے پیچھے مہاراجہ نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ ہرن ہوا میں اُچھلنے اور اُڑنے لگے۔ جگن ناتھ نے گھوڑے کی باگ اپنے دانتوں میں پکڑلی۔ کمان آگے کر کے اس میں تیر ڈالا اور تیر چھوڑ دیا۔ ایک ہرن اڑان بناجست سے زمین پر آیا تو اوپر نہ اُٹھ سکا۔ گرا اور اٹھ کر دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھی آگے نکل گئے۔ اور جگن ناتھ کا گھوڑا اس تک پہنچ گیا۔ تیر ہرن کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گیا تھا۔

"میں بھی رائے کی فوج کا کماندار ہوں"۔ مہاراجہ راجیاپال کو اُس نے بتایا ۔۔۔ "مگر بجی رائے نے ایسی بُری شکست کھائی کہ اُس کی آدھی فوج ماری گئی اور آدھی غزنی والوں کی قیدی ہوگئی۔ میرا دل پھیکا پڑ گیا۔ میں لاہور کی فوج میں چلا گیا مگر یہ فوج بھی غزنی کے مسلمانوں سے شکست کھاگئی۔ اب لاہور کا راجہ محمود غزنوی کا باجگذار ہے۔ میں سپاہی ہوں۔ کمانداری کے عہدے پر تھا۔ میں کسی غیرت مند مہاراجے کی فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ قنوج کے راجپوتوں میں غیرت ہے۔ میں اس جنگل میں آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔"

مہاراجہ نے اس کے ساتھ کچھ باتیں کیں تو اُس نے محسوس کیا کہ یہ خوبرو جوان صرف تیر اور تلوار کا دھنی نہیں، اس میں عقل بھی ہے۔ مہاراجہ اس سے اتنا متاثر ہُوا کہ اُسے اپنے محافظ دستے میں رکھ لیا۔ جگن ناتھ پر قومی اور مذہبی جذبات غالب تھے اور وہ محمود غزنوی اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف زہر آلود نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی زبان میں کچھ ایسی چاشنی تھی کہ مہاراجہ راجیاپال نے اُسے اپنا ویساہی ذاتی محافظ بنا لیا جیسے آج کل ملکوں کے سربراہوں کے اے۔ ڈی۔ سی ہوتے ہیں۔ اس کے لیے زرق برق لباس سلوایا گیا۔ وہ جب دربار میں مہاراجہ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا تو اس کے پاس رنگدار برچھی رہتی تھی جس کے پھل پر سونے کا پانی چڑھا ہُوا تھا۔ مہاراجہ جہاں جاتا

جگن ناتھ اس کے ساتھ ہوتا ۔ وہ مہاراجہ کی شان و شوکت کا حصہ بن گیا تھا۔
راجیاپال کی تین رانیاں تھیں جگن ناتھ کے فرائض میں رانیوں کی حفاظت بھی شامل تھی۔ کوئی رانی کہیں جاتی تو جگن ناتھ بھی گھوڑے پر سوار گھوڑا گاڑی کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس طرح جگن ناتھ سجاوٹ کی ایک چیز بن گیا تھا۔

مہاراجہ راجیاپال بڑے مندر میں بت کی پوجا کے لیے اندر گیا تو جگن ناتھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ مہاراجہ نے کشن واسدیو کے پاؤں پر جو سنگِ مرمر کے تھے، ماتھا رگڑا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ محمود غزنوی کا سر اس مندر میں اس بت کے قدموں میں کاٹے گا۔

"اور میں عہد کرتا ہوں" ___ جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر بت سے کہا ___ "اگر ہم سلطان محمود غزنوی کو یہاں نہ لا سکے تو میں اپنا سر اپنے ہاتھوں کاٹ کر تیرے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

مہاراجہ نے چونک کر جگن ناتھ کو دیکھا۔ جگن ناتھ آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے ہوئے بھجن گنگنا رہا تھا۔ بڑے پنڈت نے دونوں کے آگے سلگتے ہوئے لوبان کی طشتری گھمائی۔ مہاراجہ نے لوبان کی راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ جگن ناتھ نے بھی انگلی سے راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ مہاراجہ نے اپنے گلے سے ہار اتارا جو بہت قیمتی تھا، اور یہ بت کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"مہاراج!" ___ بڑے پنڈت نے راجیاپال سے کہا ___ "ہری کرشن کو ان سچے موتیوں کی نہیں، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے خون کے قطروں کی ضرورت ہے مہابھارت اپنے سپوتوں کا خون مانگ رہا ہے۔ بھارت ماتا کی بے عزتی کا انتقام نہ لینے والے مہاراجہ کو بن باسی ہو جانا چاہیے۔"

"ہم انتقام لیں گے" ___ مہاراجہ قنوج نے بت کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا ___ "غزنی کے محمود کا سر اس مندر کے دروازے پر لٹکتا رہا کرے گا۔"

دن کے وقت دریا پر نہانے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ پانی میں کہیں کھڑا ہونے

کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ عورتوں کو دُور جاکر نہانا پڑتا تھا۔ دریا میں نہانا عبادت کا ایک لازمی حصّہ تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گنگا اور جمنا کا پانی سارے گناہ دھو ڈالتا ہے۔ بعض ہندو پہروں پانی میں کھڑے عبادت کرتے رہتے ہیں۔ راجوں مہاراجوں کی رانیاں اور داشتائیں جو اُن کے ساتھ آئی ہوتی تھیں، وہ رعایا کی عورتوں کی موجودگی میں دریا میں نہانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ رات کو جایا کرتی تھیں۔

ایک شام مہاراجہ قنوج راجیا پال کی سب سے چھوٹی رانی چمپا کلی نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ جمنا اشنان کے لیے جارہی ہے۔ مہاراجہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ شام گہری ہونے کے بعد چمپا رانی کو دریا پر لے جائے۔ وہ بڑی دونوں رانیوں کو ایک رات پہلے دریا پر لے جاچکا تھا۔ خود اندھیرے میں دور کھڑا رہا تھا۔ رانیاں نہا کے آئیں تو انہیں واپس لے آیا تھا۔ چمپا ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی اور بہت خوبصورت۔ دوسری دونوں رانیاں پرانی ہوچکی تھیں۔ مہاراجہ انہیں اس لیے ساتھ رکھتا تھا کہ وہ اُس کے بیٹوں کی مائیں تھیں۔ مہاراجہ پر چمپا غالب تھی۔ پرانی رانیاں اس سے کھچی کھچی رہتی تھیں۔

چمپا کوئی دو سال پہلے جب اُس کی عمر سولہ سترہ سال تھی مہاراجہ کے پاس تحفے کے طور پر آئی تھی۔ اس کا باپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں حسن کی دولت تھی اور چمپا اس حسن کا نمونہ تھی۔ مہاراجہ راجیا پال کے ایک جاگیردار کی نظر چمپا پر پڑی تو اس نے اُس کے باپ کو بہت سی رقم دے کر لڑکی بیوی کے طور پر لے لی تھی۔ شادی کی رسم ادا کی گئی تھی۔ جاگیردار چمپا کو قنوج لے گیا اور مہاراجہ کو پیش کر دی۔ مہاراجہ نے اسے حرم میں رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی۔ مہاراجہ کی عمر پچاس سال سے اوپر ہوگئی تھی۔ چمپا اُس کی رگوں پر سوار ہوگئی اور پہلی دونوں رانیاں محل کی پرانی چیزوں میں شمار ہونے لگیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو چمپا اپنے محل نما خیمے سے نکلی۔ اس کے ساتھ ایک خادمہ بھی تھی۔ جگن ناتھ باہر انتظار کر رہا تھا۔ چمپا اپنی خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔ جگن ناتھ ان کے پیچھے پیچھے جارہا تھا۔ وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے خیموں اور بغیر خیموں

کے ڈیروں سے دور نکل گئے تو دریا کا وہ کنارہ قریب آ گیا جہاں چمپا کو نہانا تھا۔ یہ جگہ خاصی دُور تھی۔ اُدھر رعایا کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چمپا رانی نے اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ اُدھر چلی جائے جہاں لوگوں کی عورتیں نہاتی تھیں۔ جگن ناتھ دریا سے کچھ دور رک گیا۔

خادمہ اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ چمپا دریا کے قریب چلی گئی اور ذرا دیر بعد واپس آ گئی۔

"اِدھر آجاؤ جگن!" ___ اُس نے کہا ___ "وہ چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جلدی واپس نہ آئے۔"

جگن ناتھ اُس کے قریب چلا گیا۔ اندھیرا تھا اور جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ بھی تھی۔ دُور دریا کے کنارے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ مرے ہوئے دو تین ہندوؤں کو جلایا جا رہا تھا۔ دریا میں دو کشتیاں بھی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی دو مشعلیں تیرتی جا رہی ہوں۔ چمپا نے جگن ناتھ کو اپنے قریب بٹھا لیا اور سر اُس کے زانوؤں پر رکھ کر زمین پر لیٹ گئی۔

"تم نہ ہوتے تو میں اس مہاراجے کو زہر دے دیتی یا خود زہر کھا لیتی"___ چمپا نے جگن ناتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے کہا___ "مگر تمہیں مہاراجہ کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ اسے تم چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تمہیں یہ محل اور اِس کی نوکری اچھی لگتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ مَیں رانی ہوں لیکن تم ساتھ دو تو مَیں تمہاری خاطر بَن باسی بن کے دکھا دونگی۔ جنگل میں کُٹیا میں رہونگی۔ تم یہاں سے کیوں نہیں نکلتے؟ مجھے یہاں سے نکالتے کیوں نہیں؟ ہم کب تک چوروں کی طرح ملتے رہیں گے۔"

"یہ بات تم مجھے ایک سو مرتبہ کہہ چکی ہو"___ جگن ناتھ نے کہا___ "اور میں تمہیں ہر بار یہی کہتا ہوں کہ ذرا صبر سے کام لو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا.... اور میں پھر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نکل چلو گی تو یہ محل تمہیں بہت یاد آئے گا۔ میں دو گز زمین کا بھی مالک نہیں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہماری حیثیت ملازموں کی سی ہوگی۔ ہم جہاں پکڑے گئے وہاں قتل کر دیئے جائیں گے۔"

"تم بھیرہ سے آئے ہو جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "اگر ہم بھاگ کر وہاں چلے جائیں اور مسلمان ہو جائیں تو کیا مسلمان ہمیں اپنی حفاظت میں نہیں رکھیں گے؟"۔ چمپارانی نے دانت پیس کر کہا۔ "مجھے اپنے مذہب سے بھی نفرت ہوتی جا رہی ہے"۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور بولی۔ "میں مہاراجہ کو آسانی سے زہر پلا سکتی ہوں۔ پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ مر گیا تو ہمیں کون پکڑے گا؟"

"وہ چتائیں جلتی دیکھ رہی ہو؟"۔ جگن ناتھ نے اُن شعلوں کی طرف اشارہ کیا جو مرے ہوئے ہندوؤں کو چاٹ رہے تھے۔ "مہاراجہ مر گیا تو تمہیں ستی ہونا پڑے گا۔ تمہیں زندہ اپنے خاوند کی جلتی چتا پر کھڑا کر دیا جائے گا.... مجھ پر بھروسہ کرو چمپا! میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔"

"تم نے بھیرہ میں غزنی کی فوج کے خلاف لڑائی لڑی ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "کیا وہ فوج بہت زبردست ہے؟ ہمارے دیس کے راجپوت مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

"غزنی کی فوج بہت زبردست ہے"۔ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ "مسلمان فوج کی تعداد جتنی کم ہوتی ہے، وہ اتنی ہی زبردست ہوتی ہے۔ مہاراجہ بھیم پال ٹھاکر کو بھی مسلمانوں نے گھٹنوں بٹھا دیا ہے اور اُس سے باج وصول کر رہے ہیں۔ سلطان محمود کشمیر سے شکست کھا کر واپس جا رہا تھا تو اُس کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی اور وہ سب زخمی تھی۔ یہ فوج مہاراجہ بھیم پال کے علاقے سے گزری تو مہاراجے کو جرأت نہ ہوئی کہ اس مری ماری ہوئی فوج پر حملہ کر کے سلطان سمیت اسے قید کر لیتا۔"

"جگن ناتھ!"۔ چمپارانی نے کہا۔ "تم مذہب کے عاشق ہو۔ بُرا نہ جانو تو کہوں۔ ہمیں پنڈت ڈراتے ہیں کہ ہمارے جن دیوی دیوتاؤں کے بُت مسلمانوں نے توڑ دیئے اور جو مندر اجاڑ دیئے ہیں وہ قہر نازل کریں گے.... اتنا عرصہ گزر گیا ہے، میں نے تو دیوتاؤں کا قہر کہیں گرتا نہیں دیکھا۔ ابھی تو غزنی کی فوج قہر کی طرح ہم پر ٹوٹ رہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ مسلمان ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہی خدا سچا ہے۔ ہم نے تھانیسر کے وشنو دیو کی بہت باتیں سُنی تھیں۔ ہم نے

سُنا تھا کہ وشنو دیو کے پجاری کسی میدان میں شکست نہیں کھا سکتے مگر اس دیو کو غزنی کے سلطان سے نہ پجاری بچا سکے نہ دیو نے اپنے آپ کو بچایا.... کیا تم اِن دیوتاؤں کی پُوجا کرتے ہو؟"

"تم اپنی زندگی سے اس قدر اُکتائی ہوئی ہو کہ اپنے مذہب سے نفرت کرنے لگی ہو" ــ جگن ناتھ نے اُس کے ریشم جیسے ملائم بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "مذہب کے خلاف جو جی میں آئے کہو، میری محبت پر شک نہ کرنا"۔

"اپنی محبت کی خاطر تم مجھے کسی بھی امتحان میں ڈال دو، پُوری اتروں گی"۔ چمپا نے کہا ــ "مگر اس مذہب کے نام پر میں کوئی قربانی نہیں دے سکتی"۔

خادمہ کھانستی چلی آرہی تھی۔ چمپا رانی اُٹھ کھڑی ہوئی اور چل پڑی۔ جگن ناتھ وہیں چھپا رہا۔ ذرا دیر بعد چمپا نے اُسے رانیوں کی طرح آواز دی اور خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔

دوسرے دن مہاراجہ راجیاپال نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ آج چُھٹی کرے اور آزادی سے گھوم پھر آئے۔ جگن ناتھ نے اپنے کپڑے پہنے اور کمر سے تلوار لٹکا کر میلہ دیکھنے نکل گیا۔ جگہ جگہ لوگ جوتشیوں، نجومیوں اور سینیاسیوں کے گرد مجمع لگائے ہُوئے تھے۔ لوگ جوتشیوں اور نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال معلوم کر رہے تھے۔ بعض جگہ سادھوؤں نے مجمعے لگا رکھے تھے اور لوگوں کو بھجن سنا کر پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ کہیں مداری اور کہیں بازی گر اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔

جگن ناتھ ہر مجمعے میں ذرا سا رُکتا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے دو سادھو بیٹھے تھے۔ ان کے صرف ستر ڈھانپے ہوئے تھے۔ ننگے جسموں پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ سر کے بال لمبے اور راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ اُن کی داڑھیاں بھی تھیں۔ اِن کے اِرد گرد مجمع زیادہ تھا۔

جب جگن ناتھ اس مجمعے میں جا رکا تو ایک آدمی نے سادھوؤں سے کہا ــــ "رِشی مہاراج! ہمیں اُن ملیچھ مسلمانوں کے متعلق کچھ بتائیں جو پہاڑوں سے آتے ہیں اور

ہمارے مندروں کا ہتیا چار کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"مسلمان ملیچھ ہیں" ___ ایک سادھو نے کہا ___ "لوبھی ہیں۔ انہیں دھن کا لوبھ ادھر لاتا ہے۔ لوٹتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کسی دیوی دیوتا سے نہیں ڈرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ نارائن، اور تُھا بھارت، نے وشنو اور واسدیو کے کرودھ کی جو خبر دی ہے وہ سچ ہے۔ دیوتا کا کرودھ مسلمانوں پر ضرور پڑے گا لیکن ابھی ہم پر پڑ رہا ہے۔ غزنی کا بادشاہ محمود بڑا ظالم اور زبردست ہے۔ وہ سیلاب کی طرح آتا ہے اور اس کے سامنے کوئی فوج نہیں ٹھہر سکتی۔ ہاتھی بھی بھاگ جاتے ہیں۔ اُسے دریاؤں کی طغیانی بھی نہیں روک سکتی۔ اُسے پہاڑ بھی نہیں روک سکتے۔"

وہ مسلمانوں کو بُرا بھلا بھی کہہ رہا تھا اور اُن کی دہشت بھی طاری کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو غزنی کی فوج کی کچھ ایسی ہولناک باتیں سنائیں کہ سننے والوں کی آنکھیں خوف سے اُبل کر باہر آنے لگیں۔ جگن ناتھ سُنتا رہا۔ سادھو نے بولتے بولتے اُسے دیکھا۔ ان کی نظریں ملیں۔ سادھو کی زبان ذرا سی رُکی اور پھر رواں ہوگئی۔ اُس نے اب اپنے سامعین کو دیوتاؤں کے کرودھ (قہر) سے بچنے کے طریقے بتانے شروع کر دیئے۔ جگن ناتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا رکا۔ اُس نے دیکھا کہ وہی دو سادھو آ رہے تھے۔ جگن ناتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ مندر خالی اور ویران تھا۔ اس کا کچھ حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ اُسے آواز سنائی دی ___ "تاشِ!"

وہ رُکا نہیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اُسے پھر آواز سنائی دی ___ "تاشقین!"

وہ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ دونوں سادھو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے اُس تک پہنچ گئے۔ ایک نے کہا ___ "امیر بن تاشقین!"

وہ رک گیا۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے ___ "کوئی بھی نہیں سُن رہا۔ ڈرو مت۔" سادھو نے کہا۔

"ہشام سمرقندا!"۔۔۔ اُس نے سادھو کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔ "اگر آس پاس کوئی نہیں، پھر بھی تمہیں میرا نام لے کر مجھے نہیں بلانا چاہیئے تھا۔ تم اناڑی ہو گیا؟ یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی ہتھیلی پھیلاتا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے رہو اور باتیں کرتے رہو.... تم دونوں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟"

"دو آدمی اور ہیں"۔۔۔ ہشام نے جو سادھو کے بھیس میں غزنی کا جاسوس تھا جواب دیا۔۔۔ "قیس کی طرح دونو مُشرف ہیں۔ وہ بھی سادھوؤں کے بھیس میں ہیں"۔

مُشرف انٹیلی جنس کے مقامی ایجنٹوں کو کہا کرتے تھے سلطان محمود غزنوی کی انٹیلی جنس کا جو نظام کام کر رہا تھا اس میں مقامی مسلمانوں کو مُشرف کے طور پر رکھ لیا جاتا تھا اور انہیں بڑی اچھی اُجرت دی جاتی تھی۔ یہ سادھو دراصل غزنی کا جاسوس ہشام سمرقند تھا۔ اُسے ملتان سے متھرا اس مشن پر بھیجا گیا تھا کہ وہاں سارے ہندوستان کے ہندو جمع ہوں گے، الہٰذا وہ مقامی مُشرف ساتھ لے جا کر وہاں سادھوؤں کے بھیس میں لوگوں میں دہشت پھیلائیں۔ ہشام کے ساتھ دوسرا سادھو ملتان کے علاقے کا قیس نام کا ایک آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جو متھرا کے ہجوم میں کہیں گم اپنا کام کر رہے تھے۔

ہشام نے جگن ناتھ کو جو دراصل امیر بن تاشتقین تھا، پہچان لیا تھا۔ دونو غزنی کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان میں ان کی اب پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قیس تاشتقین کو نہیں جانتا تھا۔ تینوں اس علاقے کی زبان اور رسم و رواج سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔

"کہاں ٹھکانہ ہے؟"۔۔۔ ہشام نے تاشتقین سے پوچھا۔ "کچھ ہاتھ لگا؟"

"میں جا رہا ہوں"۔۔۔ تاشتقین نے کہا۔۔۔ "ہندو بن کر آیا تھا۔ اب جا رہا ہوں"۔

"آپ ہم سے چھپاتے ہیں؟"۔۔۔ قیس نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ "میں نے آپ کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ دیکھا ہے۔ آپ شاید اُس کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میں آپ کو پیر اُستاد مانتا ہوں"۔

"ہم تینوں کا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں"۔۔۔ تاشقین نے کہا۔ "قیس! تم ذرا اُٹھو ہو پھرو۔ ہم رات کو کہیں اکٹھے ہوں گے۔"

"ہشام!"۔۔۔ قیس کے چلے کے بعد امیر بن تاشقین نے ہشام سے کہا۔ "تم بہت بڑے بیوقوف ہو۔ کیا تم مقامی لوگوں پر اُس قدر اعتماد کرتے ہو کہ تم نے مجھ جیسے آدمی کو بے نقاب کر دیا ہے؟ ..... اس شخص کو تم نے کسی کام میں آزمایا ہے؟ اس نے کوئی بڑا کام کیا ہے؟"

"آدمی قابلِ اعتماد ہے"۔۔۔ ہشام نے کہا۔ "اسے ابھی کوئی نازک کام نہیں دیا گیا۔"

"خدا کرے یہ قابلِ اعتماد ثابت ہو"۔۔۔ تاشقین نے کہا۔ "لیکن ہمارا کام ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کام میں کس طرح اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں کو دبانا پڑتا ہے۔ یہ طاقت اُسی میں ہوتی ہے جس میں ایمان ہو اور جس میں وہ جذبہ ہو جو ہم میں ہے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ ایک زمانے سے ہندوؤں کے دبدبے میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور ان کی توہم پرستی کے اثرات قبول کر لیے ہیں۔ یہ لوگ اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے تحت ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمان قابلِ اعتماد ہوں بھی تو بھی انہیں میرے درجے کے آدمیوں سے واقف نہیں ہونا چاہیے۔ ہندو ذرا سی بات پر انہیں قتل کرتے اور ان کے گھر جلاتے اور ان کے گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔"

"میں اسے پکا کر دوں گا"۔۔۔ ہشام نے کہا۔

"اس نے مجھے مہاراجہ کے سامنے دیکھ لیا ہے"۔۔۔ تاشقین نے کہا۔ "اسے کسی نے پکڑ لیا تو اذیت سے گھبرا کر یا لالچ میں آ کر مجھے پکڑوا دے گا۔ میں اس کے لیے بہت موٹا شکار ہوں۔ ذرا غور کرو کہ میں قنوج کے مہاراجہ کا ذاتی محافظ ہوں اور سب مجھے جگن ناتھ کہتے ہیں۔ مجھے جس نے پکڑوایا اُسے مہاراجہ ہیروں اور جواہرات کی صورت میں انعام دے گا۔"

"اگر تم اس شخص سے خطرہ محسوس کرتے ہو تو میں اسے آج ہی ختم کر کے اس کی لاش غائب کر دیتا ہوں" — ہشام نے کہا — "مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے"۔

"محض شک میں کسی کی جان نہ لو" — تاشقین نے کہا — "اس پر نظر رکھنا اور اسے پکا کر لینا"۔

"ہمارا کام تمہیں پسند آیا؟" — ہشام نے پوچھا — "لوگوں کو ان کے اپنے پنڈتوں نے ڈرا دیا ہے۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ ہم چار آدمیوں نے پوری کر دی ہے۔ یہ لوگ سادھوؤں، سنیاسیوں اور جوتشیوں کی جھوٹی باتوں کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ ہم نے ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے کہ محمود غزنوی اپنے ساتھ جیسے جن بھوت لاتا ہے جو انسانوں کو کھا جاتے اور قلعوں کی دیواروں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ یہاں کی مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں نہیں جانے دیں گی..... تم کیا کر رہے ہو؟"

"مہاراجہ قنوج کی نیت اور ارادے دیکھ رہا ہوں" — تاشقین نے جواب دیا "سخت غصے میں ہے۔ جن راجوں اور مہاراجوں نے ہم سے شکست کھائی ہے انہیں برا بھلا کہتا رہتا ہے یہاں سب آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اجلاس ہو گا تب پتہ چلے گا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں"۔

"سلطان ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں" — ہشام نے کہا — "معلوم نہیں تمہیں اطلاع ملی ہے یا نہیں....."

"کہ سلطان کو خوارزم میں بڑی خونریز لڑائی لڑنی پڑی ہے" — تاشقین نے ہشام کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا — "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ سلطان کو لاہور سے اطلاع ملی تھی کہ مہاراجہ بھیم پال نڈر قنوج کے مہاراجہ کو سلطان سے فیصلہ کن ٹکر لینے پر آمادہ کر رہا ہے۔ مجھے یہاں یہ دیکھنا ہے کہ قنوج کا مہاراجہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا یہ سب لوگ غزنی پر حملہ کریں گے یا سلطان کو مشتعل کر کے اپنی فوجیں کسی اور جگہ اکٹھی کر لیں گے اور سلطان کو شکست دینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یہاں کے مہاراجوں کی فوجی طاقت دیکھنی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس طاقت کو کس طریقے سے استعمال کریں گے"۔

"شاید اسی لیے میں کہا گیا ہے کہ متھرا میں ہندو اکٹھے ہوں تو ان میں غزنی کی

فوج کی دہشت پھیلائی جائے"۔۔۔ ہشام نے کہا۔
"تم اب چلے جاؤ"۔۔۔ تاشقین نے کہا۔۔۔"اور مقامی مُشرفوں کو اتنا زیادہ اعتماد میں نہ لو۔ انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرو"۔

شام ہوتے ہی اُفق پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ اُسی رات مہاراجوں اور راجوں کو مہاراجہ قنوج کی قیام گاہ میں اکٹھے ہونا تھا۔ ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خوشنما قناتوں میں گھِری ہوئی اور رنگارنگ شامیانوں سے ڈھکی ہوئی وہ جگہ خاصی وسیع تھی۔ ناچ گانے کا بھی انتظام تھا۔ کھانا اور شراب پیش کرنے کے لیے نیم عریاں جوان عورتیں تھیں۔ راجوں اور مہاراجوں کے ساتھ دو دو تین تین رانیاں بھی تھیں۔ بعض مہاراجوں کے ذاتی محافظ اُن کے پیچھے کھڑے تھے۔ امیر بن تاشقین بھی مہاراجہ راجیاپال کی نشست کے پیچھے جگن ناتھ کے بہروپ میں کھڑا تھا۔ کھانے کے دوران چمپا رانی اُسے کبھی کبھی دیکھ لیتی تھی مگر تاشقین مندر کے بت کی طرح کھڑا تھا۔
کھانا ختم ہوا تو سازوں کی آواز بلند ہوئی اور ایک رقاصہ ایک طرف سے تتلی کی طرح نمودار ہوئی۔
"بند کرو اس پاپ کو"۔۔۔ ایک آواز دھماکے کی طرح گرجی۔
ساز خاموش ہو گئے۔ رقاصہ وہیں سے لوٹ گئی۔ سب نے دیکھا۔ بڑے مندر کا پنڈت اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ اُسی کی آواز تھی۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور اُن کی رانیوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔
"کیا تم اس کی خوشی منانے اکٹھے ہوئے ہو کہ مہاراجہ بھیم پال جو اپنے آپ کو نڈر کہلاتا ہے، غزنی کے پاپی اور پلید سلطان کا باجگزار ہو گیا ہے؟"۔۔۔ پنڈت نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔"کیا تم اپنے دیوتاؤں کی توہین پر خوشی منا رہے ہو؟ کیا تم اس لیے ناچنے والیوں کو ساتھ لائے ہو کہ تمہارے مذہب پر مسلمانوں نے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں یا اس لیے کہ راجپوتوں کا خون سرد ہو گیا ہے؟ تم خود ناچو۔ پاؤں سے گھنگھرو باندھ لو۔ چوڑیاں چڑھا لو....."

"ہمیں معاف کر دو مہاراج!" ــــ ایک راجہ نے اُٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "ہم آج یہ فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ غزنی کی فوج کو ہمیشہ کے لیے شکست دینی ہے"۔

"تم سب پر ہری کرشن واسدیو کا قہر آیا ہی چاہتا ہے" ــ پنڈت نے کہا ــــ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام سچا اور ہندو مت جھوٹا مذہب ہے ۔ تم نے مہابھارت میں اسلام کا بیج پھر سے بو دیا ہے ۔ تم نے محمد بن قاسم کو زندہ کر دیا ہے ۔ تم دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکتے"۔

بادل کی گرج سنائی دی ۔ پنڈت انہیں لعنت ملامت کرتا رہا ۔ بادل بار بار گرجنے لگے ۔ پنڈت راجوں مہاراجوں کو دیوتاؤں کے قہر سے ڈرا رہا تھا ۔ قناتیں بڑی زور سے ہلیں اور شامیانے اوپر کو اُٹھے ۔ اس کے بعد کپڑوں کے اس محل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ۔ طوفان فوراً ہی تُند ہو گیا ۔ جلتے ہوئے فانوس گر پڑے ۔ تیل بکھر گیا اور اسے آگ لگ گئی ۔ بجلی اتنی زور سے کڑکی جیسے زمین و آسمان پھٹ گئے ہوں ۔ فانوسوں نے زمین پر بچھی ہوئی دری کو آگ لگا دی تھی ۔ طوفان نے ایک طرف سے قنات گرا دی اور اسے بھی آگ لگ گئی ۔

پنڈت کی آواز سنائی دی ــــ "یہ وشنو دیو کا قہر ہے" ــــ اور سب بھاگ اُٹھے ۔ پھر مینہ برسنے لگا ۔ یہ طوفانِ باد و باراں تھا ۔ بجلی بار بار کڑکتی اور بادل بڑی زور سے گرجتے تھے ۔ طوفان کی چیخیں بڑی ہی ڈراؤنی تھیں ۔ ہاتھی چنگھاڑنے اور گھوڑے خوف سے ہنہنانے لگے ۔ بارش نے آگ بجھا دی اور طوفان شامیانے، قناتیں اور خیمے اڑانے لگا ۔ راجوں مہاراجوں کے محافظ اپنے آقاؤں اور ان کی رانیوں کو کسی محفوظ جگہ لے جانے کے لیے دوڑے ۔ مہاراجہ راجیاپال کی پکار بار بار سنائی دیتی تھی ــــ "جگن ناتھ! چمپا رانی کو مندر میں لے جاؤ"۔

مندر دُور تھا ۔ بھگدڑ اور افراتفری تھی ۔ سب شہر کی طرف دوڑے جا رہے تھے ۔ جنگل کے درخت چیخ اور چنگھاڑ رہے تھے ۔ ٹہن ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے ۔ تاشقین نے چمپا کو پہلے ہی اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور اُسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شہر

کی طرف لے جا رہا تھا۔

شہر کے ارد گرد باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے ہزار ہا خیمے نصب تھے۔ بعض ہندو خیموں کے بغیر آسمان تلے پڑے تھے۔ وہ اپنا سامان طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شہر کو بھاگے جا رہے تھے۔ شہر والوں نے ان لوگوں کو پناہ میں لینے کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ طوفان کا زور ابھی بڑھ رہا تھا۔ بجلی چمک کر کڑکتی تھی تو انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ بچے چیخ رہے تھے، عورتیں چیخ چلا رہی تھیں اور طوفان کی چیخیں انسانی چیخوں کو جیسے ہڑپ کرتی جا رہی تھیں۔

یہ طوفان ایک قیامت تھی۔ اس قیامت خیز طوفان میں ہشام سمرقند کا ساتھی قیس دریا کی طرف سے شہر کو آ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے طوفان کے زناٹوں، بارش کی بوچھاڑوں اور درختوں کی چیخوں میں ایک ایسی چیخ سنائی دی جو کسی بچے کی یا عورت کی معلوم ہوتی تھی۔ قیس رُک گیا۔ بجلی چمکی اور کڑکی۔ اُسے اس چمک میں قریب ہی ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی انسان نظر آیا اور وہی چیخ پھر سنائی دی۔ وہ اُدھر کو دوڑا۔ وہاں ایک عورت اکیلی بیٹھی کانپ رہی تھی۔

"مت ڈرو"۔ قیس نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم اکیلی نہیں ہو"۔

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ شام کے بعد دریا پر نہانے گئی اور طوفان نے آگھیرا۔ سب بھاگے تو وہ اپنی ساتھیوں سے بچھڑ گئی۔ قیس کو دیکھتے ہی اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ بجلی اب کے اتنی زور سے کڑکی کہ قیس بھی جو ایک دلیر مرد تھا سُن ہو کے رہ گیا۔ لڑکی کی چیخ بجلی کے دھماکے سے زیادہ بلند تھی۔ بجلی قریب ہی ایک درخت پر گری۔ لڑکی قیس کے ساتھ اس طرح اور زیادہ چپک گئی جیسے اُس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

اُدھر بڑے مندر سے سنکھ اور گھڑیال بجنے لگے۔ سنکھ ایک نہیں بیسیوں تھے۔ ان

کی بے سُری آوازیں ایسی تھیں جیسے بھیڑیے رو رہے ہوں۔ پنڈت اور پجاری کشن واسدیو کے بُت کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ "ہر ہر مہادیو اور جے جگدیش ہرے" کا واویلا بپا ہو گیا۔ سب اسے دیوتاؤں کا قہر سمجھ رہے تھے۔ گھروں میں جنہوں نے بُت اور مورتیاں رکھی ہوئی تھیں وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے مگر یہ دیوتاؤں کا قہر تھا یا خدا کا، یہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سنکھوں کی آوازوں نے طوفان کی چیخوں کو زیادہ بھیانک بنا دیا۔

راجے، مہاراجے، اُن کے محافظ اور بڑے بڑے دلیر سورمے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ اس کو طوفان نہیں، جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں کی خونریز لڑائی سمجھ رہے تھے۔ اس طوفان میں جو لگتا تھا دنیا کو ختم کرنے آیا ہے، قیس ایک ہندو لڑکی کو بازوؤں پر اٹھائے ایک پرانے ویران مندر کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی نے بازو اُس کے گلے میں ڈال رکھے تھے اور گال بچوں کی طرح اُس کے گال کے ساتھ دبائے ہوئے تھے۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ بجلی کے دھماکے سے وہ بدک کر ہوش میں آ جاتی تھی۔ طوفان قیس کے پاؤں اکھاڑ رہا تھا۔ اوپر سے درختوں کے ٹہن لپک لپک کر اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کیچڑ میں پھسلا، گرا مگر اُس نے لڑکی کو سنبھالے رکھا۔

ایک بار بادل بڑے قہر سے گرجے اور اس کے ساتھ ایسی بھیانک چنگھاڑ سنائی دی کہ قیس رُک گیا۔ اُس کی مردانگی جواب دے گئی۔ بجلی چمکی تو اُسے اپنے سامنے دو ہاتھی دکھائی دیئے جو سونڈیں اوپر کئے ہوئے چنگھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ یہ کسی مہاراجہ کے ہوں گے۔ وہ دُور نہیں تھے۔ پچیس تیس قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں ہاتھی سخت ڈرے ہوئے پہلو بہ پہلو دوڑے آ رہے تھے۔ قیس کے جسم سے کنکریوں کی بوچھاڑوں جیسی بارش اور بے پناہ تند ہواؤں نے طاقت چوس لی تھی، پھر بھی وہ دائیں کو دوڑا اور پھسل کر گر پڑا۔ لڑکی اُس کے نیچے تھی۔ ہاتھی اُوپر آ گئے۔ قیس نے لڑکی کو دھکا دے کر دُور پھینک دیا اور خود کچلے جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اُس نے زور دے کر لڑھکنی لی اور اتنا ایک طرف ہو گیا کہ ایک ہاتھی کا پاؤں اُس کے پہلو کے ساتھ پڑا اور ہاتھی آگے نکل گئے۔

لڑکی جو ڈر سے مری جا رہی تھی، دوڑی آئی اور قیس کے اوپر گر پڑی۔ اُس نے قیس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ماں کی سی بیتابی سے پوچھا "تم ٹھیک ہو؟ بولو..... بولو نا" ــــ اور قیس اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک قدیم مندر کے کھنڈر تھے جو زمین سے خاصے بلند تھے۔ قیس اور ہشام امیر بن تاشقین سے نہیں ملے تھے۔ قیس سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لڑکی اُس کے بازوؤں پر تھی۔ وہ اتر گئی۔ کہنے لگی کہ وہ خود اوپر جائے گی۔ طوفان کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا لیکن قیس کو ہاتھیوں کے نیچے پڑا دیکھ کر لڑکی کی جرأت اور طاقت واپس آ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے سیڑھیاں چڑھ گئے اور تاریکی میں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے۔ لڑکی نے ٹٹول کر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"مجھے گناہگار نہ کرو لڑکی!" ــــ قیس نے اُس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا اور جذبات سے وہ اتنا مغلوب تھا کہ اُس کے منہ سے نکل گیا ــــ "ہمارے مذہب میں یہ گناہ ہے کہ انسان کسی انسان کے آگے سجدہ کرے۔ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔"

"تم مسلمان ہو؟" ــــ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ سے ویسی ہی نفرت کرو گی جیسی ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں؟"

"نفرت؟" ــــ لڑکی نے حیرت سے کہا ــــ "تم سے؟..... تم نہ ہوتے تو میں زندہ نہ ہوتی..... تم مسلمان ہو تو تم یہ تو نہیں مانو گے کہ یہ دیوتاؤں کا قہر ہے؟"

"میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا" ــــ قیس نے کہا ــــ "لیکن یہ میرے خدا کا قہر ہے جو پتھر کے دیوتاؤں اور اُن کی پوجا کرنے والوں پر گر رہا ہے۔ یہ خدا کا اشارہ ہے۔ مجھے اسی خدا نے طاقت دی ہے کہ تمہیں ایسے سخت طوفان میں سے اٹھا لایا ہوں۔"

قیس سادھوؤں کے بھیس میں دریا کے کنارے گیا تھا۔ اُس کا کل لباس پہلوانوں والا ایک لنگوٹ تھا۔ بارش نے اس کے جسم سے راکھ، داڑھی اور سر کے بالوں میں ڈالی ہوئی مٹی اور راکھ دھو ڈالی تھی۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ وہ ننگا کیوں ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ دریا میں نہانے گیا تھا۔ طوفان کپڑے اُڑا کر لے گیا اور وہ اسی طرح بھاگ آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ متھرا کا میلہ دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ اُس نے بلند شہر کی کوئی جگہ بتائی۔ اُس کا پورا کنبہ آیا ہوا تھا۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے اس شہر سے باہر اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ قیس نے اُسے بتایا کہ اب وہاں نہ خیمہ ہوگا نہ اُس کا کنبہ اور رات اسی کھنڈر میں گزارنی ہوگی۔

"میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں" — لڑکی نے رُک رُک کر کہا۔ "تم مرد ہو اور میں نوجوان لڑکی ہوں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی .... ہمیں رات یہیں گزارنی ہے"۔ — لڑکی کے لہجے میں التجا تھی۔ قیس سمجھ گیا۔ اُس نے کہا — "میں تمہیں اپنے لیے نہیں تمہارے ماں باپ کے لیے اُٹھا لایا ہوں .... میں تم سے ایک وعدہ لیتا ہوں۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ میں مسلمان ہوں، ورنہ ہندو میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے۔ میں اپنا نام جگدیش بتاؤں گا"۔

لڑکی جس نے اپنا نام اُوشا بتایا، قیس کی ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ اُس نے بڑا پکا وعدہ کیا۔ پھر رات گذرنے لگی۔ اُوشا کی آنکھ بار بار کھلتی تھی۔ اُسے اب طوفان کا نہیں، اُس مرد کا ڈر تھا جس کے ساتھ وہ اس کھنڈر میں تنہا تھی۔

آخری بار اُوشا کی آنکھ کھلی تو کمرہ روشن تھا۔ کوئی کھڑکی اور روزن نہیں تھا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے۔ دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ قیس دروازے میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ رات کا طوفان رات کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ قیس کے چہرے پر حیرت تھی اور ایسی ہی حیرت اُوشا کے چہرے پر بھی تھی۔ قیس اس لیے حیران تھا کہ اُس نے اس قدر خوبصورت اور اتنی دلکش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی اور اُوشا اس لیے حیران

تھی کہ قیس جوان آدمی تھا جس کے جسم کے پٹھے گوشت سے بھرے ہوئے اور بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس جوان مرد نے رات اتنی جوان لڑکی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

"اب تمہارے ماں باپ کو تلاش کرنا ہوگا"۔۔۔ قیس نے کہا۔۔۔ "اٹھو، چلیں۔"

اُوشا اُسے ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں "تشکر" کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا۔ قیس کے دوبارہ کہنے کے باوجود وہ نہ اٹھی۔ قیس کچھ ہوا اُس کے قریب جا بیٹھا۔

"تم نے مجھے زندگی دی ہے"۔۔۔ اُوشا نے کہا۔۔۔ "کیا مجھے باقی زندگی کا سکھ دے سکتے ہو؟"

قیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میرے لیے یہ واقعہ معمولی نہیں کہ رات تم نے مجھے طوفان سے بچایا ہے"۔۔۔ اُوشا نے کہا۔۔۔ "اور بات یہ بھی معمولی نہیں کہ تم نے میری عزت بھی بچائی ہے مگر تم مجھے اُس بوڑھے سے نہیں بچا سکو گے جس کے ساتھ میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو.... ہندو عورت کی زندگی مرد کے قدموں میں بسر ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں اور خاوند مر جائے تو عورت اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے یا اُسے ہردوار یا یہاں متھرا بھیج دیا جاتا ہے۔ میں اپنی ایک بیوہ سہیلی سے ملی ہوں۔ وہ دو سال سے یہاں ہے۔ کہنے کو وہ پاک زندگی بسر کر رہی ہے۔ زیادہ وقت عبادت میں گذارتی ہے مگر اُس کی راتیں کسی نہ کسی پنڈت کے کمرے میں گذرتی ہیں.... مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تمہاری باندی بن کے رہوں گی۔"

قیس کیا تھا؟۔۔۔ ایک جوان آدمی تھا۔ اتنی حسین لڑکی اُسے اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر جبر کیے ہوئے تھا۔ لڑکی نے اُس کی زنجیریں توڑ دیں۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہاری خواہش کو بھی نہیں ٹال سکتا..... اُوشا! میرے دل سے پوچھو تو میں تمہیں کسی کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرے دل میں اُتر گئی ہو..... اٹھو۔ چلو چلیں۔"

وہ جب باہر آئے تو مندر کی بلندی سے انہیں بڑا ہی بھیانک منظر دکھائی دیا۔ جہاں خیموں کی بستی تھی وہاں اب ویرانہ تھا۔ یہ لوگ اِدھر اُدھر اپنا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ خیمے گرے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے۔ درختوں سے ٹہن ٹوٹے ہوئے تھے اور پانی ہی پانی تھا۔ قیس اُوشا کو ساتھ لے کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ وہ تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ انہیں بڑی ہی بلند آواز سنائی — "اُوشا"۔

دونوں رُک گئے۔ اُوشا نے کہا — "میرا باپ ہے۔ اب ہم بھاگ نہیں سکیں گے"۔

ایک دراز قد، چوڑے چکلے سینے والا آدمی جس کی گھنی مونچھیں اُس کے آدھے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں، دوڑتا آیا اور اوشا کو گلے لگا لیا۔ اُوشا نے اُسے قیس کے متعلق بتایا کہ اُس کا نام جگدیش ہے اور اُسے اس نے بچایا ہے اور رات اُس نے اُسے اس مندر کے ایک کمرے میں رکھا اور اس پر پہرہ دیتا رہا ہے۔ اوشا نے رات کی ساری بات سنا دی۔

اُوشا کے باپ نے قیس کو گلے لگالیا اور بولا — "مُنہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں۔ سونا مانگو، میرا گھوڑا مانگو"۔

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے"— قیس نے کہا۔ "انعام کا کوئی لالچ نہیں۔ اگر انعام دینا ہی ہے تو مجھے اپنا بیٹا بنالیں۔ آپ نے اپنی بیٹی کسی کو تو دینی ہے۔ یہ کرم مجھ پر کریں۔ اپنی بیٹی سے پوچھ لیں کہ میں کیسا آدمی ہوں"۔

اُوشا کا باپ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا — "میں تم جیسے بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارا جسم بہت خوبصورت ہے۔ یہ مرد کا جسم ہے۔ میں فوجی عہدیدار ہوں۔ میں خاندانی سپاہی ہوں۔ میں اپنی بیٹی تمہیں دے کر تمہیں فوج میں لے جانا پسند کروں گا لیکن ایک فوجی عہدیدار سے بات چل رہی ہے۔ میں زبان سے پھر نہیں سکتا۔ کچھ اور مانگو"۔

"آپ کون سی فوج میں ہیں؟"— قیس نے پوچھا۔

"بلند شہر کے راجہ کی فوج میں"— اُوشا کے باپ نے جواب دیا۔

قیس نے کسی خیال سے اس کے ساتھ فوجوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُوشا کے باپ نے سلطان محمود کی بات چھیڑ دی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اُسے شکست دینے کے لیے زندہ ہے۔ وہ چونکہ خاندانی اور پیدائشی فوجی تھا اس لیے وہ فوجوں اور لڑائیوں کی باتیں کرتا رہا، مگر قیس کے دل و دماغ پر اوشا سوار تھی۔ اس کے باپ نے جب لڑکی دینے سے انکار کر دیا تو قیس کو یوں لگا جیسے اُس کے سینے سے اُس کا دل نکالا جا رہا ہو، یا جیسے اُس سے اتنی حسین لڑکی چھینی جا رہی ہو۔ اس کی فطری کمزوریاں اور نفسانی خواہشات اُس کے جذبات اور اُس کی عقل پر غالب آگئیں۔ اگر اوشا کا باپ اُسے دھتکار دیتا یا اوشا کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا جاتا تو قیس اس کیفیت سے دو چار نہ ہوتا۔ یہ شخص اس کے ساتھ بڑے پیار سے انداز میں دوستانہ باتیں کر رہا تھا اور قیس سوچ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کس طرح راضی کرے۔

اُوشا کے باپ نے غزنی کے جاسوسوں کا ذکر کیا اور کہا۔ ”یہ لوگ ہم میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ محمود کو راز کی ایسی باتیں بتاتے ہیں کہ وہ ہم پر وہیں ضرب لگاتا ہے جو ہماری کمزور رگ ہوتی ہے۔ ہماری فوجوں میں غزنی کے جاسوسوں کو پکڑنے کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مجھے کوئی مسلمان جاسوس نظر آجائے تو میں اُسے زندہ اپنے راجہ کے حوالے نہیں کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر لے جاؤں گا۔“

قیس کا دماغ پھر گیا۔ اوشا باپ کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ نے قیس پر نشہ طاری کر دیا۔ کہنے لگا ــــ ”اگر میں آپ کو دو تین جاسوس پکڑوا دوں تو آپ مجھے وہ انعام دے دیں گے جو میں نے مانگا ہے؟“

”تم کیسے پکڑواؤ گے؟“

”مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں“ ــــ قیس نے کہا ــــ ”آپ انہیں پکڑیں اور انہیں زندہ رکھیں۔ ان کے ذریعے آپ غزنی کے بہت سے جاسوس پکڑ سکیں گے۔“

”کب؟“ ــــ اوشا کے باپ نے قیس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا ــــ ”کہاں ہیں وہ؟“

”ابھی... آج ہی“ ــــ قیس نے جواب دیا ــــ ”وہ یہیں ہیں۔ اگر نہ ملیں تو آپ میری گردن کاٹ سکتے ہیں۔“

"اور اگر مل گئے اور وہ واقعی جاسوس نکلے تو اپنی بیٹی کا ہاتھ متھرا کے بڑے مندر میں تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا لیکن راجہ سے انعام میں خود لوں گا ۔ مجھے ترقی مل جائے گی ۔ مجھے زیادہ آدمیوں کی کمان مل جائے گی"

"مجھے منظور ہے" قیس نے کہا ۔ "میرے ساتھ چلو"

قیس تمام رات غائب رہا تھا ۔ ہشام اور اُس کے دو اور ساتھی اُسے صبح سے ڈھونڈ رہے تھے ۔ انہوں نے سادھوؤں کے بھیس میں طوفانی رات ایک مندر میں گذاری تھی ۔ قیس شام کو واپس نہیں آیا تھا ۔ اب ساتھی اُسے ڈھونڈ رہے تھے ۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ہندو فوجی عہدیدار کو ساتھ لیے انہیں ڈھونڈ رہا ہے ۔ اب وہاں کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا ۔ لوگ شہر میں معلوم نہیں کہاں کہاں جا چھپے تھے ۔ ہر طرف کیچڑ اور پانی تھا ۔

وہ پہر کے وقت ہشام سمرقند کو اپنا ایک ساتھی ملا ۔ اُس نے بتایا کہ اس نے قیس کو دیکھا ہے ۔ وہ سادھوؤں کے بھیس میں نہیں بلکہ اُس نے ایسے کپڑے پہن رکھے ہیں جو اُس کے اپنے معلوم نہیں ہوتے ۔ اِس کے ساتھ ایک آدمی ہے جو شکل و صورت سے قد بُت اور تلوار سے فوجی معلوم ہوتا ہے ۔ اگر وہ فوجی نہیں تو بھی آدمی مشکوک ہے اور وہ ہندو لگتا ہے ۔ ہشام نے اُسے کہا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہہ دے کہ غائب ہو جائیں ۔

اُن کے اس ساتھی نے قیس کو دیکھا اور خود اُسے نظر آئے بغیر وہاں کھسک آیا تھا ۔ یہ لوگ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور ضرورت سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے ۔ قیس کو اُوشا کا باپ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جہاں رات کو اُس نے اپنے کنبے کے ساتھ پناہ لی تھی ، وہاں اُسے اپنے کپڑے پہنا دیے تھے اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی تلاش میں لے گیا تھا ۔

ہشام کو تاشقین کی باتیں آئیں ۔ اُس نے کہا تھا کہ مقامی مُشرفوں پر اتنا زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہندوؤں کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے یہاں کے مسلمان ہندو ہو

کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں ہشام نے اپنی جگہ جاکر اپنے جسم سے راکھ دھوئی، سر اور داڑھی کے بال صاف کئے۔ کپڑے پہنے اور سر پر ہندوؤں کے طرز کی پگڑی باندھ لی۔ اُس نے کُرتے کے اندر خنجر چھپا لیا اور قیس کی تلاش میں نکل پڑا۔

بہت دیر بعد اُسے قیس نظر آگیا۔ وہ اُوشا کے باپ کے ساتھ ایک قدیم عمارت کے بیرونی برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہشام دوسری طرف سے اس کھنڈر میں داخل ہُوا اور دبے پاؤں اُس کمرے تک چلا گیا جس کے برآمدے میں قیس بیٹھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی جس کے کواڑ نہیں تھے، ان دونوں کی پیٹھ پیچھے تھی۔ ہشام اس کھڑکی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

"آپ مایوس نہ ہوں، وہ نظر آجائیں گے"۔ قیس اُوشا کے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "وہ تین ہیں۔ تینوں کو پکڑوا دوں گا"۔

"لیکن چوتھے کے متعلق میں اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ مہاراجہ قنوج کا ذاتی محافظ ہے" ۔۔۔ اُوشا کے باپ نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تم اُس کے سامنے نہیں جاؤ گے، اور میں سوچتا ہوں کہ میں مہاراجہ کے خاص آدمی پر کس طرح الزام عائد کردوں گا کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے ... مہاراجہ قنوج بڑا ہی دانشمند آدمی ہے"۔

"میں اُسے پکڑوانے کا طریقہ بھی سوچ لوں گا"۔ قیس نے کہا۔

ہشام نے اپنے کُرتے کے نیچے سے خنجر نکالا۔ اس کی نوک زہر میں بجھی ہوئی تھی جسم پر اس کی خراش ہی کافی تھی۔ اس کا زہر سارے جسم میں پھیل جاتا تھا۔ ہشام کھڑا ہو گیا۔ فاصلہ صرف پانچ چھ قدم تھا۔ اُس نے پوری طاقت سے خنجر پھینکا۔ خنجر قیس کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ اٹھا مگر چکرا کر گر پڑا۔ ہشام اُس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُوشا کا باپ سمجھ گیا کہ خنجر کس طرف سے آیا ہے۔ وہ کھنڈر کے اندر دوڑا گیا۔ ہشام دوسری طرف جا نکلا۔ اُوشا کا باپ کھنڈر میں قاتل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہشام برآمدے میں آیا اور قیس کی پیٹھ سے خنجر نکال کر اُسی طرف چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔ اُوشا کا باپ اُسے کھنڈر کے اندر اور باہر ڈھونڈتا رہا۔ قیس مر چکا تھا۔

اُس رات بڑے مندر کے پنڈت نے تمام راجوں مہاراجوں کو مندر میں بلایا۔

"میں نے آپ سب کو سونے اور چاندی کا یہ انبار دکھانے کے لیے بُلایا ہے" ـــــ پنڈت نے انہیں سونے کے زیورات اور نقدی کے ڈھیر دکھاتے ہوئے کہا۔

"کل رات میں آپ کے پاس تھا جب طوفان آیا تھا۔ مجھے دوسرے پنڈتوں نے جو اُس وقت ہری کرشن کی پُوجا کر رہے تھے، بتایا ہے کہ دیوتا کی آنکھیں پہلے سفید ہوئیں پھر سُرخ ہو گئیں، پھر ان آنکھوں سے شرارے نکلے اور فوراً بعد بادل کی پہلی گرج سنائی دی۔ یہ گھنٹیاں اپنے آپ بجنے لگیں۔ دیوتا کی آنکھوں کا رنگ قرمزی ہو گیا اور بجلی کڑکنے لگی، پھر طوفان آگیا....

"یہ وہ وقت تھا جب مہاراجہ قنوج کے فانوس گر پڑے تھے اور آگ لگ گئی تھی۔ کیا آپ دیوتاؤں کے اس اشارے کو نہیں سمجھتے؟ رات کا طوفان دیوتاؤں کا قہر تھا۔ رات کو ہی لوگ مندر میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات بھر یہاں ماتھے رگڑتے رہے ہیں۔ مجھے صاف اشارہ ملا ہے کہ جب تک غزنی کے سلطان کا سر کاٹ کر ہری کرشن واسدیو کے قدموں میں نہیں رکھا جائے گا، یہ قہر ہم پر پڑتا رہے گا۔ رات کو کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ یہی انجام آپ کا ہو گا...

"میں اپنے لوگوں کو بتاتا رہا ہوں کہ جب تک اسلام کے لیے ہندوستان کا راستہ کھلا ہے، دیوتاؤں کی آنکھیں آگ برساتی رہیں گی۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے شکست دینے کے لیے بہت بڑی فوج کی اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھو۔ عورتوں نے اپنے زیورات اور مردوں نے اپنی نقدی میرے آگے ڈھیر کر دی ہے۔ میں یہ دولت آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔ آپ کی فوجیں جب غزنی کی فوج کے خلاف لڑ رہی ہونگی اُس وقت میں آپ کو آپ کی فوجوں کے اخراجات سے آزاد کر دوں گا۔ تمام خرچ متھرا کے اس مندر سے پورا ہو گا۔ آپ کی شکست میری شکست ہے۔ دیوتا مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں نے آپ کے دلوں میں اپنے مذہب کی برتری اور محبّت اور اسلام کی نفرت پیدا نہیں کی...

"فتح وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے دشمن کی اور اُس کے مذہب کی نفرت ہو۔ نفرت ایک قوّت ہوتی ہے۔ مسلمان اتنی دُور سے آکر تمہیں اس لیے شکست

دے جاتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں تمہاری نفرت بھری ہوئی ہے۔ وہ ہمارے مذہب کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اب آپ کو ثابت کرنا ہے کہ مذہب ہمارا سچا ہے۔ آپ کو غزنی کی فوج پر قہر بن کر گرنا ہے۔"

پنڈت نے راجوں مہاراجوں کو اسلام کے خلاف بھڑکا کر مژدہ سنایا کہ ہری کشن واسدیو نے اُسے اشارہ دیا ہے کہ اب مسلمانوں کو فیصلہ کُن شکست ہوگی۔ پنڈت بیٹھ گیا تو لاہور کے مہاراجہ بھیم پال، قنوج کے مہاراجہ راجیا پال، مہابن کے راجہ کوُل چند کے علاوہ بلند شہر اور چند اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجوں کی وہ تاریخی کانفرنس ہوئی جس کے بعد سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر تاریخی یلغار کرنی پڑی۔ اُس نے اپنی تاریخ کی ایک ایسی پیش قدمی کی جسے آج تک تاریخ دان اور فنِ حرب و ضرب کے یورپی مبصّر خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک مورّخ سر آرل سٹین نے لکھا ہے "محمود غزنوی غزنی سے متھرا تک قلعے سر کرتا، تیز و تند طغیانی کی طرح آیا اور متھرا اور قنوج کو اُجاڑ گیا!"

اُس وقت کی تحریروں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اُس کی ان فتوحات کے پیچھے اُس کی انٹیلی جنس (دیوانِ شغلِ اشرافِ مملوکات) کا ہاتھ تھا۔ اُس نے ان مہاراجوں کی تیاری کی اطلاع قبل از وقت اور مکمل معلومات مل جانے پر برق رفتار پیشقدمی کی اور انہیں آدبوچا۔

لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اور کالنجر (کوٹلی کشمیر) کا راجہ جانکی بھی سلطان محمود کے باجگزار تھے اور ان میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بھیم پال غزنی کے خلاف کوئی جنگی کاروائی نہیں کرے گا اور بوقتِ ضرورت غزنی کی فوج کو ہندوستان میں جس مدد کی ضرورت ہوئی، دے گا۔ یہی معاہدہ کالنجر کے راجہ نے کیا تھا۔

یہ دونوں مہاراجے ۱۰۱۷ء کے موسمِ برسات میں متھرا کے بڑے مندر میں بہت سے راجوں مہاراجوں کے ساتھ بیٹھے سلطان محمود کو فیصلہ کُن شکست دینے اور غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ بھیم پال نڈر نے اس کانفرنس

میں صاف کہہ دیا کہ اِس منصوبے میں وہ پیش پیش نہیں ہوگا، درپردہ ساتھ ہوگا۔ اُس نے وجہ یہ بیان کی کہ سلطان محمود کے خلاف جتنی لڑائیاں اُس کے خاندان نے لڑی ہیں، وہ اور کسی نے نہیں لڑیں اور ہر بار اُسے اپنا نقصان اپنے ذرائع سے پورا کرنا پڑا ہے اور اُس نے مجبور ہو کر سلطان محمود کے ساتھ صلح اور باج کا معاہدہ کیا ہے۔

اس منصوبے کی قیادت مہاراجہ قنوج راجیا پال کو دی گئی۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی سکیم کی قیادت کا اہل مہاراجہ قنوج ہی تھا۔ اُس کے پاس جنگی فہم و فراست بھی تھی، جنگی طاقت بھی تھی اور شمالی ہند میں قنوج کی گدی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، للہٰذا مشترکہ کمان اسی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ منصوبہ کچھ اس طرح بنا کہ تمام راجوں مہاراجوں کی آدھی آدھی فوجوں کی ایک مشترک فوج بنائی جائے اور باقی نصف مختلف قلعوں میں تقسیم کر دی جائے تاکہ سلطان محمود جوابی حملہ کرے یا کسی اور راستے سے آجائے تو قلعہ بند فوج اُسے روک کے مشترک فوج کے لیے طے پایا کہ پشاور کی طرف پیشقدمی کرے اور سلطان محمود کو پشاور کے قریب (درّہ خیبر کی سمت) میدان میں للکارا جائے اور اس سے پہلے فوج کا کچھ حصہ پہاڑیوں میں جگہ جگہ گھات میں بٹھایا جائے جو اُس کی جنگی طاقت کو پہاڑیوں میں ہی کمزور کردے۔

اس منصوبے پر سب نے اتفاق کیا۔ سب نے کشن واسدیو کے بُت کے سامنے کھڑے ہو کر حلف اٹھایا کہ وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے جان اور مال کی قربانی دیں گے۔

امیر بن تاشقین مہاراجہ قنوج کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ تین چار اور مہاراجوں کے ذاتی محافظ بھی اندر بتوں کی طرح کھڑے تھے۔

متھرا سے تقریباً ایک سو میل دُور شمال مشرق میں دریائے گنگا میں گرنے والے ایک چھوٹے دریا رام گنگا کے کنارے بلند شہر واقع ہے۔ اُس دَور میں یہ چھوٹی سی ایک راجدھانی تھی اور اس کا نام بارن یا بَرن ہُوا کرتا تھا۔ اس کا راجہ ہردت بھی اِس کانفرنس میں موجود تھا۔

"ہم نے سلطان محمود کو شکست دینے کا بڑا اچھا منصوبہ بنالیا ہے"۔۔۔ راجہ ہردت

نے کہا ـــــ "لیکن کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ مسلمان ہر بار کیوں فتح حاصل کر لیتے ہیں ۔ یہ بھی سوچیں کہ اُن کے پاس کونسا جادو ہے جو ہم میں نہیں ..... میں ان کی ایک خوبی بیان کروں گا ۔ غزنی کے جاسوس بہت تیز اور ہوشیار ہیں ۔ وہ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی طاقت ہیں ..... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہاں بھی غزنی کے جاسوس موجود ہیں اور ہماری باتیں سُن رہے ہیں ۔ رات طوفان میں کچھ جانیں ضائع ہوئی ہیں اور آج غزنی کا ایک جاسوس اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے ۔ میری فوج کے ایک عہدیدار نے اتفاق سے ایک جاسوس سے اُس کا اصل روپ معلوم کر لیا تھا ۔ اس جاسوس نے اپنے تین ساتھیوں کو پکڑوانا چاہا مگر معلوم نہیں کدھر سے ایک خنجر آیا اور یہ جاسوس ہلاک ہو گیا ۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جاسوس کیسے ہیں اور ان کی نظر کہاں تک پہنچتی ہے ۔"

راجہ ہردت نے اوشا کے باپ سے سنا ہُوا قصّہ اور اُوشا کا سارا واقعہ سُنا دیا ، پھر کہنے لگا ــــ "مرنے والے نے ایک ایسے جاسوس کی نشاندہی کی تھی جس کا ابھی نام نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اُسے ایسی حیثیت حاصل ہے کہ الزام غلط ہُوا تو ہم میں نفاق پیدا ہو جائے گا ۔"

ہردت نے کنکھیوں امیر بن تاشقین کی طرف دیکھا جو بُت بنا کھڑا تھا ۔ وہ اندر سے لرز گیا مگر بُت کی طرح کھڑا رہا ۔ راجوں مہاراجوں نے ہردت سے کہا کہ وہ اُس جاسوس کا نام لے لیکن اس نے کہا کہ وہ پہلے اپنے طور پر سراغرسانی کرے گا ، پھر اس جاسوس کو سب کے سامنے کھڑا کر دے گا ۔

یہ محفل برخاست ہوئی تو مہاراجہ قنوج نے راجہ ہردت کو ساتھ لے لیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ چونکہ اُسے مشترکہ کمان دے دی گئی ہے ، اس لیے اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کسے جاسوس سمجھ رہا ہے جسے یہاں اتنی اونچی حیثیت حاصل ہے کہ وہ اُس پر الزام لگانے سے ڈرتا ہے ۔ ہردت اُسے ٹالتا رہا کیونکہ تاشقین ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا ۔ مہاراجوں کے خیمے اُڑ جانے کی وجہ سے اُن کے لیے مکان خالی کرا لیے گئے تھے ۔ مہاراجہ

قنوج اپنی رہائش گاہ میں پہنچا تو اُس نے تاشقین کو جسے وہ جگن ناتھ سمجھتا تھا، چھٹی دے دی اور وہ ہردت کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

چمپا مہاراجہ کی لاڈلی رانی تھی۔ وہ اُس کے انتظار میں تھی۔ اُس نے مہاراجہ اور راجہ ہردت کو شراب کے پیالے پیش کیے اور مہاراجہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہردت نے چمپا کی طرف دیکھا تو راجیاپال اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے چمپا سے کہا کہ ایک ضروری بات کرنی ہے اس لیے وہ کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ چمپا چلی تو گئی لیکن تجسّس نے اُسے دروازے کے ساتھ ہی روک لیا اور وہ باتیں سُننے لگی۔

"میں جو بات کرنے لگا ہوں، وہ اُس قسم کے مطابق ہے جو ہم سب نے مندر میں کھائی ہے"۔ راجہ ہردت نے کہا۔ "مجھے میرے عہدیدار نے بتایا ہے کہ آپ کا یہ ذاتی محافظ جگن ناتھ نہیں امیر بن تاشقین ہے اور یہ غزنی کا بڑا ہی دانشمند اور ہر فن مولا جاسوس ہے۔ میرے عہدیدار کو یہ بات اُس جاسوس نے بتائی تھی جو قتل ہو گیا ہے... آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی ہو گی"۔

"آپ کی بات مجھے بُری نہیں لگی"۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔ "لیکن میں مان نہیں سکتا کہ کوئی اجنبی مجھے اس طرح دھوکہ دے سکتا ہے۔ میں آپ کے الزام کو ٹالوں گا نہیں"۔

"اگر آپ سُننے کی ہمّت رکھتے ہیں تو میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں"۔ راجہ ہردت نے کہا۔ "آپ کے لیے حسین لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چمپا رانی اور آپ کے ذاتی محافظ کا درپردہ دوستانہ ہے۔ اگر آپ چھوٹی رانی کی خادمہ سے پوچھیں جو اُس کے ساتھ پرسوں رات دریا پر گئی تھی تو آپ کو حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی اس جاسوس کے ساتھ مل کر آپ کے لیے ایک حسین دھوکہ بنی ہوئی ہے"۔

"ذرا کھل کر بتائیں کہ آپ کو یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں"۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔ "میں خادمہ کو آپ کے سامنے بلاؤں گا اور صبح آپ میرے محافظ اور میری رانی کی لاشیں دیکھ لینا"۔

"اُس عہدیدار کو میں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے"۔ راجہ ہردت نے کہا۔ "وہ باہر

کھڑا ہے۔ آپ اُس کی زبانی جاسوسوں کے متعلق سُن سکتے ہیں"۔۔۔ اور اُس نے چمپا اور تاشقین کی دوستی کی تفصیل سنانی شروع کردی۔

چمپا وہاں سے دبے پاؤں باہر نکل گئی اور تاشقین کے کمرے میں جا پہنچی۔

"فوراً نکلو اور گھوڑا نکالو"۔ چمپا نے اُسے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "ہم دونوں کا راز کھُل گیا ہے"۔

"کیسا راز؟"۔۔۔ تاشقین نے پوُچھا۔۔۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"بلند شہر کا راجہ ہمارے مہاراجہ کو بتا رہا ہے کہ تم جگن ناتھ نہیں، غزنی کے مسلمان ہو۔ معلوم نہیں اُس نے تمہارا کیا نام بتایا ہے... اور اُس نے مہاراجہ کو بھی بتا دیا ہے کہ میری اور تمہاری در پردہ دوستی ہے۔ وہ میری خادمہ کو بلا رہے ہیں.... کیا یہ صحیح ہے کہ تم مسلمان ہو؟"

"کیا تم مجھے پکڑوانے آئی ہو یا مجھے یہاں نکل جانے کو کہنے آئی ہو؟"

"مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ"۔ چمپا نے کہا۔۔۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ فوراً نکلو اور مجھے ایک چادر دو جو میں اپنے اوپر ڈال لوں۔ جلدی کرو"۔

"وہ ٹھیک کہتے ہیں چمپا!"۔۔۔ تاشقین نے کہا۔۔۔ "میں مسلمان ہوں۔ میرا نام تاشقین ہے۔ کیا اب بھی میرے ساتھ چلو گی؟ مسلمان ہو جاؤ گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلنے اور تمہارے ساتھ مرنے کے لیے آئی ہوں"۔۔۔ چمپا نے کہا۔۔۔ "مجھے چادر دو"۔

تاشقین نے ایک چادر چمپا کو دی۔ تلوار کمر سے باندھی اور خنجر بھی کمر بند سے اُڑس لیا۔ دونوں اصطبل کی طرف چل پڑے۔ اُدھر مہاراجہ راجیاپال نے گرج کر حکم دیا کہ اُس کے محافظ اور چمپا رانی کو فوراً حاضر کیا جائے۔

تاشقین نے چمپا کو ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا رہنے کو کہا اور خود اُس جگہ چلا گیا جہاں گھوڑے بندھے تھے۔ اُس کی حیثیت ایسی تھی کہ اُس کا حکم فوراً مانا جاتا تھا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سائیس سے کہا کہ اس کے گھوڑے

کی زین وغیرہ جلدی لائے۔

اُدھر مہاراجہ کو بتایا گیا کہ چمپا رانی معلوم نہیں کہاں ہے۔ مہاراجہ نے حکم دیا کہ دونوں کو فوراً تلاش کرو۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ اس حکم پر وہ دس بارہ محافظ جو مہاراجہ کے پہرے پر رہتے تھے، دوڑ اٹھے۔ ایک جلتی مشعل سے انھوں نے تین چار مشعلیں جلالیں اور ساتھ لے گئے تھے۔

تاشقین کا گھوڑا تیار ہو گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور وہاں پہنچا جہاں چمپا اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس نے چمپا کو اپنے پیچھے سوار کرایا مگر گھوڑا موڑا تو آگے سے مشعلیں آ رہی تھیں۔ شہر کا دروازہ کھلا تھا مگر اب اُدھر سے نکلنا مشکل تھا۔ اُس نے گھوڑا دوسری طرف موڑا۔ اسے محافظوں کی للکار سنائی دی کہ رک جاؤ ورنہ تیر آ رہے ہیں۔ وہ نہ رکا۔ اُسے چمپا کی چیخ سنائی دی۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ میری پیٹھ میں دو تیر اتر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے گر پڑی۔

گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور رکنے لگا۔ تاشقین سمجھ گیا کہ گھوڑا بھی تیروں کا نشانہ بن گیا ہے۔ گھوڑا بے لگام ہونے لگا تو تاشقین دوڑتے گھوڑے سے کودا۔ اُس کے قریب سے تیر گزر گئے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ اپنے تعاقب میں آنے والوں سے پہلے ہی وہ گلی کے دو تین موڑ مڑ گیا۔ اسے چمپا کا کوئی غم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہوگی۔ اُسے اس لڑکی کے خون کا بدلہ نہیں لینا تھا۔ وہ جس فرض کے لیے یہاں آیا تھا، اُسے وہ پورا کرنا تھا۔ اُسے غزنی پہنچنا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ شہر کی دیوار کا ایک حصہ دریا کے بالکل ساتھ ہے اور رات کی بارش سے دریا میں اتنا پانی ہوگا کہ دیوار کو چھو رہا ہوگا۔ گلیوں میں اس کے تعاقب میں آنے والے شور مچاتے جا رہے تھے۔ تاشقین اُس چوڑی ڈھلان تک پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر جاتی تھی۔ نیچے کے شور سے دو سنتری جو دیوار پر پہرہ دے رہے تھے، اُس کے راستے میں آ گئے۔ اُس نے ان کے قریب جا کر تلوار نکالی اور ایک کے پیٹ میں اتار دی۔ دوسرا بھاگ اٹھا۔ مشعل بردار محافظ ڈھلان تک آ گئے۔ تاشقین دیوار پر دریا کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے دیوار بہت اونچی تھی۔ اُس نے

دریا میں چھلانگ لگادی۔

متھرا سے غزنی تک کا ہوائی فاصلہ سات سو میل ہے۔ راستے میں سات بڑے دریا آتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ راستہ پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہے۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ یہ تین مہینوں کی مسافت تھی۔

سلطان محمود غزنوی خوارزم کو اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ خوارزم کی فوج کو اُس نے غزنی کی فوج میں مدغم کرلیا تھا اور اُس نے بھرتی کی مہم تیز کر دی تھی۔ اس کی بہت سی فوج ضائع ہو چکی تھی۔ اُس نے مسجدوں میں اعلان کروائے تھے کہ ہندوستان جو محمد بن قاسم کے دور میں اسلامی ملک بنتا جا رہا تھا، ہندوؤں کا بُت خانہ بن گیا ہے اور وہاں اسلام کے سرچشمے کو بند کرنے کے جنگی منصوبے بن رہے ہیں۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچائیں اور ہندوستان سے بُت خانوں کا خاتمہ کریں۔ یہ ایک ایسی شیطانی قوت ہے جسے وہیں نہ دبایا گیا تو یہ اسلام کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔

مسجدوں میں امام اسی موضوع پر وعظ دیتے اور لوگوں کو فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ وعظ قرآن اور احادیث کے حوالوں سے بھی ہوتے تھے اور جذباتی انداز سے بھی۔ سلطان محمود کا یہ پیغام مسجدوں اور مدرسوں میں اور سرکاری انتظامات کے تحت سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچایا گیا!

"سلطانی ایک بڑا نازک فرض ہے جو خُدا نے مجھے سونپا ہے۔ سلطان کا کام صرف حکومت کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ قوم کو خوشحال اور باوقار رکھے اور اوّلیت اس کو ہے کہ جنگی طاقت اتنی تیار کرے کہ اپنے دین کے دشمنوں کے پاس خواہ کتنی ہی جنگی طاقت ہو وہ سر نہ اٹھا سکیں اور اگر اُس کے پڑوس میں مسلمانوں پر کفّار ظلم و تشدد کر رہے ہوں تو ان کی نجات کے لیے خود بھی جائے اور قوم کو بھی اس جہاد کے لیے تیار کرے ..... مجھے قوم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ غزنی کے شیرو! آؤ ہم اپنی زندگی میں یہ فرض پورا کر جائیں۔"

سلطان محمود غزنوی جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل ناظم تھا۔ ہندوستان سے وہ جو زروجواہرات لے جاتا تھا، انہیں وہ لوگوں کی فلاح وبہبود اور تعلیم و تربیت پر خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ وہ فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ چونکہ لوگ خوشحال تھے اس لیے وہ سلطان کے اشاروں پر سرگرم عمل ہو جاتے تھے۔ اب (۱۰۱۷ء کے آخر میں) اُس نے اپنی سلطنت میں فوجی بھرتی کا جنون طاری کر دیا۔ وہ اپنے سالاروں سے کہنے لگا تھا۔ "مجھے اپنے والد محترم کی یہ وصیت پوری کرنی ہے کہ ہندوستان کے بُت خانے ختم کر کے وہاں اسلام پھیلانا ہے۔ مجھے خواب میں بھی یہی اشارہ ملا تھا۔ میرے پیرو مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور مہم بڑی دُور کی ہے۔"

سلطان ہندوستان کی خبروں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ سننے کے لیے بیتاب رہتا تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے اُس کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ۱۰۱۷ء کا سال ختم ہو چکا تھا۔ ۱۰۱۸ء کے تین مہینے گزر گئے تھے۔ اسے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

ایک روز اُسے بتایا گیا کہ ہندوستان سے امیر بن تاشقین نام کا ایک آدمی آیا ہے۔

"تاشقین آ گیا ہے؟" سلطان نے اچھل کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "فوراً بلاؤ۔"

جب تاشقین اندر آیا تو سلطان حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ زرد رُو، مریل چہرہ جس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی، تاشقین کا نہیں تھا۔ اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اُس سے پاؤں پر کھڑا نہیں ہُوا جا رہا تھا۔ سلطان نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا اور اُس کے لیے مشروب اور کھانا لانے کو کہا۔

"تین مہینوں کا سفر ڈیڑھ مہینے میں طے کیا ہے"۔ تاشقین نے ہانپتی آواز میں کہا۔ "متھرا میں گرفتار ہو چلا تھا۔ خُدا نکال لایا ہے.... ہندوستان کا نقشہ لائیے ... گھوڑے چوری کرتے اور دوڑا دوڑا کر مارتے پہنچا ہوں۔ ایک آدمی کو گھوڑے کی خاطر قتل کرنا پڑا۔ ایک دریا بغیر گھوڑے کے تیر کر پار کیا۔ گھوڑے پر ہی سوتا رہا ہوں۔"

اس نے مشروب پیا اور سانسوں کو سنبھالتے ہوئے اُن تمام مہاراجوں اور راجوں کے نام بتائے جنہوں نے مندر میں کانفرنس کی تھی۔ سلطان کو اُن کا منصوبہ بتایا اور نقشے پر اُسے دکھانے لگا کہ متھرا، قنوج، بلند شہر اور مہابن کہاں کہاں ہیں اور اس علاقے میں گھنے جنگل کے علاوہ گنگا اور جمنا بہت مشکل پیدا کریں گے۔ پھر اُس نے نقشے پر وہ چھوٹے چھوٹے قلعے دکھائے جن میں مہاراجوں نے مشترکہ فوج کی نصف نفری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"وہ پشاور کے اُس میدان میں آکر لڑنا چاہتے ہیں جہاں آپ بھیم پال نڈر کے باپ جے پال کو شکست دے چکے ہیں"۔۔۔ امیر بن تاشقین نے کہا ۔۔۔"وہ لمغان کی پہاڑیوں تک اپنے دستے ہمارے انداز سے گھات میں بٹھائیں گے۔ اگر ہماری فوج آگے نکل گئی تو چھوٹے چھوٹے قلعوں کی فوج ہمارا راستہ روکے گی"۔

"لاہور کے بھیم پال کے کیا ارادے ہیں؟"۔۔۔ سلطان محمود غزنوی نے پوچھا۔

"وہ آپ سے ڈرتا بھی ہے اور اس منصوبے میں بھی پوری طرح شامل ہے"۔

"اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے"۔۔۔ سلطان نے کہا۔۔۔"اُسے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہیئے۔ ہندوستان کے راجپوت دلیر لوگ ہیں۔ غیرت والے بھی ہیں..... کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کی فوجیں کب تک اکٹھی ہو سکیں گی اور وہ پیشقدمی کب تک کریں گے؟"

"کم از کم ایک سال لگے گا"۔۔۔ تاشقین نے کہا ۔۔۔"متھرا کے پنڈت انہیں جلدی کرنے کو کہہ رہے تھے"۔

"ہم ان کا انتظار لمغان اور پشاور میں نہیں کریں گے"۔۔۔ سلطان نے کہا۔۔۔"ان سے ہماری ملاقات متھرا اور قنوج میں ہو گی .... تاشقین! پورا ایک مہینہ آرام کرو۔ تم بہت زیادہ انعام کے مستحق ہو۔ یہ تمہیں تھوڑی دیر میں مل جائے گا"۔

"دشمن کو تیاری کی حالت میں جا پکڑو"۔۔۔ سلطان محمود اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں بتا رہا تھا۔۔۔"دشمن کو حملہ کرنے کی مہلت نہ دو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہند کے مہاراجے کس طرح اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہ فوج کو کس طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم اُس وقت انہیں جا دبوچیں گے جب اُن کے دستے مشترکہ

فوج بنانے کے لیے سفر کی حالت میں ہوں گے۔ ہمارا سب سے بڑا شکار متھرا ہو گا۔ امیر بن تاشقین نے مجھے بتایا ہے کہ متھرا کے بُت بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں اور متھرا ہندوؤں کے کرشن مہاراج کا جائے پیدائش ہے۔ کرشن ان کا پیغمبر تھا۔ تاشقین نے بتایا ہے کہ اُس کا بت سنگِ مرمر کا ہے اور اس کی آنکھیں نہایت خوشنما اور بیش قیمت ہیروں کی ہیں۔ سارے ہند کے ہندو اس بُت کی زیارت کے لیے جاتے ہیں ....

"ہمیں فوراً کوچ کرنا ہے۔ ہم پنجاب میں سے نہیں گزریں گے۔ وہاں کا مہاراجہ بھیم پال ہمارا باجگزار ہے مگر اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔ ہم کشمیر کی اُن پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ جن کے دامن میں پنجاب واقع ہے، گزریں گے۔ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے راستے میں سات دریا آئیں گے۔ پہاڑ اور جنگل آئیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم اپنے ملک سے بہت دور جا کر لڑیں گے۔ ہمیں نہ کمک ملے گی نہ رسد۔ رسد ہمیں راستے سے پوری کرنی ہے۔"

سلطان محمود نے ہندوستان کا نقشہ جو اُس نے اپنے ہاتھ سے چادر جتنے بڑے کپڑے پر بنا رکھا تھا، سب کے سامنے رکھتے ہوئے یہ بتایا کہ پیش قدمی کا راستہ یہ ہو گا اور متھرا پر براہِ راست حملہ نہیں ہو گا۔ پہلے ارد گرد کی ریاستوں کو ختم کیا جائے گا۔

"لیکن یہ مہم آسان نہیں ہو گی" ـــــ سلطان نے کہا۔ "ہم جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ مہاراجہ قنّوج مہاراجہ بھیم پال سے مختلف ہے۔ سنا ہے وہ لڑنا اور اپنی فوج کو لڑانا جانتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے متھرا میں جہاں لاکھوں ہندو جمع تھے غزنی کی فوج کی ایسی دہشت پھیلائی ہے کہ وہاں کے لوگ بھگدڑ مچا دیں گے مگر یہ نہ بھولنا کہ کسی کے مذہب پر اور مقدّس مقام پر حملہ ہو تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیا کرتا ہے۔"

سلطان محمود نے دیگر ہدایات دیں اور تیاری کے لیے صرف تین دن دے کر چوتھے روز کوچ کا حکم دے دیا۔

سلطان محمود نے بروز ہفتہ ۲۷ ستمبر ۱۰۱۸ء (۱۳ جمادی الاوّل ۴۰۹ھ) غزنی سے کوچ کیا۔ مورخوں میں اس کی جنگی طاقت کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ عطبی نے اس کی فوج کی تعداد گیارہ ہزار باقاعدہ فوج اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے جو صحیح معلوم

نہیں ہوتی۔ فرشتہ نے تعداد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ لکھی ہے۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے یہ فوج ترکستان، خوارزم، خراسان اور چند اور بڑوسی علاقوں سے اکھٹی کی تھی۔ پروفیسر محمد حبیب نے مورخوں کے حوالے سے فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار اور پیادہ اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے۔

یہ فوج کئی میل لمبی تھی اور رفتار بہت تیز۔ یہ فوج دریائے سندھ اور جہلم اس حالت میں پار کر گئی کہ دونوں دریاؤں میں طغیانی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے لیے کشتیوں کے پل بنائے گئے مگر فوج نے انسانی پل بنا کر دستے پار کر دیئے۔ دریائے راوی دور اوپر سے اُس جگہ سے پار کیا گیا جہاں پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا اور دریا کئی شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سلطان نے اس سے آگے کسی ذمہ دار گائیڈ کی ضرورت محسوس کی۔ اُس نے اپنا ایک ایلچی کالنجر (موجودہ کوٹلی) کے راجہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اُسے قنوج تک ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ ایلچی کے ساتھ سلطان نے ایک محافظ دستہ بھیجا۔

"سلطانِ غزنی محمود نے سلام بھیجا ہے" — ایلچی نے راجہ کالنجر سے اُس کے دربار میں کہا — "سلطان نے وہ معاہدہ یاد دلایا ہے جس کے تحت آپ غزنی کی فوج کی مدد کرنے کے پابند ہیں۔ سلطان نے کہا ہے کہ میری منزل کہیں اور ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری فوج کو اپنے ہاں آنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اگر آپ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو میری ضرورت فوری طور پر پوری کر دیں۔ رہبر ایسا بھیجیں جو دھوکہ نہ دے۔ دھوکے کی صورت میں میں اسے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھوں گا۔"

راجہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایلچی نے کہا — "سلطان کے ساتھ جو فوج ہے اتنی آپ کی ریاست کی آبادی نہیں۔"

راجہ نے اُسی وقت اپنے بیٹے شاہی کو (جسے بعض مورخوں نے سپلی لکھا ہے) ایلچی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سلطان نے اُسے ساتھ لے لیا اور اُسے قنوج تک چھوٹے سے چھوٹے راستے سے لے چلنے کو کہا۔ راستے میں کئی قلعے تھے۔ سلطان محمود نے ہر قلعے کا محاصرہ کر کے قلعہ داروں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

بیشتر قلعہ داروں نے اوپر سے سلطان کی فوج دیکھی تو سفید جھنڈا لہرادیا۔ سلطان نے ہر قلعے سے اپنی ضرورت کا سامان لے لیا اور بعض اہم قلعوں میں اپنی کچھ نفری چھوڑ دی اور قلعے کے ہندوستانی دستے کو گاڑیاں دھکیلنے اور سامان اٹھانے کے لیئے ساتھ لے لیا۔
سبطِ ابن الجوزی اور عنصری لکھتے ہیں ”سلطان محمود کی اس قدر دہشت تھی کہ اُس کے آگے قلعے اور چھوٹے بڑے شہر اور قصبے جیسے اپنے آپ فتح ہوتے جا رہے تھے“ سر آرل سٹین نے لکھا ہے۔ ”جن گھنے جنگلوں میں ہوا بھی راستہ بھول جاتی ہے ان میں سے سلطان اپنی فوج گذار کر لے گیا۔ اُس نے پنجاب کے پانچ دریا جیسے اُڑ کر پار کیئے ہوں، اور وہ بلند شہر تک سمندر کی موجوں کی مانند پہنچ گیا۔

سلطان محمود نے متھرا کو اپنی سکیم کے مطابق نظر انداز کر دیا اور ۲ دسمبر ۱۰۱۸ء (۲۰ رجب ۴۰۹ھ) کو دریائے جمنا پار کیا۔ اس کے سامنے سرساوا (جو اُس وقت شاروا کہلاتا تھا) کا قلعہ آگیا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں کا رائے اپنے کنبے کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ اُس کی فوج نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان کو قلعے سے تیس ہاتھی ملے۔ اُسے اس علاقے میں ایک اڈے کی ضرورت تھی۔ اُس نے اسی قلعے کو رسد گاہ بنالیا۔ قلعے سے دس لاکھ درہم خزانہ ہاتھ آیا۔

سرساوا سے سلطان نے بلند شہر کا رُخ کر لیا جو وہاں سے کم و بیش ایک سو میل دُور تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک تو دریائے گنگا عبور کرنا تھا، دوسرے رام گنگا۔ چونکہ سلطان کو ایک اڈہ مل گیا تھا اس لیے اُس نے رسد کے قافلے کو ساتھ گھسیٹنے کی بجائے صرف فوج ساتھ لی۔ قیدیوں سے کشتیوں کا پُل بنوایا اور دونوں دریا پار کر کے بلند شہر کو محاصرہ میں لے لیا۔

بلند شہر کا حکمران راجہ ہردت تھا جس نے مہاراجہ قنوج کو بتایا تھا کہ اُس کا ذاتی محافظ جگن ناتھ مسلمان جاسوس ہے اور چمپا رانی کے ساتھ اس کی در پردہ دوستی ہے۔ دوسرے راجوں مہاراجوں کے ساتھ اس نے بھی متھرا کے مندر میں حلف اٹھایا تھا کہ مذہب اور مہابھارت کے لیے جان و مال کی قربانی دے گا مگر اس کے شہر میں لوگوں کو اطلاع ملی کہ

شہر کو غزنی کی فوج نے محاصرے میں لے لیا ہے تو لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارے شہر پر دہشت طاری ہوگئی۔ یہ غزنی کے جاسوسوں کی پھیلائی ہوئی دہشت تھی۔ سلطان نے قلعے کے دروازے پر اپنے آدمی بھیج کر اعلان کرایا کہ ہتھیار ڈال دو، ورنہ شہر کو ملبے میں بدل دیا جائے گا۔

ہاتھی دروازے کو ٹکریں مار کر توڑنے کے لیے سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔ راجہ ہردت نے ایسی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ قلعے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آگیا۔ اُس کے پیچھے دس ہزار نفری کی فوج بھی ہتھیاروں کے بغیر باہر آگئی۔ ہردت کو سلطان کے پاس لے گئے۔

"میں اپنی، اپنے کنبے اور اپنی فوج کی سلامتی چاہتا ہوں" ـــــ راجہ ہردت نے سلطان سے کہا ـــــ "میں اور یہ دس ہزار فوجی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب میں قبول کرلیں۔"

زیادہ تر مورخین نے لکھا ہے کہ یہ دس ہزار افراد صرف فوجی نہیں تھے۔ ان میں شہریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ہردت کو مجبور کیا تھا کہ وہ شہر کو تباہی سے بچانے کے لیے صلح کرلے ورنہ وہ اپنے زیرِاثر فوجیوں کے ساتھ دروازے کھول دیں گے۔ ایک مورخ گردیزی نے لکھا ہے کہ راجہ ہردت دھوکہ دے کر بھاگ گیا تھا۔

سلطان محمود نے ان دس ہزار افراد کو قلعے میں پابند کرلیا، اور رات کے وقت اُس نے فوج سے دریائے گنگا عبور کرایا مگر اُس نے متھرا کا رُخ نہ کیا بلکہ متھرا کو نظر انداز کر کے مہابن کی طرف پیشقدمی کی۔ اُسے اطلاع ملی تھی کہ مہابن کے راجہ کُول چند نے اپنی فوج جنگل میں لڑائی کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے۔ کُول چند کو گھنے جنگل کا فائدہ حاصل تھا۔ اُس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے جنہیں اُس نے حملے کے لیے تیار رکھا ہُوا تھا۔

سلطان محمود نے اپنی فوج کا زیادہ تر حصہ جنگل کے دونوں پہلوؤں میں بھیج دیا اور صرف ہراول کے دستے جنگل کے اندر اس انداز سے بھیجے جیسے وہ دشمن سے بےخبر ہوں۔ یہ دستہ جنگل کے وسط میں پہنچا تو کُول چند نے حملے کا حکم دے دیا۔ سلطان کا دستہ گھوڑسوار تھا، گھنے جنگل میں بکھر گیا۔ یہ گھنے جنگل کی لڑائی تھی جس میں تیر انداز زیادہ مؤثر ثابت

نہیں ہو رہے تھے۔ مسلمان گھوڑ سوار پھرتی سے اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

اچانک کُول چند کی فوج پر دائیں بائیں اور عقب سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہراول دستہ ایک طرف ہو گیا۔ ہندوؤں کی فوج کے لیے اب کٹ مرنے اور بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ سر آرل سٹین نے اس لڑائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "اتنے گھنے جنگل میں غزنی کی فوج بالوں میں کنگھی کی طرح پھر گئی۔ آگے دریائے جمنا تھا جو اس فوج نے عبور کیا تھا۔ کول چند کی فوج دریا میں کود گئی اور بہت کم نفری زندہ رہی۔ ان میں سے جو کنارے پر آتا تھا اُسے مسلمان تیر انداز ختم کر دیتے تھے۔"

راجہ کُول چند کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت محل میں گئے تو اُس کے چوبدار نے بتایا کہ راجہ کی ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اُس نے دونوں کو تلوار سے قتل کیا اور اپنا خنجر اپنے دل میں گھونپ لیا ہے۔ چوبدار نے اندر لے جا کر تینوں کی لاشیں دکھائیں۔ راجہ کُول چند کے ایک سو پچاسی جنگی ہاتھی غزنی والوں کے ہاتھ لگے۔

متھرا کے متعلق امیر بن تاشتقین نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ اس کے ارد گرد دیوار بہت مضبوط ہے لیکن اس کا دفاع مہاراجہ قنوج کی فوج کے ایک دو دستے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہابن کی فوج کی ذمہ داری میں متھرا کا دفاع بھی تھا۔ سر ساوا اور بلند شہر والے اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ کسی بیرونی حملہ آور نے متھرا پر حملہ کیا تو وہ اُسے متھرا تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ وہ جمنا کو متھرا کا قدرتی دفاع کہا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان محمود نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متھرا کے ارد گرد کے قلعے سر کیے پھر مہابن کی فوج کو راستے سے ہٹایا اور اطمینان سے متھرا کی طرف بڑھا۔ اُس نے متھرا کو دُور سے دیکھا تو عش عش کر اُٹھا۔ بعد میں اُس نے غزنی کے گورنر کو متھرا کی خوبصورتی اور ہندوؤں کے قدیم فنِ تعمیر کے متعلق خط میں لکھا تھا۔ "یہاں کی عمارتیں یہاں کے عقیدتمندوں کے عقیدوں کی طرح مضبوط ہیں۔ زیادہ تر سنگِ مرمر کی ہیں۔ بہت سے مندر ہیں۔ یہ تھوڑے سے عرصے میں تعمیر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کی تعمیر پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہوں گے اور ان کی تعمیر دو صدیوں میں مکمل ہوئی ہو گی..... میں اس شہر کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

سلطان محمود کی فوج کا نقصان بہت کم ہُوا تھا۔ وہ خود اعتمادی سے متھرا کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مہابن کی فوج کے بھگوڑے متھرا پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لوگوں میں خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس سے پہلے ہشام اور اُس کے ساتھی دہشت پھیلا چکے تھے۔ مہابن کے شکست خوردہ سپاہیوں نے متھرا میں یہاں تک کہا کہ غزنی کی فوج کے آگے درخت اُکھڑ جاتے ہیں۔ ان افواہوں کا یہ اثر ہُوا کہ شہر کی آبادی دفاع میں لڑنے کی بجائے مندروں میں اکٹھی ہو گئی۔ سنکھ اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔

غزنی کی فوج نے شہر کا محاصرہ کیا تو نہایت معمولی مزاحمت ہوئی۔ شہر کے دروازے کھُل گئے اور سلطان محمود شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے بڑے مندر میں گیا جہاں کرشن واسدیو کا بُت رکھا تھا۔ بہت خوبصورت بُت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیش قیمت ہیرے لگے ہوتے تھے۔ پانچ بُت سونے کے تھے۔ ان کی بھی آنکھیں ہیروں کی تھیں۔ ان سب ہیروں کی قیمت فرشتہ کے مطابق پچاس ہزار دینار تھی۔ ایک اور بُت سونے کا تھا۔ اس میں چار سَو مثقال وزنی ہیرے جیسا پتھر جڑا ہُوا تھا۔ اس بُت کو پگھلایا گیا تو ۹۸۳۰۰ مثقال خالص سونا نکلا۔ ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے۔ ایک سَو بُت چاندی کے تھے۔

سلطان محمود نے پتھر کے بُت توڑ ڈالے اور سونے چاندی کے بُت پگھلا دیئے۔ ہندو مت کے اس مرکز کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے سلطان محمود بیس روز متھرا میں رہا۔ شہر جلتا رہا اور خالی ہوتا رہا حتیٰ کہ متھرا کھنڈروں کا شہر بن گیا۔

مہاراجہ قنوج نے اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اب اُس کی باری تھی۔

ہماری چند لازوال کتب

اسلامی تاریخی ناول، آپ بیتیاں، جُرم وسزا، طِب ونفسیات اور پاک بھارت جنگ



جہانگیر بُک ڈپو

JBD Press

اُردو بازار، لاہور۔ فون: 042-7220879
اقبال روڈ، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-781781
اُردو بازار، کراچی۔ فون: 021-7765086
نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر رسالہ روڈ۔ حیدرآباد